پردیسی درخت

نسیم حجازی

فہرست

پیش لفظ

"خاک اور خون" کی اِشاعت کے بعد مجھے اُمید تھی کہ آنے والے
اَدوار میں پاکستان کے کئی اہلِ قلم اِس موضوع پر لکھیں گے اور کاروانِ پاکستان
نے ماضی کی تاریکیوں کے پہلو میں جو چراغ جلائے تھے ان کی روشنی قوم
کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوگی لیکن ہمارے ترقی پسند دانش وروں کے
نزدیک زمانۂ قبل از تاریخ کے کھنڈر مُسلمانوں کی اُن جلی ہُوئی بستیوں سے
کہیں زیادہ اہم تھے جن کی راکھ ابھی تک گرم تھی۔

کوئی پچیس برس قبل جبکہ "خاک اور خون" کے کئی ایڈیشن نِکل چکے تھے،
ایک گفتگو کے دَوران مَیں نے احسن صاحب کو یہ کہا تھا کہ اگر کبھی فرصت
مِلی تو میں "پردیسی درخت" کے عُنوان سے ایک ناول لکھوں گا۔ احسن صاحب
ذرا چونکے لیکن اُن کے چھوٹے بھائی محمد محسن صاحب کافی پریشان ہُوئے
تھے ــــــ

پانچ سال قبل میں افغانستان کے اولوالعزم مجاہدوں کے متعلق لکھنے
کے لیے مواد جمع کر رہا تھا کہ اچانک بیمار ہو گیا۔ دو سال بعد مجھے ڈاکٹروں نے
مکمل آرام کا مشورہ دیا اور میرا تجزیہ یہ تھا کہ مکمل آرام کرنے کا بہترین طریقہ
یہ ہے کہ میں بستر پر لیٹے لیٹے کوئی ناول اِملا کرادوں۔

کوئی تیس برس پہلے میں نے طویل علالت اور سخت تکلیف کی حالت
میں "مُعظّم علی" اور "اور تلوار ٹوٹ گئی" اِملا کروائی تھیں لیکن اس وقت میرے

رفیقِ کار شرف الدّین اِصلاحی (اب ڈاکٹر شرفُ الدّین اِصلاحی) تھے۔

میں نے پروفیسر سعید اختر صاحب کو اِملا دینا شرُوع کی لیکن سخت
گرمی کے ایّام میں ان کی صحت پر اثر پڑا اور وہ زیادہ دیر میرا ساتھ نہ دے
سکے۔ پھر کافی عرصہ تک کوئی نیا آدمی تسلّی بخش کام نہ کر سکا۔ ۱۹۸۶ء میں
ایک ذہین بچّی آنسہ عارفہ عبّاس میرے کام میں شریک ہوگئی اور میرا خیال
تھا کہ میں سال کے اِختتام تک یہ کام ختم کرلوں گا لیکن عارفہ عبّاس کے
والد محترم ملازمت سے ریٹائر ہوچکے تھے اور وہ کراچی شفٹ ہونے کی
تیّاریاں کر رہے تھے۔ اُنھوں نے ایک مہینہ کے لیے اپنا پروگرام مُلتوی کردیا
تاہم میری تمام کوششوں کے باوجود ایک تہائی کتاب باقی رہ گئی۔ ایک سال
بعد آنسہ عارفہ کو یہ معلوم ہُوا کہ کوئی اچھّا اِملا لینے والا نہ مِلنے کے باعث
میرا کام رُکا ہُوا ہے تو وہ اپنے والد کے ساتھ راولپنڈی آگئی اور اپنی
ایک عزیز سہیلی سیما رؤف کو اِملا لینے پر رضامند کر گئی۔ سیما بیٹی کے والد رؤف
صاحب میرے پُرانے دوست نِکلے اور اُنھوں نے خوشی سے بیٹی کو کام
کرنے کی اجازت دے دی۔

آنسہ سیما رؤف کو اِملا دینے سے قبل سابقہ مسوّدے پر نظرِثانی کرتے
ہُوئے مجھے یہ افسوس ہُوا کہ جو داستان "پردیسی درخت" کے عُنوان سے شرُوع
ہُوئی تھی وہ اس قدر پھیل گئی ہے کہ اسے ایک ناول میں ختم نہیں کیا جاسکتا۔
اس کی ایک وجہ تو اس کے موضوع کا پھیلاؤ تھا اور دُوسری یہ کہ جب اِنسان
کسی بیماری یا تکلیف میں مُبتلا ہوتا ہے تو وہ اپنے بچپن اور بھرپُور توانائی
کے زمانے کی یادوں میں پناہ لیتا ہے۔ لہٰذا مَیں نے اِس ناول کو دو حصّوں
میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ دُوسرا حصّہ "گمشدہ قافلے" کے عُنوان سے

اِختتام پذیر ہُوا۔

چنانچہ یہ کام جو مَیں نے تین سال قبل موسمِ گرما میں شرُوع کیا تھا' اِس سال گرمیوں کے اِختتام پر مکمّل ہُوا۔ آخری اور سب سے زیادہ تکلیف دہ مرحلہ بے ترتیبی سے بکھرے ہُوئے مسوّدے کو یک جا کر کے اس کے صفحات کی ترتیب درُست کرنا تھا۔

"پردیسی درخت" اور اس کے بعد "گمُشدہ قافلے" احسن صاحب کے سپرُد کرتے ہُوئے مجھے یہ محسُوس ہوتا تھا کہ یہ کام آنسہ بسیما رؤف سے بہتر کوئی بھی نہیں کرسکتا تھا جس کے لیے مَیں اِس ذہین اور محنتی بچّی کا شکرگزار ہُوں۔

مجھے اس بات کا افسوس رہے گا کہ طویل علالت کے باعث میں یہ کام جلدی ختم نہ کرسکا اور مُجاہدینِ افغانستان کی ایمان افروز اور رُوح پرور داستان میں تین سال تاخیر سے شرُوع کر رہا ہُوں۔ اللہ سے دُعا ہے کہ جو احباب مجھ سے جہادِ افغانستان کے موضوع پر قلم اٹھانے کا تقاضا کرتے رہے ہیں' مَیں اُن کی توقعات پُوری کرسکوں ـــــ آمین!

نسیم حجازی

یکم جنوری ۱۹۸۹ء

"الغیاث" ۳۳/بی سیٹلائٹ ٹاؤن۔ راولپنڈی

شیخ محمّد احسن

کے نام ـــــ

جو

میرے دوست اور پبلشر بھی ہیں ـــــ

آج سے تقریبًا پینتالیس برس قبل جب کوئی پبلشر ایک نئے مُصنّف کے مسوّدے کو ہاتھ لگانے کے لیے تیّار نہ تھا تو ایک دِن اچانک میں نے قومی کُتب خانہ میں اپنے کالج کے ایک ساتھی کو دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ قومی کُتب خانہ اِسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے گیٹ کے عین سامنے تھا اور احسن صاحب میرے کلاس فیلو تھے لیکن مجھے معلُوم نہ تھا کہ یہ میاں محمّد نصیر ہمایوں صاحب کے بڑے بیٹے ہیں جن کے نام میں ایک تعارُفی خط لے کر حاضر ہُوا تھا۔

احسن صاحب کے ساتھ یہ اچانک مُلاقات میری زندگی کا ایک اہم واقعہ ثابت ہُوئی اور چند ماہ بعد قومی کُتب خانہ سے میرا پہلا ناول شائع ہو گیا اور پھر تین اور تصانیف کے بعد میں فکرِ معاش سے آزاد ہو چُکا تھا ـــــ

۴۵ سال بعد جب میں "پردیسی درخت" نصف سے زیادہ لکھ چُکا تھا تو ایک دِن مجھے احسن صاحب کی صحت کے مُتعلّق تشویش ناک خبر

ملی۔ بار بار فون کیا تو معلوم ہُوا کہ ریسیور اُتار کر رکھ دیا گیا ہے۔ ساری رات اِضطراب میں گزری۔ کئی لوگوں کو فون کیے کہ اُن کے گھر جا کر پتہ کریں۔ صُبح آٹھ بجے معلوم ہُوا کہ اب وہ ٹھیک ہیں ——— میں نے کہا:

"اگر وہ ٹھیک ہیں تو اُنھیں یہ خبر پہنچا دو کہ میری نئی کتاب کا اِنتساب اُن کے نام ہو چکا ہے۔"

احسن صاحب مُجھے دیکھ کر بہت خُوش ہُوا کرتے ہیں لیکن میرا پبلشر میرے ہاتھ میں کسی نئی کتاب کا مسوّدہ دیکھ کر اور بھی زیادہ خُوش ہوتا ہے ———

کئی برس سے میری خواہش تھی کہ میں اُنھیں کوئی تحفہ پیش کروں، اُمّید ہے کہ یہ کتاب جو میں نے بیشتر بیماری کی حالت میں لکھی ہے انھیں پسند آئے گی ———

نسیم حجازی

۳۳-بی "الغیاث" سیٹلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی

۱۹۸۹ء

پہلا حصّہ

برہنہ چٹانیں اور عظیم دریا

باب - ۱

سکھر سے آگے جیکب آباد اور سبی کی جھلسا دینے والی گرمی سہنے کے بعد یوسف مچھ کے قریب ہوا کے خوشگوار جھونکوں سے اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ چند میل کا سفر اور طے کرنے کے بعد احمد خاں نے کار روکتے ہوئے کہا۔ "بھئی میں ذرا ٹانگیں سیدھی کر لوں۔ بہت تھک گیا ہوں۔"

یوسف نے دروازہ کھول کر اُترتے ہوئے کہا: "خانصاحب میں بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا۔" چند قدم آہستہ آہستہ چلنے کے بعد وہ اچانک ٹیلے کی طرف بھاگنے لگا اور آن کی آن میں اس کی چوٹی پر جا پہنچا۔

یہ دراز قامت نوجوان جس کے دست و بازو تندرستی اور توانائی کا مظہر تھے اور جس کی آنکھوں سے جراُت ٹپکتی تھی، اُن خوش وضع لوگوں میں سے تھا، جن کے لڑکپن اور جوانی کی سرحدیں آپس میں ملتی ہیں تو دیکھنے والے ایک مُدت تک عمر کے ان دو حصوں کے درمیان فرق محسوس نہیں کرتے۔ اُس کے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ اور عزم و یقین کی روشنی تھی۔ گفتگو کے دوران جب وہ اچانک خاموش ہو جاتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے اُفق سے آگے وہ کوئی اور چیز دیکھ رہا ہے۔

اُس کا ساتھی احمد خاں جس کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی، سندھ

کا ایک خوشحال زمیندار تھا لیکن تن آسانی کے باعث موٹاپے کی طرف مائل تھا۔

ڈرائیور اور نوکر جو پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کار سے اُتر کر احمد خاں کے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے اور وہ پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھا جسم کو بچپن سے محکم رکھنے میں کتنا فائدہ ہے۔ تم بھی تھوڑا بہت دوڑ لیا کرو۔"

ڈرائیور نے کہا "سائیں میں اُسے آواز دوں؟ وہ کہیں اگلی پہاڑی کی طرف نہ بھاگ جائے۔"

"تمہاری آواز وہاں نہیں جائے گی، بہتر یہ ہوگا کہ تم بھاگ کر جاؤ اور اسے ساتھ لے کر آؤ۔"

"نہ سائیں میری توبہ، میں ایک ہرن کی طرح کیسے بھاگ سکوں گا۔"

یوسف اب پہاڑی سے نیچے اُتر رہا تھا، دوسرے نوکر نے کہا "سائیں اسے اب آواز دینے کی ضرورت نہیں، وہ خود ہی آ رہا ہے۔"

بیس منٹ بعد کار آگے روانہ ہو چکی تھی اور یوسف خوشگوار ہوا میں لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔



احمد خاں سے یوسف کی پہلی ملاقات صرف چار دن قبل سکھر میں اپنے ماموں زاد حسین احمد کے ہاں ہوئی تھی۔ حسین احمد وہاں اوورسیئر تھا اور یوسف اچانک ہی اُس کے گھر پہنچا تھا۔ حسین احمد اپنی ملازمت کے دوران کافی عرصہ پہلے بھی سکھر رہ چکا تھا اور وہاں سے چند میل دُور ایک گاؤں کے زمیندار سے اُس کے پرانے مراسم چلے آ رہے تھے جس سے ملنے وہ گیا ہوا تھا۔

یوسف کو اپنے ماموں زاد کے گھر پہنچے ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ کسی کی کار

دروازے پر آکر رُکی۔ حسین احمد کی بیوی نے ہارن سُن کر کہا: "یوسف! یہ تمہارے بھائی جان کے دوست احمد خاں صاحب ہوں گے۔ انہیں بیٹھک میں بٹھاؤ اور کہو کہ وہ تھوڑی دیر تک آجائیں گے!!

اور وہ یہ بھی کہہ گئے تھے: کہ آپ اسی وقت ان کے ساتھ کھانا کھائیں گے"

یوسف نے باہر نکل کر احمد خاں سے مصافحہ کیا اور کہا "جناب! آپ کے دوست اس وقت گھر پر نہیں ہیں، وہ ابھی آجائیں گے۔ آپ تشریف رکھیئے۔"

احمد خاں نے سر سے پاؤں تک غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ یقیناً یوسف صاحب ہوں گے۔ وہی قد و قامت، وہی لمبے لمبے بازو، بڑے بڑے ہاتھ اور وہی کشادہ سینہ جن کا احمد صاحب اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!"

ایک منٹ بعد احمد خاں اور یوسف بیٹھک میں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ یوسف اپنے گاؤں کے دلچسپ واقعات سُنا رہا تھا اور احمد خاں بے تحاشہ قہقہے لگا رہا تھا۔

کوئی بیس منٹ بعد حسین احمد بھی آ پہنچا۔ احمد خاں کی کرسی بیٹھک کے سامنے تھی وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حسین احمد نے دہلیز پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"السلام علیکم!

سائیں شکر ہے۔ کہ آپ آگئے۔ میری بیس دن کی چھٹی منظور ہو گئی ہے انشاء اللہ میں کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔"

احمد خان نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا: "سائیں! شاید آپ کو اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑے گا"۔ حسین احمد کی نظر یوسف پر پڑی اور وہ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ حسین احمد نے شکایت کے لہجے میں کہا "نالائق مجھے تار ہی دے دیا

ہوتا۔ مجھے بلاوجہ اپنے افسروں کی منتیں کرنا پڑیں۔ خانصاحب! مجھے اب واقعی سارا پروگرام بدلنا پڑے گا۔ میرا خیال ہے کہ چھٹی منسوخ کرانے کی بجائے یوسف کو کراچی کی سیر کرائی جائے۔"

"نہیں بھائی جان! کراچی میں ایک بار دیکھ چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جولائی میں پہاڑوں کے سوا ہمارا اپنا علاقہ ہر جگہ سے زیادہ خوب صورت ہوتا ہے۔ مَیں صرف آپ کا اور بھابی کا گلہ دُور کرنے کے لیے آیا ہوں۔ سکھر بیراج کا کچھ حصّہ میں دیکھ آیا ہوں، باقی شام کو دیکھ لوں گا۔"

احمد خان نے کہا "سائیں! میری تجویز ہے کہ آپ کو چھٹی بڑی مشکل سے ملی ہے اب اسے منسوخ نہ کرائیں! یوسف صاحب چند دنوں کے لیے کوئٹہ میں میرے مہمان ہوں گے۔ میں پرسوں وہاں جا رہا ہوں جب میں یہ دیکھوں گا کہ ان کا دل بھر چکا ہے تو مَیں انھیں گاڑی پر سوار کرا دوں گا، مجھے یقین ہے کہ زیارت کی سیر کرنے کے بعد آپ کا بھائی بہت خوش ہوگا۔"

حسین احمد نے کچھ سوچ کر کہا: "یوسف! تمھاری بھابی شاید اس بات پر خوش ہوں گی کہ ہمارے ساتھ ہی واپس ہو نگی، لیکن انھیں افسوس بھی ہوگا کہ تم اِتنی دُور سے آئے اور سیر بھی نہ کر سکے۔ ایک اچھے آدمی کی دعوت ٹھکرانا اچھی بات نہیں۔ تمھیں شکریہ کے ساتھ خانصاحب کی دعوت قبول لینی چاہیے، تعارف کے لیے یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ مَیں انھیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔"

یوسف نے احمد خاں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "خانصاحب شکریہ لیکن میں ایک ہفتہ سے زیادہ وہاں نہیں ٹھہروں گا۔"

تیسرے روز وہ حسین احمد اور اس کی بیوی کو گاڑی پر سوار کر کے احمد خاں کی رفاقت میں کوئٹے کا رُخ کر رہا تھا۔

کوئٹے تک باقی راستے میں یوسف کے لیے خوشگوار ہوا کے سوا دلچسپی کی اور کوئی بات نہ تھی۔ اُس نے چلتن اور کوہِ مردار کے مناظر دیکھتے ہوئے کہا: "خانصاحب! یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ پہاڑ اس قدر برہنہ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں سبزہ زاروں، جنگلوں، آبشاروں اور برفانی چوٹیوں کے سوا پہاڑوں کے متعلق کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

احمد خان نے جواب دیا: "بھئی ان پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف تو سردیوں میں نظر آتی ہے۔ وہ برہنہ پہاڑ جو کوئٹے سے بالکل قریب ہے اُسے کوہِ مردار کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک یا دو دن کوئٹے میں آرام کرنے کے بعد ہم زیارت جائیں گے۔ وہاں پہاڑوں پر ماجو کے درخت دیکھ کر آپ کو بہت خوشی ہوگی۔ اگر بارش ہوگی تو کسی جگہ آبشار بھی نظر آجائے گی۔"



بلوچستان میں یوسف کے قیام کے آٹھ دن ایک دل کش خواب کی طرح گذر گئے۔ اُس نے تین دن زیارت میں قیام کیا تھا۔ ایک دن گرد و نواح کے سرسبز پہاڑوں کی سیر کی تھی۔ اگلے دن ایک مقامی سکول ماسٹر کی رفاقت میں خلیفت کی چوٹی سے ہو آیا تھا اور جو لوگ بلوچستان کے بلند ترین پہاڑ کو دیکھ چکے تھے وہ اِسے ایک کارنامہ سمجھتے تھے۔

اب آٹھ دن بعد اس نے احمد خاں سے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا: "یار! کل پھر دیکھا جائے گا۔"



عصر کی نماز کے بعد یوسف سیر کے لیے نکلا اور تھوڑی دیر بعد احمد خاں بھی اپنی کار پر کسی دوست سے ملنے کے لیے چلا گیا۔

رات کے وقت احمد خاں واپس آیا اور اُس نے کار سے اُترتے ہی نوکر سے پوچھا۔ "مہمان آگیا ہے"؟ "جی نہیں"! نوکر نے جواب دیا: "کافی دیر ہوگئی ہے۔ اگر حکم ہو تو آپ کا کھانا لگوا دیا جائے"۔

"نہیں ہم اس کا انتظار کریں گے تم ڈرائیور کو کھانا کھلا دو"۔

تھوڑی دیر بعد احمد خاں اپنے کمرے میں بیٹھا ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ نوکر نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ "سائیں۔ مہمان آگیا ہے"۔ احمد خاں نے کہا: "اُسے یہیں بُلا لو اور کھانا بھی لے آؤ"۔

نوکر "اچھا سائیں" کہہ کر واپس چلا گیا۔ اور ایک منٹ بعد یوسف کمرے میں داخل ہُوا۔

احمد خاں نے اُٹھ کر اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"سائیں آج آپ نے بہت پریشان کیا"۔

"جناب! بات یہ ہوئی تھی کہ مجھے قندھاری بازار میں اسلامیہ کالج لاہور کے چند طلباء مِل گئے تھے۔ اُن میں سے ایک تو کوئٹہ کا ہی باشندہ ہے۔ دو کو مَیں پہچانتا تھا۔ باقی میرے لیے اجنبی تھے اور ملتان سے کوئٹہ کی سیر و سیاحت کے لیے آئے تھے۔ وہ تھوڑی سی مُدّت میں بلوچستان کے زیادہ سے زیادہ علاقے کی سیر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا کل کا پروگرام یہ تھا۔ کہ کوہ مردار کی چوٹی سر کی جائے"! مجھے ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کو بھی پہاڑوں پر چڑھنے کا تجربہ نہیں۔ مَیں کانگڑہ کے پہاڑوں پر چودہ ہزار فٹ کی بلندی تک جا چکا تھا۔ لیکن کوہِ مردار میں میرے لیے کوئی کشش نہ تھی۔ مَیں نے انھیں سمجھایا کہ اگر تم واقعی اس پہاڑ پر چڑھنا چاہتے ہو تو تمہاری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ تم پچھلے پہر تک اس پہاڑ کے دامن میں کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤ، جہاں سے اُوپر جانے کا راستہ تلاش کرنا آسان ہو اور طلوعِ آفتاب

کے ساتھ ہی تمھیں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بعد گرمی میں پہاڑ پر چڑھنا تمہارے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ پیاس بہت لگے گی۔ اس لیے ہر ایک کے پاس اپنی چھاگل ہونی چاہیے۔ میرے مشورے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مجھے راہنما بنا کر ساتھ لے جانے پر مُصر ہو گئے اور میں کوشش کے باوجود اُن سے جان نہ چھڑا سکا۔

پروگرام یہ بنا کہ ہم ابھی کسی مقامی راہنما کو ساتھ لے کر شہر سے باہر وہ مقام دیکھ آئیں جہاں پر ہمیں کل علی الصبح جمع ہونا ہے۔ نماز فجر پہلی چڑھائی ختم کرنے کے بعد ادا کریں گے۔ اس لیے سب یہاں سے وضو کرکے روانہ ہوں گے۔ اگر کسی کو دیر ہو جائے تو اُسے ہمارے پیچھے پیچھے آنا پڑے گا۔ میرا یہ مطلب ہے کہ اس کا انتظار نہیں کیا جائے گا۔ انہوں نے میری یہ باتیں مان لیں، لیکن ——

پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر ہمیں اوپر کا راستہ دیکھنے کے لیے کافی دُور جانا پڑا! اِس لیے مجھے یہاں آنے میں دیر ہوگئی جس کے لیے مَیں معذرت خواہ ہوں"۔

اِتنی دیر میں نوکر نے کھانا لا کر تپائی پر رکھ دیا اور احمد خاں دیر تک یوسف سے بلوچستان کے مختلف پہاڑوں کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"یار! یہاں سے چلتن بھی بہت خوبصورت نظر آتا ہے۔ مَیں نے سُنا ہے کہ چلتن کے اندر بہت ٹھنڈے، میٹھے چشمے اور بہت بڑے بڑے غار بھی ہیں۔ جن میں اِتنے بڑے بڑے اژدہے ہوتے ہیں کہ انسانوں تک کو نگل جاتے ہیں"۔

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا۔

"خانصاحب! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چلتن جیسا خشک پہاڑ کسی کو بھوک اور پیاس کے سوا کیا دے سکتا ہے؟ میرا خیال ہے کہ درندہ جو دوسروں

کے گوشت پر پلتا ہے ہمیشہ ایسا مسکن تلاش کرتا ہے جہاں قدم قدم پر شکار مل
سکے اور شکار وہاں ہوتا ہے جہاں پانی اور سبزہ ہو۔

"آپ نے کبھی اژدہا دیکھا ہے ؟"

"جی ہاں : کانگڑہ میں ! ایک سرسبز پہاڑ خچروں کی گذرگاہ تھی ، میں بلندی
کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک مَیں نے کوئی آہٹ محسوس کی ۔ سامنے دیکھا تو ایک
موٹا تازہ سانپ پگڈنڈی کے بائیں ہاتھ کی جھاڑیوں سے نکل کر دائیں طرف کی
جھاڑیوں میں غائب ہو رہا تھا ۔ مَیں نے اُس کا سر نہیں دیکھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
وہ کسی شکار کے پیچھے جا رہا ہے ۔

جتنا وقت اُس نے میری آنکھوں سے اوجھل ہونے میں لگایا تھا ۔ اگر اس
کے پیشِ نظر میں اُس کی جسامت کا اندازہ کروں تو اس کی لمبائی پہاڑی راستے کی
چوڑائی سے تین گنا زیادہ ہوگی ۔ یعنی کوئی اٹھارہ بیس فٹ !

"ــــــ اور اُس کی تیز رفتاری کی وجہ بھی تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ کسی شکار
کے پیچھے لگا ہوا تھا ، جسے مَیں نے نہیں دیکھا تھا ۔ ورنہ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا
کہ اِتنا بڑا اژدہا مجھ سے ڈر کر بھاگ جائے گا ۔"

احمد خاں نے کہا ۔ "یار ! مَیں چڑھائی سے گھبراتا ہوں لیکن کانگڑہ کے متعلق
تمہاری باتیں سُن کر مجھے یہ خیال آنے لگا ہے کہ اگر کبھی تمہاری رفاقت میں سفر کا موقع
ملا تو میں تمہارا ساتھ دُوں گا ۔

اب آپ کے صبح کے پروگرام کے متعلق میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ پورے
اطمینان سے ناشتہ کر کے جائیں میرا ڈرائیور آپ کو اُس مقام تک لے جائے گا
جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے ۔

ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبح تک میرا موڈ بھی بن جائے اور میں کچھ دُور تک

آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤں ۔"

یوسف نے کہا ۔ "خاں صاحب ! یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی ۔ اس
صورت میں میری یہ کوشش ہوگی کہ آپ کم از کم پہلی چڑھائی تک میرے ساتھ چلیں ۔
اور ہم دوسروں کا انتظار کرنے کی بجائے جلد از جلد روانہ ہو جائیں تاکہ پہلی چوٹی
پر نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد آپ صبح کے دلکش مناظر دیکھ سکیں اور پھر اگر آپ
یہ محسوس کریں کہ آپ تھک گئے ہیں تو آپ وہیں آرام کریں اور مَیں بہت جلد
بلند چوٹی کے اوپر سے ہو آؤں گا ۔ ایسی صورت میں مجھے اس بات کی پروا نہ ہوگی
کہ میرے ساتھی آتے ہیں یا نہیں ؟"

احمد خان نے کہا ۔ "میرے دل میں آپ کے ساتھ جانے کا خیال ہی اس
لیے پیدا ہوا ہے کہ آپ کے ساتھی شاید نہ آئیں اور ہم تھوڑی سی تھکاوٹ
کے بعد واپس آ جائیں گے ! سچ تو یہ ہے کہ مجھے کوہ مردار کا نام ہی اچھا نہیں لگتا
اور ایک دوست کو تنہا اس طرف بھیجتے ہوئے مجھے ایک اَن جانا سا خوف
محسوس ہوتا ہے اور اگر صبح تک تمہارے ساتھ جانے کا ارادہ پختہ کر لوں تو اس کا
مقصد اپنی بہادری اور مستعدی کا ثبوت دینا نہ ہوگا ۔ بلکہ اس کی وجہ محض یہی ہوگی
کہ مجھے تمہاری رفاقت پسند ہے ۔"

باورچی برتن اُٹھانے آیا تو احمد خان نے کہا ۔

"دیکھو ! ناشتہ صبح ۴ بجے سے پہلے تیار کرنا ہے ۔ مہمان کے ساتھ میرا بھی !
ـــــ یہ اور بات ہے کہ میں بستر سے اُٹھتا یا ناشتہ کرنا پسند نہ کروں لیکن تم مجھے
جگا ضرور دینا ۔ گل محمد چوکیدار اور ڈرائیور کو بھی تین بجے تک ناشتہ دے دینا ۔ اگر میں
نہ بھی گیا تو بھی گل محمد جو اس علاقے سے واقف ہے یوسف صاحب کا ساتھ دے گا ۔
اسے ابھی کہہ دو کہ تیار رہے ۔ میری ایک دو نالی بندوق دُوربین اور کارتوسوں کی پیٹی

بھی اس کے سپرد کر دو۔ اور صبح مجھے اپنا ریوالور اٹھانا بھی یاد دلا دینا۔

احمد خاں ایک تنگ راستے پر گل محمد اور یوسف کے پیچھے پیچھے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہُوا، پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اُس کے بائیں ہاتھ پر ایک خوفناک کھڈ تھا جس کی چوڑائی اُوپر کی طرف بتدریج کم ہوتی چلی جا رہی تھی اور گہرائی اُسی نسبت سے بھیانک نظر آتی تھی۔ احمد خاں اس بات سے بہت پریشان تھا کہ راستہ بار بار کنارے کو چھُوتا تھا۔ اُسے قدم قدم پر یہ احساس ہوتا تھا کہ کسی جگہ اُس کا پاؤں پھسل جائے گا اور وہ کئی گز نیچے لڑھکتا چلا جائے گا۔

مشرق کی سمت آسمان پر روشنی بتدریج پھیل رہی تھی۔ ہوا بڑی خوشگوار تھی اس کے باوجود اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ گل محمد جس نے بندوق اٹھا رکھی تھی گٹھے ہوئے جسم کا ایک تندرست آدمی تھا۔ وہ اپنی چال سے پہاڑ پر چڑھنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

احمد خاں نے اپنے گلے سے پستول کی پیٹی آتار دی اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

"بھئی! اِسے بھی پاس رکھو اور یہ میری ٹوپی بھی لے لو۔ شکر ہے کہ مَیں نے یوسف کو دیکھ کر کوٹ نہیں پہنا تھا۔"

جب ان کا راستہ کھڈ سے دُور ہٹ گیا تو یوسف اچانک تیزی سے آگے نکل گیا اور ایک موڑ پر رُک کر ان کا انتظار کرنے لگا۔

احمد خاں نے شکایت کی: "دیکھو یار! مَیں آپ کے ساتھ اِس لیے آیا ہوں کہ ہم سیر بھی کریں گے اور باتیں بھی کریں گے۔"

یوسف نے جواب دیا: "خان صاحب! مَیں یہ محسوس کرتا تھا کہ باتیں کرنے سے آپ کا سانس جلدی پھول جائے گا۔ اب ہماری پہلی منزل قریب آ رہی ہے اُس کی چوٹی پر پہنچ کر ہم پہلے نماز پڑھیں گے اور پھر خوب باتیں کریں گے۔"

احمد خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کاش! یہ راستہ ایسا ہوتا کہ میں آنکھیں بند کر کے بھاگ سکتا اور ایک ہی دوڑ میں چوٹی پر پہنچ جاتا۔ لیکن یہاں تو اس خوف سے بھی بات نہیں کرتا۔ کہ ایک ذرا سی غفلت یا بے توجہی سے میں موت کے منہ میں جا سکتا ہوں۔ یار! سچ کہو۔ تمہیں خوف نہیں آتا، اِن راستوں سے"؟

یوسف نے جواب دیا۔ "خان صاحب دو چار بار چلنے کے بعد آپ کو بھی خوف نہیں آئے گا۔"

وُہ چند منٹ خاموشی سے چلتے رہے، پھر ایک جگہ پہنچ کر یوسف نے احمد خاں کا بازو پکڑ لیا:

"خان صاحب! اب تیزی سے دس قدم اٹھائیں اور پھر تین اطراف نظر دوڑائیں تو آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ آپ کے سفر کی پہلی منزل آپ کے قدموں میں ہے۔"

ایک۔ دو۔ تین ——— بلند آواز میں دس تک گن کر اُس نے اللہ اکبر کہا اور خان صاحب سبحان اللہ۔ سبحان اللہ کہتے ہوئے ان پہاڑوں کی طرف دیکھنے لگے جو تین اطراف سے کوئٹہ کی وادی کو گھیرے ہوئے تھے۔

یار واللہ! وہ بولے: میرا یہاں تک پہنچنا ایک معجزہ ہے۔ اب اگر وقت باقی ہے تو ہمیں نماز پڑھ لینی چاہیے اور تم امامت کے فرائض انجام دو گے۔"

یوسف نے ایک طرف ہٹ کر نسبتاً ہموار جگہ پر اذان دی اور دونوں قبلہ رُو کھڑے ہو گئے۔

یوسف نے نماز پڑھانے سے پہلے نوکر کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ نوکر آگے بڑھنے کی بجائے جلدی سے ایک پتھر کی اوٹ میں چھپ گیا۔ دونوں نے

نماز ادا کی ۔ احمد دعا کے بعد وہیں لیٹ گیا: "یار! بڑا مزہ آیا، مجھے نیند آرہی
ہے ۔ اگر تمہیں اُوپر جانا ہے تو جلدی سے ہو آؤ۔ مَیں تو ایک قدم بھی آگے
نہیں جاؤں گا۔ اور دیکھو! نوکر سے میری بندوق لے لو۔"

یوسف نے کہا۔ "خان صاحب! یہ تو آپ کو تجربہ ہوگیا کہ چڑھائی پر
ایک پاؤ وزن بھی ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ بندوق اُٹھا کر تو مَیں بالکل آگے
نہیں جاسکوں گا۔"

"اچھا تو یوں کرو کہ نوکر سے میرا پستول ہی لے لو۔ پیٹی گلے میں ڈالنے
سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

یوسف نے کہا۔ "اگر ضرورت ہوتی تو مَیں یہ دونوں چیزیں ساتھ لے جاتا
لیکن وہاں اِن کی کیا ضرورت ہوسکتی ہے؟"

"احمد خان نے کہا۔ "دیکھو! بھئی میں کچھ وہمی سا آدمی ہوں اور یہی وجہ ہے
کہ مَیں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا تھا۔ دراصل یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی نہیں
آتا۔ اِس لیے تمہیں ہتھیار کے بغیر یہاں بالکل نہیں جانا چاہیے۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "خان صاحب! جب میں خطرہ دیکھوں گا تو
مَیں سیدھا آپ کے پاس آجاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!"



یوسف چوٹی کا تقریباً دو تہائی فاصلہ طے کر چکا تھا اور وہ کھڈ جو پہاڑ
کے قدموں میں نصف میل سے زیادہ چوڑا تھا اب کم ہو کر تقریباً سو گز چوڑا رہ گیا تھا۔

وہ تازہ دم ہونے کے لیے رُکا۔ اچانک اُس کی نظر دوسرے کنارے
پر دو بھورے رنگ کے جانوروں پر جا پڑی۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ وہ السیشن

کُتّے ہیں اور اطمینان سے اپنے مالک کے پیچھے جا رہے ہیں۔ لیکن چند قدم اُٹھانے کے
بعد اُس نے دیکھا کہ وہ دونوں جانور اسی رفتار سے اُوپر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ان کے
آس پاس کوئی آدمی نہ پاکر یوسف کو یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ پہاڑی بھیڑیئے ہیں وہ
تیزی سے کنارے کی طرف بڑھا۔ اُس نے کھڈ کی گہرائی کا جائزہ لیا۔
ایک پتھر اُٹھایا اور نیچے اترنے لگا۔ بھیڑیئے اس عرصے میں ایک جگہ
کھڑے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اُس نے چلتے چلتے دو مرتبہ مڑ کر
دیکھا تو وہ اُسی جگہ کھڑے تھے۔ اُسے اطمینان تھا کہ کھڈ عبور کرکے بھیڑیئے اگر
حملہ کربھی دیں تو وہ پتھر گرا کر انہیں ہلاک کرسکتا ہے۔ یہ چٹانیں ایسی تھیں کہ ایک بھاری
پتھر نیچے لڑھکا دینے سے راستے کے کئی چھوٹے چھوٹے پتھر اپنے ساتھ لے جاسکتی تھیں۔

بھیڑیوں کے حملے کی دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ پہلے بھاگتے ہوتے
بلندی کی طرف جاتے پھر اُس جگہ پہنچ کر اس طرف اُترتے جہاں کھڈ کے کنارے آپس
میں ملے ہوئے تھے لیکن ایسی صورت میں وہ ان سے کافی دور جاسکتا تھا۔

یہ سوچتے ہی وہ اپنی عام رفتار سے نیچے اترنے لگا۔ اس نے دوبارہ مڑ کر دیکھا تو
بھیڑیئے اُسی جگہ دکھائی دیئے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ شاید بھیڑیوں کا کوئی اور گروہ کسی دوسری جگہ اُس کی
گھات میں بیٹھا ہوا ہو۔ اس نے اپنی رفتار تیز کرلی اور جب وہ پہلی منزل کے قریب
پہنچا تو احمد خان نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"آپ چوٹی سے ہو آئے ہیں؟"

"جی نہیں! مَیں دو بھیڑیوں سے جان بچا کر واپس آگیا ہوں اور میں اس
بات پر پچھتا رہا ہوں کہ میں نے آپ کی چھٹی حس کا احترام کیوں نہ کیا؟"

"بھیڑیئے تم نے کہاں دیکھے تھے؟"

"خانصاحب، کھڈ کے دوسرے کنارے وہ میرے ساتھ ساتھ اوپر جا رہے تھے
اور چوٹی سے نیچے ایک جگہ جہاں کھڈ کے دونوں کنارے آپس میں ملتے دکھائی دیتے ہیں،
وہاں ہماری ملاقات ہونے والی تھی۔"

احمد خاں نے کہا۔" واللہ! اگر میری ٹانگوں میں جان ہوتی تو میں اسی وقت
آپ کے ساتھ چل پڑتا۔ پھر آپ میرا نشانہ دیکھتے۔ میں نے بندوق اٹھانے کا ارادہ
کرتے وقت سوچا تھا کہ شاید کوئی شکار مل جائے لیکن یہ خیال دل میں نہیں آیا تھا کہ
شکار بھیڑیئے بھی ہو سکتے ہیں! بہرحال اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اب ہمیں آہستہ آہستہ
نیچے اترنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

یوسف احمد خان کے ساتھ چل دیا مگر تھوڑی دُور جا کر وہ اچانک چلّایا:

"خان صاحب! غضب خدا کا! اِدھر دیکھیے"!

"کیا ہوُا؟" احمد خان نے بدحواس ہو کر پوچھا۔

یوسف نے کھڈ کے دوسرے کنارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"خان صاحب۔ اِس دنیا میں بے وقوف صرف مَیں ہی نہیں ہوں۔ میری طرح کے
اور لوگ بھی اس جہان میں بستے ہیں۔

۔ وہ دیکھیے! اُدھر سے کوئی احمق سیدھا اُسی طرف جا رہا ہے جہاں مَیں
نے ابھی ابھی بھیڑیئے دیکھے تھے۔

وہ فوجی بوٹ پہنے ہوئے ہے۔ چھاگل گلے میں ڈال رکھی ہے۔ سر پر ہیٹ
ہے۔ ہاتھ میں چھڑی بھی ہے۔ اگر بھیڑیئے کہیں دُور نہیں چلے گئے تو وہ بیوقوف
سیدھا موت کے منہ میں جا رہا ہے۔"

یوسف ہاتھ بلند کرتے ہوئے پوری قوت سے چلّایا:

" ٹھہر جاؤ! رُک جاؤ! آگے مت جاؤ!"

وُہ ایک لمحہ رُکا اور پھر احمقوں کی طرح آگے چل دیا۔

یوسف نے کھڈ کا جائزہ لینے کے بعد گل محمد سے بندوق پکڑتے ہوئے کہا:

"خانصاحب اگر مَیں اُوپر جا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر سکوں تو اُس کی جان بچ
سکتی ہے۔"

یوسف یہ کہہ کر اُوپر چڑھنے لگا۔

احمد خان نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔" بھئی میں تمہارے ساتھ ہوں"۔

گل محمد بھی اُس کے ساتھ تھا اور کھڈ کی دوسری جانب مڑ کر پوری قوت سے
آوازیں دے رہا تھا۔" رک جاؤ! بھائی رک جاؤ آگے خطرہ ہے"۔

کوئی دس منٹ چلنے کے بعد احمد خان نڈھال سا ہو کر بیٹھ گیا، گل محمد نے مڑ کر
کہا۔"سائیں وُہ نظر نہیں آتا"۔

"کون یوسف؟" احمد خان نے دوربین آنکھوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سائیں، وہ بیوقوف نظر نہیں آتا، جس کی وجہ سے ہم سب اس مصیبت
میں پھنس گئے ہیں"۔

احمد خان چند منٹ اوپر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لیٹتے ہوئے کہا۔

گل محمد اب تم دُوربین پکڑ لو اور ان کی طرف دیکھتے رہو"۔

گل محمد نے دوربین پکڑ لی اور احمد خان نے آنکھیں بند کر لیں، چند منٹ بعد
گل محمد چلّایا۔"سائیں، یوسف بھی کہیں غائب ہو گیا ہے"۔

احمد خان ہڑبڑا کر اُٹھا: کہیں گر تو نہیں پڑا وُہ"؟

"سائیں وہ بائیں طرف مڑا تھا شاید اُس طرف کسی کھڈ میں اُتر گیا ہو جو
یہاں سے نظر نہیں آتی"۔

احمد خاں کچھ دیر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہا۔ پھر دور سے یکے بعد دیگرے

بندوق کے دو فائر سنائی دیے تو وہ خوشی سے چلایا"گل محمد تم نے فائر سُنے ہیں"

"جی دو فائر ہوئے ہیں۔ لیکن نظر کوئی نہیں آتا۔"

"یہ فائر یوسف کے سوا کون کرسکتا تھا۔خدا کا شکر ہے کہ وُہ زندہ ہے اور شاید وہ بیوقوف بھی زندہ ہو— اس وقت ہم دعا کے سوا کچھ نہیں کرسکتے۔"

احمد خان پھر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کرلیں اور تھوڑی دیر بعد وہ گہری نیند میں خراٹے لے رہا تھا۔



گل محمد دُوربین اُٹھائے بیس منٹ اوپر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک چلاّیا"سائیں وہ آرہا ہے۔وہ دونوں آرہے ہیں۔ سائیں مبارک ہو۔"

احمد خان نے آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

گل محمد نے اسے دُوربین پیش کرتے ہوئے کہا۔"سائیں دُوربین سے دیکھئے وہ صاف نظر آرہا ہے۔ سائیں مَیں درست کہتا تھا۔وہ کسی دوسرے کھڈ سے نمودار ہوئے ہیں جو نظر نہیں آتا۔ احمد خان نے دوبارہ لیٹتے ہوئے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔اللہ کا شکر ہے تم دوربین اپنے پاس رکھو اور میری باتوں کا جواب دیتے رہو۔ وہ آرام سے آرہے ہیں یا بھاگتے ہوئے آرہے ہیں؟" سائیں اوہ بہت آرام سے آرہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ باتیں بھی کررہے ہیں۔"اُس کا مطلب یہ ہوا کہ بھیڑیے ان کا پیچھا نہیں کررہے۔" "بالکل نہیں سائیں۔"

"اچھا گل محمد اب تم شور نہ کرو اور مجھے سونے دو۔"

"سائیں میرا خیال ہے کہ اگر آپ آہستہ آہستہ پہاڑ سے اترنا شروع کردیں تو بہتر ہوگا، اتنی تھکاوٹ کے بعد یہاں سونے سے آپ کا جسم اکڑ جائے گا۔"

احمد خان نے اطمینان سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا"یار اکڑ جانے دو جسم کو۔"

اور چند منٹ بعد وہ خرّاٹے لے رہا تھا۔



"خان صاحب! خانصاحب!!"

احمد خان نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ یوسف اس کا بازو ہلا رہا تھا۔اور ایک اجنبی اس کے ساتھ کھڑا تھا! گل محمد نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس سے کہا:

"السلام علیکم! جناب! آپ نے ہمیں بہت پریشان کیا۔"

اجنبی نے جھک کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا:"وعلیکم السلام! مجھے اپنی حماقت کا احساس ہے کہ آپ لوگوں کو تکلیف ضرور ہوئی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے کہ آپ اس طرح آگئے جیسے کسی کی جان بچانے کے لیے فرشتے پہنچ جائیں۔ مَیں آپ کا احسان مند ہوں۔"

احمد خان نے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا"سائیں! فرشتہ یہ ہے جسے آپ نے مجھ سے زیادہ خوار کیا ہے، لیکن آپ اس پہاڑ پر کیسے پہنچے؟"

اجنبی نے جواب دیا۔

"جناب! مَیں اس کے لئے حماقت کے سوا کوئی اور لفظ استعمال نہیں کروں گا۔ دراصل مجھے پہاڑوں پر چڑھنے کا خبط ہے اور مَیں سمجھتا تھا کہ یہاں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہوسکتا۔"

احمد خان نے پوچھا:"آپ یہاں پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے آئے ہیں؟"

"نہیں جناب ! مَیں فوج میں ملازم ہوں۔ میری تبدیلی یہاں ہوئی ہے۔ میں صرف پندرہ دن پہلے آیا ہوں اور ایم ای ایس کا ایس ڈی او میرا رشتہ دار ہے۔ اِس لیے عارضی طور پر مَیں اُن کے پاس ٹھہر گیا ہُوں۔"

احمد خان یوسف کی طرف متوجہ ہوا۔

"بھائی مجھے یقین ہے کہ آپ اِن سے اچھی طرح متعارف ہو چکے ہیں۔ اور میرے ساتھ اِن کا تعارف کروانا اب آپ کا پہلا فرض ہے۔"

یوسف مسکرایا۔ "خان صاحب ! یہ ہیں ایم ای ایس کے اوورسیئر، اِن کا نام محمد صدیق ہے اور یہ پنجاب کے ایک شہر لدھیانہ کے رہنے والے ہیں۔ ایس ڈی او صاحب جن کے ہاں یہ ٹھہرے ہوتے ہیں ان کا نام محمد سعید ہے اور وہ بھی لدھیانے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔"

احمد خان نے غور سے محمد صدیق کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی تیس بتیس سال کا قوی الجثہ اور خوش وضع آدمی تھا۔ چہرے پر سادگی اور شرافت تھی۔

اُس نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔

"دیکھو ! یوسف صاحب ! اب ہمیں نیچے پہنچنے کے لیے اپنی ٹانگوں پر اپنا بوجھ اٹھانا ایک مجبوری ہے۔ میں آپ سب سے وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ اگر میں تیز نہ چلوں تو تم میرا مذاق نہیں اُڑاؤ گے۔"

محمد صدیق نے کہا۔ "خان صاحب ! میں تو ساری عمر ویسے بھی آپ کا احترام کرتا رہوں گا اور یوسف کی حالت یہ ہے کہ اُن کے نزدیک آپ کا یہاں تک پہنچنا ایک کارنامہ ہے۔ یہ سارا راستہ آپ ہی کے متعلق باتیں کرتے آئے ہیں۔"

نیچے اُترتے ہوئے احمد خان سب سے آگے تھا۔ گل محمد نے کھڈ کے قریب اُس کا سہارا بننے کی کوشش کی لیکن احمد خان نے اسے جھڑک دیا۔

ایک گھنٹہ بعد وہ موٹر پر سوار ہو رہے تھے۔

محمد صدیق نے کہا۔ "خان صاحب ! اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو ایس ڈی او صاحب آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

احمد خان نے جواب دیا۔ "بھئی ! آج تو مَیں گھر جا کر نہانے، کھانا کھانے اور اُس کے بعد سونے کے سوا اور کچھ نہیں کروں گا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں، کھانا کھائیں اور کچھ دیر آرام کریں پھر میرا ڈرائیور آپ کو ایس ڈی او کے گھر چھوڑ آئے گا۔"

محمد صدیق نے پُوچھا، "خانصاحب ! آج آپ چائے پر آسکیں گے ؟"

"نہیں بھائی ! ایک دو دن مجھے آرام کرنا چاہیے اُس کے بعد دیکھا جائیگا۔"

"یوسف صاحب آپ تو ضرور آئیں گے نا !"

احمد خان نے فوراً کہا "ہاں بھئی یہ ضرور آئیں گے۔"

باب - ۲

یوسف نے دوپہر کو دو گھنٹے گہری نیند سونے کے بعد اُٹھ کر غسل کیا۔ اور عصر کی نماز کے بعد کار پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کو اُس بنگلے کی طرف چلنے کو کہا جہاں وہ دوپہر کے وقت محمد صدیق کو چھوڑ کر آیا تھا۔

کار کا ہارن سنتے ہی ایک کم سن بچی بھاگتی ہوئی باہر نکلی اور بڑی خود اعتمادی سے کار کے قریب پہنچ کر بولی۔

"آپ یوسف صاحب ہیں نا؟ اندر آجائیں۔ آپ ہی کا انتظار ہو رہا ہے۔"

سُرخ و سفید، بھورے بالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی یہ بچی دس سال سے کم عمر کی ہوگی لیکن اُس کی گفتگو سے ذہانت اور شعور کی پختگی مترشح تھی۔

"آپ ایس ڈی او صاحب کی بیٹی ......"

"جی وہ میری نانی کے خالہ زاد بھائی ہیں" لڑکی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا" اور محمد صدیق صاحب؟" "جی وہ رشتے میں میرے ماموں ہیں۔ یعنی میرے ناناجی کے بھائی کے بیٹے۔"

اِتنی دیر میں محمد صدیق باہر نکل آیا اور اُس نے یوسف سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"مجھے معلوم تھا کہ اس باتونی لڑکی نے آپ کا راستہ روک رکھا ہوگا اور بھیڑیوں کا قصہ یہیں شروع کر دے گی۔"

بچی نے غصے سے مُنہ پھیر لیا اور جب وہ منہ بسورتی ہوئی واپس جانے لگی تو یوسف نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ لیا: "صدیق صاحب! غضب کرتے ہیں آپ بھی! آپ اس شہزادی کو باتونی لڑکی کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تک آپ نے اِسے غور سے نہیں دیکھا۔" لڑکی نے رُک کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ یوسف نے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کا نام کیا ہے؟"

"جی نسرین" اُس نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"صرف نسرین نہیں جی بلکہ شہزادی نسرین۔ محمد صدیق صاحب!" یوسف نے کہا: "آپ اس کے متعلق جس قدر سوچیں گے اُسی قدر زیادہ آپ کو اس کے لیے شہزادی نسرین کا نام پسند آئے گا۔"

صدیق نے کہا۔ "بھائی میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ جب اس کی نانی کو اس کے اِس نئے نام کا پتہ چلے گا تو اس کی عید ہو جائے گی۔ وہ ہمیں بھی بہت سی دُعائیں دیں گی۔ چلیے اب آپ کا اندر انتظار ہو رہا ہے۔"

وہ بنگلے کے ایک کمرے میں داخل ہوئے وہاں گھر کے چند افراد موجود تھے۔

ایس ڈی او نے اُٹھ کر یوسف سے مصافحہ کیا۔

ایک خاتون نے جس کے چہرے پر معمّر ہونے کے باوجود غیر معمولی دلکشی تھی۔ یوسف سے کہا:

"بیٹا! تمہیں اللہ تعالیٰ عزت دے، عمر دراز کرے، ترقی دے اور تمہارے والدین تمہاری خوشیاں دیکھیں۔ تم ہمارے لیے ایک فرشتۂ رحمت بن کر کوئٹہ آئے ہو۔"

یوسف نے شرماتے ہوئے کہا۔ "ماں جی! یہ شاید میری خوش قسمتی تھی کہ میں

اُس وقت وہاں پہنچ گیا اور یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ سندھ کے ایک رئیس کو اچانک میری دیکھا دیکھی پہاڑ پر چڑھنے کا خیال آگیا۔ بچوں کو ہر وقت بزرگوں کی دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مَیں یہاں اس لیے نہیں آیا کہ آپ میرا شکریہ ادا کریں۔ کیونکہ جب آپ میرے لیے دعا کریں گی تو میں شکریہ ادا نہیں کرسکوں گا۔ مَیں یہی سمجھوں گا کہ ایک شفیق ماں کا یہی فرض ہے۔"

دروازے کی طرف سے ہلکے ہلکے قہقہے سنائی دیے۔ ———

محمد صدیق نے کہا۔ "آپا جان! آپ کو مبارک ہو۔ مجھے خالی نسرین کے لفظ سے الجھن سی محسوس ہوتی تھی۔ یوسف صاحب نے اسے دیکھتے ہی اس کا نام شہزادی نسرین رکھ دیا ہے اور میں حیران ہوں کہ ہم میں سے آج تک کسی کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ نسرین بیٹی کا نام شہزادی نسرین ہونا چاہیے تھا۔"

معمر عورت مسکرائی۔ "اچھے لوگوں کے منہ سے ہمیشہ اچھی باتیں ہی نکلتی ہیں۔ نسرین مجھے ہمیشہ ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی لیکن مَیں دوسروں کے سامنے اِسے شہزادی کہتے ہوئے جھجکتی رہی ویسے میری تینوں بیٹیاں شہزادیاں ہی ہیں، یعنی اِس کی دوسری بہنیں بھی شہزادیاں ہیں۔ لیکن یہ میری بیٹی کوئی خاص شہزادی ہے۔"



نسرین کے ساتھ ایک معزز مہمان کا سا سلوک ہو رہا تھا اور وہ یوسف کے بائیں ہاتھ اپنی نانی اماں کے ساتھ بیٹھی خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ ایس ڈی او کی جواں سال بیٹی نے یہ سوال پُوچھا کہ یہاں سے کوہ مردار کی چوٹیاں دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔ مَیں حیران ہوں کہ آپ کو اور ماموں جان کو اُن تک پہنچنے کا شوق کیسے پیدا ہوا؟

صدیق میاں نے کہا۔ "بیٹی! اگر ہمت ہو تو بلندیاں، ہمیں آگے بڑھنے کی

ترغیب دیتی ہیں۔ میں وہاں اِس لیے چلا گیا تھا کہ یہ پہاڑ زیادہ قریب تھا۔

یوسف بولا۔ "میرا وہاں جانا محض اتفاق تھا۔ اگر کل شام اچانک اسلامیہ کالج لاہور کے بعض دوست نہ مل جاتے تو میں آج گاڑی میں سفر کر رہا ہوتا۔ پروگرام ان کا تھا۔ میں ان کا ساتھ دینے پر تیار ہو گیا۔ جب میں پہاڑ کے دامن میں پہنچا تو وہ وہاں نہیں پہنچے تھے۔ اب خدا جانے میرے میزبان کے دل میں کیا آئی تھی کہ وہ میرے ساتھ آگئے تھے اور ایک پستول، ایک بندوق اور ایک دُوربین بھی ساتھ لے لی تھی۔ اُس وقت یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ساز و سامان آپ کے ماموں جان کو بھیڑیوں سے بچانے کے کام آئے گا۔"

محمد صدیق نے پُوچھا۔ "آپ کب جا رہے ہیں؟"

"جی! میں انشاء اللہ کل چلا جاؤں گا۔"

ایس ڈی او محمد سعید نے معمر عورت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپا جان! آپ کا کام بن گیا۔ اللہ نے آپ کو قابلِ اعتماد ساتھی دے دیا ہے اور میری یہ پریشانی دُور ہو گئی ہے کہ آپ کے ساتھ کس کو بھیجا جائے۔"

"بھئی میں چھوٹی بچی نہیں۔ میں بہت سفر کر چکی ہوں۔ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ ایک بیٹا میرے ساتھ ہو گا اور راستے میں میری شہزادی نسرین کو بھی خوش رکھے گا۔"

محمد سعید نے کچھ سوچ کر کہا:

"یوسف صاحب! کیا یہ بہتر نہ رہے گا کہ آپ کل کی بجائے پرسوں جائیں؟ میں آپ کے ساتھ احمد خاں صاحب کے پاس جاؤں گا اور اُن سے درخواست کروں گا کہ کل دوپہر آپ اور وہ ہمارے ساتھ کھانا کھائیں اور پھر آپ کو ہمارے پاس ایک یا دو دن رہنے کی اجازت دے دیں۔"

"یوسف صاحب! ایس ڈی او نے اس معمر خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ معزز خاتون بیگم فریدہ احمد ہیں اور نسرین، میرا مطلب ہے شہزادی نسرین، ان کی بہت لاڈلی بلکہ سارے خاندان کی لاڈلی اِن کی سب سے چھوٹی نواسی ہے محمد سعید کی چھوٹی بیٹی بولی۔" آپا جی نسرین کہتی ہے کہ سب سے لاڈلی فہمیدہ ہے اور نانی جان جب جالندھر جائیں گی تو اسے شہزادی کہنا شروع کر دیں گی۔

مسز احمد بولی۔" نہیں بیٹی شہزادی ہمیشہ چھوٹی بیٹی ہوتی ہے۔"



چائے پینے کے بعد وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

مغرب کی نماز کے بعد وہ پھر ایک گھنٹے تک بیٹھے رہے اور بعد میں یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔" اب مجھے اجازت دیجیے۔ خانصاحب میرا انتظار کر رہے ہونگے میں دوپہر کی دعوت کے متعلق ان سے کہہ دوں گا اور اگر وہ اس عرصے میں کسی اور کی دعوت قبول نہیں کر چکے ہوں گے، تو ضرور آئیں گے۔"

"میں خود کیوں نہ تمہارے ساتھ چلوں۔"

"نہیں! آپ کو تکلیف ہوگی، لیکن ٹھہریے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خانصاحب کی کار آ رہی ہے۔"

—— کار بنگلے کے قریب آکر رُکی! احمد خان کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یوسف نے آگے بڑھ کر کہا:

"خان صاحب! السلام علیکم! مجھے افسوس ہے کہ آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔" "بھائی! کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" احمد خان نے کہا:

"تم کچھ عرصہ میرے پاس رہو تو میری بہت سی عادتیں بدل جائیں گی۔"

"خان صاحب! یہ ایس ڈی او محمد سعید ہیں۔"

احمد خان نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"اب آپ سب حضرات چلیں اور میرے ساتھ کھانا کھائیں۔"

محمد صدیق نے کہا۔" نہیں خان صاحب پھر سہی آپ جب بلائیں گے۔ ہم حاضر ہو جائیں گے۔ ویسے ہم یہ درخواست لے کر آپ کے پاس حاضر ہونے کے متعلق سوچ رہے تھے کہ کل دوپہر آپ ہمارے ہاں کھانا تناول فرمائیں۔"

احمد خان بولا۔" اگر یوسف صاحب رُک جائیں تو مجھے آپ کے ساتھ کھانا کھانے میں بہت خوشی ہوگی۔"

سعید بولا۔" جناب! یوسف کو ہم نے یہیں روک لیا ہے۔ کل شام وُہ آپ سے اجازت لے کر ہمارے پاس آ جائیں گے اور پرسوں یہاں سے روانہ ہو جائینگے۔ —— انہیں ہم اِس لیے زحمت دے رہے ہیں کہ وہ ہماری ایک قریبی رشتہ دار کو راستے میں اُن کے گھر پہنچائیں گے۔

احمد خان نے کہا۔" اگر آپ نے یوسف صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا ہے تو مجھے اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

محمد صدیق نے کہا۔" خان صاحب! یوسف صاحب کی رضامندی کا انحصار آپ کی رضامندی پر ہے۔"

احمد خان نے کہا۔" بھئی! آپ یوسف صاحب کو دو چار دن اور نہیں روک سکتے؟"

"خان صاحب! اگر یہ رُک جائیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوگی اور اس بہانے سے ہم اپنی آپا جان کو بھی روک سکیں گے۔"

احمد خان نے مسکراتے ہوئے سوال کیا: "کیوں یوسف صاحب! آپ بلوچستان

کے دوسرے پہاڑ دیکھنا پسند نہیں کریں گے؟"

یوسف: "خان صاحب! مَیں آپ کے ساتھ زیارت دیکھ چکا ہوں اور وہاں سے بابا خرواری جاکر مَیں نے جو دلکش مناظر دیکھے ہیں ان کے دیکھنے کے بعد میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے بلوچستان کے کوہساروں کے حصّے کا بیشتر حُسن خلیفت کے دامن میں بکھیر دیا ہے اور اب اگر موقعہ ملا تو مَیں یہاں صرف برف باری دیکھنے آؤں گا۔

لیکن، خان صاحب! "مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے ایک بار کانگڑہ کے پہاڑ دیکھ لیے تو پھر آپ ہر سال وہاں جایا کریں گے"۔

احمد خاں بولا: انشاء اللہ! اگلے سال کانگڑہ ضرور جاؤں گا۔" لیکن شرط یہی ہو گی کہ آپ میرے ساتھ چلیں"۔

محمد صدیق نے کہا: "خان صاحب! یوسف صاحب نے ٹھیک کہا ہے: کانگڑہ بہت خوب صورت ہے اور وہاں حسبِ منشا شکار ہوتا ہے۔ جنگلی مرغیوں سے لے کر ریچھ، چیتے اور شیر تک"۔

احمد خان نے کہا۔ "چلیے یوسف صاحب! امید ہے کہ آپ کو رخصت کرنے سے پہلے مجھے کئی سالوں کا پروگرام بنانا پڑے گا۔ ممکن ہے میں ستمبر کے شروع میں کانگڑہ جانے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ آپ مجھے خط لکھتے رہیں کیونکہ اگر کوئی ساتھی آوازیں دینے والا نہ ہو تو میں حرکت میں نہیں آیا کرتا"۔

یوسف نے کہا: "خان صاحب! مَیں آپ کو خط لکھتا رہوں گا۔ انشاء اللہ۔ اور آپ پروگرام بنا لیجیئے گا"۔

یوسف، محمد صدیق اور محمد سعید سے مصافحہ کر کے احمد خاں کے ساتھ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

اور جب گاڑی سٹارٹ ہو رہی تھی تو محمد صدیق نے آگے بڑھ کر پوچھا:

"خان صاحب! آپ کل دوپہر کے کھانے پر خود ہی پہنچ جائیں گے یا مَیں آپ کو لینے آؤں"؟

"بھئی! مَیں خود ہی آجاؤں گا"۔ احمد خان نے کہا: "اور میرا خیال ہے کہ ہم وقت سے پہلے یہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر شام کو آپ میرے ہاں چائے پئیں گے اور اس کے بعد یوسف کو آپ کے ساتھ یہاں واپس پہنچا دیا جائے گا"۔



اُن کے جانے کے تھوڑی دیر بعد محمد سعید کے گھر میں چند خواتین اور لڑکیاں جمع ہو گئیں اور خاتون خانہ سے گلہ کرنے لگیں کہ آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا کہ وہ بہادر لڑکا جس نے محمد صدیق کی جان بچائی ہے آپ کے پاس چائے کے لیے آیا ہے"۔

"بھئی! وہ کل پھر آئے گا۔ چاہو تو اُسے اچھی طرح دیکھ لینا!

محمد سعید کی بیٹیوں نے اپنی سہیلیوں کو یہ بتا دیا تھا کہ اُس نے نسرین کو دیکھتے ہی اِس کا نام شہزادی نسرین رکھ دیا تھا اور وہ سب اس کی طرف غور سے دیکھ رہی تھیں۔

ایک لڑکی نے سعید کی بیوی سے کہا: "چچی جان! آپ اُس سے ضرور پوچھیں کہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟"

"واہ بھئی! مَیں کیوں پوچھوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟

دوسری لڑکی نے نسرین سے مخاطب ہو کر کہا۔

اچھا شہزادی نسرین صاحبہ ——— آپ ہی یہ بتا دیں کہ شہزادی کیسی ہوتی ہے"؟

"مجھے کیا معلوم وہ کیا ہوتی ہے۔ کل یوسف بھائی جان سے پُوچھ کر بتاؤں گی"۔

باب ۔ ۳

اگلے روز محمد سعید کے ہاں یوسف اور احمد خاں دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے
علاوہ چند اور مہمان بھی تھے۔ ایک عبدالحمید ای، ایے، سی انتہائی بااثر پٹھانوں کے سردار
گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرا ایک صحافی تھا اور تیسرا کالج کا پروفیسر تھا۔ کوہِ مردار
کے بھیڑیوں کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی اور یوسف کو مختلف سوالات کے جواب
میں ساری داستان ایک بار پھر سنانی پڑی۔ تیمور علی خان نے کہا: "میں نے مقامی
لوگوں سے سُنا ہے کہ کوہِ مردار پر انتہائی خوفناک بلائیں رہتی ہیں لیکن میں سوچتا ہوں
کہ ایسی ویران جگہوں پر کوئی بلا بھوکے بھیڑیوں سے زیادہ خوفناک نہیں ہوسکتی۔"
پروفیسر نے کہا: "یہ ایک قابلِ فخر کارنامہ ہے لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کا
پہلے بھی کبھی کسی درندے سے سابقہ پڑا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا "جناب میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا تو مجھے
ایک ناقابلِ یقین واقعہ پیش آیا۔ ہمارے علاقے میں گنّا بہت زیادہ ہوتا ہے اور
ہمارے ایک کھیت میں ایک نئی قسم کا گنّا جو چوسنے میں بہت نرم ہوتا ہے کاشت
کیا گیا تھا۔ اِس کھیت سے پہلے دو اور کھیت راستے میں آتے تھے۔ ہمیں وہاں پہنچنے
کے لیے ایک کھائی میں سے گزرنا پڑتا تھا اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا تھا
جب کھائی خشک ہوتی تھی۔ ایک شام میں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ہاکی کھیلتے
کھیلتے گنّوں کے لیے اس کھیت کی طرف چل دیا۔ نصف فاصلہ طے کرنے کے بعد

میں نے اچانک دیکھا کہ میرا چھوٹا بھائی میرے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ شام ہو رہی تھی اور
میرا خیال تھا کہ میں چند گنے توڑ کر واپس بھاگ آؤں گا۔ اب چھوٹے بھائی کے آجانے
سے مجھے پریشانی ہوگئی۔ وہ مجھ سے چھ سال چھوٹا تھا اور دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔
ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں کماد کے کھیتوں کے درمیان تھوڑی جگہ خالی تھی۔ میں
نے چھوٹے بھائی کو وہاں کھڑا کیا۔ جلدی جلدی چند گنے توڑے اور خالی جگہ آکر ان کے
چھلکے اتارنے لگا۔ اچانک مجھے آہٹ سنائی دی۔ دو کھیتوں کے درمیان ایک
پتلی سی منڈیر حدِ فاصل کا کام دے رہی تھی اور خالی جگہ سے چند فٹ آگے دونوں طرف
سے کماد کے گرے ہوئے خشک پتوں میں چھپ گئی تھی اور ان پتوں پر کسی جانور کے
چلنے سے دھیمی دھیمی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ شاید یہ میری چھٹی
حس تھی کہ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو بازو سے پکڑ کر اپنے پیچھے کھڑا کر لیا۔ جوں جوں
آہٹ قریب آرہی تھی میرے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی پھر نیچے لٹکتے ہوئے سوکھے
پتوں سے اُس کا سر نمودار ہوا۔ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ پندرہ فٹ کا فاصلہ ہو
گا۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا مبہوت ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔" یوسف یہاں تک کہہ کر
رکا۔ پروفیسر اور دوسرے لوگوں نے یک زبان ہو کر پوچھا "بھئی وہ کیا تھا؟"

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا "میں یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا تھا۔ وہاں
شام کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ میں آپ کو یہ بھی نہیں بتا سکتا کہ وہ مجھے کتنی دیر دیکھتا
رہا! اُس کی آنکھیں یقیناً ایک درندے کی آنکھیں تھیں۔ اُس کا قد کتے سے یقیناً
بڑا تھا۔ اُس نے اچانک منہ موڑ لیا اور جس طرح آیا تھا اُسی طرح قدم اٹھاتا ہوا غائب
ہوگیا۔"

دروازے کی اوٹ سے عورتوں کی کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں۔ ای لے
سی نے سوال کیا: "جب وہ مڑا تھا۔ آپ یہ نہیں دیکھ سکے کہ وہ کیا تھا؟"

"جناب! مَیں اُسے اِس لیے بھی اچھی طرح نہ دیکھ سکا کہ اُس کا رنگ کماد کے خشک پتوں سے مِلتا جُلتا تھا۔ مَیں صرف اُس کی چمکدار آنکھیں دیکھ سکا تھا اِس کے علاوہ مَیں صرف یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُس کی دُم کافی لمبی تھی۔

اِس کے بعد میں نے اپنی ہاکی اٹھائی۔ اور چھوٹے بھائی سے کہا بھاگو وہ شاید یہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔ وہ بھاگا اور چند سیکنڈ کے بعد مَیں بھی اس سے جا مِلا اور جب ہمارے درمیان کچھ فاصلہ ہو گیا . . . . . تو میں بھی بھاگ کر اُس سے جا مِلا۔ اب ہم کھیتوں سے باہر آ چکے تھے۔"

پروفیسر نے پوچھا "آپ رُک کیوں جاتے تھے جناب؟"

"پروفیسر صاحب! درندے سے زیادہ مجھ پر اس بات کا خوف سوار تھا۔ کہ اگر درندے نے حملہ کر دیا تو میرا بھائی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ اسی لیے مَیں اس کے پیچھے رہنا چاہتا تھا۔"

ای اے سی نے پوچھا! "بھائی! پھر آپ کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کون سا جانور تھا۔"

"جناب! اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید گاؤں کے لوگ اس کا مذاق اڑاتے، لیکن یہی باتیں میں نے وہاں کہی تھیں اور کسی نے میرا مذاق نہیں اڑایا میرے والد اتفاق سے گھر آئے ہوئے تھے۔ مَیں نے انھیں بتایا تو انہیں بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ مَیں نے کوئی خطرناک درندہ ضرور دیکھا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ شیر کا یہاں تک پہنچنا ناممکن نہیں تھا۔ وہ لگڑ بگڑ بھی ہو سکتا تھا۔

گاؤں کے پندرہ بیس جوان لاٹھیاں اُٹھا کر تیار ہو گئے اور انہوں نے ابّا جان سے درخواست کی کہ آپ بندوق لے کر ہمارے ساتھ چلیں لیکن انہوں نے سمجھایا کہ رات کے وقت کسی درندے کے پیچھے جانا خطرناک ہو سکتا ہے۔

"اگلے دن اُس جگہ سے کوئی سو قدم دُور ایک کُتّے کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ جس کا کچھ حصّہ اُسے ہلاک کرنے والا درندہ ہڑپ کر چکا تھا۔

ہمارے علاقے کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے کماد کے کھیت دوسرے گاؤں سے مِل جاتے تھے۔ کہیں راستے میں کوئی نہر یا سڑک آتی تھی تو اس سے آگے پھر گنّے کے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اِس لیے کسی درندے کا پہاڑی علاقے سے نکل کر اس طرف آ جانا ناممکن نہیں تھا۔"

پروفیسر نے کہا: "دیکھیے برخوردار! اگر آپ یہ بتا سکیں کہ جب آپ نے قدموں کی آہٹ سُنی تھی اور پھر جب آپ نے درندے کے چہرے کا کچھ حصّہ دیکھا تھا تو آپ کی ذہنی کیفیت کیا تھی؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "جی مجھے معلوم نہیں کہ میری ذہنی کیفیت کیا تھی؟"

"بہرحال آپ ایسی باتیں کہہ سکتے ہیں کہ خوف سے آپ کے ذہنی قویٰ شل ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ اچانک اس قدر سنبھل گئے تھے کہ آپ کو اپنی جان سے زیادہ اپنے بھائی کی جان کا خوف تھا۔ اور پیچھے رہ کر آپ اس کے لیے ڈھال بننا چاہتے تھے۔"

یوسف نے جواب دیا۔ "پروفیسر صاحب میرے قویٰ شل نہیں ہوئے تھے اگر میں ڈرنے میں کوئی فائدہ دیکھتا تو یقیناً ڈرتا لیکن میں اس عمر میں بھی حقیقت پسند تھا۔" پروفیسر نے کہا۔ "آپ کا دل تو دھڑکتا ہو گا؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "جناب اُس وقت دل کی دھڑکن سننے کی فرصت نہ تھی" اور وہ سب ہنس پڑے۔

احمد خان نے کہا۔ "یوسف عام لوگوں سے بہت مختلف ہے اگر کوئی مجھے یہ کہے کہ یہ غار میں ستانے والی شیرنی کا بچّہ اٹھا لایا ہے تو مَیں یقین کر لوں گا۔"

محمد صدیق نے کہا: "خان صاحب! یوسف صاحب کے متعلق ایسی باتوں پر مجھے بھی یقین آجائے گا۔"

پروفیسر نے کہا: "یوسف صاحب! مجھے درندوں کا کوئی تجربہ نہیں، لیکن آپ شاید اس کی معقول وجہ بیان کرسکیں کہ ایک درندہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آپ کے قریب آیا اور آپ پر حملہ کیے بغیر واپس چلا گیا۔"

یوسف نے جواب دیا: "پروفیسر صاحب! شاید وہ اپنا شکار چھوڑ کر آیا تھا اور اسے نئے شکار کی ضرورت نہیں تھی۔ درندہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے شکار کرتا ہے جب بھوک ختم ہوجاتی ہے تو وہ امن پسند بن جاتا ہے۔"

صحافی نے کہا: "اِس کا مطلب یہ ہے جب بھوک مٹ جاتی ہے تو درندے بھی عدمِ تشدّد کے اصول پر کاربند ہوجاتے ہیں۔"

یوسف نے کہا: "نہیں جی درندے پر پیٹ بھرتے ہی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے اور وہ کہیں چھُپ کر سو جاتا ہے۔ اہنسا یا عدمِ تشدد کے فلسفے سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ——

اہنسا اُن سیاستدانوں کا کھیل ہے جو طاقت ور کے پاؤں پر گرتے ہیں اور کمزور کا گلہ گھونٹتے ہیں۔

عدمِ تشدد کا واحد مقصد مسلمانوں کو لوریاں دے کر سلانا ہے اور ہندوؤں کو خون کی ندیاں بہانے کے لیے تیار ہونے کے مواقع فراہم کرنا ہے۔"

پروفیسر مسکرایا: "یعنی آپ کے خیال میں عدمِ تشدّد ایک ڈھونگ ہے۔"

یوسف نے جواب دیا: جناب! "میری ترجمانی کے لیے آپ اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرسکتے ہیں۔"

سب لوگ یوسف کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ نہایت اطمینان سے

بول رہا تھا:

"آج تک کانگرس کا ایک ہی مطالبہ رہا ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ انگریز یہاں سے نکل جائیں، بلکہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی صورت میں وہ کانگرس کو ملک کی واحد نمائندہ جماعت مان لیں اور مسلم لیگ کو جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اپنی واحد نمائندہ جماعت سمجھتی ہے۔ نظر انداز کردیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب اچھوتوں کے علیحدہ ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوا تھا تو گاندھی جی نے مرن برت کی دھمکی سے انہیں بے دست و پا کردیا تھا۔

جناب پروفیسر صاحب! ہماری تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ہم سو رہے ہیں اور گاندھی اور نہرو کے اعصاب پر یہ خوف سوار ہے کہ یہ مسلمان جنہوں نے ایک ہزار برس اس برِصغیر پر حکومت کی ہے۔ انگریز کے جاتے ہی کہیں ایک بار پھر ملک کا اقتدار نہ سنبھال لیں اور دراصل یہی عدمِ تشدد کا فلسفہ ایک ایسے عفریت کے چہرے کا نقاب ہے، جو آگے چل کر ظلم و وحشت اور سفاکی کی تاریخ میں یقیناً ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔"

پھر اُس نے اپنا رُخ بدلا اور صحافی سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"جناب! گستاخی معاف میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟"

صحافی نے جواب دیا۔ "بھائی میری ملازمت کراچی میں ہے لیکن میرا گھر احمد آباد میں ہے۔"

"معاف کیجیے"! اگر یہ بات ہے تو پھر آپ کو اپنے خیالات پر بہت جلد نظرثانی کرنا ہوگی: مسلمان اس وقت آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں اور اگر آج ان میں سے کوئی قائدِ اعظم کی زبان نہیں سمجھتا تو اگر وہ بدنیّت نہیں تو

بیوقوف ضرور ہے"۔ کانگرسی ذہن کا یہ صحافی شکست خوردہ نگاہوں سے یوسف کی طرف دیکھ رہا تھا۔

تیمور خان نے کہا" آپ نے یہاں رہ کر بلوچستان کے حالات کا تھوڑا بہت تجزیہ کیا ہوگا۔ مَیں آپ سے پُوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کی رفتار سے آپ مطمئن ہیں؟" یوسف نے جواب دیا:

"خان صاحب کو کچھ معززین ملنے کے لیے آتے رہتے ہیں اور مَیں ان کی گفتگو سنتا رہا ہوں۔ اِس کے علاوہ میں نے اپنے طور پر عام لوگوں سے بھی گفتگو کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بلوچستان میں تحریکِ پاکستان کا کام صحیح خطوط پر شروع نہیں ہوا۔ یہاں ایک قبائلی نظام ہے اور بلوچستان میں وہی سیاست کامیاب ہوگی جسے قبائل کے سربراہوں کی حمایت حاصل ہوگی۔ اگر پچاس یا پچپن قبائل کے سرداروں کو پاکستان کا حامی بنا لیا جائے تو یہاں پر پاکستان کی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ قبائل کے عوام ہر قیمت پر اپنے سرداروں کا ساتھ دیں گے۔ یہاں قبائلی عصبیت کی یہ حالت ہے کہ کوئی لیڈر خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔ دوسرے قبیلے کے ایک عام آدمی کو بھی اپنے پیچھے نہیں لگا سکتا۔ یہاں جب شاہی جرگہ کے ارکان ایک قطار میں کھڑے ہو جائیں گے تو یہ سمجھ لیجیے کہ پورا بلوچستان ان کے پیچھے کھڑا ہے۔ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ کو پورے بلوچستان میں زیادہ سے زیادہ ایسے پچاس ساٹھ معززین سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا جو سردار گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں اور اپنے سردار پر اثر انداز ہو سکتے ہوں۔"

تیمور خان نے کہا:" بھائی والله! آپ میرے دل کی بات کہہ رہے ہیں، مَیں چند آدمیوں کا ایک وفد بناؤں گا اور پھر ہم ہر با اثر آدمی کے پاس جائیں گے۔ خواہ مجھے اس مقصد کے لیے ملازمت ہی کیوں نہ چھوڑنی پڑے۔"

یوسف! کہہ کر وہ پھر اس کی طرف دیکھنے لگا: "اگر آپ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی اور فیصلہ نہیں کر چکے تو میں آپ کو یہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں، میرا مطلب ہے کہ اگر آپ کو اپنے حالات آزادی سے تحریکِ پاکستان کے لیے کام کرنے کی اجازت دے سکیں اور کسی دشواری کی وجہ سے آپ نے اپنی زندگی کا کوئی خاص پروگرام نہ بنا رکھا ہو تو میں آپ کو یہاں آکر کام کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ یہاں ایسے لوگ ہیں جو آپ کے راستے میں اقتصادی مشکلات حائل نہیں ہونے دیں گے۔"

یوسف نے چند ثانیے سوچنے کے بعد جواب دیا۔" جناب! میرے سامنے اہم ترین مقصد یہی ہے کہ مَیں حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں ان لوگوں کا ساتھ دوں جو اسے مسلمانوں کی موت و حیات کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس معرکے میں میرا سب سے بڑا ہتھیار میرا قلم ہے! اپنے متعلق مَیں اب تک صرف اِتنا جانتا ہوں: کہ مَیں اپنی قوم کے جوانوں کو ان کے ماضی کی ولولہ انگیز، روح پرور اور سبق آموز داستانیں سُنانے کے لیے پیدا ہُوا ہوں۔ مَیں تاریخ کا طالب علم ہوں اور ماضی کی تاریخ میرے لیے ایک آئینہ ہے جس کی بدولت مستقبل کے خدوخال سنوارے جا سکتے ہیں۔ مَیں اپنے دل میں وہ تڑپ رکھتا ہوں جو مجھے ہمیشہ بے چین اور بے قرار رکھتی ہے اور اِسی بے چینی اور بے قراری کے باعث میرے دماغ میں ان گنت داستانیں جنم لیتی ہیں۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی دلچسپ داستانیں پہلے کبھی نہیں لکھی گئیں۔ میری قوم کی موجودہ اور آئندہ نسلیں انہیں بہت پسند کریں گی اور متاثر ہوں گی اور ان میں سے کئی پاکستان کے نقیب اور معمار بن جائیں گے۔

خان صاحب! علامہ اقبال، قائدِ اعظم اور نواب بہادر یار جنگ کا پاکستان وہ خطۂ زمین ہوگا جہاں ہم اپنے ناقابلِ شکست قومی حصار تعمیر کریں گے اور میں اپنے قلم سے اس ناقابلِ شکست ذہنی اخلاقی اور روحانی حصار کے نقشے تیار کروں گا۔ آپ

کو میری یہ بات سُن کر یقیناً حیرت ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب میری داستانوں پر ناول کا لفظ چسپاں ہوگا اور جب یہ ناول پڑھے جائیں گے تو کسی کو میری دماغی حالت پر شک نہیں ہوگا"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نظر میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو آپ کی دماغی حالت پر شک کرتے ہیں؟" صحافی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں۔ ایسے لوگ ہیں اور میں انہیں بڑی جلدی پہچان لیتا ہوں۔ اس وقت آپ کا چہرہ یہ بتا رہا ہے کہ آپ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہونے کے باوجود ان میں سے ایک ہیں۔"

پروفیسر نے کہا۔ "دیکھئے یوسف صاحب! یہاں آپ کا کوئی دشمن نہیں، آپ ایک تعلیم یافتہ اور صحت مند انسان ہیں اور کوئی آپ کو مستقبل کے متعلق سہانے خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ تاہم ہمیں اس بات سے دلچسپی ضرور ہے کہ اس دنیا میں رہنے کے لیے اور اس دنیا میں زندگی کی ضروریات پورا کرنے کے لیے آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ پیدائشی طور پر ایک خوشحال آدمی ہیں اور آپ کے گھر میں وہ سب کچھ ہے جسے آرام کی زندگی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے تو آپ کو یا آپ کے کسی خیر خواہ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں لیکن اگر ایسی بات نہیں تو پھر آپ سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اپنی روزی کے لیے کیا کام کریں گے۔"

یوسف نے جواب دیا۔ "دیکھئے صاحب! میرے دل میں ایسے ناول لکھنے کا ہرگز ارادہ نہیں جو مجھے عزت کی روٹی بھی نہ دے سکیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے نہیں، کھلی آنکھوں سے اپنے لیے یہ راستہ تلاش کیا ہے۔ ویسے آپ میں سے اگر کوئی صاحب دنیا کے بڑے بڑے ناول نگاروں کے متعلق کچھ

جانتے ہوں تو میں یہ بتا سکتا ہوں کہ گذشتہ دو تین صدیوں سے ادب میں ناول نگاری ہی ایک مقبول ترین صنف ہے اور میں ایسے بیسیوں ناول نگاروں کے نام لے سکتا ہوں جنہوں نے مقبولیت بھی حاصل کی اور جن کی آمدنی بھی بے حد وحساب ہوتی تھی۔ جن کی زندگی میں ہی ان کی تصانیف کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو گئے اور دُنیا کی متعدد زبانوں میں ان کے تراجم بھی شائع ہو گئے تھے۔ لیکن میرے متعلق کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ میرے دل میں ان کی وجہ سے یا ان کو سامنے رکھ کر اپنا حساب کتاب جوڑنے سے یہ شوق پیدا ہُوا ہے۔ میرے لیے ناول نگاری اِس قومی ابتلاء کے زمانے میں واحد محاذ ہے جہاں میں اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن ادا کر سکتا ہوں۔ میرے نزدیک اہمیت اس مقصد کی ہے جس کے لیے میں لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ مجھے روٹی کتنی ملے گی۔

جس بھنور میں میں اپنی قوم کو دیکھ رہا ہوں۔ اس سے نکالنے کے لیے مجھے اگر بھوکا بھی رہنا پڑے اور میرا مقصد پورا ہو جائے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔ جب قوم کو اپنی بقا کے خطرات درپیش ہوں تو میں اپنے شاندار کیریئر کے متعلق نہیں سوچ سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ ناول کے متعلق سوچتے ہوئے میں اپنے اندر ایک خود اعتمادی پاتا ہوں۔ شاید آپ کے دل میں یہ خیال آئے کہ میں اپنے خدشات دُور کرنے کے لیے یہ باتیں کر رہا ہوں۔"

نہیں یہ بات نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ اللہ نے مجھے اگر کوئی صلاحیت دی ہے تو اِس کا صحیح استعمال کرنے کے بعد میری روزی اسی کے ذمہ ہے زیادہ یا کم ہو اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے حصولِ وطن راشن جمع کرنے سے بہت اہم ہے۔"

وہ سب خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ احمد خان نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "دیکھو بھئی یوسف! اگر تم وہی ہو جو تم اپنے آپ کو سمجھتے ہو تو یقین مانو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہ تمہیں کبھی بھی مایوس نہیں ہونے دے گا۔"

تیمور خان نے کہا: "یار! میں تو تمہاری گفتگو کے دوران یہ محسوس کر رہا تھا کہ پاکستان کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے اور اس کے باہمت معمار جب تھک جاتے ہیں تو تمہاری کتاب اٹھا کر چند صفحات پڑھنے کے بعد تازہ دم ہو کر پھر کام پر لگ جاتے ہیں اور یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اپنی قوم کے لئے ایسا ادب پیدا کرنے والا بھوکا بھی رہ سکتا ہے۔ میرے بھائی! میں ہر نماز کے بعد آپ کے لئے دعا کروں گا۔"

احمد خان صاحب نے کہا: "یار! ایک بات عجیب ہے۔ صرف چند دن قبل یوسف صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے وہ بہت چھوٹے نظر آئے۔ پھر بھیڑیوں کا واقعہ پیش آیا تو مجھے یہ افسوس ہوا کہ یہ اپنے قد و قامت اور عمر میں بڑے ہو گئے ہیں اور آج میں یوسف صاحب کے چہرے پر بزرگی کے آثار دیکھ رہا ہوں۔ میرے بھائی! اللہ تمہیں ہمت دے تم کوئی ایسی چیز ہو جسے میں نہیں سمجھ سکتا۔ آج سے میں یہ دعا کیا کروں گا کہ تمہارا ہر خواب پورا ہو۔"

اور پھر وہ سعید کی طرف مخاطب ہوا: "سعید صاحب! مجھے اچھا کھانا کھانے کے بعد فوراً نیند آجایا کرتی ہے۔ اور آپ کا کھانا بہت ہی اچھا تھا! اس لئے میں اجازت چاہتا ہوں۔ آپ چائے پر ضرور آئیں۔ یوسف صاحب اگر رُکنا چاہتے ہوں تو رُک جائیں۔ وہ آپ کے ساتھ آجائیں گے۔"

یوسف بولا: "نہیں خان صاحب! میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے

بھی نیند آرہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف احمد خاں کے ساتھ کار پر اس کی قیام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔

باب - ۴

اگلی شام یوسف محمد سعید کا مہمان تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ سیر کے ارادے سے باہر نکلا تو نسرین بھاگتی ہوئی اُس کے قریب آ گئی:

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" اُس نے پوچھا۔

یوسف نے کہا: "شہزادی صاحبہ! مَیں تو سیر کے لیے جا رہا ہوں —— آپ بھی میرے ساتھ چلیں — شہزادیوں کے لیے سیر بہت ضروری ہوتی ہے"۔ اِس طرح اُس نے اپنا ہاتھ نسرین کی طرف بڑھا دیا۔

اور وہ اِس کا ہاتھ پکڑ کر ساتھ چل پڑی۔ تھوڑی دور جا کر اُس نے پوچھا بھائی جان یہ شہزادی کیا ہوتی ہے؟

یوسف نے غور سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"شہزادی وہ ہوتی ہے جس کے بال سنہری ہوں۔ بڑی بڑی آنکھیں تاروں کی طرح چمکتی ہوں۔ پیشانی کشادہ ہو۔ کوئی آواز دے تو بے پروائی سے منہ پھیر لے۔ کوئی ہنس پڑے تو وہ تلملا کر جلاّد سے کہے: جلاّد! اِس گستاخ کی گردن مار دو اور جسے سب پیار کرتے ہوں، لیکن اُسے کسی کی پروا نہ ہو"۔

نسرین نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور پیچھے ہٹ کر بولی۔

"واہ جی! آپ کا مطلب ہے کہ شہزادی بڑی اُلّو ہوتی ہے ——

ایکدم اُلّو! اور بدتمیز اور بے وقوف بھی!

یوسف ہنس پڑا۔ "نہیں نسرین! مَیں مذاق کر رہا تھا۔ مجھے یہ کہنا چاہیے تھا کہ شہزادی بالکل نسرین جیسی ہوتی ہے۔ اِسی لیے تو مَیں نے تمہیں دیکھتے ہی شہزادی نسرین کہا تھا۔"

"اور آپ نے مجھ میں کون سی بے وقوفی کی بات دیکھی تھی؟"

"یہ کس نے کہا ہے کہ شہزادی نسرین بے وقوف ہے"۔

"آپ کا مطلب تو یہی تھا!"

"بالکل نہیں!"

"مَیں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی کبھی کبھی چھوٹی سی بات پر روٹھ جایا کرتی ہے"۔

"آپ سے کب روٹھی تھی میں؟"

"اِتنی جلدی آپ کیسے روٹھ سکتی ہیں؟"

"میں بہت دیر کے بعد بھی آپ سے نہیں روٹھوں گی"۔

یوسف نے کہا۔ "نہیں! آپ کو یہ کہنا چاہیے کہ آپ کبھی کبھی رُوٹھا کریں گی! شہزادیاں اگر روٹھنا بھول جائیں تو وہ شہزادیاں نہیں رہتیں اور میں ننھی نسرین کو ہمیشہ ایک شہزادی دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"نانی جان کہتی تھیں کہ کسی اور نے مجھے شہزادی نہیں کہا!"

یوسف بولا: "شہزادی کو پہچاننے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔ ایک بے وقوف آدمی شیشے کے ٹکڑے اور ہیرے میں امتیاز نہیں کر سکتا"۔

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ کے سوا سب بے وقوف ہیں"۔

"نہیں! میرا مطلب یہ نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی نے آپ کو غور سے دیکھا ہی نہیں۔"

"نانی جان بھی سب سے یہی کہتی ہیں کہ میری بیٹی کو غور سے دیکھو!"

"وہ ٹھیک کہتی ہیں۔ اب ہمیں باتیں کرنے کی بجائے ذرا تیز تیز چلنا چاہیے! خاموشی سے تیز چلنا بھی شہزادیوں کے لیے بہت ضروری ہے۔"

یوسف لمبے لمبے قدم تیزی سے اٹھا رہا تھا اور نسرین اُس کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ ایک فرلانگ چلنے کے بعد وہ رُک گئی۔ یوسف نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے شہزادی؟"

نسرین بولی: "میں نہیں بنتی شہزادی، اب واپس چلیں۔"

یوسف واپس چل دیا۔ اور نسرین نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

یوسف بولا: "اب اگر شہزادی صاحبہ چاہیں تو بہت آہستہ چل سکتی ہیں اور باتیں بھی کر سکتی ہیں۔"

"بھائی جان!" نسرین نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پوچھا:

"یہ ناول کیا ہوتا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا: "اِس کا اصل مفہوم تو تم اس وقت سمجھ سکو گی جب بڑی ہو جاؤ گی اور چند اچھے ناول پڑھ لو گی۔ اس وقت میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ ناول ایک طرح کی کہانی ہوتی ہے جس میں کئی پہلوؤں سے زندگی کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہانی تھی کہ دو آدمی جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا مختلف سمتوں سے کوہِ مردار کی چوٹی پر جا رہے تھے۔ پھر راستے میں بھیڑیے آ گئے اور وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ پھر ان کی دوستی چند خاندانوں تک پہنچ

گئی اور نئے واقعات پیش آتے اور نئے کردار شامل کرنے سے یہ کہانی پھیل کر ایک ناول بن گئی۔"

"بھائی جان! آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن میں کچھ نہیں سمجھی۔"

وہ دونوں گھر پہنچے تو صحن میں محمد سعید کی بیوی اور بیٹیاں اور نانی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر نسرین کی نانی نے آواز دی:

"بیٹا! ادھر ہی آ کر بیٹھ جاؤ۔ میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں!"

پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی:

بیٹی! اپنے بھائی کے لیے ایک کرسی میرے پاس رکھ دو۔

یوسف آہستہ سے السلام علیکم کہہ کر بیگم احمد کے پاس بیٹھ گیا تو اُس نے کہا:

"بیٹا! ابھی احمد خان صاحب جو تمہارے میزبان تھے، آئے تھے اور ایک لفافہ دے گئے ہیں۔ وہ یہ کہتے تھے کہ وہ تمہیں گاڑی پر رخصت کرنے آئیں گے لیکن ہم نے انہیں یہ کہہ دیا تھا کہ ہم نے ابھی سفر کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اب ہم کل کی بجائے پرسوں جائیں گے۔

بات یہ ہوئی تھی کہ جب تم دوپہر کے کھانے کے بعد اپنے میزبان کے ساتھ گئے تھے تو اسماء اس کی بہن اور پڑوس میں اُس کی چند سہیلیوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ ہم نے اِس شرط پر ایک پڑوسی کی طرف سے دوپہر کا کھانا کھانے کی دعوت قبول کی تھی۔ کہ آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔"

یوسف نے کہا: "ہاں جی! اگر آپ نے کسی کی دعوت قبول کی ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"بیٹا! شہزادی نسرین کو ہم سب نے منع کیا تھا اور اسے اس بات کا احساس دلایا تھا کہ اگر اس کے منہ سے کوئی بات نکل گئی تو آپ کسی صورت میں یہاں نہیں رُکیں گے۔ اور بیٹا خان صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ تمہاری کچھ چیزیں تمہیں ریل گاڑی پر پہنچا دی جائیں اور یہ بھی تاکید کی تھی کہ تم اپنا ٹکٹ نہ لو۔"

یوسف نے کہا "ماں جی! یہ ان کی بہت زیادتی ہوگی۔ انہیں مہمان نوازی کی حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ میں ان سے کوئی چیز نہیں لوں گا۔"

بیگم احمد نے کہا۔ "بیٹا! تمہیں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ تمہارے طرزِ عمل سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔"

"نہیں، ماں جی! ایسا نہیں ہوگا۔"

بیگم احمد نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"یہاں ہمارے جاننے والوں میں کل سے بھیڑیوں کے واقعہ کے بعد زیادہ شہرت ہماری شہزادی کو ملی ہے۔ اور اسے تحائف بھی موصول ہو چکے ہیں۔ کل ہنا وادی میں ہماری پکنک اور پرتکلف دعوت ہے۔

نسرین بیٹی! وہ لفافہ اگر تم نے گم نہیں کر دیا تو جب یہ اندر جائیں۔ انہیں دے دو!"

تھوڑی دیر بعد یوسف بیٹھک کے اندر گیا۔ نسرین نے لفافہ لاکر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ یوسف نے لفافہ کھولا اندر سو سو کے دو نوٹ تھے اور ایک کاغذ پر یہ تحریر لکھی ہوئی تھی:

بھائی یوسف صاحب! السلام علیکم: یہ بڑے بھائی کی طرف سے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ ہے اگر قبول کر لو تو مجھے خوشی ہوگی۔ اگر قبول نہیں کرو گے تو مجھے صدمہ ہوگا۔ کہیں یہ نہ لکھ دینا کہ مجھے ضرورت نہیں۔ اگر

ضرورت نہ ہو تو بھی یہ پیسے اپنے پاس رکھ لینا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تمہارے ہاتھ سے یہ چند روپے کسی بہتر جگہ خرچ ہوں گے۔ میں ریلوے سٹیشن پر تم سے ملوں گا، لیکن اس سے پہلے مجھے یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ ان پیسوں کے متعلق کوئی بات نہیں ہوگی۔ اور مجھے شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔

تمہارا بھائی احمد خان

رات کھانا کھانے کے بعد یوسف نے عشاء کی نماز ادا کی اور اس کے بعد اپنے ہینڈ بیگ سے بڑے سائز کی ایک نوٹ بک نکالی اور میز کے سامنے بیٹھ کر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ گھر کے باقی افراد سو چکے تھے۔

نسرین اور اسماء دبے پاؤں اُس کے کمرے میں داخل ہوئیں اور اُسے منہمک دیکھ کر کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑی رہیں پھر وہ واپس جانے لگیں تو اس نے اچانک دیکھ کر کہا۔

"ارے! شہزادی نسرین تم جاگ رہی ہو؟"

"آپا اسماء کا خیال تھا کہ آپ ہمیں کوئی بہت اچھی کہانی سنائیں گے لیکن آپ مصروف ہیں۔"

یوسف مسکرایا: "اِس وقت کچھ لکھ رہا ہوں اس کے متعلق اس وقت میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب بڑی ہو کر تم پڑھو گی تو تمہیں پسند آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد یہ میرے کسی ناول کا اہم حصہ بن جائے۔ لیکن یہ ہے بہت اہم۔ اب تم کو اس کی رکھوالی کرنی پڑے گی اور اس کے بعد سفر کے دوران اس کی حفاظت کی ذمہ داری میں شہزادی نسرین کو سونپتا ہوں۔ لیکن ابھی کسی کو پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اب تم دونوں یہ وعدہ کرو کہ کسی سے اس کاپی کا ذکر نہیں کرو گی اور نہ ہی

اسے کھول کر پڑھو گی۔"

اسماء نے بھولے پن سے کہا۔" جی میں وعدہ کرتی ہوں اور نسرین تو شاید سمجھ بھی نہ سکے کہ آپ کیا لکھ رہے ہیں"۔ نسرین نے تلملا کر کہا۔

" واہ جی ! میں کوئی نالائق ہوں۔ ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل آتی ہوں۔"

یوسف نے کہا۔" اچھا شہزادی صاحبہ ! اب جا کر آرام کریں۔ میں سونے سے پہلے چند صفحات اور لکھ لوں۔"

وہ چلی گئیں اور یوسف لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

بیگم فریدہ احمد تہجد کی نماز کے لیے اُٹھیں تو یوسف کے کمرے میں روشنی دیکھ کر اُدھر آ گئیں:

"بیٹا ! تم رات سوئے نہیں؟"

"ماں جی !" یوسف نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔" اب تہجد پڑھ کر ہی سوؤں گا۔"

بیگم احمد نے پوچھا،"بیٹا ! کیا تم ساری رات لکھتے رہے ہو؟"

"ہاں ماں جی ! آج لکھنے کا موڈ تھا۔ اور جب موڈ بن جاتا ہے تو مجھے رات کا احساس نہیں رہتا۔ مجھے نیند یا تھکاوٹ بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

"بیٹا ! تم کیا لکھ رہے ہو؟"

"ماں جی ! میں نے اپنے گاؤں پر ایک مضمون لکھا تھا جو ہمارے انگریزی کے پروفیسر کو بہت پسند آیا اور انہوں نے مجھے کہا کہ یہ مضمون ذرا تفصیل سے لکھ ڈالو۔ اب میں اِسے تفصیل سے لکھ رہا ہوں اور اس میں بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں جو اس کی ابتدا کرتے وقت میرے ذہن میں نہ تھیں۔ مثلاً۔ میری اپنی زندگی کے کئی واقعات اس میں شامل ہوتے جا رہے

ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب یہ علیحدہ کتاب کی صورت میں یا کسی کتاب کے حصے کے طور پر شائع ہوں گے تو آپ انہیں پسند فرمائیں گی۔"

بیگم احمد نے کہا: بیٹا ! مجھے یقین ہے۔ کہ جو کچھ تم لکھو گے۔ مجھے پسند آئے گا۔ اب اٹھ کر تہجد پڑھ لو۔ اس کے بعد نماز فجر کا وقت ہو جائے گا اور ایسے کاموں کے لیے زندگی پڑی ہے۔

یوسف نے قلم رکھ دیا اور اُٹھ کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

وضو کے بعد واپس آ کر یوسف نے اپنے بیگ سے جائے نماز نکالی اور صحن میں چلا گیا۔ وہاں نمازِ تہجد ادا کرنے کے بعد اُس نے بنگلے سے باہر کچھ دُور ٹہلنے کے بعد صبح کی نماز ادا کی۔ تازہ ہوا میں چند لمبے لمبے سانس لئے اور پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

برآمدے میں بیگم احمد، سعید کی بیوی ، اسماء، اور نسرین نماز ادا کرنے کے بعد دعا مانگ رہی تھیں۔

یوسف نے بیگم احمد کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔

"ماں جی !" میرے لیے بھی دُعا کریں۔"

کمرے میں پہنچتے ہی وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور چند ثانیے کے بعد گہری نیند سو گیا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو نسرین کرسی پر اُس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ میں بہت سویا ہوں"۔ اُس نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں" نسرین کی آواز آئی۔

"نانی جان کے حکم سے پہرہ دے رہی ہوں کہ آپ کو کوئی جگا نہ دے۔ میں اتنی دیر سوتی تو میری پٹائی کر ڈالتیں۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نسرین شہزادی! جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو نانی جان کی پٹائی کو بھی اپنی زندگی کے انعامات میں شمار کیا کرو گی"۔

"ماں جی!" وہ بیگم احمد کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:

"میں ابھی نہا کر آتا ہوں"۔

"بیٹا! جلدی کرو۔ میں تمہارا ناشتہ بناتی ہوں۔ وہ سب کب سے سیر کو جانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں"۔

"ماں جی! آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا"۔

"نہیں بیٹا! تمہاری نیند اِن کی سیر سے زیادہ قیمتی تھی۔ میں نے تو یہ کوشش کی تھی کہ چلنے کا پروگرام ہی منسوخ کر دیا جائے لیکن یہاں ایک اچھی خاصی دعوت کا انتظام ہو چکا ہے"۔

یوسف نے کہا۔ "ماں جی! اگر یہ دعوت منسوخ ہو جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ مَیں اِتنے دن کبھی اپنی والدہ سے دُور نہیں رہا۔ یہ عجب بات ہے کہ آپ کو مَیں نے پہلی نظر دیکھ کر محسوس کیا ہے کہ شاید امی جان یہاں آگئی ہیں اور مجھے آپ کو "ماں جی" کہتے ہُوئے خوشی محسوس ہوتی ہے"۔

بیگم احمد نے کہا۔ "بیٹا! تمہارے منہ سے ماں جی کا لفظ سُن کر مجھے بھی بہت خوشی ہوتی ہے۔ اب جا کر ناشتے کی تیاری کر لو۔ ناشتے کے بعد تمہیں چند گھنٹے آرام کرنا چاہیے۔ اُس کے بعد ہم بہت سی باتیں کریں گے"۔

باب - ۵

تیسرے دن جب وہ اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہے تھے، احمد خاں کا ڈرائیور کار لے کر آگیا۔ اُس نے ایک ٹوکری اور ایک چھوٹا سا پیکٹ یوسف کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اسے اپنے سامان کے ساتھ رکھوا لیجئے۔ خان صاحب کا حکم ہے کہ مَیں آپ کو اسٹیشن تک پہنچا دوں۔ وہ گاڑی روانہ ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے"۔

یوسف نے کہا۔ "مَیں یہ پیکٹ اپنے سامان میں رکھ لیتا ہوں اور خشک پھل والی اس ٹوکری کو کار میں ہی رہنے دو۔ مَیں باقی سامان بھی پہنچا دیتا ہوں"۔

یوسف نے اندر جا کر پیکٹ کھولا اور قراقلی کی ایک خوب صورت ٹوپی نکال کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لی۔



تھوڑی دیر بعد یوسف، بیگم احمد اور نسرین کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ جب گاڑی لگ گئی تو انہوں نے انٹر کلاس کے ایک ڈبے میں سامان رکھنے اور اوپر کی سیٹوں پر بستر لگانے کے بعد بیگم احمد کو اندر بٹھا دیا۔ محمد صدیق نے تازہ پانی کی صراحی بھر کر رکھ دی اور باہر نکل کر گاڑی دیکھنے لگا: "معلوم ہوتا ہے کہ بھائی جان کسی اہم کام میں مصروف ہو گئے ہیں۔ ورنہ اب تک وہ ضرور آجاتے"۔

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ ابھی گاڑی روانہ ہونے میں بہت وقت ہے۔ دیکھئے! شاید خاں صاحب آرہے ہیں۔"

محمد سعید نے پھاٹک کی طرف دیکھا تو احمد خان دکھائی دیتے۔ وہ دونوں پھاٹک کی طرف بڑھے اور نسرین اُن کے پیچھے بھاگنے لگی۔

یوسف نے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا"خان صاحب! مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک مدت آپ کے پاس رہا ہوں اور مدت تک آپ کا مقروض رہوں گا۔"

احمد خان نے کہا۔"یار! کیا بات کرتے ہو۔ اگر بڑا بھائی ایک فرض پورا کرے تو چھوٹے بھائی کو شکریہ ادا کرکے اسے پریشان نہیں کرنا چاہیے۔"

یوسف نے مڑ کر نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے! تمہیں گاڑی کے اندر بیٹھنا چاہیے تھا۔"خان صاحب! یہ وہ شہزادی ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا۔"

محمد سعید، پھاٹک سے اندر آگیا اور اُس نے بیگم احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔

"مجھے شکارپور اور سکھر ٹیلی فون کرتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی۔ ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ سندھ کے بند میں کسی جگہ شگاف پڑ گیا ہے۔ اگرچہ اُسے بند کرنے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن اگر شگاف بند نہ ہو سکا۔ تو بند ٹوٹ جانے سے ایک وسیع علاقے میں سیلاب آجائے گا اور کئی دیہات ڈوب جائیں گے۔ یہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سکھر اور شکارپور کے درمیان ریلوے لائنیں اور سڑکوں کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اِس لیے میں نے احتیاطاً شکارپور اور سکھر اپنے جاننے والوں کو ٹیلی فون کر دیا ہے۔ شکارپور کا اسٹیشن ماسٹر اور سکھر میں ریلوے پولیس کا انسپکٹر میرے دوست

ہیں اور انہوں نے مجھے تسلی دی ہے کہ خدانخواستہ اگر کوئی خطرناک صورتِ حال پیش آگئی تو وہ آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے۔ اگر آپ یہ دیکھیں کہ شکارپور سے آگے سڑک بند ہے تو بہتر یہی ہوگا کہ آپ فوراً واپس کوئٹہ آجائیں۔ میں ان لوگوں سے رابطہ رکھوں گا۔ اور یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے کہ یوسف جیسا نوجوان آپ کا ساتھی ہوگا۔"

احمد خان نے کہا۔"اگر ایسی بات ہے تو یہ لوگ رُک کیوں نہیں جاتے۔"

"نہیں خان صاحب! یوسف بولا: اگر میرے ساتھی رُکنا چاہیں تو یہ اور بات ہے ورنہ میرا واپس جانے کا فیصلہ اٹل ہے۔ اگر سیلاب کی وجہ سے کسی جگہ ریل گاڑیاں اور موٹریں بند بھی ہو جائیں تو وہاں کشتیاں کام آئیں گی۔ اور مجھے کشتی پر سفر کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں کشتی کھینا بھی جانتا ہوں اور بوقتِ ضرورت تیر بھی سکتا ہوں۔"

احمد خان نے کہا۔"میرے بھائی کوئی ایسا بھی کام ہے جو آپ نہیں جانتے؟"

"خان صاحب! بعض کام سب کو آنے چاہئیں اور تیرنا ان میں سے انتہائی اہم ہے۔"

بھئی! میں تیرنا چاہتا ہوں۔ ایک اچھا تیراک بننے میں کتنی دیر لگے گی؟"

یوسف نے کہا۔"خان صاحب! انسان فطری طور پر تیراک ہے مجھے یقین ہے کہ چند ماہ کا بچہ بھی تیراک بن سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اُس میں خود اعتمادی پیدا کی جائے۔"

محمد صدیق نے پوچھا"یوسف! آپ نے کس عمر میں تیرنا سیکھا تھا؟"

"مجھے معلوم نہیں کہ میں کب سے تیرنا جانتا تھا۔ لیکن یہ بات مجھے

اُس وقت معلوم ہُوئی جب میرے چچا جان نے گہرے پانی میں مجھے دھکا دے دیا اور
میں ایک غوطا کھانے کے بعد تیرنے لگ گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے میں ——— اور
میری عمر کے دوسرے لڑکے کمر برابر پانی سے آگے جانا پسند نہیں کرتے تھے۔"
محمد صدیق نے کہا: "اب گاڑی چلنے کا وقت ہوچکا ہے"! اور وہ گاڑی
کی طرف چل دیے۔

نسرین کو محمد سعید اور محمد صدیق نے یکے بعد دیگرے پیار کیا اور وہ گاڑی
کے اندر جا بیٹھی۔ یوسف نے سب کے ساتھ مصافحہ کیا اور ٹرین پر سوار ہوگیا۔

ریل گاڑی کے ڈبے میں پانچ بڑی سواریاں تھیں، جن میں دو مرد، تین عورتیں اور
انکے علاوہ ایک بچہ بھی تھا، یوسف، بیگم فریدہ احمد اور نسرین دونوں سے ذرا ہٹ کر بیٹھا ہوا تھا گاڑی
چلنے سے تھوڑی دیر بعد بیگم فریدہ احمد نے کہا" خدا کا شکر ہے کہ یہ ڈبہ خالی جا رہا ہے۔
جب میں آئی تھی، تو بہت زیادہ رَش تھا۔"

یوسف بولا" ماں جی! ان دنوں مسافروں سے بھری ہوئی گاڑیاں یہاں آتی ہیں
اور قریباً خالی واپس جاتی ہیں۔ جب گرمی گذر جائے گی تو حساب اُلٹا ہو جائے گا۔"

مسز احمد نے کہا" بیٹا: تم ذرا قریب آجاؤ۔ مجھے گاڑی کے شور میں باتیں کرتے
ہوئے اُلجھن محسوس ہوتی ہے، نسرین بیٹی! اپنے بھائی کو جگہ دے دو۔"

نسرین سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئی اور یوسف بیگم احمد کے قریب ہوگیا وہ
دیر تک باتیں کرتے رہے۔

بستی تک پہنچنے سے پہلے مسز احمد، یوسف کے والدین، اُس کے
بہن بھائیوں، چچاؤں اور اُن کے بیٹوں بیٹیوں کے متعلق بہت کچھ جان چکی تھیں۔ اُسے
یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ وہ پچلے متوسط زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اُس کا والد ایک
تحصیلدار ہے۔ اُس نے اپنے متعلق یوسف کو یہ بتایا تھا کہ وہ لدھیانے کے ایک ایسے

تجارت پیشہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کے بعض افراد سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں
پر فائز ہیں اور نسرین کے والد کا جالندھر میں کاروبار بھی ہے اور شہر سے چند میل دُور وہ اپنی
اور اپنے بھائیوں کے حصّے کی زمین کا انتظام بھی کرتا ہے۔

بستی میں انہوں نے چائے پی اور جب یوسف بیرے کو بل دینے لگا تو بیگم احمد
نے کہا: "یوسف بیٹا! یہ پیسے اپنی جیب میں رکھو۔ ——— مَیں یہ سوچنے کے لیے
تیار نہیں ہوں کہ تم میرے بیٹے کے سوا کچھ اور ہو۔"

یوسف بولا: "ماں جی! اگر آپ ناراض ہوتی ہیں تو مَیں معافی مانگتا ہوں۔"

"مائیں بیٹوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتیں۔ لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ سفر کے
دوران تم کوئی چیز بھی اپنی جیب سے نہیں خریدو گے۔ اب ایک اچھے بیٹے کی طرح
وعدہ کرو کہ مجھ کو یہ بات دوبارہ نہیں کہنی پڑے گی۔"

"ماں جی! اگر آپ اس بات پر خوش ہوسکتی ہیں، تو مَیں وعدہ کرتا ہوں۔"

بیگم احمد نے بیرے کو بل ادا کرنے کے بعد قدرے توقف کے بعد کہا۔

"بیٹا! تمہاری امی جان تم سے بہت پیار کرتی ہوں گی؟"

"جی ہاں!"

"تمہارا اُٹھنا بیٹھنا اور بولنا ہمیں بھی بہت اچھا لگتا ہے اور میرا خیال ہے کہ
جب تم سو جاتے ہوگے تو وہ ٹکٹکی باندھے تمہارا چہرہ دیکھتی رہتی ہوں گی۔"

یوسف مسکرایا۔ "ماں جی! مجھے یہ یاد ہے کہ جب مَیں چھوٹا تھا تو بستر پر لیٹ
کر اُن کا انتظار کیا کرتا تھا اور جب وہ کمرے کی طرف آتی تھیں تو مَیں اپنی آنکھیں بند
کرکے یہ ظاہر کیا کرتا تھا کہ مَیں سو رہا ہوں۔ وہ میرا ماتھا چُوما کرتی تھیں اور میرے لیے دعائیں
کیا کرتی تھیں۔"

بیگم احمد نے کہا! "بیٹا تمہاری ماں بہت خوش قسمت ہے! کل جب تم

ساری رات جاگنے کے بعد سو رہے تھے تو میں یہ سوچ کر تمہارے پاس بیٹھی رہی کہ
کوئی تمہیں جگا نہ دے پھر ذرا غور سے تمہارا چہرہ دیکھا تو میری نگاہیں تمہاری پیشانی پر
مرکوز ہو کر رہ گئیں۔ میں نے تمہارے ماتھے پہ ہاتھ پھیرا تھا لیکن تم گہری نیند سو رہے
تھے۔ بیٹا! تمہیں وہ بہت یاد آتی ہوں گی"

"جی ہاں بہت زیادہ! ہو سکتا ہے آپ کو میری اس بات پر یقین نہ آئے:
اگر امی جان اچانک اس گاڑی میں آجائیں تو شاید نسرین بھی بدحواس ہو کر
کہے کہ یہ دوسری نانی اماں کہاں سے آگئی ہیں؟

"انشاء اللہ میں انہیں ضرور ملوں گی۔ میں انہیں لدھیانے آنے کی دعوت
دوں گی اور تم سے یہ وعدہ لوں گی کہ تم انہیں لے کر آؤ گے"۔ بیگم احمد نے کہا۔

نسرین بولی "نانی جان! دعوت میری امی جان کی طرف سے ہوگی اور آپ سب
جالندھر آئیں گے۔ جالندھر پہلے آتا ہے اور لدھیانہ بعد میں! اس لیے جب ان کی
امی آئیں گی تو ہم آپ کو بھی جالندھر بلا لیں گے"۔

"ٹھیک ہے بیٹی! شاید تمہارے بھائی یوسف بھی یہ پسند نہ کریں کہ کوئی شہزادی
کو سلام کیے بغیر آگے چلا جائے۔ کیوں یوسف"؟

"آپ درست فرماتی ہیں! ہم گھر سے روانہ ہونے سے پہلے آپ کو لکھ دیں گے
کہ ہم فلاں تاریخ کو جالندھر پہنچ جائیں گے اور اس کے بعد باقی پروگرام آپ کے حکم کے
مطابق طے ہوگا۔ لیکن میں ایک بات سے ڈرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اگر آپ لدھیانہ میں
ہوئیں اور ہم جالندھر پہنچ گئے اور وہاں جا کر ہم نے شہزادی صاحبہ کے گھر دستک دی اور
شہزادی صاحبہ نے باہر نکل کر یہ پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اور یہاں تمہارا
کیا کام ہے؟ تو ہم انہیں اس وقت کیا جواب دیں گے؟"

"واہ جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے"۔ نسرین نے کہا۔

"شہزادیاں اکثر بھول جایا کرتی ہیں"۔

نسرین بولی۔ "آپ اگر کئی سال کے بعد بھی وہاں آئیں تو میں آپ کو دور سے
دیکھ کر پہچان لوں گی"۔

یوسف نے کہا! "آپ کو معلوم نہیں کہ عمر کے ساتھ شکلیں بھی بدل جایا کرتی ہیں"۔

"ہرگز نہیں! آپ کی شکل اتنی نہیں بدل سکتی کہ میں پہچان نہ سکوں اور اگر بدل
بھی جائے تو آپ کی ایک نشانی میں کبھی نہیں بھولوں گی"۔

بیگم احمد نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹی، وہ کیا ہے"۔

"نانی جان! ان کے ماتھے پر آنکھ کے اوپر زخم کا داغ ہے"۔



جیکب آباد کے اسٹیشن پر وہ رات کا کھانا کھا رہے تھے کہ سٹیشن ماسٹر کمرے
میں داخل ہوا اور اس نے پوچھا۔ یہاں بیگم فریدہ احمد کون ہیں؟

"میں ہوں"۔ بیگم فریدہ احمد نے جواب دیا۔

"جناب! مجھے روہڑی کے ریلوے پولیس انسپکٹر اور شکارپور کے سٹیشن ماسٹر کا
ابھی ابھی فون آیا ہے کہ دریا کے بند کا جو حصہ ٹوٹ چکا ہے اس کا مرمت ہونا ناممکن ہے۔
سکھر اور شکارپور کے درمیان قریباً سولہ میل کے علاقے میں بڑی تیزی سے پانی بہہ رہا
ہے۔ ریلوے لائن بھی ٹوٹ گئی ہے اور سڑک کئی کئی فٹ پانی میں ڈوب گئی ہے!
اسٹیشن ماسٹر نے شکارپور میں آپ کے قیام کا انتظام کر دیا ہے اور سرکاری اطلاع
یہ ہے کہ ایک دو دن تک کشتیوں کے ذریعے آمد و رفت شروع ہو جائے گی اگر آپ سفر
جاری رکھنے کا فیصلہ کریں تو اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ پہلے دن ہی آپ کو روانہ
کر دیا جائے۔ لیکن اگر آپ کوئٹہ واپس جانے کا فیصلہ کر لیں تو بہتر یہ ہوگا کہ آپ جیکب آباد
سے ہی پہلی گاڑی پر واپس تشریف لے جائیں"۔

بیگم احمد نے پوچھا"۔ اگر مَیں کوئٹہ واپس چلی جاؤں تو تمہارے خیال میں کتنی دیر تک ریلوے لائن یا سڑک سفر کے قابل ہو جاتے گی ؟"

"بیگم صاحبہ! اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ کام ہفتوں بلکہ مہینوں کا بھی ہو سکتا ہے۔"

بیگم احمد نے کہا"۔ اگر دو چار ہفتے بعد بھی ہمیں کشتی پر ہی سفر کرنا ہے تو ہم کوئٹہ واپس کیوں جائیں؟ مَیں ایک دو دن کے لیے شکار پور کی گرمی برداشت کر لوں گی —— کیوں بیٹا یوسف، تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ماں جی! آپ کا یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ مَیں ہر صورت میں گھر جانا چاہتا ہوں! اگر آپ کوئٹہ لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیتی ہیں تو بھی میں آپ کو وہاں پہنچا کر اگلی گاڑی پر شکار پور کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ جس علاقے میں سیلاب آیا ہے میں نے کار پر کوئٹہ جاتے ہوئے یہ علاقہ دیکھا ہے آپ کو گرمی سے تکلیف ہو گی اور آپ یہ محسوس کریں گی کہ جنگلوں میں سے گزر رہی ہیں۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا"۔ بابو صاحب! آپ شکار پور ٹیلی فون کر دیں کہ ہم کشتیاں روانہ ہونے تک اُن کے پاس ٹھہریں گے اور یہ بھی کہہ دیں کہ اس وقت ہم کھانا کھا چکے ہیں۔ شاید ہمارے متعلق سکھر اور کوئٹہ سے بھی آپ کو فون آئیں۔ مہربانی فرما کر آپ سب کو ہمارے فیصلے کی اطلاع دے دیجیے۔"



رات کے وقت وہ شکار پور کے سٹیشن ماسٹر کے مکان کی چھت پر آرام کر رہے تھے۔ ہوا خلافِ معمول خوشگوار تھی اور وہ جلد ہی گہری نیند سو گئے۔

صبح نسرین کو اُس کی نانی جان نے جھنجوڑ کر جگایا: "بیٹی! اُٹھو! نماز کا وقت

جا رہا ہے"۔ نسرین نے آنکھیں کھول کر یوسف کی کھاٹ خالی دیکھی تو نانی سے پُوچھا۔

"وہ کہاں ہیں نانی جان؟"

"بیٹی! وہ بہت سویرے نماز کے لیے نکل گیا تھا اور اپنا تھیلا اُٹھا کر اُس نے تمہارے سرہانے رکھ دیا تھا اور یہ کہہ گیا تھا کہ اس تھیلے کے اندر کوئی بہت اہم چیز ہے۔ اس لیے جب نسرین بیدار ہو، اُسے تاکید کر دیں کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ نماز کے بعد وہ سیر کے لیے جائے گا اور وہ مقام دیکھ کر آئے گا جہاں تک سیلاب کا پانی پہنچ چکا ہے اور یہ بھی پوچھ کر آئے گا کہ ہمیں کشتی کس جگہ سے ملے گی؟"

نسرین وضو کرنے کے بعد نماز کے لیے کھڑی ہونے لگی تو بیگم احمد نے کہا: "بیٹی! نماز پڑھ کر نیچے آجانا"۔

نسرین نے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو روزمرّہ کی دعا کے ساتھ اُس کی زبان پر چند نئی باتیں آگئیں۔ وُہ کہہ رہی تھی:

"یا اللہ! اس خوفناک سیلاب میں سے گزرتے ہوئے ہمیں ہر مصیبت سے بچائیو۔
یا اللہ! گرمی لگنے سے نانی جان کی صحت خراب نہ ہو۔ جس کشتی پر ہم سوار ہوں۔
اُس کی حفاظت کیجیو اور مگرمچھوں اور پانی کی دوسری بلاؤں کو ہم سے دور رکھیو۔
یا اللہ بھائی یوسف بھی خیریت سے اپنے گھر پہنچ جائیں"۔

میزبان کی بیوی اوپر آئی اور اس نے کہا"۔ بیٹی نیچے آؤ ہم سب ناشتے کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں"۔

نیچے کشادہ کمرے میں میزبان کی بیٹیاں اور دو بیٹے باپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ نسرین نے اپنی نانی سے سوال کیا"۔ نانی جان! بھائی یوسف ابھی تک نہیں آئے؟"

"بیٹی! تم اطمینان سے ناشتہ کرو۔ جب وہ آئے گا تو اس گھر میں اُس کی تواضع تمہاری خواہش کے عین مطابق کی جائے گی"۔

نسرین نے اچانک اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "نانی جان! مَیں ابھی آ تی ہُوں۔" وہ بھاگتی ہوئی زینے کی طرف بڑھی اور پھر چند ثانیے بعد وہ اُسی طرح بھاگتی ہوتی واپس آئی تو اُس کے ہاتھ میں وہ بیگ تھا جو یوسف اس کے سرہانے چھوڑ گیا تھا:

"نانی جان! مَیں یہ بھول گئی تھی اور بھول جانے کی وجہ یہ تھی کہ مَیں نماز پڑھتے ہی نیچے آ گئی تھی۔"

میزبان کی بیوی نے پوچھا۔ "کیا اس تھیلے میں کوئی خاص چیز ہے بیٹی!"

"جی اس میں یوسف بھائی کی چیزیں ہیں جن کے متعلق وہ کہتے تھے کہ مَیں ان کی حفاظت کروں۔"

دُھوپ کافی تیز ہو چکی تھی! یوسف واپس آیا تو نسرین پریشانی کی حالت میں دروازے کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔

وُہ صحن میں داخل ہوا تو نسرین ایک کمرے کی طرف بھاگی۔

"نانی جان! وہ آگئے ہیں" پھر وہ مڑ کر یوسف کی طرف متوجہ ہوئی جو تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔

"آیئے نا، یہاں کیوں کھڑے ہوگئے۔ نانی جان آپ کا انتظار کر رہی ہیں، گھر کے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بہت پریشان تھے وُہ!"

یوسف مسکراتا ہوا داخل ہوا اور اُس نے کہا۔ "ماں جی! وہ جگہ جہاں کشتیاں پہنچنا شروع ہو گئی ہیں یہاں سے کافی دور ہے۔ میں ہر بات کا پتہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ تاکہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ انشاء اللہ! کل ہمیں کشتی مل جائے گی۔

گرمی بہت ہوگی۔ لیکن ہماری کوشش یہی ہونا چاہیے کہ ہم روانگی میں دیر نہ لگائیں۔ یہاں سے کشتی تک پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی چار میل تانگے پر سفر کرنا پڑے گا۔ اس میں سے آخری چار فرلانگ کہیں گھٹنے گھٹنے اور کہیں اس سے بھی زیادہ پانی میں سے گزرنا پڑے گا۔

آپ کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے میں یہ کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے کوئی اچھا تانگہ تلاش کر لیا جائے۔"

"ہاں بیٹا! اس مصیبت سے بچنے کے لیے مَیں تانگے والے کو پانچ روپے انعام بھی دے دوں گی۔"

یوسف نے کہا۔ "ماں جی! مَیں پہلے یہ دیکھوں گا کہ گھوڑا پانی سے نہ ڈرتا ہو۔ پھر پانچ روپے انعام کے لالچ میں تانگے والا آپ کو بالکل کشتی کے قریب پہنچا دے گا۔"

"ہاں بیٹا! گھوڑا ضرور دیکھ لینا، انعام ہم زیادہ بھی دے سکتے ہیں۔ نسرین اس بات سے بہت ڈرتی ہے کہ پانی میں مگرمچھ اسے پکڑ لیں گے!"

نسرین نے پریشان ہو کر کہا۔ "نانی جان! مجھے یہ بتائیں کہ مگرمچھوں سے کون نہیں ڈرتا اور دریائے سندھ کے مگرمچھ تو اور بھی زیادہ خوفناک ہوتے ہوں گے۔ کیوں بھائی جان! آپ نے جس جگہ سیلاب کا پانی دیکھا تھا وہاں مگرمچھ تو نہیں تھے؟"

یوسف بولا! "دیکھو نسرین! دریا میں مگرمچھ تو ہوتے ہیں لیکن وہ اتنے بے وقوف نہیں ہوتے کہ جس طرف سیلاب رُخ کرے اُدھر ہی چل پڑیں۔ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس جگہ سیلاب کا پانی اُتر جائے گا وہاں وہ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ اس لیے جس طرح ہم اپنا شہر یا گاؤں چھوڑنا پسند نہیں کرتے اس طرح مگرمچھ بھی اپنی مستقل رہائش گاہوں سے دُور نکل جانا پسند نہیں کرتے، لیکن یہ سیلاب چونکہ ایسا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا نے اپنا رُخ ہی بدل دیا ہے تو بعض مگرمچھ ایسے بے وقوف ہو سکتے ہیں کہ وہ اس طرف آنکلیں، لیکن آپ کو ان سے نہیں ڈرنا چاہیے۔

نانی جان نے کہا! "اچھا بیٹی جاؤ۔ ان کے ناشتے کی فکر کرو۔ پھر مگرمچھوں کی باتیں کرنا۔"

میزبان کی بیوی نے کمرے میں جھانکتے ہُوئے کہا: "بی بی جی ناشتہ تیار ہے، بَیں

یہیں لے آتی ہوں"۔ تھوڑی دیر بعد یوسف اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا اور نسرین بڑی سنجیدگی کے ساتھ یہ پوچھ رہی تھی کہ "بھائی جان! اُن بے وقوف مگرمچھوں میں سے کوئی مجھے تو نہیں پکڑے گا"

یوسف نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف! خواہ انسان ہو یا مگرمچھ اُس پر کبھی اعتماد تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن مجھے یہ اطمینان ہے کہ کئی میلوں میں پھیل جانے کی وجہ سے دریا کے پانی کی گہرائی اتنی کم ہو گئی ہے کہ انتہائی بے وقوف بلکہ پاگل مگرمچھ بھی اِس طرف نہیں آئے گا"

بھائی جان! جو مگرمچھ بے وقوف ہو سکتے ہیں اور پاگل بھی تو پھر وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہوں گے؟"

یوسف نے جواب دیا "مگرمچھ صرف مگرمچھ ہوتا ہے اور یہ اس کی عادت ہے کہ وہ دریا کے اصل راستے سے دُور جانا پسند نہیں کرتا۔ راوی اور بیاس دونوں ہم سے قریب ہیں اور جب ان میں سے کسی دریا میں بھی سیلاب آتا ہے تو میلوں تک پانی پھیل جاتا ہے لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں سُنا کہ دوسری مچھلیوں کی طرح مگرمچھ بھی دریا سے نکل کر کھیتوں میں آ گئے ہوں اور جس جگہ سے ہم نے کشتی پر سوار ہونا ہے وہاں ڈر کی تو کوئی بات ہے ہی نہیں"۔

نانی اماں نے کہا۔ "ارے بیٹا! جب ہم سیلاب عبور کر لیں گے اور بے وقوف مگرمچھوں کا خطرہ دُور ہو جائے گا تو پھر اس کے قہقہے سننا"۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر نسرین نے اچانک سوال کیا

"آپ نے پہلے کبھی کشتی پر دریا عبور کیا ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "کئی بار!"

"میرا مطلب ہے، سیلاب کی حالت میں؟"

"مَیں نے سیلاب کے دنوں میں تین بار راوی عبور کیا ہے اور ایک بار دریائے بیاس کو عبور کیا ہے۔ مَیں کئی بار دونوں دریاؤں کے آر پار جا چکا ہوں اور مَیں تیر کر بھی دریا عبور کر لیتا ہوں"۔

نانی جان نے پوچھا۔ "بیٹا! دریاؤں پر کس لیے جایا کرتے تھے تم؟"

"ماں جی! شکار کے لیے! پہلے مرغابیوں کا شکار دیکھنے کا شوق تھا۔ اب موقع ملتا ہے تو خود شکار کو چلا جاتا ہوں"۔

"آپ کو دریا سے خوف نہیں آتا؟" نسرین نے پوچھا۔

"بالکل نہیں! مَیں تیرنا جانتا ہوں اور مجھے کشتی کھینا بھی آتا ہے۔ بانس کے ساتھ بھی! اور چپوؤں کے ساتھ بھی!"

نسرین کی نانی نے کہا۔ "بیٹا! اتنا کچھ تم نے کیسے سیکھ لیا تھا؟

یوسف نے جواب دیا۔ "اگر پانی کا خوف اُتر جاتے تو آدمی سب کچھ سیکھ لیتا ہے"۔

"تمہارا مطلب ہے اگر کوئی تیرنا سیکھ لے تو پھر اُسے سب کچھ آ جاتا ہے؟"

"ماں جی! جب آدمی کے دل سے خوف جاتا رہتا ہے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ وہ تیرنا جانتا ہے"۔

"بیٹا! تم نے یہ نئی بات بتائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے تیرنا کسی سے نہیں سیکھا!"

"ماں جی! مجھے اتنا یاد ہے کہ مَیں نہر کے کنارے چار پانچ فٹ گہرے پانی میں ہاتھ پاؤں مارا کرتا تھا۔ اس کے آگے جاتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ ایک دن مَیں بے خیالی میں کھڑا تھا۔ پیچھے سے میرے چچا جان آئے اور انہوں نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ تو مجھے ایک دو غوطے آ گئے۔ پھر میں نے شاید یہی سوچا کہ ڈرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اس لیے مَیں تیرنے لگ گیا اور اس کے بعد سکول میں میرے متعلق مشہور تھا کہ مَیں نہر کو سیدھا

تیر کر عبور کر لیتا ہوں۔"

بیگم احمد نے غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور پھر نسرین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بیٹا! اب مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آیا تو بھی تم نسرین کو ضرور بچا سکو گے۔" نسرین کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اُسے غصہ ظاہر کرنا چاہیئے یا نہیں؟

باب - ۶

اگلے دن دس بجے کے قریب وہ کشتی پر سوار ہو رہے تھے۔ یوسف نے جو تانگہ پسند کیا تھا، اُس کا گھوڑا انہیں کشتی سے کوئی بیس قدم کے فاصلے تک لے آیا تھا باقی راستہ انھیں گھٹنے گھٹنے پانی اور کیچڑ میں پیدل چلنا پڑا۔ سامان اُٹھا کر رکھنے کے لیے ایک قلی اور ایک گھریلو نوکر پہلے سے وہاں پہنچ چکے تھے۔ پانی کی صراحی کے علاوہ ایک تھرماس بھی شکا پور کا میزبان اسٹیشن ماسٹر اپنے گھر سے لے آیا تھا۔ ان کا سامان رکھوانے کے بعد میزبان اسی تانگے پر واپس چلا گیا تھا۔

ایک سفید ریش سکھ جسے ایک نوجوان کشتی تک پہنچانے آیا تھا۔ اُن کا ہم سفر تھا اور وہ بار بار کہہ رہا تھا "بیٹا تم اطمینان سے جاؤ۔ تم میری فکر نہ کرو۔ دھوپ تیز ہو رہی ہے تم جا کر آرام کرو۔"

نوجوان نے بوڑھے ملاّح سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بھئی! یہ میرے باپو جی ہیں۔ ان کا خیال رکھنا۔"

بوڑھے ملاّح نے کہا۔ "جناب! آپ فکر نہ کریں۔"

کشتی بھر چکی تھی اور تنگ چھپر کے اندر سکڑی سمٹی سواریوں کا دم گھٹ رہا تھا لیکن لالچی ملاّح لوگوں کی چیخ پکار کے باوجود مزید سواریاں لادنے پر مُصر تھا۔

یوسف نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور اُس میں سے دو کھجور کے پنکھے نکال کر نسرین کو دیتے ہوئے کہا۔ "نسرین! یہ لو! ماں جی کا گرمی سے بُرا حال ہو رہا ہے" پھر اُس

نے اپنی قمیص اُتار کر ٹی شرٹ پہن لی ۔ اور قمیص بیگ کے اندر ٹھونسنے کے بعد نسرین کی طرف متوجہ ہو کر کہا ۔" نسرین ! اب اس بیگ میں بہت سی اہم چیزیں جمع ہو گئی ہیں ۔ ان سب کی حفاظت آپ کے ذمّے ہے "۔

اچانک اُس کی نگاہ بیگم فریدہ احمد پر پڑی ۔ اُن کا گرمی سے بُرا حال تھا ۔ یوسف نے پانی کی صراحی سے ایک گلاس بھرا ۔ تھرماس سے کچھ برف نکال کر اُس کے اندر ڈالی اور ماں جی کو پیش کرتے ہوئے کہا : لیجیے ، پانی پی لیجیے "! اُس نے پانی قبول کرتے ہوئے کہا ۔

" بیٹا ! میرا دم گھٹ رہا ہے ۔ خدا کے لیے مجھے اس قید خانے سے نکالو "!

" ماں جی ! آپ باہر آجائیں "۔ یوسف نے کہا ۔

وہ لڑکھڑاتی ہوئی اُٹھی اور چھپر سے باہر ایک جگہ بیٹھ گئی ' وہاں اگرچہ دھوپ تھی لیکن کھلی ہوا میں اُس کے چہرے پر تازگی آگئی تھی ۔ ایک اور خاتون اور اُس کا خاوند بھی جو پیچھے بیٹھے ہوتے تھے یہ دیکھ کر آگے بڑھے اور نسرین کی نانی کے قریب آ بیٹھے ۔ بوڑھا سکھ بھی کھسکتا ہوا سامنے دوسرے کونے پر پہنچ گیا ۔

———O———

" تین ملاحوں میں سے ایک جو بانس پکڑے ہوئے تھا چلایا "سب اندر چلے جاؤ ۔ باہر کوئی نہیں بیٹھے گا ۔ جو باہر بیٹھے گا اسے ہم کشتی سے اتار دیں گے "۔

مسافر پیچھے کھسکنے لگے لیکن نسرین اور اس کی نانی جان پریشان سی ہو کر یوسف کی طرف دیکھنے لگیں ۔

ملاح پھر چلایا ۔" او مائی سنتی نہیں ۔ میں کیا کہہ رہا ہوں "؟ اُس نے ابھی اپنا فقرہ پورا ہی کیا تھا کہ یوسف نے آگے بڑھ کر بانس پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کے مُنہ پر

اِتنے زور سے تھپڑ مارا کہ وہ پانی میں جا گرا ۔ لوگ شور مچانے لگے :" دیکھو ابھی کشتی پر فساد نہ کرو ، یہ ڈوب جائے گی "! یوسف نے بلند آواز میں کہا ۔" آپ پریشان نہ ہوں ۔ میں کشتی چلانا جانتا ہوں اور انشاء اللہ اسے اکیلا کنارے لے جاؤں گا ۔ ان ملاحوں کی بدتمیزی برداشت نہیں کی جاسکتی "! پھر وہ بوڑھے ملاح کی طرف متوجہ ہُوا جو کشتی والوں کا لیڈر معلوم ہوتا تھا ۔" تم میری طرف کیا دیکھ رہے ہو ؟ اُٹھو ! بانس پکڑ لو ، ورنہ میں تمہیں اُلٹا لٹکا دوں گا اور سُنو بھائیو ! کسی کے لیے اِس ذلیل چھپر کے اندر بیٹھنا ضروری نہیں ہے ۔ تم اسے توڑ کر نیچے پھینک دو "۔

قوی ہیکل ملاح جو تھپڑ کھا کر پانی میں گرا تھا ، کشتی پر دوبارہ سوار ہو کر سر جھکائے کھڑا تھا ۔

بوڑھے ملاح نے کہا ۔" بے وقوف کے بچے ! تم سب کا بیڑا غرق کرو گے "۔ اور پھر وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہُوا ۔

دیکھو بھائیو ! آپ اطمینان سے باہر نکل کر ہوا کھا سکتے ہیں ۔ لیکن یہ صرف ایک کشتی ہی نہیں ہمارا گھر بھی ہے ۔ خدا کے لیے اس کی چھت کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں ۔ میں آپ سے معافی مانگتا ہوں "۔

ایک ثانیے کے اندر ساری فضا بدل گئی ۔ بوڑھے سکھ نے کہا ۔" او کاکا ! بھگوان تیرا بھلا کرے ذرا میرا ہاتھ پکڑ کر سہارا دینا "۔ یوسف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُس نے کشتی سے نیچے لٹک کر پانی میں غوطہ لگا دیا ۔ پھر کئی لوگ باری باری کشتی سے اُتر اُتر کر پانی میں نہا رہے تھے ۔

———O———

ایک جگہ کشتی گھنے درختوں میں سے گذر رہی تھی ۔ کہ اچانک یوسف نے دیکھا کہ ایک درخت پر سانپ لٹک رہا ہے ۔ اُس نے پھر بوڑھے ملاح کی طرف

متوجہ ہوکر کہا۔ "دیکھو! یا تو تم راستہ بھول گئے ہو، یا جان بوجھ کر کشتی کو غلط راستے پر لیے جا رہے ہو۔ اس کشتی کو اس جگہ پر رہنا چاہیے جہاں سے سڑک گذرتی ہے"۔

"جناب! اس طرح راستہ لمبا ہو جائے گا"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ کشتی کو درختوں سے دُور رکھنا کیوں ضروری ہے۔ سُنو! اگر اب کشتی سڑک سے اِدھر اُدھر ہوئی تو مَیں چھپر کو آگ لگا دوں گا۔ آگے پانی اِتنا کم ہے کہ ہم پیدل چل کر جا سکیں گے"۔

بوڑھے ملّاح نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "او! بے وقوفو! اپنا بیڑا کیوں غرق کرواتے ہو۔ جس طرح یہ کہتے ہیں اُسی طرح کرو"۔

غروبِ آفتاب کے قریب کشتی دوسرے کنارے پر پہنچ چکی تھی اور محمود علی اپنے نوکروں سمیت اُن کے استقبال کو پہنچ چکا تھا۔

نسرین کی نانی نے کہا۔ "یوسف بیٹا! مجھے کشتی سے اتارنے سے پہلے اس صراحی میں جتنا پانی ہے وہ میرے سر پر ڈال دو"۔

سِکھ نے کہا۔ "بی بی جی! آپ کا بیٹا بڑا ہونہار ہے۔ میں ہمیشہ اسے دعائیں دیا کروں گا۔ پھر وہ یوسف سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا! لیکن بیٹا جی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ کشتی کو سڑک کے اُوپر سے لے جانے میں بھلا کیا حکمت تھی؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "باباجی! جو سانپ سیلاب میں بہتے ہوئے آتے تھے۔ وہ درختوں پر پناہ لے چکے تھے"۔ ایک عورت نے بلند آواز سے کہا۔ "ہائے مَیں مرگئی۔ مَیں بھی سوچ رہی تھی کہ کوئی بہت بڑی بات ہوگی۔ جس کے لیے بھائی صاحب کو اتنا غصّہ آرہا ہے"۔ اور نسرین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔



نسرین کی نانی نے پوچھا۔ "بیٹا! تم نے اپنی آنکھوں سے کوئی سانپ دیکھا تھا؟"

جی ہاں"۔ یوسف نے جواب دیا۔

"بہت بڑا ہوگا وُہ!" بیگم فریدہ احمد نے فکرمند ہوکر کہا۔

"بڑا نہیں تھا، لیکن اِس علاقے کا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے"۔

"بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ تمہیں خطرے کا احساس ہوگیا ورنہ اِن درختوں سے کئی خطرناک سانپ ہماری کشتی پر ٹوٹ پڑتے"۔

"ہاں جی! یہ ہوسکتا تھا کہ کسی جگہ گھنے درختوں میں کشتی رُک جاتی اور کوئی سانپ کسی شاخ سے اُتر کر کشتی پر آجاتا۔ ورنہ سیلاب کے باعث جانور بھی بہت سہمے ہوئے تھے۔ جو گاؤں سیلاب میں ڈوب گئے ہیں۔ اُن کے آس پاس جنگلوں سے ہر قسم کے جانور پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ سانپوں کے لیے درختوں کے سوا کوئی جگہ نہ تھی"۔

نسرین بولی "وہ جانور جو درختوں پر چڑھنا نہیں جانتے۔ سب ڈوب گئے ہوں گے"۔

یوسف مسکرایا اور نسرین نے فوراً اپنے الفاظ پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجیے۔ مَیں بھول گئی تھی کہ سب جانوروں کو تیرنا آتا ہے"۔

تھوڑی دیر بعد وہ تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔

بیگم فریدہ احمد نے محمود علی سے یوسف کا تعارف کراتے ہوئے کہا: محمود! یہ میرا بہادر بیٹا یوسف ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ ہمارے ساتھ تھا۔ ورنہ خدا معلوم ہم پر کیا گذرتی؟"

نسرین نے کہا۔ "پھوپھا جان! مَیں بتاؤں بھائی یوسف نے کیا کیا تھا: کشتی کے ملّاح بڑے ظالم تھے۔ ایک تو کوئی دیو معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں تھیں اُس کی۔ نانی جان گرمی سے بے ہوش ہو رہی تھیں۔ یوسف بھائی نے کہا۔ "ہاں جی! آپ چھپر سے باہر ہوا میں آجائیں۔ نانی جان باہر نکلیں ..... مَیں بھی اِن کے ساتھ تھی۔ پھر بہت سے لوگ چھت سے باہر نکل آئے۔ اُس بدصورت ملّاح نے سب کو ڈانٹا اور وہ خوف زدہ ہوکر چھت کے نیچے

دوبارہ چلے گئے۔ جہاں گرمی میں دم گھٹ رہا تھا۔ جب اُس نے نانی جان کو بھی ڈانٹنے
کی کوشش کی تو یوسف بھائی جان نے اِتنے زور سے ——— اِتنے زور سے اُس کے
منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ پانی میں گر پڑا"۔

نانی بولی "بس اب چپ ہو جاؤ باقی کہانی گھر جا کر سنا دینا"۔

محمود علی نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا بہت شکرگذار
ہوں اور اگر نیک شہرت آپ کی نیکی کا صلہ ثابت ہو سکے تو میں آپ کو یہ یقین دلاتا
ہوں کہ اگر تم نسرین کے ساتھ جالندھر تک جا رہے ہو تو وہاں پہنچتے پہنچتے کافی مشہور ہو
جاؤ گے!

ویسے ابھی تو یہ ابتداء ہوئی ہے۔ نسرین ہمارے گھر پہنچ کر جب لڑکیوں کو اپنے سفر کے
حالات سنائے گی تو یہ داستان بہت دلچسپ ہو گی اور جالندھر تک پہنچتے پہنچتے سفر
کے یہ واقعات الف لیلہ کی داستان بن جائیں گے"۔

یوسف نے کچھ دیر سوچ کر کہا۔ "ہمارے راستے اوّل تو لاہور ہی سے جدا ہو جائیں
گے۔ ورنہ یہ ہو سکتا ہے کہ امرتسر تک ہم ایک ہی گاڑی میں جائیں۔ جہاں سے بہرحال
مجھے گاڑی تبدیل کرنی پڑے گی"۔

بیگم فریدہ احمد نے کہا۔ "نہیں بیٹا! تم جالندھر تک ہمارے ساتھ جاؤ گے، دو چار
دن وہاں ٹھہرو گے! میرا مطلب ہے کہ جالندھر میں تمہاری میزبان نسرین ہو گی اور میں بھی
تمہارے قیام کے دوران اِسی کے والدین کے پاس رہوں گی"۔

نسرین نے جلدی سے کہا۔ "نانی جان! یہ وہاں ضرور جائیں گے"۔

یوسف نے کچھ سوچ کر کہا۔ "ہاں جی! میں پھر کسی وقت حاضر ہو جاؤں گا اور جب
تک نسرین خود سے یہ نہیں کہے گی کہ اب تم جا سکتے ہو۔ میں وہیں ٹھہروں گا"۔

نسرین نے نانی سے لپٹ کر اُن کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولی "بیٹا نسرین کہتی ہے!

"کہ میں تو کبھی یہ نہیں کہوں گی کہ آپ واپس جا سکتے ہیں! لیکن اگر آپ آج سیدھے
ہمارے گھر چلیں تو میں پہنچتے ہی آپ سے کہہ دوں گی کہ آپ جس وقت چاہیں
واپس جا سکتے ہیں"۔

یوسف بولا! "میں نے چچا جان کو خط لکھ دیا تھا، گاؤں سے کئی لوگ مجھے
ریلوے اسٹیشن پر لینے آئیں گے۔ اگر میں نہ پہنچا تو امی جان سخت پریشان ہوں گی
اور گاؤں کے لوگوں کو بھی بڑی اذیت ہو گی اور دادی جان کی تو یہ حالت ہو گی کہ وہ ہر
گاڑی پر مجھے تلاش کرنے کے لیے دن رات کوئی نہ کوئی آدمی بھیجا کریں گی"۔

بیگم فریدہ نے کہا "بیٹا! اگر امی جان اور دادی جان کے انتظار کا مسئلہ ہے تو تمہیں
ایک منٹ کے لیے بھی راستے میں نہیں رکنا چاہیے"۔

"کیوں نسرین؟"

نسرین نے پھر نانی سے لپٹ کر کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کچھ کہا۔

بیگم فریدہ نے کہا۔ "بیٹا نسرین کہتی ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں روٹھ نہ جاؤں تو تمہیں
اپنی امی جان سے اجازت لے کر بہت جلد ہمارے گھر آنا چاہیے۔ ہاں نسرین یہ بھی کہتی ہے کہ
وہ آپ کو اپنا ایڈریس لکھ دے گی"۔

یوسف نے کہا: "یہ بہت ضروری ہے! اپنے پھوپھا کے گھر پہنچتے ہی میرے تھیلے
سے میری نوٹ بک نکال لیجئے یا میری کتابوں میں سے کسی کتاب کے شروع میں اپنے اباجی کا نام اور
گھر کا پورا پتہ لکھ دیجیے"۔

"واہ جی اپنے گھر کا ایڈریس بھی کوئی ادھورا لکھ سکتا ہے؟"

محمود علی نے کہا "نسرین بیٹی بہت ہوشیار ہے، اس کے جو خط ہمارے گھر آتے ہیں۔
وہ پڑھ کر کسی کو یقین نہیں آتا کہ جو بچی چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے وہ ایسے عمدہ مضامین
لکھ سکتی ہے"۔

اگلی صبح یوسف نماز ادا کرنے کے بعد دوبارہ بستر پر لیٹ گیا اور خلافِ معمول گہری نیند سو گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو چند عورتیں اور لڑکے اُس کے گرد جمع تھے اور نسرین اُن سے اُس کی بہادری کے قصّے بیان کر رہی تھی۔ اُس نے پل بھر کے لیے آنکھیں کھولیں پھر شرما کر جلدی سے بند کر لیں۔ خاتون خانہ نے کمرے میں داخل ہو کر کہا "بھئی! شور نہ مچاؤ۔ ہمارا مہمان بہت تھکا ہُوا ہے۔" دوسری عورت بولی۔ "بہن یہ شیر معلوم ہوتا ہے خدا اِسے نظرِ بد سے بچائے۔ چلو لڑکیو! اِسے آرام کرنے دو۔"

نسرین نے کہا۔ "آنٹی یہ تو اُس وقت دیکھنے والے تھے جب انہوں نے دیو جیسے ملّاح کو تھپڑ مار کر پانی میں گرا دیا تھا۔"

نسرین کشتی کے واقعات کی ایک ایک تفصیل دہرا رہی تھی۔

نانی جان اچانک کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں "باتونی لڑکی! اب چُپ کرو اور انہیں جگا کر ناشتے کا پوچھ لو۔" یوسف نے اسے امدادِ غیبی سمجھ کر کہا۔ "ہاں جی! میں جاگ رہا ہوں۔"

"اچھّا بیٹا!" خاتونِ خانہ نے کہا۔ "میں آپ کا ناشتہ لاتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اطمینان سے ناشتہ کر رہا تھا اور نسرین اُس کے بیگ سے نوٹ بُک نکال کر اپنا ایڈریس لکھ رہی تھی۔ ایڈریس لکھنے کے بعد اُس نے یوسف کو دکھاتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ پڑھ لیں گے نا؟"

"ارے! تمہاری ہینڈ رائیٹنگ تو واقعی بڑی خوب صُورت ہے، نوٹ بُک اُسی طرح بیگ میں رکھ دو اور یاد رکھو: جب تک ہمارے راستے جُدا نہیں ہوتے، اُس کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے۔"

نسرین کی نانی نے کہا۔

"بیٹا آج تم خوب آرام کر سکتے ہو۔ محمود علی کہہ گیا تھا کہ گاڑی جس پر ہمیں آسانی سے جگہ مل سکے گی رات بارہ بجے کے بعد روانہ ہو گی۔ انٹر کلاس کی جو بوگی روہڑی سے ٹرین کے ساتھ لگتی ہے وہ بعض اوقات خالی جاتی ہے اور سیکنڈ کلاس کے ڈبّے سے بھی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ ریل گاڑی دیکھ کر اسٹیشن سے ضرورت کے مطابق ٹکٹ تبدیل کروائے جا سکتے ہیں۔"

باب ـ ۷

رات انہوں نے کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر سکھر بیراج کی سیر کی اور پھر تانگے پر دوہڑی سٹیشن پہنچ گئے اور ایک آدھ گھنٹہ پہلے کراچی سے آنے والی ایکسپریس کے ساتھ لگنے والے انٹرکلاس ڈبے میں چلے گئے ۔ وہاں وُہ عمر رسیدہ سکھ جسے انہوں نے کشتی میں دیکھا تھا پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا ۔ اُس نے یوسف کو دیکھتے ہی کہا :

"کل مجھے گاڑی نہ ملنے کا افسوس تھا، لیکن اب میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں ۔ تُم مجھے بہت یاد آتے رہے ہو ۔ میں سوچتا تھا کہ اگر میں نے تمہارا ایڈریس پوچھ لیا ہوتا تو کسی دن تمہارے بزرگوں کو سلام کرتا ۔" پھر عمر رسیدہ خاتون کی طرف متوجہ ہوُا ۔

"بی بی جی سلام! یوسف صاحب آپ کے رشتے میں کیا لگتے ہیں ؟"

" بھائی جی! انسے میرا بیٹا سمجھ لیں ۔"

"بی بی جی! وہ تو مَیں سمجھ گیا ہوں ۔ ایسا لڑکا ہر ماں کا بیٹا اور ہر بہن کا بھائی ہوتا ہے ۔ آپ اس طرف آرام سے لیٹ جائیں ۔ بابو کہتا تھا کہ اس گاڑی پر نئی سواریاں آنے کی امید نہیں ۔ آپ اس طرف کی دونوں سیٹوں پر قبضہ کرلیں ۔

کاکا جی! تم میرے پاس اس سیٹ پر آجاؤ اگر کوئی سواری آئی تو ہم اُسے یہاں بٹھالیں گے ۔"

جب گاڑی روانہ ہوئی تو نسرین آہستہ آہستہ اپنی نانی سے باتیں کر رہی تھی ۔

" نانی جان! ایک کہانی ہوتی ہے دوسرا افسانہ ہوتا ہے اور اگر زیادہ کہانیاں جمع ہوجائیں

تو ناول بن جاتا ہے ۔ یعنی یہ ایک افسانہ تھا کہ یوسف بھائی کے کشتی پر سوار ہوتے ہی ایک ملاح کی شامت آگئی تھی ۔ نانی جان جب ہم سیلاب سے نکل آئے تھے تو یہ افسانہ ختم ہوگیا تھا لیکن نانی جان! جالندھر ابھی بہت دُور ہے ۔"

بیگم احمد نے جھنجھلا کر کہا ۔" با تونی لڑکی! میری سمجھ میں تمہاری کوئی بات نہیں آتی ۔"

" نانی جان! خدا کے لیے آہستہ بات کریں ۔ وُہ سن لیں گے تو کیا کہیں گے ۔"

" اری کیا سُن لیں گے وہ!"

نانی جان! مَیں یہ کہنا چاہتی ہوں ۔ اگر اسی قسم کے ایک دو واقعات اور پیش آجائیں، فرض کرو کوئی خوف ناک ڈاکو ہمارے ڈبے میں گھس آئے اور بھائی یوسف پھر ڈاکو کے ساتھ وہی سلوک کریں جو اس دن دیو قسم کے ملاح کے ساتھ کیا تھا یعنی : یہ اُسے اُٹھا کر گاڑی کے باہر پھینک دیں تو کیا یہ کوئی ناول نہیں بن جائے گا ؟"

نانی نے کہا ۔" میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔ اس وقت سو جاؤ ۔ مَیں صبح یوسف سے تمہارے سوال کا جواب پوچھ دوں گی ۔"



صبح کی نماز کے وقت یوسف گہری نیند سے بیدار ہوا ۔ ریل گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی ۔ اُس نے نیچے اُتر کر پلیٹ فارم پر وضو کیا اور نماز سے فارغ ہوکر اپنے کمپارٹمنٹ میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک آدمی اور اُس کے ساتھ تین عورتیں اپنا سامان اٹھائے اندر داخل ہو رہے ہیں اور بوڑھا سکھ اُن سے کہہ رہا ہے :" بھئی دیکھو! یہ انٹر کلاس کا ڈبہ ہے ۔"

جس آدمی سے وہ مخاطب تھا ۔ اُس کا رنگ گہرا سیاہی مائل تھا اور شکل بھی اُس کی کافی کریہہ تھی ۔ وہ بوڑھے سکھ کو یوں جواب دینے لگا :" بابا! تم تو اس طرح بات کرتے ہو جیسے یہ گاڑی تمہارے باپ دادا کی ملکیت ہو ۔ ہمارے پاس انٹر کلاس کا سرکاری

پاس ہے اور کوئی ہمیں اس ڈبے میں سفر کرنے سے نہیں روک سکتا۔ اگر یقین نہیں آتا۔ تو ٹکٹ چیکر کو بلا کر پوچھ لو۔ میں ریلوے کو بیکانیر سے لیبر سپلائی کرتا ہوں اور مجھے ایک افسر کے حقوق حاصل ہیں۔"

اتنی دیر میں دو اور آدمی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا "اچھا ٹھیکیدار جی! اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر کر دی جائے۔"

ٹھیکیدار نے کہا "نہیں تم جاؤ۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں! ویسے ان کو یہ شک ہے کہ ہم انٹر کلاس میں سفر نہیں کر سکتے اس لیے گارڈ کو یہاں بھیج دینا!"

اُس نے اپنا پاندان اور ایک بکس نسرین کے پاؤں کی طرف رکھ دیا اور وہ جلدی سے اُٹھ کر اپنی نانی کے پاس بیٹھ گئی۔

سکھ نے کہا "او بھئی ٹھیکیدار تم اِس طرف آجاؤ۔ میں نے پہچان لیا کہ تم ایک باگڑی ہو۔"

باگڑی نے بے اعتنائی سے مڑ کر سکھ کی طرف دیکھا اور اپنی عورتوں کے ساتھ ایک سرے پر بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی نسرین اور کبھی اس کی نانی کی طرف دیکھ رہا تھا اور انہوں نے نفرت سے اپنے سر کھڑکی میں سے باہر نکال رکھے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک عورت اپنی جگہ سے اُٹھ کر نسرین اور اُس کی نانی کے پاس آبیٹھی۔ پھر اُس نے پاؤں اُٹھا کر سیٹ پر رکھ لیے۔ نسرین نے دیکھا کہ اُس کے پاؤں میں چاندی کے دو یا تین موٹے موٹے کڑے پڑے ہوئے ہیں جو اُس کی کلائیوں کی طرح موٹے تھے! یہی حال دوسری عورتوں کا تھا۔

یوسف ناول پڑھنے میں مشغول تھا پھر بھی کبھی کبھی وہ اُن کی حرکات دیکھ لیتا تھا۔ اگلے سٹیشن پر اُس نے اُٹھ کر پوچھا:

"ماں جی! آپ کے لیے ناشتہ لاؤں؟"

"ہاں بیٹا! منگوا لو۔ نسرین کو بھوک لگ رہی ہو گی۔"

یوسف باہر نکل گیا۔ جب بیرا ناشتہ لے کر آیا۔ اُس نے باگڑی عورت سے کہا: "انہوں نے ناشتہ کرنا ہے۔ اس لیے آپ درمیان سے ایک طرف ہٹ جائیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی اور دروازے کے پاس بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد یوسف نے چائے پینے کے بعد اپنے تھیلے سے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے میں مشغول ہو گیا! اچانک اُس کی نظر دوسری طرف جا پڑی: نسرین سراسیمگی کی حالت میں اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اور اپنی موٹی سی باگڑی عورت کی بجائے ٹھیکیدار خود وہاں بیٹھا ہوا تھا۔

ایک ثانیے کے لیے یوسف کا سارا خون سمٹ کر اُس کے چہرے پر آگیا۔ اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر نسرین کی طرف دیکھا اور اُس نے اپنے دوپٹے کا وہ حصہ جس پر پان کی پیک کا داغ لگا ہوا تھا سامنے کر دیا۔

"او باگڑی کے بچے! تمہیں ہر جگہ گندگی پھیلاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔" اُس نے غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

باگڑی نے جواب دیا "تمہیں غصہ کس بات پر آرہا ہے بابو! میں نے کھڑکی سے باہر تھوکا تھا لیکن ہوا کے زور سے اِس لڑکی کے باہر لٹکے ہوئے دوپٹے کا سرا تھوک کے سامنے آگیا تھا۔"

یوسف چلّایا "یہاں سے اُٹھو جلدی کرو۔"

باگڑی نے کہا: "یہ گاڑی کسی کے باپ ......

اور ابھی اُس نے اپنا فقرہ پورا نہ کیا تھا کہ ایک زوردار طمانچے کی آواز سنائی دی۔

یوسف نے اُسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا اور پھر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ سیدھا بیت الخلا میں جاگرا۔ کمپارٹمنٹ کے اندر جو اچانک ایک سکوت طاری ہُوا تھا اُس میں پہلی آواز بوڑھے سکھ کی سُنائی دی:

"کاکا جی! آپ اِدھر آجاؤ! مَیں نے اِس باگڑی کی شکل دیکھتے ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ اُس ملاح سے زیادہ ہی بے وقوف ہے۔"

نسرین نے کہا۔ "نانی جان! مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ قصّہ اب ناول سے بھی زیادہ طویل ہو جاتے۔ یقیناً، یہ تو اُن بھوتوں میں سے ایک ہے جن کے قصے سُنا کر آپ مجھے ڈرایا کرتی تھیں۔"

باگڑی عورتیں جو ایک ثانیے کے لیے سہم کر رہ گئی تھیں یکایک گالیاں دینے لگیں اور ان گالیوں کا ہدف یوسف سے زیادہ نسرین اور اس کی نانی تھیں جو الفاظ یوسف کی سمجھ میں آسکتے تھے وُہ ناقابلِ برداشت تھے۔ اُسے ایسی عورتوں سے لڑنے کا کوئی طریقہ معلوم نہ تھا۔ وہ غصّے اور بے بسی کی حالت میں اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

نسرین کی نانی باہر دیکھ رہی تھی اور نسرین اُس کی گود میں منہ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بوڑھے سِکھ نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں بیٹا! آخر لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں نا؟"

"باباجی!" یوسف نے بے چارگی کی حالت میں کہا:

"اگر انہوں نے زبان بند نہ کی تو مَیں انھیں گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔"

"واہ کاکا جی" سکھ نے کہا "اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اپنی جان خطرے میں یُوں ڈالو گے؟"

یوسف نے کہا: "باباجی! میرے ذہن میں تو یہی آتا ہے کہ انھیں گاڑی سے اُٹھا کر باہر پھینک دوں یا خود گاڑی سے چھلانگ لگا دوں۔"

"ذرا اپنا کان میرے قریب کرو۔"

یوسف نے فوراً اُس کے حکم کی تعمیل کی۔ سکھ نے کہا: "ان عورتوں کی زبان کی کُنجی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ ذرا کُنجی گھماؤ۔ یہ عورتیں خاموش ہو جائیں گی۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ جو مزے سے بیت الخلائے سے سر نکال کر اپنی عورتوں کی کارگزاری دیکھ رہا ہے۔ اُسے پکڑ لو۔ وہی کُنجی ہے۔ جب وہ دہائی دے گا یہ خاموش ہو جائیں گی۔"

یوسف اطمینان سے آگے بڑھا۔ اُس نے ٹھیکیدار کو چوٹی سے پکڑ کر اٹھایا، ساتھ ہی اسے سکھ کی آواز سنائی دی۔

"او کاکا! ہوشیار ہو جاؤ! اس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔"

یوسف نے جلدی سے ایک طرف ہٹ کر اُس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن چاقو کی نوک اُس کے بازو کو زخمی کرتے ہوئے نیچے پھسل گئی۔

جواب میں یوسف نے یکے بعد دیگرے چند بھرپور مکّے رسید کر دیے اور وہ نیچے گر پڑا۔ یوسف نے پھر اسے اُٹھایا اور آنکھ جھپکنے کی دیر میں باگڑی کی ٹانگیں گاڑی کے اندر تھیں اور جسم کھڑکی کے باہر تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "اگر اب میں نے کسی عورت کی آواز سُنی، تو تمہیں کھڑکی کے باہر پھینک دوں گا۔"

باگڑی چلّایا: "اری کم بختو! تم میری جان لے کر ہی چھوڑو گی۔ بھگوان کے لئے چُپ ہو جاؤ۔"

عورتیں جو پہلے ہی یوسف کی خون آلود قمیص دیکھ کر سہمی ہوئی تھیں ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"یوسف تم فوراً اِدھر آؤ"۔ نسرین کی نانی نے جلدی جلدی اپنی گٹھڑی سے ایک دوپٹہ نکالتے ہوئے کہا۔

بوڑھے سکھ نے اُٹھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "مجھے چار انگل چوڑی پٹی پھاڑ دیں۔ ابھی زخم کس کر باندھنے سے خون بند ہو جائے گا۔ اور سٹیشن پر پہنچتے ہی ہم ڈاکٹر کو بلا لیں گے"

نسرین کی نانی نے پریشانی کے عالم میں دوپٹے سے ایک طرف کپڑا اتارنے کی بجائے لمبے رُخ پٹی پھاڑ دی۔

سکھ نے پٹی پکڑتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے یوسف کا بازو پکڑا اور کہا "کاکا جی! آپ اُدھر میری کھڑکی کے قریب آجائیے! مَیں اطمینان سے پٹی باندھ لوں گا تو ڈاکٹر کی بھی ضرورت نہیں رہے گی"

سکھ نے یہ کہہ کر سیٹ کے نیچے سے اپنا بیگ نکالا۔ اُس میں سے ایک بوتل نکالی۔ پھر پٹی کا ایک ٹکڑا اتار کر بوتل کے سیال مادہ سے تر کرتے ہوئے کہا "یہ قیمتی تحفہ میرے بیٹے نے دیا۔ میرا خیال تھا کہ کسی خاص آدمی کو پیش کروں گا! آپ کو تھوڑی سی تکلیف تو ضرور ہو گی۔ لیکن اس موسم میں اتنے گندے چاقو کے زخم کو کسی ایسی چیز سے ہی صاف کیا جا سکتا ہے"

کمرے میں بدبُو پھیل چکی تھی اور یوسف کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ سردار جی کی قیمتی شئے کیا ہے؟

یوسف نے اپنے چہرے سے تکلیف ظاہر نہ ہونے دی اور باگڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"مَیں نہیں چاہتا کہ اس سفر میں میرے ہاتھ تم جیسے بدصورت آدمی کے خون سے رنگے جائیں اِس لیے اپنا سامان اٹھا کر دروازے میں رکھ لو اور جونہی اگلا اسٹیشن آئے، اس کمپارٹمنٹ سے دفع ہو جاؤ"

اور دیکھو! پھر وہ بولا: "تمہاری عورتیں جو گندی زبان استعمال کرتی رہی ہیں۔ اس کی سزا یہ ہے کہ اس معصوم بچّی اور ماں جی دونوں سے معافی مانگو ورنہ میں ایک منٹ سوچے بغیر ان چڑیلوں کو ایک ایک کر کے چلتی گاڑی سے نیچے پھینک دوں گا"

باگڑی چلایا۔ "میری طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتی ہو، ماں جی کے پاؤں پکڑ لو"۔ وُہ آگے بڑھ کر بیگم احمد اور کبھی نسرین کے آگے ہاتھ جوڑنے لگیں۔ "ماں جی! ہمیں معاف کر دو۔ ہم سے غلطی ہو گئی، ہم ایسا کبھی نہیں کریں گی"

اگلے اسٹیشن کے آثار نظر آنے لگے۔ تو یوسف نے کہا۔ "بس! اب چپکے سے اُتر جاؤ۔ ہمیں تنگ نہ کرو"

اور وُہ لوگ گاڑی رکتے ہی ایک منٹ کے اندر اندر اپنے ساز و سامان سمیت غائب ہو گئے۔



بوڑھے سکھ نے کہا۔ "بی بی جی میں ڈاکٹر کا پتہ کرتا ہوں"۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا تو بیگم احمد نے پوچھا: "کیوں بابا جی! ڈاکٹر نہیں ملا؟"

"بہن جی! میں نے اگلے اسٹیشن پر پیغام بھیج دیا ہے۔ ڈاکٹر وہاں موجود ہو گا"

بوڑھے سکھ نے کہا۔ "یوسف میں بی بی جی کو محض اطمینان دلانا چاہتا ہوں۔ ورنہ ڈاکٹر بھی دیکھے گا تو شاید پٹی بدلنے کی ضرورت محسوس نہ کرے گا۔ علاج میرے پاس موجود تھا۔ لیکن بہن جی کو بتاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ اچھا! اب گاڑی چلنے والی ہے۔ اگلے اسٹیشن پر میں ڈاکٹر کو لے کر یہیں آجاؤں گا"

جب بوڑھا سکھ اطمینان سے بیٹھ گیا تو یوسف نے کہا۔ "بابا جی! مَیں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔ سکھ مسکرایا، "شکر گذار تو مجھے ہونا چاہیے جو تمہاری وجہ سے ایک چھوٹے سے کام کے لیے زندہ رہا۔ ورنہ اگر کشتی پر تم نہ ہوتے تو مَیں نے یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ

شاید . . . . . . میری زندگی کا سفر ختم ہو گیا ہے"۔

اگلے سٹیشن پر ڈاکٹر کمپاؤنڈر اور سٹیشن ماسٹر تینوں اس کے ڈبے میں پہنچ گئے۔ باہر پولیس کا ایک تھانیدار اور پولیس مین ریلوے سٹیشن پر کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے پٹی کھول کر زخم دیکھا اور مطمئن ہو کر کہا۔" زخم صاف کر کے دوبارہ پٹی کر دیتا ہوں۔ ٹانکے لگانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ احتیاطاً ایک ٹیکہ بھی لگا دیتا ہوں۔ یہ زخم بہت جلد مندمل ہو جائے گا۔ آپ کو چند گولیاں بھی دے جاتا ہوں"۔

بوڑھے سکھ نے کہا۔" ہاں ڈاکٹر صاحب بھگوان آپ کا بھلا کرے ٹیکہ ضرور لگا دیجیے۔ زخمی کرنے والا بہت گندا تھا"۔

تھانیدار نے اندر گھستے ہوئے کہا"۔ پرچہ کون لکھوائے گا اور ملزم کہاں ہے؟"

سکھ نے کہا۔" تھانیدار جی! آپ بہت دیر سے آتے ہیں اب تو کوئی نجومی ہی بتا سکتا ہے کہ ملزم کہاں ملے گا؟"

آپ اپنی رپورٹ میں لکھ سکتے ہیں کہ ملزم نے بھاگنے سے پہلے جرم کی معافی مانگ لی تھی"۔

تھانیدار نے سوال کیا! کس سے معافی مانگی تھی؟

"ہم سے جناب!"

تھانیدار نے جھنجھلا کر کہا۔" یہ کیا بات ہوئی؟" زخم کسی کو آتا ہے اور معاف دوسرے کرتے ہیں"۔

سکھ نے کہا: "تھانیدار جی! آپ تلخی سے بات نہ کریں۔ یہاں کا کا جی کی ماں جی بھی بیٹھی ہوئی ہیں"۔

"کا کا جی کون ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"یہی جس نے اُس پاگل ٹھیکیدار کو اُس کی بدزبانی کی سزا دی تھی"۔

"سردار جی! آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ پاگل ٹھیکیدار کون؟"

"جی پاگل ٹھیکیدار وہی تھا جس نے کا کا جی کو زخمی کیا تھا۔

پھر مار بھی کھائی، تو یہ بھی کی اور بھاگ بھی گیا"۔

"آپ کا مطلب ہے کہ اُسی نے چاقو مارا تھا"۔

"تھانیدار جی! مَیں شروع سے یہی کہہ رہا ہوں۔ اب تو شاید وہ واپس بیکانیر جا چکا ہو گا"۔

تھانیدار نے دوبارہ سوال کیا۔" سردار جی! آپ سیدھی طرح کوئی بات نہیں بتا سکتے"۔

"تھانیدار جی! اگر مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ بیکانیر کا رہنے والا ہے تو مَیں اس کے سوا کیا سوچ سکتا ہوں کہ وہ واپس بیکانیر چلا گیا ہو گا"۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بیکانیر کا رہنے والا ہے"۔

"جناب! وہ خود ہی تو یہ کہتا تھا اور راستے میں جو لوگ اُس سے ملنے آتے تھے "ٹھیکیدار جی" کہہ کر اُسے سلام کرتے تھے! وہ بیکانیر کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ تین عورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ جن میں سے ہر ایک نے کم از کم ایک ایک سیر چاندی پہن رکھی تھی۔ وہ بھی اپنے لباس سے باگڑی عورتیں معلوم ہوتی تھیں اب مَیں اگر کوئی پولیس کا چھوٹا موٹا افسر ہوتا تو شاید میرا دماغ سیدھے طریقے سے نہ سوچتا اور مَیں یہ سمجھتا کہ یہ لوگ کسی اور علاقے کے باشندے ہیں اور مجھے میری آنکھیں دھوکا دے دیتیں"۔

اِس پر سب ہنس پڑے اور تھانیدار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "سردار جی! آپ میری عمر کے ہیں اور مَیں آپ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دے سکتا"۔

سکھ نے ہنستے ہوئے کہا۔" تھانیدار جی! جواب دینے کے لیے یہ جگہ ٹھیک بھی نہیں"۔ یہ چھوٹا سا شہر ہے ناں! مَیں اس کے ساتھ بڑی دور سے سفر کر رہا ہوں اور مَیں دو بار یہ دیکھ چکا ہوں کہ جب کوئی بدتمیزی سے گفتگو کرتا ہے۔ تو بڑی تیزی سے اس کے ہاتھ حرکت میں آ جاتے ہیں۔ آپ کو مَیں یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ مجرم جس نے اِس پر چاقو سے حملہ کیا تھا، ریلوے کے سرکاری پاس پر سفر کر رہا تھا۔ زیادہ پان کھانے سے اُس کے دانت سیاہ

ہو چکے تھے اور اُس کے ساتھ جو تین عورتیں سفر کر رہی تھیں۔ وہ بھی پان کھاتی ہیں اور خوب تھوکتی ہیں۔

سٹیشن ماسٹر نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

" تھانیدار صاحب! آپ کو وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے مجرم ایک خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آپ کی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ وہ بھاگ نہ سکے۔"

" میں ابھی فون کرتا ہوں" تھانیدار نے مڑتے ہوئے کہا۔

" ہاں بھائی صاحب فون ضرور کیجئے" سکھ نے کہا۔

ڈاکٹر اور اُس کا معاون بھی گاڑی سے اتر گئے اور جاتے ہوئے ڈاکٹر نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

" یوسف صاحب! اب آپ آرام سے لیٹ جائیں۔ مَیں پولیس سے بھی کہہ دوں گا۔ کہ اِس ڈبے میں ایک ایسی سواری ہے جسے کسی پاگل نے زخمی کر دیا ہے۔ اِس لیے کسی اور کو راستے سے نہ بٹھایا جائے۔"



بیگم فریدہ احمد نے گارڈ سے کہا: " بھائی! ڈائننگ کار والے سے کہہ دیں کہ ٹھیک بارہ بجے ہم سب کا کھانا یہیں بھیج دیا جائے۔"

گارڈ نے پوچھا: " اِن سردار صاحب کے لیے بھی کھانا بھیج دیا جائے؟"

سکھ نے جلدی سے جواب دیا۔ " نہیں بی بی جی! صبح میں ناشتے کے وقت پیٹ بھر کر کھانا کھا آیا تھا۔"

بیگم احمد نے کہا۔ " اچھا بیرے سے کہنا کہ اِن کے لیے ٹھنڈے دودھ کا ایک جگ لیتا آئے، چینی ڈال کر۔"

سکھ نے کہا: " بہن جی دودھ ایسی چیز ہے جس سے میں انکار نہیں کر سکتا۔"

دوسری سیٹ پر یوسف لیٹ گیا اور بیگم احمد نے کہا۔

" بیٹا! زخم میں کوئی تکلیف تو نہیں؟"

" جی نہیں!"

نسرین بولی۔ " ڈاکٹر کی دو گولیاں ابھی کھا لیجیے۔ مَیں پانی لاتی ہوں۔"

اُس نے پانی کا گلاس لا کر پیش کیا!

یوسف نے گولیاں منہ میں ڈال کر پانی کا گھونٹ لیا اور پھر لیٹ گیا۔

نسرین بولی: یوسف بھائی! ٹیکے سے آپ کو درد ضرور ہوا ہوگا۔ جب انہوں نے ٹیکے کی سوئی آپ کے جسم میں چبھوئی تھی تو نانی جان نے فوراً دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا اور میں اگر آنکھیں بند نہ کر لیتی تو شاید میری چیخ نکل جاتی۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو سوئی ابھی تک آپ کے بازو میں تھی۔ اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ پھر میری طرف آپ نے دیکھا اور مسکرانے لگ گئے۔ بھلا اس میں مسکرانے کی کون سی بات تھی!"

یوسف نے لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ اُس کے سر پر رکھ دیا اور اُس کے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا: " تمہیں بلاوجہ خوف زدہ دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی تھی۔"

" یعنی آپ کو درد بالکل نہیں ہوا!"

" ہوا تھا لیکن اتنا معمولی کہ مَیں نے محسوس بھی نہیں کیا۔"

" مَیں سچ کہتی ہوں کہ خوفناک سوئی دیکھ کر تو نانی جان بھی ڈر گئی تھیں۔"

" جب سوئی بچوں کو چبھوئی جانے لگے تو مائیں ڈر جاتی ہیں۔ اگر میری ماں یہاں ہوتی تو شاید وہ ڈاکٹر کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتی۔"

" لیکن یہ تو میری نانی جی ہیں۔"

" ماں کی ماں کا دل ماں سے بھی زیادہ نرم ہوتا ہے۔"

نسرین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ " مَیں آپ کا سر دبا دوں۔"

"وہ کیوں"؟

"مَیں نانی جان کا سر دبایا کرتی ہوں اور امّی اور ابّو کا بھی۔ اور کبھی کبھی امّی میرا سر دبایا کرتی ہیں!"

"مجھے سر دبوانے کی عادت نہیں!"

"اگر کوئی مجھ جیسی بہن ہوتی تو آپ کو یہ عادت پڑ جاتی۔"

"اگر تم جیسی بہن ہوتی تو کئی ایسی عادتیں پڑ جاتیں جو اس وقت میرے ذہن میں بھی نہیں آتیں۔ مثلاً مجھے پڑھنے اور سوچنے کے ساتھ باتیں کرنے کی عادت بھی پڑ جاتی۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں سچ مچ آپ کی بہن ہوتی اور ہمیشہ آپ کے پاس رہتی تو آپ باتیں زیادہ کیا کرتے اور لڑائیاں بھی ہم بہت کیا کرتے۔"

یوسف ہنس پڑا: "یہ تمہاری بات تو میں کبھی بھی نہیں بھول سکوں گا۔ کہ تم مجھے ایک لڑاکا گنوار سمجھتی ہو۔"

"بالکل نہیں بھائی جان، آپ مجھے لڑتے ہوئے بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔ مَیں آپ کے لیے یہ دعا کیا کروں گی کہ جب آپ اچھی کتابیں لکھا کریں تو ساری دنیا انھیں پسند کرے اور نانی جان بھی آپ کے لیے دعا کیا کریں گی۔"

"ماں جی!" یوسف نے بیگم احمد کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "مجھے آج کل نیک لوگوں کی دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ میری مصیبت یہ ہے کہ لوگ قلم سے روزی کمانا ناممکن قرار دیتے ہیں اور ــــ میری خواہش ہے کہ اپنا حلال رزق اِس فن سے تلاش کروں۔"

بیگم احمد نے یوسف کی جانب پورے انہماک سے دیکھا تو وہ انہیں ہمدرد پاکر کہنے لگا:

"میری بدنصیبی تو یہ ہے کہ میرے ابا جان بھی یہ برداشت نہیں کرتے کہ میری کوئی تحریر کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہو۔ وہ مجھے پڑھنے سے نہیں روک سکے لیکن مجھے کوئی قابلِ

اشاعت مضمون یا افسانہ لکھنے نہیں دیتے تھے۔"

نسرین کی نانی نے کہا: "کیوں بیٹا! ایک پڑھے لکھے آدمی میں اتنا تعصب تو نہیں ہونا چاہیے۔"

یوسف نے کہا: "مَیں نے ایف اے کا امتحان دینے سے پہلے ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ جسے میں ابّا کے خوف سے چھپ چھپ کر لکھا کرتا تھا لیکن میں نے ابھی چند صفحات ہی لکھے تھے کہ ایک دن وہ اچانک میرے کمرے میں آگئے اور میں لکھے کاغذ چھپانے کی کوشش میں پکڑا گیا۔ انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ مَیں نے کیا لکھا ہے۔ اگر وہ پڑھ لیتے تو شاید واپس چلے جاتے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ چند صفحات بار بار پڑھوا کر سنتے مگر انہوں نے سارا مسوّدہ پرزہ پرزہ کر ڈالا اور میرے لیے غصّہ پی جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔"

نسرین نے کہا: "میں آپ کے لیے دعا کیا کروں گی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آپ کے ابّا جان اور خاندان کے ہر آدمی کا دل نرم کر دے اور یہی دعا میری نانی جان، میرے ابّو، امّی، اور ہم سب آپ کے لیے کیا کریں گے۔"

باب ۔ ۸

ریل گاڑی ملتان سے چلی تو بوڑھے سکھ نے کہا۔

"کاکا جی! میرا نام جگت سنگھ ہے۔ خانیوال سے میں نے دوسری لائن پر جانا ہے میرا پتہ شاید تمہیں زبانی یاد نہ رہے اِس لیے میں اسے اخبار پر لکھ دیتا ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے جگت سنگھ نے اخبار کو تہہ کیا ایک خالی جگہ پر چند الفاظ لکھنے کے بعد یوسف کو اخبار دیتے ہوئے کہا: "کاکا جی! اگر کبھی آپ اجنالہ آئیں تو مجھے ضرور ملیں۔ میرا گاؤں دریا سے بہت نزدیک ہے اور اجنالہ میں میری دو دکانیں بھی ہیں۔ وہاں کسی کے سامنے میرا نام لے لیں۔ وہ آپ کو ہمارے گھر پہنچا دے گا"۔

"تمہارا ضلع گورداسپور ہی ہے نا؟ وہ بھی ہمارے گاؤں کے قریب ہے"۔

"جی ہاں"۔

"میں تمہاری باتوں سے سمجھ گیا تھا"۔

"میرا خیال ہے۔ کہ تمہارے گاؤں کے کہیں آس پاس ہمارے کئی رشتے دار رہتے ہیں"۔

"سردار جی میرا گاؤں دھاری وال سٹیشن سے قریب ہے"۔

"______ او کاکا جی آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آپ میاں عبدالرحیم کے بیٹے ہیں"۔

یوسف نے کہا۔"جی ہاں اگر میں کبھی راوی کی طرف آیا۔ تو آپ کو سلام عرض

کرنے ضرور آؤں گا"۔

جگت سنگھ بولا" بیٹا! تمہاری کچھ باتیں میرے کانوں تک پہنچی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔ تم کیا لکھنا چاہتے ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بھگوان اچھے انسان بناتا ہے وہ ان کی اچھی خواہشات بھی پوری کرتا ہے۔ اگر تم کسی چیز کو اچھا سمجھتے ہو۔ تو ڈٹے رہو اور اس بات کی پرواہ نہ کرو۔ کہ دنیا کیا کہتی ہے۔؟

یوسف نے کہا۔" سردار جی! مجھے یقین ہے کہ کسی دن ہر اچھا آدمی میری کتابیں پڑھ کر خوش ہوگا"۔

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھے رہے۔ بالآخر یوسف نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔"سردار جی! شاید خانیوال قریب آرہا ہے"۔

جگت سنگھ نے کہا۔"تم اطمینان سے بیٹھے رہو اور پلیٹ فارم کی طرف کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ کھولو۔ ورنہ بہت رش ہو جائے گا۔ میں پچھلی طرف سے اُتر جاؤں گا اور یہ کوشش کروں گا کہ اِس ڈبے سے لوگوں کا ہجوم روکنے کے لیے پولیس کی مستعدی میں فرق نہ آئے"۔

"بی بی جی! سلام! چھوٹی شہزادی جی سلام"۔

جگت سنگھ اپنا بیگ اٹھا کر پچھلے دروازے سے اُتر گیا۔

بیگم احمد ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور کچھ دیر کے لیے کبھی یوسف اور کبھی نسرین کی طرف دیکھتی رہیں۔ انہیں دونوں کے لیے یکساں پیار آتا تھا اور وہ دونوں کے مستقبل کیلئے یکساں دعائیں کر رہی تھیں۔ اچانک انہوں نے پوچھا۔

"یوسف بیٹا! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ چند دن تک تم جالندھر آؤ اور تمہاری اُمّی جان بھی تمہارے ساتھ ہوں؟"

______ میں یہ چاہتی ہوں کہ تمہاری اور نسرین کی امّی میری زندگی میں ایک دوسرے

کی سہیلیاں بن جائیں۔"

بیگم فریدہ احمد نے کچھ دیر خاموشی کے بعد کہا نسرین بیٹی! کوئٹہ سے مجھے گلاب کے عطر کی جو شیشیاں تحفے میں ملی تھیں اُن میں سے ایک نکال کر یوسف کے سوٹ کیس میں رکھ دو۔ تاکہ اپنی امی جان کے پاس میری طرف سے یہ تحفہ لے جائے۔ اِس بیگ میں نہیں! سُوٹ کیس کے اندر!"

"سنبھال کر رکھنا! کہیں توڑ نہ دینا!"

نسرین نے اُٹھ کر نانی اماں کا بکس کھولا۔ اُس میں سے ایک عطر گلاب کی شیشی نکالی اور وہ ریشم کے رومال میں لپیٹتے ہوئے یوسف سے کہا۔ اپنا سوٹ کیس کھول دیجئے۔ تاکہ میں احتیاط سے وہاں رکھ دوں

یوسف نے سیٹ کے نیچے پڑا ہُوا سوٹ کیس نکال کر کھول دیا اور نسرین نے عطر کی شیشی اُس کے اندر رکھتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان جب آپ گھر جا کر سوٹ کیس کھولیں تو سب سے پہلے یہ شیشی نکالیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی نوکر کی بے احتیاطی سے گر کر ٹوٹ جائے"

"شہزادی صاحبہ آپ فکر نہ کریں۔ مَیں اپنی جان سے زیادہ ماں جی کے تحفے کی حفاظت کروں گا۔"

نسرین کی نانی نے تکیے پر سر رکھتے ہُوئے آنکھیں بند کرلیں تھیں

یوسف نے پہلے اخبار اُٹھایا جس پر سکھ مسافر نے اپنا ایڈریس لکھا تھا۔ اسے بے توجہی سے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اسی طرح تہہ کر کے رکھ دیا۔ اُس کے بعد اُس نے اُٹھ کر اپنے بیگ سے ایک کتاب نکالی اور پڑھنے میں منہمک ہوگیا۔ گاڑی ایک سٹیشن پر رُکی۔ وہ جلدی سے نیچے اُترا اور تھوڑی دیر بعد جب پلیٹ فارم کے نل سے وضو کر کے واپس آیا، تو کمپارٹمنٹ میں تین سواریاں جن میں سے دو ہندو اور ایک کوئی مسلمان زمیندار معلوم ہوتا تھا بیٹھ گئیں۔ ایک ہندو اور ایک زمیندار خالی سیٹ پر اس طرح بیٹھے کہ جس جگہ چار

سواریاں آسکتی تھیں وہ صرف دو کے لیے کافی معلوم ہوتی تھیں۔ تیسرے کو باقی دو سیٹوں پر ایک عورت اور ایک بچی کا آرام سے سونا پسند نہ آیا اور اُس نے جُھک کر نسرین کا بازو ہلاتے ہوئے کہا۔

"او کاکی! یہ سونے کا وقت نہیں ہے!"

یُوسف نے اُس کا بازو جھنجوڑ کر پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا:

"سامنے اُس سیٹ پر دو اور آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔ تم بچّوں کو کیوں تنگ کرتے ہو؟"

ہندو کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اُس کے ساتھی نے ایک طرف کھسک کر سیٹ کا وہ حصّہ خالی کر دیا، جہاں یوسف کی کتاب اور اخبار پڑا ہوا تھا۔ یوسف نے کہا: جائیے وہ سیٹ خالی ہے۔ مَیں بیٹھے بیٹھے تھک گیا ہوں اور کچھ دیر کھڑا رہنا چاہوں گا۔ بنیے نے آگے بڑھ کر کتاب اور اخبار ایک طرف کر دیے اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اِتنی دیر میں گاڑی چل پڑی۔

اِس عرصے میں بنیا جس جگہ پر بیٹھا ہوا تھا وہاں سے اُٹھا اور اخبار اُٹھا کر پڑھنے لگا! وہ ایک مسلمان کے پاس ایسا اخبار دیکھ لینا بھی کامیابی سمجھتا تھا۔ جس پر گاندھی ابوالکلام آزاد اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی تصویریں نمایاں تھیں۔

اُدھر انگریزی کی کتاب پر ایک نظر ڈال کر وہ پہلے ہی مرعوب ہوچکا تھا۔

اُس نے دوسرے ہندو ساتھی سے کہا۔

"سیٹھ نارائن داس! میں نیشنلسٹ مسلمان کو دیکھتے ہی پہچان لیتا ہُوں۔"

یوسف نے کہا۔ "میں ایک مسلمان ہوں اور ایک مسلمان پہلے بھی مسلمان ہوتا ہے اور بعد میں بھی مسلمان ہوتا ہے۔"

زمیندار بولا! بابو جی! مَیں تو ایک گنوار آدمی ہوں، یہ ہمارے پنڈت دُرگا پرشاد

جب کسی مسلمان پر خوش ہوتے ہیں تو اُسے نیشنلسٹ یا قوم پرست کہہ کر تھپکی دیتے ہیں۔ آپ سمجھائیں اس کا مطلب کیا ہے؟

یوسف نے جواب دیا" چوہدری جی! پنڈت صاحب کی تھپکیاں کئی مسلمانوں کو لے ڈوبیں گی اور ہندوؤں کا تو بالکل ستیاناس کر دیں گی۔"

پنڈت درگا پرشاد نے فوری طور پر موضوع بدلتے ہوئے کہا: "میاں جی! آپ اس اخبار میں چند بھگتوں کی تصویریں دیکھ کر غصے میں آ گئے یا کوئی اور بات ہے؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "پہلے میں چوہدری صاحب کے سوال کا جواب دیتا ہوں۔"

"چوہدری صاحب اگرچہ میری عمر اور تجربہ زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس بات کا یہ جواب دے سکتا ہوں کہ یہ دونوں الفاظ ان لوگوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جو برہمنی سیاست کا مکروہ چہرہ چھپانے کے لیے نقاب کا کام دے سکیں۔ اب پنڈت جی کے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس اخبار میں ہندو دیش بھگتوں کے علاوہ اُن مسلمانوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کانگرس بار برداری کا کام لیتی ہے اور شاید آپ کے ساتھیوں نے میرے پاس یہ اخبار دیکھ کر سمجھ لیا تھا کہ میں بھی ان کی پسند کا جانور ہوں۔"

"اصل میں یہ اخبار ایک سکھ کے پاس تھا اور میرے پاس اس لیے پڑا ہوا ہے کہ اس پر اس کا ایڈریس لکھا ہوا ہے۔"

سیٹھ نرائن داس نے کہا" بابو جی! پنڈت درگا پرشاد نے آپ کو نیشنلسٹ کہا ہے کوئی گالی تو نہیں دی۔"

یوسف نے کہا۔ "پنڈت جی بے وقوف نہیں۔ اور ایک عقل مند آدمی کو گالی دینے سے پہلے بہت کچھ سوچا کرتا ہے۔"

زمیندار جس کا نام چوہدری اللہ بخش تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ عقل مند آدمی بحث شروع کرنے سے پہلے ہی یہ سوچ لیتا ہے کہ جس کے ساتھ بحث کرنے لگا ہوں۔ وہ کیا ہے؟ ورنہ اب تک پنڈت جی وہ ساری باتیں دہرا چکے تھے۔ جو وہ ہم سے کیا کرتے ہیں۔"

"جی ہاں!"

"میں اُسی وقت سمجھ گیا تھا۔ جب نرائن داس نے وہ کتاب کھول کر فوراً بند کر دی تھی۔ اگر اس میں سے کوئی بات اُن کی سمجھ میں آ جاتی تو یہ ہمارا سر کھا جاتے۔" میں نے دیکھا ہے کہ جب یہ ہندو اخبار قائد اعظم کے کوئی کارٹون شائع کرتے ہیں یا مسلمان لیڈروں کو بُرا بھلا کہتے ہیں تو سیٹھ نرائن داس خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور کچھ پرچے خرید کر بانٹ دیا کرتے ہیں۔"

پنڈت درگا پرشاد نے کہا: "چوہدری جی! ہمیں ایسے جھگڑوں سے کیا فائدہ ہمیں آپس میں شانتی اور پریم سے رہنا چاہیے۔ یہ دنیا چار دن کا میلہ ہے۔"

یوسف بولا: "اور چار دن کے میلے کی ساری خوشی صرف پنڈت جی کے لیے ہے یا کسی اور کا بھی حصہ ہے؟"

"پنڈت جی یہ کب کہتے ہیں کہ کسی اور کا حق نہیں!"

"کتنے بھولے ہیں آپ؟ انگریز نے ابھی اپنا بستر لپیٹا نہیں اور آپ اپنا بچھونا ڈالنے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔

ہمیں وہ شانتی اور پریم کا سبق دیتے ہیں اور خود انگریز سے خفیہ سودے بازیاں ہو رہی ہیں: کہ آپ نہ صرف اپنی سنگینیں ہمارے حوالے کر دیں بلکہ مسلمانوں کو اس طرح کس کر باندھ دیں کہ جب ہم انھیں قتل کرنا چاہیں تو وہ اپنی گردن تک نہ ہلا سکیں۔"

نرائن داس نے کہا: جن لوگوں نے بھارت ماتا کی آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں

اُن پر ایسے الزام لگانا پاپ ہے! میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک پڑھے لکھے نوجوان کی زبان سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں ——— کیا آپ کے خیال میں یہ قوم پرست مسلمان جنھوں نے آزادی کی جنگ میں جیل خانوں کی سختیاں برداشت کی ہیں اور یہ سکھ جو ہمیشہ آزادی کی جنگ میں دوسروں سے دو چار قدم آگے ہوا کرتے ہیں سب بے وقوف ہیں؟"

یوسف نے کہا: "نیشنلسٹ مسلمان اُس ہندو کانگرس کے چہرے کے نقاب ہیں جس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ گوراشاہی کے بعد بنیا اور برہمن شاہی قائم ہو جائے گی۔ نقاب دُنیا کو دھوکا دینے کے لیے ہوتا ہے۔ اِسے اپنا کام لینے کے بعد اُتار کر پھینک دیا جاتا ہے۔ رہی بات سکھوں کی! تو ——— ان کے متعلق میں یہ مانتا ہوں کہ تم ان کے دل و دماغ میں بُری طرح گھس گئے ہو، لیکن وہ دن دُور نہیں جب ان کے اندر بھی ایسے لوگ پیدا ہو جائیں گے، جو مکر و فریب کے ان گنت نقابوں میں تمہارے چہرے کے گھناؤنے خدوخال پہچان لیا کریں گے، لیکن وُہ وقت شاید بہت دیر سے آئے! بعض بدنصیب قومیں اُس وقت خوابِ غفلت سے بیدار ہوتی ہیں جب دشمن انہیں آہنی زنجیروں میں جکڑ لیتا ہے۔ یا اپنا خنجر اُن کے سینے پر رکھ لیتا ہے اور وہ اِتنے بے بس ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ چیخنا بھی چاہیں۔ تو اُن کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔"

بابوجی! آپ کہاں پڑھتے ہیں؟

"مَیں اسلامیہ کالج کا طالب علم ہوں۔"

پنڈت درگا پرشاد نے کہا۔ "میرا بھی یہی خیال تھا کہ ایسے نئے خیالات صرف وہاں پڑھنے والوں میں پیدا کیے جاتے ہیں۔"

"یوسف بولا: "پنڈت جی! اگر آپ اسلامیہ کالج کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ تو اُس کے لیے آپ کو عقل کی ضرورت نہیں۔ مَیں نے بنیے اور برہمن ذہنیت کے متعلق جو معلومات حاصل کی ہیں وہ مجھے اسلامیہ کالج سے نہیں بلکہ باہر سے حاصل ہوئی ہیں:

میں ایک دیہاتی ہوں۔ مَیں نے بھارت کے برہمنوں کا مسلمانوں سے شودروں کا سا سلوک دیکھا ہے۔ مَیں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بنیا ساہوکار غیر ہندوؤں کو کس طرح دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے۔

مَیں نے اُن مذہبی، اخلاقی اور سیاسی اداروں کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے جن کی بنیاد ہی نفرت پر رکھی گئی ہے۔ گاندھی اور اس کے چیلے ہندوستان پر حکمرانی کا جو خواب دیکھ رہے ہیں۔ اُس کا ماضی اس نفرت کی سیاہی میں ڈوبا ہوا ہے۔ وُہ بیسویں صدی کی تیز رفتار مشینوں کی جگہ پتھر اور دھات کے انتہائی مکروہ ترین ادوار کو واپس لانا چاہتے ہیں۔"

چوہدری اللہ بخش نے کہا: میاں جی! مَیں نے کل واپس آنا تھا لیکن سیٹھ نارائن داس مجھے آج ہی کھینچ لائے۔ شاید اس لیے کہ اللہ نے آپ سے ملاقات کروانی تھی جس کے لیے مَیں ان کا شکر گزار ہوں۔ آپ سے باتیں کرنے کا بڑا لطف آیا کہ اب یہ لوگ پاکستان کے خلاف کچھ سوچ سمجھ کر بات کیا کریں گے۔ اگر مسلمان قوم میں آپ جیسے پندرہ بیس اور نوجوان موجود ہوتے تو پھر پاکستان بن کر رہے گا۔

"چوہدری جی! آپ اطمینان رکھیں پاکستان کا ہر شہری مجھ جیسا ہی ہوگا۔

چوہدری اللہ بخش نے اخبار سے کاغذ کا ایک پرزہ پھاڑتے ہوئے کہا۔

"میاں جی! اگر یہ اخبار ایڈریس لکھنے کے کام آتا ہے تو مَیں بھی اپنا ایڈریس لکھ دیتا ہوں! جب کبھی آپ منٹگمری (ساہیوال) آئیں تو مجھے ضرور ملیں۔ ہماری زمین بالکل شہر کے قریب ہے اور عام رہائش شہر میں ہے۔ اور اب بھی اگر آپ وہاں پہنچ سکیں تو ہمارے گھر تک بآسانی آجائیں گے۔"

یوسف نے کہا "چوہدری صاحب! اس وقت تو ممکن نہیں پھر کبھی ملنے کی کوشش کروں گا۔ اور ضرور ملوں گا۔"

چوہدری صاحب! "یوسف صاحب سے آپ صرف ملیں گے ہی نہیں۔ بلکہ آپ ہمارے ہاں چند دن قیام بھی کریں گے اور اگر شکار کا شوق ہوا تو شکار کو چلیں گے۔ میرے چھوٹے بھائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ شاید آپ کو دیکھ کر وہ کچھ بدل جائیں۔"

سیٹھ نارائن داس نے کہا: "دیکھا پنڈت جی! ہمارے دوست ابھی سے اس طرح باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔ جیسے پاکستان بن چکا ہے۔"

یوسف نے کہا: "پاکستان ضرور بنے گا لیکن یہ حقیقت تم برسوں تک جھٹلاتے رہو گے۔"

نارائن داس نے باہر دیکھتے ہوئے کہا، "منٹگمری آگیا ہے۔"

چوہدری اللہ بخش نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں جی! اب آپ کھڑے کھڑے تھک گئے ہوں گے۔ مَیں نے بیٹھنے کے لیے اِس لیے نہیں کہا۔ کہ آپ کھڑے ہو کر باتیں کرتے ہوئے اچھے لگ رہے تھے۔ اب آپ تھک گئے ہوں گے بیٹھ جائیں اور وعدہ کریں کہ جب کبھی آپ کو موقعہ ملے گا۔ آپ میرے پاس ضرور ٹھہریں گے۔"

یوسف نے کہا: "مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ جب بھی مجھے یہاں ٹھہرنے کا موقعہ ملے گا تو میں آپ کو ضرور تلاش کروں گا۔

○

چوہدری اللہ بخش رخصت کے وقت یوسف سے بغل گیر ہونے لگا، تو نسرین چلّائی

"جی اِن کا بازو زخمی ہے۔"

چوہدری اللہ بخش نے حیرت سے پوچھا "یہ بازو کیسے زخمی ہوا؟" "جی! ایک بیوقوف نے چاقو مارا تھا۔"

چوہدری اللہ بخش نے کہا۔ "وہ متعصب کانگریسی ہوگا؟ پولیس نے گرفتار نہیں

کیا اُسے؟

"نہیں!" ——— نسرین بولی، "اِنہوں نے خود ہی اُس کی مرمت کر دی تھی اور وہ گاڑی سے اُتر کر بھاگ گیا تھا۔"

گاڑی سے اُترتے ہی نارائن داس نے پنڈت درگا پرشاد سے کہا۔

"پنڈت جی! آج آپ بچ گئے۔ ورنہ جب اپنی جگہ بنانے کے لیے تم بچّی کو اُٹھا رہے تھے۔ اُس نے تمہاری طرف اس طرح دیکھا تھا، جیسے وہ تمہیں کچّا کھا جائے گا۔"

نسرین نے پانی کا ایک گلاس اور تھرماس سے ایک برف کی ڈلی نکال کر اُس میں ڈالنے کے بعد یوسف کو پیش کرتے ہوئے کہا "لیجیے! آپ کو پیاس لگ رہی ہے۔"

یوسف ایک ہی سانس میں سارا گلاس پی گیا اور پھر اُس نے پُوچھا۔ "ایک اور لیجیے۔"

"شکریہ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔" نسرین نے جواب دیا۔ "واہ جی! اِس کے لیے بھی کچھ سوچنے کی ضرورت ہے؟ آپ اتنی دیر کھڑے تقریر کر رہے تھے۔ گرمی تھی اور پنکھا آپ سے دُور تھا۔ آپ کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ کیونکہ گاڑی کے شور میں بلند آواز سے بولنے کی ضرورت پڑی۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ آپ کو ٹھنڈا پانی پلاؤں۔ لیکن پھر سوچا کہ وہ احمق ہنس پڑیں گے۔"

"جی ہاں!" وہ پھر بولی: "مَیں نانی جان سے بار بار کہہ رہی تھی کہ آپ کو بیٹھنے کو کہا جائے۔ جب آپ اُس بنئے سے اُلجھنے لگے تھے تو مَیں نانی جان کے کان میں کہہ رہی تھی۔ نانی جان! اُس کی شامت آئی ہوئی ہے۔ اب ہم ناول سے بڑی چیز دیکھ رہے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اُس بنئے میں اتنی عقل ضرور تھی کہ اُس نے نرم ہو جانے میں عافیت سمجھی اور بحث میں اُلجھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔"

○

نانی نے پوچھا۔ "بیٹا! گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرے گی؟"

یوسف نے جواب دیا۔ "ماں جی! کوئی دس منٹ ٹھہرے گی۔"

"بیٹا! ایسا کرو کہ نسرین کو پلیٹ فارم پر گھما لاؤ۔ بیٹھے بیٹھے تنگ تو میں بھی بہت آ گئی ہوں لیکن مجھے لاہور پہنچنے کا انتظار ہو گا اور وہاں مجھے گھومنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔"

نسرین نے سر کا دوپٹہ اوڑھ لیا اور پلیٹ فارم پر اُترتے ہی یوسف کا ہاتھ پکڑ لیا۔

جب وہ دوبارہ گاڑی پر سوار ہوئے تو نسرین نانی کے کان میں سرگوشی کرنے لگی۔

—"نانی جان! ایک بات سے میں بہت ڈر گئی تھی: جب وہ اُسی باگڑی کو گاڑی سے نیچے پھینک رہے تھے تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی تھی۔ اُس وقت ایسے محسوس ہوا تھا جیسے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا: "شہزادی صاحبہ! یہ تو صرف ایک ڈرامہ تھا۔ تم نے یہ نہیں دیکھا ہو گا کہ میں نے ایک ہاتھ سے اُس کی ٹانگ پکڑ رکھی تھی ———"

"بھائی جان! میں بھی حیران تھی کہ وہ آدھا گاڑی سے باہر نکلا ہوا ہے مگر گرتا بھی نہیں، اب معلوم ہوا ہے۔ کہ آپ اُسے ڈرا بھی رہے تھے اور بچا بھی رہے تھے۔ بھائی جان! یہ وعدہ کیجئے گا۔ کہ آپ کو مجھ پر کبھی غصہ نہیں آئے گا۔"

یوسف مُسکرایا: "تم پر؟"

"اگر تم وعدے سے خوش ہو سکتی ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ مجھے ننھی نسرین پر کبھی غصہ نہیں آئے گا۔"

"ننھی نسرین نہیں! جب میں بڑی ہو جاؤں تب بھی!"

"جب آپ بڑی ہو جائیں گی تب بھی!"

"اور آپ کو دکھاوے کا غصہ بھی نہیں آئے گا!"

یوسف ہنس پڑا۔ "میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں۔"

———○———

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یوسف نے اخبار اٹھا کر اس پر عمر رسیدہ سکھ کے لکھے پتے پر نظر ڈالی اور چونک پڑا:

"ماں جی! میں بھی حیران تھا کہ سردار جگت سنگھ نے اس پر اپنا ایڈریس لکھنے میں اتنی دیر کیوں لگائی۔ اصل میں انہوں نے دو ایڈریس لکھے ہیں! ایک تو راوی کے کنارے اُنکے پرانے گھر کا ہے اور دوسرے ایڈریس میں اس گاؤں کا نام ہے جو ہمارے گاؤں سے کوئی دس میل دُور ہے اور میں وہاں سے تین چار بار گزر چکا ہوں۔"

نسرین! بھئی میں تمہیں پھر ایک تکلیف دے رہا ہوں۔ یہ اخبار لپیٹ کر میرے ہینڈ بیگ میں رکھ دو۔"

نسرین نے اخبار اُوپر کے برتھ پر پڑے ہوئے بیگ میں رکھ دیا اور پھر اپنی نانی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "نانی جان، یہ بات کتنی اچھی ہوتی کہ چچا جان لاہور میں ہوتے اور ہم آج اُن کے پاس رُک جاتے۔"

"بیٹی! بات تو تمہیں ٹھیک ہی سوجھی ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ بیک وقت انبالہ اور لاہور میں تو نہیں ہو سکتے اور تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ اگر تمہارے چھوٹے چچا——— ولایت نہ جا چکے ہوتے تو تمہارے لیے اور زیادہ خوشی کی بات ہوتی۔"

"نانی جان، چھوٹے چچا جان کے متعلق تو میں بہت سوچا کرتی ہوں مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ فہمیدہ آپا ان کے ساتھ کئی بار چڑیا گھر کی سیر کر چکی ہیں لیکن جب بھی میں لاہور جاتی وہ اپنے امتحانوں میں مصروف ہوتے تھے۔"

"بیٹی! اپنی تعلیم ختم کر کے جب وہ لاہور واپس آئے گا تو میں اسے کہوں گی کہ وہ تمہیں جی بھر کر چڑیا گھر کی سیر کرائے اور اس بات کی کوشش کرے کہ چڑیا گھر والے تمہارے لیے وہاں ایک خوبصورت سا پنجرہ بنوا دیں۔"

یوسف نے کہا: "ماں جی، شہزادی کے لیے سونے کا پنجرہ ہونا چاہیے۔"

"بیٹا! بات یہ ہے کہ اس کے چچا ولایت سے بہت بڑے ڈاکٹر بن کر واپس آئیں گے۔ اس لیے ان کے لیے سنہری پنجرہ مہیا کرنا مشکل نہیں ہوگا۔"

نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا "نانی جان، اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ آپ، نانا جان، امی، ابو، چچا اور چچیاں سب ہر روز مجھے دیکھنے کے لیے چڑیا گھر آیا کریں گے تو مجھے لوہے کے پنجرے میں رہنے پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا، لیکن میری بھی ایک شرط ہے کہ بھائی یوسف بھی مجھے دیکھنے آیا کریں گے...... اور فہمیدہ آپا بھی۔"

"بھئی وہ تو ضرور آئے گی اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے لیے چنے، مونگ پھلی اور کیلوں کا راشن وہی لایا کرے گی۔"

یوسف نے کہا "ہاں جی، یہ تو بہت زیادتی ہو گی! اس شہزادی کو تو چڑیا گھر کے اندر بھی بہت اچھے اچھے کھانے ملنے چاہئیں۔"

"بھائی جان! اس بات کی آپ فکر نہ کریں مجھے یقین ہے کہ آپا فہمیدہ میرے لیے بہترین کھانا لایا کریں گی۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا "بیٹا! یہ جس چھوٹے چچا کا ذکر کر رہی ہے وہ پچھلے دنوں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا ہے! اس کا بڑا بھائی جو فوج میں ڈاکٹر ہے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ اسے یورپ کے بعد کچھ عرصہ امریکہ بھی جانا چاہیے۔ بڑا ذہین بیٹا ہے وہ، اس کا دوسرا چچا جس کا ایک گھر لاہور میں بھی ہے۔ پولیس انسپکٹر ہے۔ لاہور والا مکان اُسے اپنے سسرال سے ملا۔ جب وہ لاہور میں ہوتا تھا تو اس گھر میں بہت رونق تھی۔ نسرین کا چھوٹا چچا تعلیم کے زمانے میں وہاں گیا تھا اور اُس کی چچی بلقیس فہمیدہ کو بھی وہیں لے آئی تھی۔ ہم بھی اکثر وہاں جایا کرتے تھے اور نسرین ہر بار یہ پروگرام لے کر جاتی تھی کہ وہ چھوٹے چچا کی انگلی پکڑ کر سیر کرے گی لیکن اتفاق ایسا ہوتا تھا کہ اُسے فہمیدہ کی طرح اس کے ساتھ چڑیا گھر دیکھنے کا کبھی موقع نہ ملا۔"

نسرین نے کہا "بھائی جان! مجھے چچا جان نے انگلستان پہنچتے ہی خط لکھا تھا کہ جب وہ یورپ سے واپس آئیں گے تو ہمیں خوب چڑیا گھر کی سیر کرائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کسی دن وہ بیرونی ممالک کا دورہ کریں گے تو مجھے بھی دنیا کے بہترین چڑیا گھر دکھانے ساتھ لے جائیں گے۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا "بیٹا! میں اب سوچتی ہوں کہ تمہارے ساتھ نسرین کے اتنی جلد مانوس ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ اسے تم میں اور ــــ مجید میں کوئی مشابہت نظر آتی ہے۔"

اوکاڑہ سے آگے یوسف نے مغرب کی نماز ادا کی اور جائے نماز اپنے بیگ میں رکھ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ نسرین نے جھجکتے ہوئے پوچھا "بھائی جان، آپ نے میرے لیے بھی دعا مانگی ہے"

"ہاں میں سب کے لیے دعا مانگا کرتا ہوں۔"

"بھائی جان! میں نے سب کے متعلق نہیں پوچھا صرف یہ پوچھتی ہوں کہ میرے لیے بھی دعا مانگی ہے یا نہیں۔" یوسف نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا کہ تم بہت اچھی لڑکی ہو تمہیں دعاؤں کی ضرورت نہیں تاہم میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے تمہارے لیے دُعا کیا کروں گا۔"

بیگم احمد اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولیں "نسرین نے تمہیں جالندھر میں اپنے والد کے گھر کا پتہ لکھ دیا ہے۔ مَیں امید کرتی ہوں کہ تم کسی دن ضرور آؤ گے۔ نسرین کے بھائی بہن اور والدین تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

یوسف نے کہا "ہاں جی، مَیں انشاءاللہ ضرور آؤں گا۔"

نسرین بولی "بھائی جان! آپ کا یہ خیال درست نہیں تھا کہ اگر آپ دیر سے آئیں گے تو میں پہچان نہیں سکوں گی۔ اگر آپ کی صورت بدل بھی جائے تو بھی آپ کے

ماتھے پر زخم کا نشان دیکھ کر میں پہچان لوں گی۔"

فریدہ احمد نے کہا: "بیٹا یوسف میرے قریب آؤ۔"

یوسف جب قریب آیا تو انھوں نے اس کی پیشانی کے بائیں جانب شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا: "بیٹا یہ زخم تمہیں کیسے لگا؟"

جی مَیں بچپن میں گھوڑے سے گر پڑا تھا نوکیلے پتھر سے زخم لگا تھا۔"

نسرین بولی: "بہت خون بہا ہوگا ان کا اور ان کی امی بہت روتی ہوں گی۔"

یوسف نے مسکرا کر جواب دیا: "جب مَیں گھر پہنچا تھا تو میرے سر پر پٹی بندھی تھی اور میری امی کو رونے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔"

نسرین کی نانی بولیں "بہادر بیٹوں کی مائیں رویا نہیں کرتیں۔"

"لیکن ان کو درد تو بہت ہوا ہوگا۔"

یوسف نے جواب دیا "مجھے یاد نہیں مجھے کیا محسوس ہوا تھا۔"

نسرین نے نانی سے لپٹ کر اس کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولیں "بیٹا یوسف، نسرین ایک بات پر بہت ناراض ہے اور وہ یہ ہے کہ تم نے جالندھر میں اس کے گھر جانے کی دعوت ٹھکرا دی ہے۔"

"نہیں ماں جی، نسرین اتنی اچھی بچی ہے کہ اس بات سے ناراض ہوتی ہی نہیں۔"

نسرین نے پھر نانی کے کان میں کچھ کہا اور وہ بولیں "بیٹا وہ کہتی ہے کہ نسرین اچھی بچی نہیں ہے۔"

یوسف نے کہا "ماں جی آپ اسے سمجھائیے کہ مَیں امرتسر تک اس کے ساتھ رہوں گا اور باتیں کرنے کے لیے کچھ اور وقت مل جائے گا۔ مَیں گھر پہنچتے ہی خط بھیجنا شروع کر دوں گا اور کسی دن میرے خط میں یہ لکھا ہوگا کہ میں فلاں فلاں دن فلاں گاڑی سے شہزادی صاحبہ کو سلام کرنے کے لیے جالندھر پہنچ رہا ہوں۔"

نسرین ہنس پڑی اور نانی نے کہا: "یہ تو بہت اچھا ہوا کہ امرتسر تک ساتھ ہے۔"

جب لاہور دس منٹ کے فاصلے پر رہ گیا تو یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے کہ اب مَیں عشاء کی نماز پڑھ ہی لوں تو بہتر ہے۔ اچھا نسرین تم یہ بتاؤ کہ تمہارے لیے کیا دعا مانگوں۔"

نانی نے نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بیٹا اس کے لیے یہ دعا مانگو کہ یہ پڑھائی میں زیادہ دلچسپی لے اور باتیں کم کرے!"

نسرین نے لال پیلے ہوتے ہوئے کہا: "میں کب زیادہ باتیں کرتی ہوں"! اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔

سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نانی نے کہا "مَیں تو مذاق کر رہی تھی۔"

"میں اب کوئی بات نہیں کروں گی۔"

"مجھ سے بھی بات نہیں کرو گی"۔ یوسف نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"ہاں، آپ سے بھی نہیں .... کسی سے بھی نہیں!!"

یوسف مسکراتا ہوا آگے بڑھ کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ جب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو اپنے بہن بھائیوں، عزیزوں کے ساتھ نسرین کا نام بھی شامل ہو چکا تھا۔

یوسف نے نماز سے فارغ ہو کر نسرین سے کہا "نسرین اللہ تعالیٰ سے تمہارے لیے مَیں نے بہت کچھ مانگا ہے۔"

بیگم احمد نے کہا: "بیٹا، اللہ نسرین کے لیے تم جیسے لوگوں کی دعائیں قبول فرمائے۔ یوں تو کبھی کبھی مَیں بھی اس کے جھگڑوں سے تنگ آ جاتی ہوں مگر میں اس کے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتی۔"

نسرین نے چونک کر کہا "مَیں کب جھگڑا کرتی ہوں نانی جان؟"

"بیٹی مَیں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے تمہارے جھگڑوں پر بھی پیار آتا ہے۔"

"پھر وہی بات نانی جان! مَیں کہتی ہوں کہ مَیں جھگڑا نہیں کرتی آپ ہمیشہ مجھ پر

الزام لگاتی ہیں۔"

" اچھا ... اب خاموش ہو جاؤ۔ لاہور آنے والا ہے ... اپنے بھائی سے باتیں کرو وُہ سمجھ رہے ہوں گے کہ تم ان سے روٹھ گئی ہو۔"

"نہیں، نانی جان وہ ایسا نہیں سمجھ سکتے انہیں معلوم ہے کہ مَیں ان سے نہیں روٹھ سکتی۔"

یوسف نے مُسکراتے ہوئے کہا: " نسرین ابھی تو تم مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم مجھ سے ناراض ہو چکی ہو۔"

" مَیں تو مذاق کر رہی تھی اور مجھے یہ معلوم تھا کہ آپ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ میں آپ سے مذاق کر رہی تھی۔"

" اچھا اب میرے پاس بیٹھ جاؤ اور مجھے اپنے اسکول کی باتیں سناؤ۔" نسرین نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا " واہ جی، ہمارے اسکول کی باتیں بھی کوئی سننے والی ہوتی ہیں۔"

"گھنٹی بجتی ہے۔ حاضری لگتی ہے، پھر اسکول کی کاپیاں دیکھی جاتی ہیں، سبق سنائے جاتے ہیں۔ کسی کو شاباش اور کسی کو "ویری گڈ" کہا جاتا ہے۔ اور کسی کی پٹائی ہو جاتی ہے۔ کسی کی پٹائی کی باری آتی ہے تو گھنٹی بج جاتی ہے، وہ سزا سے بچ جاتی ہے۔ بس اسی طرح ہوتا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ جلدی جلدی اسکول سے نجات ملے اور کسی کالج میں جاؤں، کہتے ہیں وہاں پٹائی وغیرہ نہیں ہوتی۔!"

" اچھا نسرین کبھی تمہاری پٹائی ہوتی ہے؟"

نسرین مسکرائی " واہ جی آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میری پٹائی ہوتی ہوگی میں تو ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں۔ نانی جان سے پوچھ لیجیے۔"

یوسف نے کہا " مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں، مجھے یقین ہے کہ آپ ہمیشہ فرسٹ آتی ہوں گی۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ اپنے خاندان کا نام روشن کریں گی

اور مجھے توقع ہے کہ کسی دن اخبار میں تمہاری تصویر دیکھ کر میں فخر سے کہوں گا کہ اس بھولی بھالی لڑکی کو مُدّت سے جانتا ہوں۔"

نسرین نے کہا " آپ کو یقین ہے کہ آپ مجھے بھول نہیں جائیں گے۔" مجھے یقین ہے کہ یہ سفر میری زندگی کا یادگار سفر ہوگا اور اس کی ایک ایک بات مجھے یاد رہے گی۔"

نسرین نے کچھ سوچ کر کہا۔" پھر آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ میں آپ کو دیکھ کر پہچان نہیں سکوں گی۔"

" ارے ... وہ تو مذاق تھا۔"

نسرین ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے اس کے معصوم چہرے میں ایک خاص قسم کی جاذبیت پیدا ہو جاتی تھی۔

باب ۔ ۹

لاہور پہنچ کرانہیں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ سامان قلی کے حوالے کرنے کے بعد وہ ٹہلتے ہوئے ایک خالی پلیٹ فارم کی طرف نکل گئے۔ بیگم فریدہ احمد، یوسف سے اس کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے متعلق پوچھتی رہیں لیکن نسرین خلاف توقع خاموش تھی کیونکہ کراچی سے آنے والی گاڑی کچھ دیر سے پہنچی اس لیے انہیں جالندھر کی گاڑی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور وہ جالندھر کی گاڑی پہنچتے ہی اس پر سوار ہو گئے۔ یوسف نے کہا "دیکھو نسرین تم ابھی تک غصے میں ہو اور اب تو ہم گاڑی بھی بدل رہے ہیں"۔ نسرین نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ بیگم فریدہ احمد نے کہا "بیٹا... نسرین غصے میں نہیں صرف اداس ہے۔ اگر تمہارا جلدی خط نہ آیا تو اس کی اداسی گھر والوں کو بہت پریشان کرے گی۔ اگر تم اسے یقین دلا سکو کہ تم بہت جلد جالندھر آؤ گے اور اسے خط بھی لکھتے رہو گے تو اس کا موڈ بالکل ٹھیک ہو جائے گا"۔

یوسف نے نسرین سے پوچھا "کیوں نسرین تمہیں میرے اس وعدے پر یقین نہیں کہ میں جالندھر ضرور آؤں گا اور تمہیں خط بھی لکھتا رہوں گا۔ نسرین صرف یہ جواب دے کر خاموش ہو گئی۔ "بھائی جان، میں دعا کیا کروں گی کہ آپ ضرور آئیں"۔

یوسف نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی نیت سے اپنے گاؤں کی دلچسپ باتیں سنانی شروع کر دیں۔ نسرین کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، لیکن یہ مسکراہٹ دلکش قہقہوں میں تبدیل نہ ہو سکی، پھر اس نے کہا "نسرین میرے دل میں ایک اور بات ہے۔ جب میں

گھر جا کر یہ بتاؤں گا کہ جالندھر میں ایک چھوٹی سی شہزادی رہتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ امی جان بھی تمہیں دیکھنے کے لیے میرے ساتھ چلی آئیں گی۔ تم خوش ہو گی نا میری امی کو دیکھ کر.... !"

"آپ سچ کہتے ہیں؟"

"میں تمہارے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا، میں کوشش کروں گا کہ امی جان، میرے ساتھ ضرور آئیں"۔

"آپ امی جان کو یہ بھی کہیں گے نا کہ میری امی جان اور فہمیدہ آپا کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گی"۔

بیگم احمد نے کہا "بیٹا یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے اگر ہمیں یہ اطلاع ملی کہ آپ اپنی امی کے ساتھ جالندھر آ رہے ہیں تو میں ان کے استقبال کے لیے وہاں پہنچ جاؤں گی"۔

اس کے بعد مسز احمد اپنی بیٹی صفیہ اور اس کے شوہر نصیر کے متعلق باتیں کرتیں اور یوسف کے رشتہ داروں اور عزیزوں کے متعلق مزید سوالات پوچھتی رہیں۔ امرتسر آ گیا اور جب تک گاڑی وہاں کھڑی رہی۔ یوسف ان سے باتیں کرتا رہا۔ گفتگو کے دوران اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ نسرین نے اچانک کہا: "بھائی جان! میں خدا سے ایک دعا مانگتی ہوں"۔ "ابھی میں یہ دعا کر رہی تھی کہ آپ یہاں سے اترنے کا خیال بھول جائیں اور گاڑی چل پڑے پھر آپ کو اترنے کا خیال اس وقت آئے جب گاڑی دور جا چکی ہو پھر یہ خیال آیا کہ آپ تو چلتی گاڑی سے چھلانگ بھی لگا سکتے ہیں۔ میں نے اللہ سے توبہ کی اور آپ سے معافی مانگتی ہوں"۔

نسرین! یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا: "تمہیں معلوم ہے کہ میں بھول جاتا تو مجھے خوشی ہوتی اور میں کبھی چلتی گاڑی سے چھلانگ نہ لگاتا"۔

گاڑی نے سیٹی بجائی اور نسرین نے کہا "بھائی جان گاڑی چل پڑی ہے"۔

"تم فکر نہ کرو" یوسف نے اپنا سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔

"ماں جی! خدا حافظ۔"

"نسرین خدا حافظ اور آپ اپنی امی، ابو اور اپنی آپا کو بھی میرا اسلام کہیے گا۔"

"بھائی جان گاڑی تیز ہو رہی ہے" وہ چلائی۔

یوسف اطمینان سے سوٹ کیس سمیت نیچے اتر گیا اور پلیٹ فارم پر ایک نوجوان کھڑا تھا وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور یوسف سے لپٹ گیا۔

نسرین گاڑی سے سر نکالے آوازیں دے رہی تھی۔ بھائی جان، بھائی جان . . . "

یوسف نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا لیکن اسے یہ موقع نہ ملا کہ وہ دوسرے نوجوان کی گرفت سے آزاد ہو کر بھاگے اور اُس کی بات سُنے۔ البتہ اس نے منہ اس طرف کر کے بے بسی کی حالت میں اپنا ہاتھ ہلانا شروع کر دیا اور نسرین جسے اس نے باہر سر نکالے دیکھا تھا اس کی نگاہوں سے اُوجھل ہو گئی۔ اس نے تلملا کر کہا احمق آدمی میرا ہینڈ بیگ آگے چلا گیا ہے؟

"بھئی، اگر آوازیں دینے والی لڑکی تمہیں جانتی ہے تو تمہیں اپنے ہینڈ بیگ کے متعلق اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے . . . اُسے آج ہی خط لکھ دو۔"

"یار منظور.. تم ہر بات، ہر کام بے وقت کرتے ہو۔"

"مَیں نہیں سمجھتا کہ اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز ہو گی لیکن اگر کوئی ایسی چیز ہے تو تم میرے ساتھ چلو جس اسٹیشن پر انہیں اترنا ہے میں اس کے اسٹیشن ماسٹر کو ریلوے پولیس کے دفتر سے فون کروا دوں گا۔ تمہیں صرف ان لوگوں کے متعلق بتانا پڑے گا جو لڑکی کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ایک سب انسپکٹر میرا رشتہ دار ہے اور میں پچھلے ہفتے سے اس کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ آج تم بھی میرے پاس ٹھہرو گے اور وہ تمہارا بیگ وہیں منگوا دیں گے۔"

"یار، گولی مارو اپنے رشتہ دار کو مَیں نے امرتسر پہنچ کر اُن سے اجازت اس لیے نہیں لی کہ یہاں رُک جاؤں گا۔"

"بھئی میں تمہاری پریشانی دور کرنا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کوئی پریشانی نہیں، اس بیگ میں کوئی قیمتی چیز نہیں تھی صرف ایک ایڈریس تھا جو وہیں رہ گیا۔"

"کس کا ایڈریس تھا؟"

"کسی کا تھا، تمہیں اس سے کیا۔"

"منظور نے گرم ہو کر کہا۔" یوسف صاحب آج کچھ زیادہ ہی موڈ خراب ہے آپ کا۔"

"میرا موڈ بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم بتاؤ کہ دھاریوال کی طرف جانے والی گاڑی میں کتنی دیر ہے۔"

"یار اس میں کافی وقت ہے ہم اطمینان سے ڈائننگ روم میں جا سکتے ہیں۔"

"ورنہ ویٹنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔"

"بھئی، میں بیٹھنا نہیں، ٹہلنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔" منظور نے اس کا سوٹ کیس پکڑتے ہوئے کہا۔

"چلو میں تمہارا سوٹ کیس پہلے کہیں رکھوا دیتا ہوں اس کے بعد ہم کافی دیر گھوم سکیں گے۔" یوسف اس کے ساتھ چل دیا۔ "سوڈا واٹر کے اسٹال پر منظور نے سوٹ کیس دکاندار کے سامنے رکھتے ہوئے کہا" بھئی، ہمیں ونٹو کی دو بوتلیں کھول دو اور اس سوٹ کیس کا خیال رکھو ہم کچھ دیر گھومنے کے بعد گاڑی پر سوار ہونے کے لیے پہنچ جائیں گے۔ یوسف نے ایک بوتل پی کر گلاس رکھ دیا تو منظور نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور اس نے بوتل کھول کر گلاس میں انڈیل دی۔

"بھئی نہیں مجھے اور نہیں چاہیے . . . یوسف نے کہا، لیکن منظور کے اصرار پر اس نے گلاس اٹھا لیا چند منٹ بعد وہ پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے اور یوسف کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد یوسف منظور سے بغلگیر ہو کر گاڑی پر سوار

ہو رہا تھا۔ گاڑی چل پڑی۔ یوسف کے ساتھ اس نے بھاگتے ہوئے کہا "یار مجھے موقع ملا تو کسی دن تمہارے گاؤں آؤں گا۔"

"بھائی ضرور آؤ لیکن اس وقت گاڑی سے ذرا دُور رہو۔"



چند منٹ بعد نسرین جب اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کر رہی تھی۔ "ارے پگلی"! نانی نے کہا۔ "مَیں جانتی ہوں کہ جو لوگ بچوں کے ساتھ اتنا پیار کرتے ہیں۔ وہ بہت اچھے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یوسف کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن تم روکیوں پڑی ہو؟ جو اتنا پیار کرتے ہوں ان کی یاد سے خوشی حاصل ہونا چاہیے۔"

نسرین نے ایک بیمار بچی کی طرح کچھ کہے بغیر اپنا سر جھکا لیا۔ پھر وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

"نانی جان! نانی جان! اُدھر دیکھئے۔ جس بات سے مجھے خوف محسوس ہوتا ہے وہ ہو کر رہتی ہے۔"

"کیا ہوا؟" نانی اماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"نانی جان! اُدھر دیکھئے۔ وہ اپنا ایک بیگ یہیں چھوڑ گئے ہیں"، "پھر کیا ہوا ہم ساتھ لے جائیں گے اور جب وہ آئے گا تو اُسے مل جائے گا۔ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے"۔ "جس نوٹ بک میں مَیں نے اپنا ایڈریس لکھ کر دیا تھا وہ بیگ میں تھی اب وہ ہمارے پاس کیسے آئے گا؟۔ شاید اُسے میری کچھ باتیں یاد رہ گئی ہوں!"

"اچھا اُس نے تم کو اپنا ایڈریس لکھ کر دیا تھا؟"

"نہیں نانی جان! اُس نے تو اپنے خط میں اپنا ایڈریس لکھ کر بھیجنا تھا۔"

"عجیب بے وقوف ہے وہ!"

"نہیں نہیں! نانی جان وہ بے وقوف نہیں تھا۔ میں بے وقوف تھی۔ یہ محسوس

کرتے ہوئے کہ غلطی ہو رہی ہے۔ مَیں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کیا غلطی ہو سکتی ہے؟"

"بیٹی اگر وہ احمق نہیں ہے تو میڈیکل کالج سے ایڈریس معلوم کر کے گھر تلاش کر لے گا۔ پھر وہ ایک ذہین لڑکا ہے اگر وہ ویسے بھی جالندھر پہنچ گیا تو کسی دِقّت کے بغیر ہمیں تلاش کر لے گا۔ اگر اسے کسی کا نام یاد نہ رہا ہو تو بھی اسے اتنا تو معلوم ہے تمہارا ایک چچا فوج میں ڈاکٹر دوسرا پولیس انسپکٹر اور ایک یہاں ڈاکٹری کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت گیا ہے۔"

نسرین قدرے اطمینان کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اُٹھ کر اُوپر سے بیگ اُٹھایا۔ اسے کھولا اور ضخیم نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا: دیکھئے نانی جان! اگر میں اسے کہتی کہ اس نوٹ بک پر اپنا ایڈریس بھی لکھ دو اور جانے سے پہلے وہ ورقہ پھاڑ کر وہ مجھے دے دیتا! تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ کتنی بے وقوف ہوں مَیں! پھر اُس نے صفحے اُلٹ کر دیکھا تو دائیں طرف کے چند صفحات پر "میرا بچپن" کے عنوان سے چند صفحات لکھے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے صفحے سے چند سطور پڑھیں۔ یہ الفاظ نہیں بلکہ محرک اور متحرک زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی تھیں۔

عام حالات میں وہ شور مچا دیتی۔ "نانی جان دیکھئے! اُس نے کیا لکھا ہے؟ ساری کاپی بھری ہوئی ہے نانی جان! یہ ایک کتاب ہے لیکن اب وہ بڑی مشکل سے اپنی زبان بند رکھنے اور دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نانی نے پوچھا۔

"بیٹی! اب بتاؤ۔ سیدھا میرے ساتھ لدھیانے چلو گی۔ یا تمہیں جالندھر تمہارے گھر چھوڑ کر جاؤں۔"

"دیکھئے نانی جان! بیس دن میں آپ کے ساتھ رہی ہوں۔ آپ اب اتنے ہی دن ہمارے گھر رہیں گی۔ اگر ہم پہاڑوں پر گئے تو آپ کو ساتھ جانا پڑے گا۔ ممکن ہے کہ ابا جان کو فرصت نہ ملے لیکن اگلے سال وہ ڈیرہ دون جانے کے پروگرام کو تبدیل نہیں کریں گے۔ یہ بھی

تو ممکن ہے کہ نانی جان اگلے سال شملہ جائیں اور آپ مجھے اور آپا فہمیدہ کو بلالیں آپ یہ تو کہہ سکیں گی کہ اپنی پیاری بچیوں کے بغیر میرا پہاڑوں پر جی نہیں لگے گا۔ اس سفر میں اگر فہمیدہ آپا ہمارے ساتھ ہوتی تو آپ کتنا خوش ہوتیں۔ پھر ان کی موجودگی میں ہمیں یہ پریشانی تو نہ ہوتی کہ وہ اپنے بیگ کے ساتھ ہمارا ایڈریس بھی چھوڑ گئے ہیں۔ نانی جان مجھے یقین ہے کہ اگر فہمیدہ آپا ہمارے ساتھ ہوتیں تو یوسف بھائی ہمیں جالندھر پہنچا کر واپس جاتے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دو دن ہمارے پاس گزارتے۔“



جالندھر اسٹیشن پر بیگم احمد نے قُلی کو سامان اتارنے کے لیے کہا اور نسرین نے جلدی سے بیگ اٹھا لیا۔ وہ گاڑی سے اُتر رہے تھے کہ ظہیر خان وہاں پہنچا اور اس نے نانی کو سلام کرنے کے بعد سر جھکاتے ہوئے کہا ”نانی جان آپا جان بھی آ رہی ہیں۔ اُن کے ساتھ نوکر بھی ہے۔“
نانی نے ظہیر کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا اب تو ہم نے قلی کو کہہ دیا ہے۔“

ایک قد آور آدمی جو سفید شلوار قمیص اور سر پر ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا مسافروں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آگے بڑھا اور اس نے کہا ” ماں جی ! السلام علیکم۔ ہم سب نے آنا تھا لیکن ان بادلوں کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ دوپہر سے تین چار بار بارش ہو چکی ہے اور اب بھی ایسا نظر آتا ہے یہ بادل رات کو ٹوٹ کر برسیں گے۔“

نسرین نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ” ابا جی ! وہ سیلاب جس سے ہم گزرے تھے بڑا خوفناک تھا۔“

باپ نے اُسے اُٹھا کر اپنے ساتھ چمٹا لیا اور بیگم فریدہ احمد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا: ”ماں جی ! خالدہ، حسن علی اور عمر یہاں آئے تھے اور پرسوں واپس چلے گئے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ آپ سیلاب سے گزر کر آ رہی ہیں تو وہ رک جاتے۔“

” بیٹا ! خدا کا شکر ہے کہ میں شکار پور سے واپس نہیں چلی گئی ورنہ وہ یہ کہتے تھے کہ

شاید کئی مہینے ریلوے لائن اور سڑکیں بند رہیں گی۔“

” ماں جی ! آپ نے بہت اچھا کیا۔“

چند منٹ بعد وہ تانگوں پر سوار ہو چکے تھے اور کوئی نصف گھنٹے بعد وہ تانگے سے اتر کر ایک مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ بوندا باندی آہستہ آہستہ تیز ہو گئی۔ ڈیوڑھی میں صفیہ ایک نوکرانی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بیگم فریدہ احمد کے ساتھ گلے لگ کر ملی۔ پھر اُس نے جھک کر نسرین کو پیار کیا اور وہ بڑے کمرے میں داخل ہو گئے۔ نانی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا: نصیر بیٹا ! تمہارے گھر روشنی کیوں اتنی مدھم ہے ؟“

نصیر نے پریشان ہو کر جواب دیا ” ماں جی ! روشنی تو اسی طرح کی ہے۔ اگر آپ کہیں تو ایک بڑا بلب لگوا دیا جاتے۔“

صفیہ نے کہا ” ماں جی ! روشنی پانچ منٹ میں تیز ہو جائے گی۔“

” بیٹی تو ٹھیک ہے نا !“

” امی جان میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

فہمیدہ برابر والے کمرے سے نمودار ہوئی۔ ”میں نماز پڑھ رہی تھی۔ نانی جان ! آج کافی دیر آپ کا انتظار کرتی رہی۔ پھر میں نے سوچا آپ کے آنے تک نماز پڑھ لیتی ہوں۔“
نانی نے اُٹھ کر اسے گلے لگا لیا اور پھر اس کا سر، اُس کی پیشانی، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں اور خوب صورت چہرہ چومنے لگی۔

” میری آنکھوں کی روشنی !“ میں نے سیلاب عبور کرنے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ میں کسی تاخیر کے بغیر تمہیں دیکھوں اور سفر کے دوران تم ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے تھیں۔ نسرین اٹھو۔ اپنی بہن کے ساتھ کھڑی ہو جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں وہاں سے نہ ہلنا۔“

نسرین مسکراتی ہوئی اٹھ کر اُس کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ ان کے والدین ہنسنے لگے اور

فہمیدہ کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھیلتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے سرخ و سفید چہرے اور اس کی چمکدار آنکھوں سے قہقہے پھوٹ نکلے۔

بیگم فریدہ نے کہا "بیٹی صفیہ! خدا ان کو نظرِ بد سے بچائے یہ دونوں شہزادیاں ہیں ایک چھوٹی اور ایک بڑی۔ اور جب میری تھکاوٹ دُور ہو جائے گی تو مَیں تمہیں اطمینان سے بتاؤں گی کہ میرے دماغ میں شہزادیوں کا خیال کیوں آیا ہے۔

"فہمیدہ! آؤ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

فہمیدہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی اور نانی نے اس کا سر اپنی گود میں لیتے ہوئے کہا:

"بیٹی! مَیں بہت اداس ہو گئی تھی تمہارے بغیر۔ تمہیں شہزادی کہلانا پسند ہے نا!"

نانی جان! اس نے جواب دیا۔ "مَیں صرف ایک بیٹی ہوں۔ آپ کی، امی کی اور ابو کی۔"

بیگم فریدہ بولی "بیٹی! تمہاری آواز، تمہارا قد و قامت، تمہارے ہاتھ، تمہارے بازو، تمہارے پاؤں اور تمہاری آنکھیں دیکھنے والے تمہیں، ہمیشہ ایک شہزادی سمجھیں گے۔"

فہمیدہ نے پریشان ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنی ماں سے کہا "امی جان! نانی جان کو بھوک لگی ہو گی، کھانا لگا دوں۔"

"ہاں بیٹی! لگا دو۔"

جب وہ کھانے کے کمرے کی طرف جا رہے تھے تو نصیر نے کہا "ماں جی! مَیں نے کبھی غور نہیں کیا لیکن آپ کی باتوں سے مجھے بھی یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ ایک غریب آدمی کے گھر شہزادیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

اور اگر خالدہ بہت بڑی نہ ہو چکی ہوتی تو میں کہتا، خالدہ ہماری بڑی شہزادی ہے۔"

صفیہ نے کہا "امی جان! ان کے لیے دعا کیا کریں۔"

"بیٹی! مَیں ہر سانس کے ساتھ ان کے لیے دعا کیا کرتی ہوں۔ فہمیدہ جتنی مجھے پیاری لگتی ہے اُسی قدر مجھے اس کی فکر رہتی ہے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کے لیے میری بہت

سی دعائیں قبول ہونے والی ہیں۔ دیکھو! نسرین سفر کے جو حالات بیان کرے انہیں اطمینان سے سننا، اُسے جھڑک نہ دینا۔"

کھانا کھانے کے بعد نسرین اور فہمیدہ بالاخانے کے ایک کمرے میں چلی گئیں، بارش اب تیز ہو چکی تھی اور کھڑکیوں سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ نسرین نے کہا:

"آپا جان! اگر مَیں نے باتیں شروع کر دیں تو آپ کو نیند نہیں آئے گی۔ اِس لیے آپ سو جائیں۔ میں اطمینان سے آپ کے ساتھ بڑی دلچسپ اور بڑی لمبی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"دیکھو نسرین! کئی دن میں تمہاری آواز نہ سننے کے باعث اداس ہو گئی تھی۔ اب تم جب تک چاہو، بولتی رہو۔ سکھر سے اباجان کو فون پر بتایا گیا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک بہادر اور قابلِ اعتماد آدمی نے سیلاب عبور کیا ہے اور امرتسر تک تمہارا ساتھ دے گا جس کی محمود علی اور اُس کی بیوی نے تعریف کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ امرتسر تک وہ تمہارے ساتھ سفر کرے گا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اگر وہ اتنا اچھا تھا تو نانی جان اسے ساتھ کیوں نہیں لائیں۔ ہمیں شکریہ کا موقع تو ملنا چاہیے تھا۔"

"نسرین بولی: آپا جان حیرت تو آپ کو اس وقت ہو گی جب آپ میری باتیں سنیں گی، مجھے اس بات کا کم افسوس نہیں کہ مَیں بھائی یوسف کو یہاں نہیں لا سکی۔ سارے سفر کے دوران مَیں یہ سوچتی رہی کہ کاش آپ میرے ساتھ ہوتیں اور اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتیں۔

پھر نسرین نے ابتداء سے آخر تک کے واقعات سنا دیئے۔

دوسرا حصّہ

مہکتی خاک اور ٹھنڈی نہریں

باب - ۱۰

رات دو بجے کے قریب یوسف گاڑی سے اُترا تو اسٹیشن پر چند آدمی جو اُسے لینے آئے ہوئے تھے۔ اُس کے گرد جمع ہو گئے کوئی اُس سے مصافحہ کر رہا تھا اور کوئی بغل گیر ہو رہا تھا۔ ایک لمبے تڑنگے سکھ نوجوان نے آگے بڑھ کر فوجی طریقے سے اسے سلیوٹ کیا۔ یوسف نے اُس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "ارے بہادر سنگھ! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" بہادر سنگھ نے جواب دیا: "جی کل آوارہ گردی کرتے ہوئے تمہارے گاؤں جا نکلا تھا وہاں سے معلوم ہوا کہ تمہارے آدمی دو دن سے رات کی گاڑی دیکھنے جاتے ہیں - اِس لیے آج میں بھی یہاں آگیا۔

"تم نے بہت پریشان کیا سب کو اگر کوئٹہ میں رک گئے تھے تو تار بھیج دیا ہوتا۔"

یوسف نے جواب دیا "شاید دریائے سندھ کا بند ٹوٹ جانے سے جو سیلاب آیا ہے، تم نے اُس کے متعلق نہیں سنا۔"

"یار وہ تو میں نے سنا ہے لیکن سیلاب تو کہیں شکارپور کے پاس آیا ہے۔" یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بھئی کوئٹہ سے آتے ہوئے شکارپور سے گزرنا پڑتا ہے اور شکارپور سے آگے ریلوے لائن ٹوٹ گئی تھی۔ اب بتاؤ فوج میں کب بھرتی ہوئے تھے۔"

"بھائی صاحب میں فوج میں بھرتی نہیں ہُوا۔ بھگوان کی کرپا سے مجھے پولیس میں نوکری مل گئی ہے۔

چودھری صاحب نے بھی میری بڑی مدد کی تھی وہ یہ کہتے تھے کہ تم بہت جلد اے ایس۔ آئی ہو جاؤ گے۔"

ایک آدمی نے یوسف کا سوٹ کیس اٹھا لیا اور اُس نے بہادر سنگھ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا: "اچھا بہادر سنگھ! بہت بہت شکریہ تم نے بڑی تکلیف کی۔ اب اپنے گھر جاکر آرام کرو۔

جب تم ڈیوٹی پہ جاؤ گے تو مَیں تمہیں رخصت کرنے آؤں گا" بہادر سنگھ نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا:

"تمہارے آنے کی خوشی مجھے نوکری مل جانے سے کم نہیں ہوگی۔ آج میں ہیڈ ماسٹر صاحب کو بھی سلام کرنے گیا تھا۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں"

"میں بھی انہیں بہت یاد کرتا ہوں" یوسف نے جواب دیا۔



گاؤں میں داخل ہونے کے بعد یوسف نے ایک نوجوان سے اپنا سوٹ کیس پکڑتے ہوئے کہا: "بھئی اب تم سب جاکر آرام کرو"

وہ سب منتشر ہوگئے اور یوسف حویلی کی ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔

سب سے پہلے اُس کی والدہ نیم وا دروازے سے باہر نکلیں اُس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا سر جھکا لیا۔ ماں نے اُس کا سر پکڑ کر اُس کی پیشانی آنکھوں اور گالوں پر بوسے دیئے۔ پھر دادی اور چچی اُس سے پیار کرنے لگیں۔

چھوٹے بھائی محمد صدیق نے اُس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لیتے ہوئے کہا "بھائی جان! مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں نا" یوسف نے پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "صدیق! جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو ہم اکٹھے جایا کریں گے اور امی جان بھی ہمارے ساتھ ہوا کریں گی۔ اب اگر میں تمہیں ساتھ لے جاتا تو امی جان کے پاس کون رہتا؟"

صدیق نے کہا "بھائی جان، عائشہ آدھی رات تک آپ کا انتظار کر کے سو گئی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ جب بھائی جان آئیں تو مجھے جگا دینا"

"نہیں اُسے سونے دو اور تم بھی سو جاؤ"

قدسیہ یہ کہہ کر یوسف کی طرف متوجہ ہوئی "بیٹا۔ میرا خیال ہے کہ سفر کرنے والوں کی نسبت انتظار کرنے والوں کو زیادہ تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔ میں ساری رات تمہاری خیریت کی دعائیں مانگا کرتی تھی اور مجھے دن کے وقت بھی نیند نہیں آتی تھی۔ کبھی کبھی جی میں آتا تھا کہ میں اُڑ کر کوئٹہ پہنچ جاؤں۔ بیٹا! تم نے اتنے دن میرے بغیر کیسے گزار لیے"

یوسف نے جواب دیا۔ "امی جان۔ مجھے معلوم نہیں کہ اتنے دن کیسے گزر گئے لیکن مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے آپ کی یاد سے بھی ایک سکون ملتا تھا۔ آپ جس قدر میری آنکھوں سے دُور ہوتی ہیں اتنا ہی میرے دل کے قریب ہوتی ہیں میں تصور میں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے آپ کو دیکھا کرتا تھا۔ آپ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ امی جان! اب آپ سو جائیں کل مَیں آپ کو بہت دلچسپ باتیں سناؤں گا"

"بیٹا! میرے لیے تمہاری ہر بات دلچسپ ہوتی ہے اور مَیں یہ چاہتی ہوں کہ تم بولتے رہو اور میں سنتی رہوں۔ تمہاری باتوں سے میری ساری تھکاوٹ دور ہو جائے گی اور وہ غصہ بھی جاتا رہے گا جو مجھے دو دن سے تم پر آرہا ہے"

"امی جان" یوسف نے کہا "آپ کا غصہ اتارنے کے لیے میرے پاس ایک بہت اہم چیز تھی۔ مَیں حیران ہوں۔ کہ آپ کو دیکھنے کے بعد وہ میرے ذہن سے کیسے نکل گئی" یوسف بھاگتا ہوا نیچے گیا اور دو منٹ بعد اس نے ایک ریشمی رومال میں لپٹی ہوئی عطر کی شیشی ماں کو دیتے ہوئے کہا۔ "امی جان عطر کی یہ شیشی اور ریشمی رومال اس خاتون کا تحفہ ہے جسے پہلی بار دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوا تھا کہ آپ کی شکل وصورت کے اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور میں نے پہلی ملاقات میں ہی اسے ماں جی کہنا شروع کر دیا! گلاب کا یہ عطر یقیناً بہت اچھا ہوگا اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ مَیں گھر پہنچتے ہی آپ کو پیش کر دوں گا۔ امی جان، اس معزز خاتون کے ساتھ ایک شہزادی بھی تھی"

ماں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کیا لگتی تھی وہ اس کی؟"

"جی امی جان . . . . وہ اس کی نواسی تھی۔ اگر آپ اس کو دیکھ لیں تو آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ ایک شہزادی کے سوا کچھ اور ہو سکتی ہے۔"

"بیٹا! جس خاتون کو تم نے دیکھتے ہی ماں کہہ دیا تھا اس کی یقیناً نواسی کوئی شہزادی ہو گی . . . کیا عمر تھی اس کی؟"

"امی جان وہ چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے لیکن بہت ہوشیار ہے۔"

"بیٹا میں پوچھ رہی ہوں عمر کیا تھی؟"

"یہی کوئی دس گیارہ سال کی ہو گی، میں نے ان سے کہا تھا کہ میری امی جان تمہیں دیکھنے کے لیے کسی دن جالندھر آئیں گی۔ امی جان اس کی نانی کہتی تھیں۔ اس شہزادی کی بڑی بہن فہمیدہ بھی ایک شہزادی ہے۔ امی جان مجھے یقین ہے کہ آپ ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

ماں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھ لیے اور یوسف کو کوئٹہ میں قیام اور اس کے بعد امرتسر تک سفر کے تمام واقعات بیان کرنے پڑے۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ ماں نے کہا "بیٹا خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ شہزادی جسے تم نے نہیں دیکھا میرے ان سپنوں کی تعبیر ہو گی جو میں ایک مدت سے دیکھا کرتی تھی۔ میں ان کے گھر ضرور جاؤں گی۔ تم صبح ہوتے ہی انہیں خط لکھ دو کہ میری ماں کو شہزادیاں دیکھنے کا بہت شوق ہے اس لیے ہم آپ کی طرف سے خط کا جواب ملتے ہی جالندھر پہنچ جائیں گے۔"

یوسف نے کچھ سوچ کر کہا "امی جان، میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میرا جو بیگ گاڑی میں رہ گیا تھا۔ اس کا ایڈریس اس کے اندر تھا مجھے صرف یہی یاد ہے کہ ان کی نانی کا نام بیگم فرید احمد تھا، نواسی کا نام نسرین تھا۔ نانی لدھیانہ میں رہتی ہیں اور نسرین کے والدین جالندھر میں رہتے ہیں۔"

"اور فہمیدہ بھی جالندھر میں . . . . ؟"

"جی ہاں اور کہاں ہو گی۔"

ماں نے کچھ سوچ کر کہا "ارے بیٹا یہ کون سا ایسا معمہ ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔ جب انہوں نے تمہیں اپنا ایڈریس دیا تھا تو تم نے بھی انہیں اپنا ایڈریس ضرور دیا ہو گا اور اگر وہ اتنے اچھے لوگ ہیں جتنا تم بیان کرتے ہو اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا ایڈریس تمہارے تھیلے میں پڑا ہوا ہے وہ بہت جلد تمہیں خط لکھیں گے۔"

یوسف نے کہا "امی جان یہی ایک حماقت تو مجھ سے ہوئی تھی کہ میں نے اپنا ایڈریس انہیں نہیں دیا۔ دادا جان مرحوم کہا کرتے تھے ہر بات میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے اگر ان سے ملنے میں ہماری کوئی بہتری ہے تو وہ ہمیں اور ہم انہیں تلاش کر لیں گے۔"

"ہاں بیٹا یہ کوئی مشکل بات تو نہیں تم کوئٹہ میں ان کے رشتہ داروں کو جانتے ہو اور جالندھر میں جس خاندان کا لڑکا ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گیا ہے اسے بڑی آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

"امی جان! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب مجھے اپنی تعلیم سے فرصت ملے گی ہم دونوں جگہ جگہ سیر کے لیے جایا کریں گے اور میرا پہلا کام یہ ہو گا کہ میں آپ کے ساتھ جالندھر جا کر انہیں تلاش کروں۔"

"اچھا بیٹا! اب تم اپنی چارپائی گھسیٹ کر برآمدے میں لے جاؤ اور نماز پڑھ کر اطمینان سے سو جاؤ۔ جب تک تمہاری نیند پوری نہیں ہو گی میں کسی کو اوپر نہیں آنے دوں گی۔ پریشان تو میں بہت ہوتی ہوں کہ تم اُن کا پتہ اپنے تھیلے میں چھوڑ آئے ہو، لیکن مجھے اس میں بھی اللہ کی کوئی حکمت نظر آتی ہے۔"

یوسف گہری نیند سے بیدار ہوا تو اس کی چھوٹی بہن عائشہ اس کے بستر کے قریب کھڑی تھی۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے کہا۔ "السلام علیکم بھائی جان! میں دو بار آپ کو جگانے کے لیے آئی ہوں۔ اگر اب بھی آپ اچانک کروٹ بدل کر آنکھیں نہ کھولتے

تو میں آپ کی نیند خراب کرنے کی جرأت نہ کرتی۔ بھائی جان! آپ یہیں منہ دھولیں تولیہ صابن اور پانی سب کچھ میں نے یہاں رکھ دیا ہے اور آپ کے لیے صاف کپڑوں کا جوڑا بھی کرسی پر پڑا ہے۔ میں جا کر انہیں کہتی ہوں کہ بھائی جان لباس تبدیل کر رہے ہیں۔ آپ کا بڑی دیر سے انتظار ہو رہا ہے۔"

"بھئی کون انتظار کر رہا ہے میرا؟" ۔ یوسف اٹھا اور لوٹا اٹھا کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

"جی وہی چھوٹے گاؤں والے۔ میرا مطلب ہے امینہ، اس کی امی اور ان کی ایک رشتہ دار —— ان کا نوکر ہر روز آپ کا پتہ کرنے آتا تھا اور وہ بھی امی جان کے پاس ہر دوسرے تیسرے دن آجایا کرتی ہیں۔ امینہ کی ماں کہتی تھیں میری بیٹی کو کھلی ہوا بہت پسند ہے۔ اِس لیے برسات کے دن وہ یہیں گزارنا چاہتی ہے۔ چھٹیاں بھی ہوتی ہیں نا بھائی جان برسات میں، اِس لیے۔ اچھا بھائی جان! میں نیچے جاتی ہوں۔ آپ جلدی آئیں ورنہ مجھے دادی جان کی ڈانٹ ڈپٹ سننا پڑے گی۔ وہ گھر میں سب سے ناراض ہیں کہ جب آپ آئے تھے تو انہیں اُسی وقت کیوں نہیں بتایا گیا۔ وہ بھی دو مرتبہ آپ کو دیکھ کر گئی ہیں۔"

دس منٹ بعد یوسف نیچے پہنچا۔ ایک طرف وسیع دالان کے سامنے کشادہ برآمدے میں اس کی والدہ، دادی، چچیوں کے پاس رشیدہ، اس کی بیٹی امینہ اور چراغ بی بی بیٹھی ہوئی تھیں۔ رشیدہ ایک ہٹی کٹی اور خوب کھانے والی جفاکش قسم کی عورت تھی۔ یوسف نے اُسے سلام کیا اور اُس نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹے! بیٹھ جاؤ۔ قدسیہ بہن، ان کا ناشتہ یہیں منگوا لو۔

"بہن اب تو کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ آپ کچھ دیر باتیں کریں۔ یوسف بیٹا تم دودھ پیو گے یا لسی؟"

یوسف نے کہا۔ "عائشہ میرے لیے لسی کا ایک گلاس لے آؤ نمک ڈال کر۔" پھر وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے امینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگ یہاں آئے اور میں

یہاں گھر میں موجود تھا مگر مجھے اطلاع ابھی ابھی ہوئی اِس لیے مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔"

"جی ہاں۔ گرمیوں کی ساری چھٹیاں یہیں گزارنی ہیں اور اگر کسی اور طرف نہ نکل گئے تو انشاء اللہ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ ہمارے نوکر نے صبح اطلاع دی تھی کہ آپ آ گئے ہیں اور امی جان آپ کو پوری فیملی کے ساتھ کھانے کی دعوت دینے چل پڑی ہیں۔ ابا جان چند دن کے لیے امرتسر اور لاہور چلے گئے ہیں ورنہ وہ خود یہاں آتے۔ چچی جان نے ہمیں یہ جواب دیا ہے کہ وہ آپ سے مشورہ کیے بغیر ہماری دعوت قبول کرنے کا فیصلہ نہیں کر سکتیں"

یوسف مسکرایا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ امی جان کا ہر فیصلہ میرے لیے حکم ہوتا ہے"۔

امینہ مسکرائی "یہ ہمیں معلوم ہے۔ لیکن آپ کے ہونے کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے"

امینہ کھلتے ہوئے سانولے رنگ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی ایک صحت مند لڑکی تھی۔ اِس وقت اِس کا قد و قامت بھی موزوں دکھائی دیتا تھا لیکن اس کے ہاتھ اس کے جسمانی تناسب سے قدرے چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ یوسف کی نگاہ اس کے ہاتھوں پر اِس لیے پڑ گئی تھی کہ اس نے ناخن ذرا بڑھا رکھے تھے اور ان پر سرخ پالش چڑھا رکھی تھی۔ یوسف کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

امینہ بولی۔ "یوسف صاحب فرمایئے دعوت کے لیے آپ کا موڈ کب تک ٹھیک ہو جائے گا؟"

"آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ امی جان کی کسی خواہش کے مقابلے میں میرے موڈ کے کوئی معنے ہو سکتے ہیں۔"

امینہ کی ماں بولی "واہ بھئی آپ کو یہ معلوم ہی نہیں کہ آپ کی امی آپ کو کتنا چاہتی ہیں اور آپ کے موڈ کو کس قدر اہمیت دیتی ہیں۔"

یوسف نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میری امی جان کو یہ بھی معلوم ہے کہ ان کا ہر اشارہ میرے لیے حکم کی حیثیت رکھتا ہے، اگر وہ ابھی کہہ دیتیں کہ آج دوپہر کے وقت

آپ کے ہاں دعوت ہے تو میرا موڈ اُسی وقت بن جاتا۔"

رشیدہ نے ہنستے ہوئے کہا "ناجی اتنی جلدی نہ کرو وہ جس جگہ رہتے ہیں، دعوت کرنا آسان نہیں۔"

امینہ نے کہا "یوسف صاحب یہ بات پکی ہو گئی کہ دعوت کی تاریخ پر ہمیں آپ کے موڈ کے متعلق کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اور اباجان کے واپس آتے ہی ہم آپ سب کی دعوت کریں گے۔"

"جی ہاں طے ہو گیا۔" یوسف نے جواب دیا۔

یوسف کی چچی نے کہا "بیٹا! تم نے چراغ بی بی سے کوئی بات نہیں کی، وُہ امینہ کے ماموں کی بیٹی ہے۔ ہمیں رشیدہ اور امینہ تو کبھی ملا کریں گی۔ وہ زیادہ تر اپنے گاؤں میں ہی رہا کرے گی۔"

یوسف کی ماں نے کہا "بیٹا! چراغ بی بی کے باپ نے میاں عبدالکریم کے کئی اور کاموں کے علاوہ ان کی زمین کا انتظام بھی سنبھال لیا ہے اور سنا ہے کہ میاں صاحب مزید زمین خریدنے کی فکر میں ہیں۔"

یوسف نے کہا "امی جان! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے ہمیں ایک طاقت ور ہمسایہ مل جائے گا۔"

یوسف کی دادی صحن سے نمودار ہوئی اور اس نے کہا "اری لڑکیو! مہمانوں کو کچھ کھلاؤ پلاؤ گی بھی یا باتیں ہی کرتی رہو گی۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا "دادی جان! آپ کے مہمان بھوکے نہیں رہیں گے۔"

دادی نے اس کے سر پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹا! اللہ تمہیں بہت عزت اور بہت ترقی دے۔ میں نے ان سب سے جھگڑا کیا تھا کہ جب بیٹا آیا تھا تو تم نے مجھے

بلایا کیوں نہیں تھا۔"

"دادی جان! مَیں نے آتے ہی کہا تھا کہ دادی جان کی نیند خراب نہ کی جائے۔"

"مکار کہیں کا۔ تمہیں معلوم ہے کہ مَیں کتنی بار یہ پوچھ چکی ہوں کہ تم بیدار ہوتے ہو کہ نہیں۔"

"دادی جان! آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ نے مجھے جگا دیا ہوتا۔"

"اور مَیں تمہاری نیند کیوں خراب کرتی۔"

"دادی جان! تھوڑی سی نیند خراب ہوتی اور اس کے عوض مجھے آپ سے سینکڑوں دعائیں ملتیں۔"

"اچھا تمہارا خیال ہے کہ تمہاری نیند خراب کیے بغیر میں تمہیں دعائیں نہیں دیتی۔" "دادی جان مَیں یہ تو نہیں کہتا لیکن آپ کی جو دعائیں میں نیم خوابی کی حالت میں سنا کرتا تھا وہ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔"

دادی نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا "قدسیہ بیٹی، تمہاری یہ بات بالکل صحیح ہے کہ تمہارے بیٹے کی پیشانی پر روشنی دکھائی دیتی ہے۔" امینہ نے اُٹھ کر کہا "دادی جان! آپ میرے پاس بیٹھ جائیں۔"

"رشیدہ! تمہاری لڑکی بڑی ذہین ہے" دادی نے امینہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے معلوم تھا کہ مَیں اس کے سوا کسی کے قریب نہیں بیٹھوں گی۔ مجھے بہت پیاری لگتی ہے یہ۔"



تھوڑی دیر بعد وہ کمرے کے اندر وسیع دسترخوان کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے جسے دیہاتی معیار کے مطابق کافی پرتکلف سمجھا جاتا تھا۔ کھانے میں میٹھے کی جگہ آموں سے بہتر کوئی چیز نہ تھی اور یوسف کا چچا غلام نبی علاقے کے باغات سے بہترین پودوں سے چنے والے آموں کا ایک ٹوکرا اٹھوا لایا تھا۔

جب مہمان خواتین جانے کے لیے اُٹھیں تو دادی نے کہا "یوسف جاؤ ان کو ان کے

گاؤں تک چھوڑ آؤ۔"

یوسف نے جواب دیا۔" دادی جان، مجھے کچھ تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔ اگر آپ حکم دیتی ہیں تو چل پڑتا ہوں ورنہ شاید تھوڑی دیر اور سونے سے میری طبیعت ٹھیک ہو جاتے۔"

"ارے بیٹا! تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم بالاخانے میں جا کر گرمی میں سو جاؤ۔ تپش لگ گئی ہے میرے چاند کو۔ جاؤ جا کر سو جاؤ۔ میں نائن اور اس کے بیٹے کو ان کے ساتھ بھیج دیتی ہوں۔"

یوسف نے کہا" اوپر والا کمرہ ہوادار ہے۔ مَیں ہوادار علاقوں سے گھوم کر آیا ہوں۔ نیچے گھٹن میں مجھے نیند نہیں آئے گی۔ اگر آپ حکم دیں تو میں باہر باغ میں چلا جاتا ہوں۔"

"بیٹا! جہاں چاہتے ہو جاؤ لیکن سو جاؤ۔ لڑکیو! تم کیا دیکھتی ہو۔ جاؤ نا اس کا سر دباؤ۔ گھر میں کدو کا روغن ہو گا۔ اس کی مالش کر دو۔"

"دادی جان! میں سونے سے بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اچھا جاؤ نا جلدی کرو۔ قدسیہ بیٹی! یہ کسی اور کی نہیں مانے گا۔ تم اپنے ہاتھ سے اس کے سر پر کدو کے روغن کی مالش کرو۔"

قدسیہ نے کہا" آؤ بیٹا! تمہاری دادی پریشان ہو رہی ہیں۔"

یوسف نے کہا۔" مہمانوں کو تو رخصت ہو لینے دیں۔ دادی جان۔"

یوسف کی چچیاں اور خاندان کی دوسری عورتیں بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کر رہی تھیں۔

"آؤ" دادی نے مہمانوں کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

وہ دادی کے پیچھے چل پڑیں باقی خواتین نے باہر کی ڈیوڑھی تک ان کا ساتھ دیا۔ وہ ڈیوڑھی میں باتیں کر رہی تھیں کہ نوکر نائن اور اس کے بیٹے کو لے کر پہنچ گیا اور وہ دادی کے بعد باری باری سب سے مل کر رخصت ہوئے۔ دادی واپس آئیں تو قدسیہ سیڑھیوں سے

نیچے اتر رہی تھی۔

"اری بیٹی! تمہیں کیا جلدی پڑی ہے میں نے کہا تھا۔ اس کے سر پر کدو کے روغن کی مالش کرو۔"

قدسیہ نے کہا" ماں جی وہ سو گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔" بیٹی! تم نے اچھی طرح دیکھا ہے۔ کہیں بخار تو نہیں تھا اُسے۔"

"ماں جی۔ اگر یوسف کو بخار ہو تو مجھے اچھی طرح دیکھے بغیر بھی معلوم ہو جاتا ہے آپ بالکل فکر نہ کریں۔ جب وہ بیدار ہو گا قہقہے لگاتا ہوا آپ کے پاس آئے گا۔"

"اچھا میں جا کر دعا کرتی ہوں۔"

دادی یہ کہہ کر یوسف کے چچا معین الدین کے گھر چلی گئیں۔

عصر کی نماز کے بعد قدسیہ اوپر گئی تو یوسف لیٹے لیٹے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ ماں اس کے قریب بیٹھ گئی اور پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ یوسف نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہیں اور آپ کسی بات پر بہت خوش ہیں۔"

"تمہاری دونوں باتیں صحیح ہیں بیٹا! میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم ان کے ساتھ نہیں گئے۔ خدا معلوم مجھے ان لوگوں سے کیوں الجھن محسوس ہوتی ہے۔"

"امی جان"! یوسف نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔" اگر آپ کی الجھن کا باعث وہ لڑکی ہے تو یہ الجھن ہمیشہ کے لیے دُور ہو جانی چاہیے لیکن میں حیران ہوں کہ آپ نے جلدی ان کی دعوت قبول کیوں کر لی۔"

"بیٹا! اگر میں دعوت قبول نہ کرتی تو دادی اماں فوراً ایسا فیصلہ سُنا دیتیں جو تمہارے ابا جان کے خیالات کی تائید میں ہوتا اور پھر میں کچھ نہ کر سکتی۔

"اباجان کے خیالات امی جان ......"

"بیٹا! میں یہ جانتی ہوں کہ وہ عبدالکریم کی دولت سے کتنے مرعوب ہیں، جس زمین کا ذکر تم نے آج سنا ہے اس کے متعلق تمہارے آبا جان کو تین ماہ سے معلوم تھا۔ وہ ایک دفعہ انہیں امرتسر اپنے گھر بھی لے گیا تھا اور دس دن کی چھٹی میں سے انہوں نے تین دن وہاں گزارے تھے اور گھر آکر اس کی شاندار دعوتوں کی بے حد تعریف کی تھی۔ ان کے جگہ جگہ پھیلے ہوتے کاروبار کا وہ اکثر ذکر کیا کرتے ہیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس کے بھٹوں کی تعداد کتنی ہے اور ان سے کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ تمہارے آبا جان کو وہ لاہور میں دو وسیع پلاٹ بھی دکھا چکے ہیں۔ جہاں دو عالی شان کوٹھیاں تعمیر ہونے والی ہیں ایک امینہ کے لیے اور دوسری اس کے بھائی کے لیے۔ بیٹا! مجھے اس بات سے خوف آتا ہے کہ ہمارے خاندان کے لوگ کہیں تمہیں جکڑ کر ان کے آگے نہ ڈال دیں۔ تمہاری دادی جان سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔ وہ تم سے بے حد پیار کرتی ہیں اور ابھی تم نے ہوش نہیں سنبھالا تھا کہ انہوں نے تمہاری منگنیاں شروع کر دی تھیں۔ انہیں اتنی لڑکیاں پسند آئی تھیں کہ میں تعداد بھی نہیں بتا سکتی۔ لیکن جب انہیں یہ بتا دیا جائے کہ یوسف کا اس میں فائدہ نہیں تو وہ فوراً اپنی سوچ کا رخ بدل لیتی ہیں۔ لیکن تمہارے اباجان سے میں بہت ڈرتی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایسی صورت حال پیدا کر دیں کہ تم جانتے اور سمجھتے ہوئے کوئی غلط فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔"

"امی جان! یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اباجان مجھ پر کوئی غلط فیصلہ نہیں ٹھونس سکتے۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

"بیٹا! جب تک میں زندہ ہوں انشا اللہ کوئی ایسا خطرہ پیش نہیں آئے گا لیکن مجھے سوچتے ہوئے بہت تکلیف ہوتی ہے کہ کسی دن تمہیں تنہا ایسے حالات کا مقابلہ نہ کرنا پڑے جو اس وقت تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتے۔"

"امی جان! آپ ایسی باتیں کیوں کہتی ہیں۔" یوسف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور ماں

کی گود میں سر رکھ کر ایک بچے کی طرح سسکیاں لینے لگا: "اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رکھے۔ امی جان آپ کو یہ سوچنا بھی نہیں چاہیے کہ جب میں آپ کے سایے سے محروم ہو جاؤں گا تو میں زندہ رہنا پسند کروں گا۔"

ماں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا "ارے! میرا شیر بیٹا رو رہا ہے۔ میں کتنی بے وقوف ہوں میں نے کیسی بات کہہ دی ہے۔ بیٹا! تمہارے ساتھ ہزار برس زندہ رہ کر میں دعا کروں گی یا اللہ مجھے اور زندگی دے۔ اب تم مطمئن ہو۔"

یوسف نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

باب ۔ ۱۱

چوتھے روز یوسف مغرب کی نماز کے بعد گاؤں سے باہر سیر کے لیے نکل گیا۔ اچانک مکئی اور کماد کے کھیتوں کی اوٹ میں پگڈنڈی سے ہر دیال سنگھ اس کا بیٹا جگجیت سنگھ اور چراغ بی بی نمودار ہوتے اور وہ انہیں دیکھ کر رک گیا۔ ہر دیال سنگھ جس کی عمر بیالیس سال سے اُوپر تھی۔ عبدالکریم کا مزارع تھا اور عبدالکریم کی جائداد کی دیکھ بھال میں اسے قائم دین کے ساتھ ایک ثانوی پوزیشن حاصل تھی۔ اس کا بیٹا جگجیت سنگھ عبدالکریم کی بیوی کو ماں جی امینہ کو آپا کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا تھا اور اُسے گھر کے چھوٹے موٹے کاموں کے عوض صاف ستھرے کپڑے ملتے تھے۔ ہر دیال سنگھ پسینے سے شرابور ہو کر بری طرح ہانپ رہا تھا۔ چراغ بی بی چند قدم پیچھے تھی اور بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کر رہی تھی۔ ابھی ہر دیال سنگھ بات کرنے کے لیے اپنی سانس درست کر رہا تھا۔ کہ اُس نے قریب آکر روتی آواز میں کہا چوہدری یوسف جی ہمیں بچائیے جگجیت سنگھ سے پوچھ لیجیے۔ ڈاکو آج رات ہمیں قتل کرنے اور لوٹنے کا فیصلہ کر چکے ہیں ۔ جگجیت سنگھ نہر کے کنارے درخت کے اُوپر چڑھ کر جامن اتار رہا تھا۔ ہمارے دشمن اور وہ ڈاکو ارجن سنگھ وہاں آگئے اور یہ خوف کے مارے چھپ گیا۔"

یوسف نے سر ہلا کر کہا۔" تم یا تو رو لو یا بات کر لو۔ یہ جامن کے ساتھ ڈاکوؤں کا کیا تعلق ہے اور چھپ کون گیا تھا؟"

چراغ بی بی نے دردناک آواز میں کہا۔" وہ ہمیں قتل کر دیں گے اور رات ہوتے ہی ہمارے گھر پر حملہ ہو جائے گا۔ مجھے امینہ نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ ابا شہر گیا ہوا ہے اور فضل دین

خدا جانے کہاں غرق ہو گیا ہے۔ میاں جی نے آج آنا ہے۔ خدا کرے وہ شام تک پہنچ جائیں لیکن آپ جگجیت سے پوچھ لیں کہ ڈاکو کتنے خطرناک ہیں۔"

چراغ بی بی پھر رو رہی تھی۔ یوسف نے کہا۔

" اب تم خاموش ہو جاؤ اور سیدھی ہمارے گھر چلی جاؤ اور وہاں کسی سے یہ بات نہ کرو کہ ہمارے گھر ڈاکہ پڑنے والا ہے۔ رونے کے لیے پیٹ درد یا سر درد کا بہانہ کر لینا۔ لیکن ڈاکوؤں کا ذکر نہ کرو۔ سُن لیا تم نے"

"جی نہیں کروں گی میں ڈاکوؤں کا ذکر۔"

" اچھا جگجیت، تم بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

جگجیت بولا" جی، چھوٹی بی بی جی کو جامن بہت پسند ہیں اور میں نہر کے قریب ایک درخت پر چڑھ کر جامن توڑ رہا تھا کہ مجھے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ ہمارے گاؤں کے دو آدمی گنگا سنگھ اور بشن سنگھ آموں کے باغ کی طرف سے نکل کر اس درخت کی چھاؤں میں رک گئے جس پر میں جامن توڑ رہا تھا، سوار نے گھوڑا روک کر اترتے ہوئے کہا۔ میرا خیال ہے کہ ہم تھوڑی دیر کے لیے یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔" میں نے تو انہیں دُور سے دیکھ کر ہی پہچان لیا تھا—— وہ ارجن سنگھ ڈاکو تھا جب وہ بیٹھ گئے تو ارجن سنگھ بولا"گنگا سنگھ! میرے چار آدمی رات ہوتے ہی تمہارے گھر پہنچ جائیں گے۔ تم نے اپنے بال بچوں کو اندھیرا ہوتے ہی بشن سنگھ کے گھر بھیج دینا ہے اور یہ بھی پتہ کر چھوڑنا کہ آج عبدالکریم واپس اپنے گھر آگیا ہے یا نہیں اور ان کی حویلی کے اندر کتنے آدمی ہیں اور ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں کون سی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔" اُس ڈاکو کو یہ بھی معلوم تھا کہ بڑی بی بی اور چھوٹی بی بی سونے کے زیور پہنتی ہیں اور اگر نیچے عبدالکریم اور قائم دین کو پکڑ لیا جائے تو اُوپر زینے کا دروازہ کھلوایا جا سکتا ہے۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ انہیں کہیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ میں درخت پر ان کی باتیں سن رہا ہوں۔ میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ کبھی کبھی ان کی باتیں بھی نہیں سنائی دیتی تھیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے

منہ سے چیخ نکل جائے گی اور مَیں نیچے گر پڑوں گا۔ جب وہ چلے گئے تو مَیں ڈرتے ڈرتے درخت سے اُترا اور سیدھا میاں جی کے گھر پہنچا۔ بڑی بی بی شاید میرا اعتبار نہ کرتی لیکن چھوٹی بی بی نیچے بیٹھی ہوئی تھی۔ جب مَیں نے ہانپتے کانپتے انہیں ساری باتیں بتائیں تو انہوں نے فوراً میرے پتا جی کو بلایا اور یہ کہا کہ ہم کسی سے اس کا ذکر نہ کریں اور فوراً یوسف صاحب کے پاس جائیں"۔ یوسف نے پوچھا۔

"اور چراغ بی بی کو بھی انہوں نے بھیجا تھا؟"

ہردیال سنگھ بولا "نہیں جی! جب میں بی بی جی سے باتیں کر رہا تھا تو اس نے زینے سے چیخیں مارنی شروع کر دیں اور پھر روتی ہوئی ہمارے ساتھ چل پڑی۔ مَیں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر چھوٹی بی بی نے کہا۔

"نہیں نہیں اسے لے جاؤ۔ اس کا جانا بہتر ہوگا۔"

یوسف نے مڑ کر چراغ بی بی کی طرف دیکھا اور کہا "چراغ بی بی تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو تمہیں معلوم نہیں کہ ڈاکو جس جگہ رونے کی آواز سنتے ہیں وہاں فوراً پہنچ جاتے ہیں۔"

چراغ بی بی نے منہ میں دوپٹہ ٹھونستے ہوئے کہا "جی میں بالکل نہیں روؤں گی۔"

یوسف نے کہا "ہردیال سنگھ! تم سب میرے ساتھ آؤ۔ مجھے گاؤں سے چند آدمی لے جانے پڑیں گے۔"

گھر پہنچ کر یوسف نے گاؤں کے دس آدمیوں کو جمع کر کے چند ہدایات دیں اور پھر ایک رقعہ لکھ کر بلو کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"بلو! تم فوراً تھانیدار کو میرا یہ رقعہ پہنچا دو اور شام ہونے سے پہلے واپس پہنچنے کی کوشش کرو۔ آج رات ہم نے ایک بہت بڑا شکار پکڑنا ہے۔" "میاں جی، شکار کے لیے میری برچھی کی ضرورت بھی ہوگی؟"

"ہاں لیکن اندھیرا ہونے سے پہلے ہم نے میاں عبدالکریم کے گاؤں پہنچ جانا ہے۔"

"میاں جی مَیں سورج ڈوبتے ہی یہاں پہنچ جاؤں گا۔"

یوسف نے باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم مہمان خانے میں بیٹھو، میں چراغ بی بی کو چھوڑ کر ابھی آتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ اپنی دادی، والدہ اور گھر کی دوسری خواتین کے سامنے کہہ رہا تھا۔

"چراغ بی بی کی طبیعت بہت خراب ہے یہ کسی بھوت سے ڈر گئی ہے اور اس خوف کا اثر یہ ہے کہ یہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چیخیں مارتی ہے۔ ایک دوائی سے اس کی طبیعت کچھ ٹھیک ہوگئی ہے لیکن چونکہ بھوت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے یہیں رہے گی۔ اگر بھوت زیادہ خطرناک ثابت ہوا اور اس نے دوبارہ چیخنا شروع کر دیا تو اسے پچھلی کوٹھڑی میں بند کر دیں۔"

"لیکن یہ یہاں کیسے پہنچی؟" دادی نے پوچھا۔

"دادی جان! اسے یہاں تک لانے کے لیے گاؤں سے دو آدمی آئے تھے۔"

چراغ بی بی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی لیکن یوسف کے سامنے کوئی بات نہ کر سکی۔

نو بجے کے قریب بارش شروع ہو چکی تھی اور گنگا سنگھ بے چینی سے اپنے مہمانوں کا انتظار کر رہا تھا۔ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا تو اس نے بھاگ کر کنڈی کھولی۔ اس کے ساتھ ہی دو آدمی جنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اندر داخل ہوئے اور ایک نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچ لی دوسرا اُسے دھکیلتا ہوا صحن سے آگے کمرے میں لے گیا۔ تیسرے آدمی نے اُسے آن کی آن میں رسّی سے جکڑ کر فرش پر ڈال دیا۔ اس کی پگڑی کا ایک سرا اس کے منہ میں اس طرح ٹھونس دیا کہ اس کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ دو منٹ میں یوسف کے علاوہ آٹھ آدمی وہاں جمع ہو چکے تھے۔ پھر کسی اور نے دروازہ کھٹکھٹایا اور تین آدمی اور ڈھاٹے باندھے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ صحن میں جو چار آدمی ڈھاٹے باندھے ہوئے کھڑے تھے انہیں کسی زور آزمائی کی ضرورت پیش نہ آئی۔ وہ اطمینان سے انہیں باقی ساتھیوں کے پاس لے گئے اور باندھ کر گنگا سنگھ کے پاس لٹا دیا۔ دس منٹ بعد دو اور ان کے قابو میں آ چکے تھے۔

پھر کوئی بس منٹ گزر گئے اور انہیں ارجن سنگھ کے متعلق مایوسی ہونے لگی۔ بارش میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بشن سنگھ نے اپنے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلا" سردار جی! آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں تو بارش میں کھڑے کھڑے ٹھٹھر رہا تھا۔ آپ کو اتنے آدمی جمع کرنے کی ضرورت نہ تھی۔"

"کیا بکتے ہو۔ میں نے صرف چار آدمی بھیجے ہیں"

"جناب! گنگا سنگھ نے اپنی کارگزاری دکھانے کے لیے زیادہ آدمی جمع کر لیے ہوں گے ورنہ یہاں تین چار آدمی بھی کافی تھے اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ سے مایوس ہو کر اندر بیٹھ گیا ہے۔"

"او گنگا سنگھ کے بچے!" ارجن سنگھ نے کہا "بے وقوف خاموش رہو۔ میاں عبدالکریم گاؤں میں آگیا ہے نا؟"

اندر سے دروازہ کھلا اور جگجیت سنگھ نے کہا "جی وہ آگیا ہے۔"

"میرے آدمی کہاں ہیں؟"

یوسف نے کہا۔ "آئیے، وہ اندر بیٹھے ہوتے ہیں۔"

"گنگا سنگھ کہاں ہے؟"

"جی وہ ان کے ساتھ باتیں کر رہا ہے۔"

"کن کے ساتھ باتیں کر رہا ہے؟"

"مہمانوں کے ساتھ"

"مہمان کون ہیں؟"

"جن کو اس نے مدد کے لیے بلایا ہے"

"وہ بڑا بدمعاش ہے۔"

"بدمعاش وہ ہوتا ہے جو رات کے وقت نہتے لوگوں کے گھر میں پستول لے کر پھرتا

ہے۔ لیکن اب تمہیں اپنا پستول پھینک دینا چاہیے۔ تیز برچھی تمہاری کمر کو چھو رہی ہے اور تمہارا ساتھی بشن سنگھ اگر دائیں بائیں دیکھ سکے تو اسے ایک نیزہ اور تلوار دکھائی دے گی۔ فضل دین اس کے ہاتھ سے پستول پکڑ لو۔"

ارجن سنگھ ایک ثانیہ تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا لیکن جب پیچھے سے بلّو نے برچھی کو ذرا دبایا تو اس نے بھرا ہوا پستول نیچے پھینک دیا۔ یوسف نے کہا "اس کی اچھی طرح تلاشی لو۔"

اب بلّو اور فضل دین دونوں اس کی اطمینان سے تلاشی لینے کے بعد ایک خنجر ایک چاقو اور اٹھائیس گولیاں برآمد کر چکے تھے۔ فضل دین ارجن سنگھ کے باقی ساتھیوں کو مضبوط رسّی کے ساتھ جکڑ چکا تھا لیکن وہ مطمئن نہ تھا وہ بھاگ کر گھر گیا اور ایک پلنگ کی نئی نواڑ کے دو بنڈل اٹھا کر لے آیا۔ اُس نے سب سے پہلے ارجن سنگھ کو باندھا پھر اس کے ساتھیوں کو دوبارہ کسا۔ اس کے بعد ان سب کو تھانے پہنچانے کے لیے حویلی کے اندر ایک گڈے پر ڈالا گیا تو باقی نواڑ استعمال کی گئی۔ حالت یہ تھی کہ ڈاکوؤں کے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوتے تھے۔ اور ارجن سنگھ کے ہاتھ بھی اس طرح باندھ دیئے گئے تھے کہ ایک سے دوسرا جدا نہ ہو سکے۔ گڈے پر ڈالتے وقت ان کے آرام کا بھی خیال کیا گیا تھا اور ان کے نیچے کچھ پرالی ڈال دی گئی تھی لیکن نواڑ کا جو حصہ بچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ گڈے کے تختے کے ساتھ اس طرح کس کر باندھ دیئے گئے تھے کہ ارجن سنگھ پیٹھ کے بل سب کے نیچے پڑا ہوا تھا اور باقی سب کا بوجھ اس کے اُوپر تھا۔

بارش تیز ہو چکی تھی اور پانی میں بھیگ جانے کے باعث نئی نواڑ کا کھچاؤ بتدریج زیادہ بڑھ رہا تھا۔ ارجن سنگھ اور اس کے ساتھی ایک ناقابل برداشت اذیت کی حالت میں دہائی دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے منہ فضل دین نے اس احتیاط سے بند کیے تھے کہ کسی کے حلق سے آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ یوسف نے جگجیت سنگھ کی حویلی کا دروازہ کھلوایا فضل دین سے کہا "تم جا کر

اپنی حویلی کا پھاٹک کھلواؤ۔ پولیس کے آنے تک یہ گڈا تمہاری حویلی میں رہے گا۔"

دس منٹ بعد عبدالکریم اور گاؤں کے دوسرے لوگ علاقے کے مشہور و معروف ڈاکو ارجن سنگھ کو ٹارچ کی روشنی میں ایک ناقابلِ یقین حالت میں دیکھ رہے تھے عبدالکریم نے سر پر چھتری تان رکھی تھی اور اس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اس نے اچانک جگجیت سنگھ کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! تم بہت بڑے انعام کے حق دار ہو لیکن چراغ بی بی تمہارے ساتھ گئی تھی اُسے ڈاکو پکڑ کر تو نہیں لے گئے؟"

یوسف نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: جی آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں اُسے اپنے گھر چھوڑ آیا ہوں"۔ پھر اس نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ تم ابھی تھانیدار کی طرف جا کر انہیں میرا سلام کہو اور یہ بتاؤ کہ ہم نے ڈاکو ارجن سنگھ اور اس کے چھ ساتھی پکڑ لیے ہیں اور انہیں تھانے بھیجا جا رہا ہے"۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! یہ بہتر نہیں ہے کہ پولیس ان خطرناک آدمیوں کو خود گرفتار کر کے یہاں سے لے جائے؟"

یوسف نے جواب دیا "اب یہ خطرناک نہیں ہیں۔ اب میرے آدمی تھانے تک ان کے ساتھ جائیں گے"۔

جگجیت سنگھ! تم مضبوط بیلوں کی ایک جوڑی لے آؤ"۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! ذرا اُوپر جا کر بچوں کو تسلی دے آؤ۔ انہیں یقین نہیں آتا کہ ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں۔

"آیئے" یوسف نے کہا اور عبدالکریم اس کے ساتھ چل دیا۔ امینہ اس کی ماں اور بھائی بالائی منزل کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ یوسف نے آگے بڑھ کر سلام کرنے کے بعد کہا "بچی جان! میں آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے آیا ہوں کہ ڈاکو ارجن سنگھ اور اس کے

چھ ساتھی نیچے گڈے کے اندر آپ کی نئی نوار سے اس طرح بندھے ہوئے پڑے ہیں کہ وہ سانس بھی نہیں لے سکتے"۔

"لیکن بیٹا یہ کیسے ہوا؟ مجھے تو فضل دین کی قسموں پر بھی یقین نہیں آ سکتا۔ وہ ایک ہی پلنگ کی نوار کافی سمجھتا تھا۔ میں نے زبردستی نوار کے دونوں نئے بنڈل اُسے دے دیئے تھے۔ یہ نوار میں نے پچھلے ہفتے ہی امرتسر سے منگوائی تھی"۔

"بچی جان! معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوار بنائی ہی ڈاکوؤں کے لیے گئی تھی۔ قائم دین نے اُسے اتنی احتیاط سے استعمال کیا ہے کہ وہ سانس بھی نہیں لے سکتے"۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! آپ نے ان ڈاکوؤں کو گرفتار ہی نہیں کیا بلکہ میرے گھر سے اکیس ہزار روپیہ نقد انعام حاصل کرنے سے انہیں محروم بھی کر دیا ہے۔ اب میں صبح ہوتے ہی اکیس ہزار روپیہ یہاں رکھنے کی بجائے قائم دین کے ہاتھ امرتسر واپس بھیج دوں گا یا گورداسپور کے بنک میں جمع کرا دوں گا اور سیٹھ دینا ناتھ کو اطلاع بھیج دوں گا کہ میں نے چند دن کے لیے زمین خریدنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے"۔

"کون سی زمین خریدنے کا ارادہ؟"

"بیٹا! سیٹھ دینا ناتھ نے اپنے گاؤں کے ایک زمیندار سورن سنگھ سے زمین کا سودا کروایا تھا اور کل میں نے رقم کی ادائیگی کے لیے گورداسپور پہنچنا تھا"۔

یوسف نے پوچھا "دینا ناتھ کو اس بات کا علم تھا کہ آپ آج رات رقم لے کر گھر پہنچ جائیں گے؟"

"ہاں میں اس کے ساتھ وعدہ کر کے آیا تھا۔ میں نے سورن سنگھ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ میں بنک سے کورے نوٹ لے کر آؤں گا"۔

امینہ نے کرسیاں گھسیٹ کر آگے کرتے ہوئے کہا۔

"جناب اگر ڈاکوؤں کے بھاگ جانے کا خطرہ نہیں تو آپ اطمینان سے بات کریں"۔

یوسف نے عبدالکریم کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "میاں صاحب! اگر دینا ناتھ کو یہ

معلوم تھا کہ آپ روپیہ لے کر آرہے ہیں تو آپ اُسے یہ بالکل نہ کہیں کہ آپ نے سودا ملتوی
کر دیا ہے بلکہ یہ لکھیں کہ آپ کا منشی پرسوں ایک ضروری کام سے فارغ ہوتے ہی رات کی
گاڑی پر رقم لے کر پہنچ جائے گا اور سردار سورن سنگھ کو خوش کرنے کے لیے نئے نوٹوں کے علاوہ
ایک ہزار چمکتے ہوتے نئے سکے بھی لیتا آئے گا۔

میاں جی! میں آپ کو یہ بعد میں بتاؤں گا کہ میں یہ کیوں کہہ رہا ہوں لیکن یہ بہت ضروری
ہے۔ ان ڈاکوؤں کے گرفتار ہو جانے سے بھی زیادہ ضروری۔ اگر دینا ناتھ یہ پوچھے کہ آپ پیسے ساتھ
لے کر کیوں نہیں آتے تو آپ اپنے منشی کا دیر سے بنک پہنچنے کا عذر یا کوئی اور بہانہ پیش کر دیں
آپ اپنے منشی کو بھی یہ خط لکھ دیں کہ وہ پرسوں رات گاڑی پر سوار ہو کر یہاں آنے کے لیے تیار
رہے۔ باقی ہدایات کے لیے ہمیں آپ کے نوکر فضل دین سے کام لینا پڑے گا۔ کیونکہ ہر بات
خط میں نہیں لکھی جا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکوؤں کی گرفتاری کا سن کر دینا ناتھ چند دن آپ کے پاس
آنے سے اجتناب کرے لیکن آپ کی کامیابی اس میں ہے کہ آپ اسے اس بات پر قائل کر لیں
کہ زمین خریدنے کے بارے میں آپ کے ارادے میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ "بھئی اس وقت میرا خیال
یہی ہے۔ اب تو میں اسے یہاں تک یقین دلاؤں گا کہ میں اس کی مدد سے چالیس پچاس ایکڑ
زمین اور بھی خریدنا چاہتا ہوں۔ اگر زمین کا کوئی اچھا ٹکڑا مل گیا تو میری کوشش یہ ہوگی کہ یہاں
بجلی بھی پہنچ جائے۔ ملاقات کے دوران اگر آپ اس کے ذہن میں یہ ڈال دیں کہ آپ کی وجہ سے
پولیس کے ساتھ اس کے چھوٹے موٹے کام آسانی سے نکل جایا کریں گے تو یہ اور بھی بہتر ہوگا۔

عبدالکریم نے کہا "بیٹا! میں سب سمجھتا ہوں۔ میں صبح دینا ناتھ کو ایسا خط لکھوں گا
کہ وہ بھاگتا ہوا یہاں آئے گا۔"

"چچا جی آپ کا منشی پرسوں رات رقم لے کر شام کی گاڑی پر سٹیشن پر پہنچ جائے گا اور
سورن سنگھ کے لیے نئے نوٹوں کے علاوہ ایک ہزار چمکتے ہوتے سکے بھی لائے گا۔ پھر
اگلی صبح گورداسپور کچہری میں رجسٹری کے وقت یہ رقم اس کے حوالے کی جائے گی۔"

"بیٹا! میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ قائم دین نے اوپر آکر کہا۔ "ہر دیال سنگھ نے گڈے
کے ساتھ بیل جوت دیئے ہیں اور فضل دین کہتا ہے شاید پولیس بھی آرہی ہے۔"

"بھئی شاید کا کیا مطلب؟"

"جی وہ یہ کہتا ہے کہ گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دے رہی ہے۔"

عبدالکریم نے کہا "گھوڑوں پر ڈاکو بھی آسکتے ہیں۔ یوسف نے اُٹھ کر بندوق سنبھالتے
ہوئے کہا "نہیں جی اب یہ خطرہ نہیں ہو سکتا۔ آپ اوپر سے دروازہ بند کر لیں۔ میں نیچے
دیکھتا ہوں۔"

پانچ منٹ بعد قائم دین نیچے سے آوازیں دے رہا تھا۔

"میاں جی، پولیس پہنچ گئی ہے۔"

عبدالکریم گلی میں پہنچا تو تھانیدار گھوڑے سے اُتر کر ٹارچ کی روشنی میں بندھے ہوئے
ڈاکوؤں کا معائنہ کر رہا تھا

"یار! مجھے تو ان کا سر پیر نظر نہیں آرہا۔"

فضل دین نے کہا "جناب، یہ سات آدمی ہیں۔ چار جو ارجن سنگھ کے ساتھ آئے تھے دو جو
اس گاؤں سے اس کے ساتھ ملے تھے اور جناب ساتواں ارجن سنگھ ہے۔"

"تھانیدار نے جھنجھلا کر کہا "کیا بکتے ہو؟ وہ ساتواں کہاں ہے؟"

"جناب، ساتواں نیچے ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے گڈے کے نیچے؟"

"نہیں جناب ساتواں ان کے نیچے ہے۔"

"کن کے نیچے؟"

"ان چھ کے نیچے جو اس کے اُوپر پڑے ہوتے ہیں۔"

"میں ٹارچ روشن کرتا ہوں۔ اگر آپ غور سے دیکھیں وہ تھوڑا بہت نظر آجائے گا۔"

"وہ زندہ ہے؟"

"جناب جب اُسے باندھا گیا تھا تب تو بالکل زندہ تھا۔ اب یہ دیکھنے کے لیے اسے کھولنا پڑے گا۔"

"ہم ان سب کو ہتھ کڑیاں لگانا چاہتے ہیں۔ تم انہیں ایک ایک کرکے کھولنا شروع کردو۔"

"جناب یہ ایک ایک کرکے نہیں کھلیں گے۔"

"کیا بکواس ہے۔ یہ ایک ایک کرکے کیوں نہیں کھلیں گے۔"

"جناب، یہ ایک ایک کرکے اس لیے نہیں کھلیں گے کہ مَیں نے انہیں اپنے ہاتھوں سے باندھا ہے۔" فضل دین نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

ہردیال سنگھ نے کہا۔ "سرکار یہ گڈے پر بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں وہیں رہنے دیں۔ اور گڈے کو اسی طرح تھانے لے چلیں۔ میاں یوسف کے آدمی ساتھ جائیں گے۔"

"میاں یوسف صاحب میاں عبدالرحیم کے صاحبزادے جنھوں نے مجھے رقعہ لکھا تھا۔ وہ یہیں ہیں؟"

یوسف نے اطمینان سے جواب دیا "تھانیدار صاحب، میں یہیں ہوں اور میرے خیال میں زیادہ مناسب یہی ہے کہ رات یہاں ہتھ کڑیاں لگا کر ان کے گرد پہرہ دینے کی بجائے انہیں تھانے بھیج دیں۔ میں دس قابلِ اعتماد آدمی اسی وقت آپ کے ساتھ روانہ کرسکتا ہوں اور اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو میں خود بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"میاں صاحب! بلّو کی باتیں سننے کے بعد مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ارجن سنگھ کو آپ نے گرفتار کرلیا ہے۔ میں نے اسی وقت گورداسپور کے انسپکٹر صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں نے ایس پی صاحب کو خبر دی تھی اور فوراً مجھے یہ حکم دیا تھا کہ میں خود جاکر تصدیق کروں کہ ارجن سنگھ کیسے گرفتار ہُوا۔ انسپکٹر صاحب کو میں نے آپ کا رقعہ ملنے کی بھی اطلاع دی تھی اور اس کے بعد

جب تک آپ کا آدمی دوبارہ میرے پاس نہیں آیا ان کے دو ٹیلیفون آچکے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کو اس کارگزاری پر ایک بڑا انعام ملے گا۔"

"مَیں نے جو کیا ہے وہ ایک فرض سمجھ کر کیا ہے اور انعام کے لیے مَیں اپنا ساتھ دینے والے کو آگے کروں گا۔"

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے کہا "جناب، مجھے تو یہ سانس لیتے ہوئے بھی دکھائی نہیں دیتے۔"

یوسف نے کہا "ان کے منہ سے کپڑے نکال دو۔"

فضل دین نے پوچھا "جی سب کے منہ سے؟"

"ہاں سب کے منہ سے۔"

"جناب میرا مطلب ہے ارجن سنگھ کے منہ سے بھی؟"

"ہاں۔ اس کا سانس لینا زیادہ ضروری ہے۔"

"اچھا جی۔ کام تو بہت مشکل ہے لیکن میں کوشش کرتا ہوں۔"

یوسف نے غصّے میں آکر کہا "کوشش نہیں یہ ضروری ہے۔"

فضل دین نے کہا "ہردیال سنگھ! میری مدد کرو ورنہ تم میاں جی سے جو نواڑ حاصل کرنا چاہتے ہو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گی۔

میں ٹارچ سے روشنی کرتا ہوں اور تم اس جگہ سے نواڑ کاٹ دو جہاں سے ہمارے ہاتھ ارجن سنگھ کے منہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ نقصان نہیں ہوگا۔"

یوسف نے تھانیدار، اے ایس آئی، ہیڈ کانسٹیبل اور پولیس کے آٹھ سپاہیوں سے کہا "چلیے میاں صاحب کی خواہش ہے کہ آپ اندر جاکر چائے پی لیں۔"

تھانیدار نے کہا "بھئی فضل دین، اگر اوپر کے دو تین آدمیوں کو ہتھ کڑیاں لگا دینے کے لیے جگہ بنالو تو ہماری تسلی ہوجائے گی اور ہم اطمینان سے میاں صاحب کی چائے پی لیں گے۔"

یوسف نے کہا " جناب میرے مسلح آدمی یہاں موجود ہیں اور اگر کوئی یہاں موجود نہ ہوتا تو بھی صرف بلّو ہی اپنی برچھی کے ساتھ کافی تھا۔"

چائے پر بیٹھتے ہوئے یوسف نے تھانیدار سے کہا۔

"جناب! آپ ان قیدیوں کو حوالات میں بھیجنے کی بجائے تفتیش کے سلسلے میں دو چار دن کے لیے تھانے میں روک سکتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ان کا جسمانی ریمانڈ لیا جا سکتا ہے۔"

"تو انسپکٹر صاحب سے میری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ان قیدیوں کو پانچ چھ روز کے لیے تھانے میں ہی رہنے دیں۔ سرِدست میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا لیکن یہ بہت ضروری ہے۔"

تھانیدار نے کہا یوسف صاحب! یہ تو اتنی معمولی سی بات ہے کہ اگر میں ٹیلی فون پر بھی کہہ دوں کہ یوسف صاحب کی یہ خواہش ہے کہ انہیں روک لیا جائے تو انہیں روک لیا جائے گا۔"

وہ چائے پی کر اٹھنے کو تھے کہ فضل دین بھاگتا ہُوا اندر آیا اور کہنے لگا۔

"جناب، وہ سب زندہ ہیں اور ارجن سنگھ بھی زندہ ہے لیکن بڑی گالیاں دیتا ہے"

"کس کو گالیاں دیتا ہے؟ ایک سپاہی نے پوچھا۔"

"جی باندھنے والے کو گالیاں دیتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک اسے میرا نام معلوم نہیں"۔ تھوڑی دیر بعد گڈا روانہ ہو چکا تھا۔ پولیس کے دو افسر اور نو سواروں کے علاوہ گاؤں کے آدمی اس کے ساتھ جا رہے تھے۔ یوسف نے عبدالکریم کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا " اچھا چچا مجھے اجازت دیجئے۔"

عبدالکریم نے کہا " بھئی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ باقی رات آپ یہیں رہیں گے۔"

" دیکھئے چچا جان میرا اس لیے جانا ضروری ہے کہ امّی جان پریشان ہوں گی اور چراغ بی بی

کو بھی تسلی دینا ضروری ہے۔ میں انشاء اللہ کل آپ سے ملوں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو بچوں کو چند دن کے لیے ہمارے گھر بھیج دیں کیونکہ اس واقعہ کے بعد ان کا خوفزدہ ہونا ایک قدرتی بات ہے۔"

"بیٹا اگر تم یہ نہ کہتے تو بھی میں یہی کرتا۔"

"چچا جی! آپ آرام سے سو جائیں۔ اب یہاں دوبارہ ڈاکوؤں کے حملے کا کوئی خطرہ نہیں تاہم میں چند اور آدمی آپ کے گاؤں کی حفاظت کے لیے بھیج دوں گا۔"

یوسف نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو عبدالکریم تذبذب کی حالت میں اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے کہا۔

" بیٹا یوسف! ذرا ٹھہرنا تمہاری چچی کچھ کہنا چاہتی ہے۔"

رشیدہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا " بیٹا یوسف! تمہارے چچا جس کام سے جھجک محسوس کرتے ہیں اس کے لیے مجھے آگے کر دیا کرتے ہیں۔ یہ لو بیٹا! ہم تمام عمر تمہاری نیکیوں کا صلہ نہیں دے سکتے لیکن ہماری خواہش ہے کہ یہ چھوٹا سا نذرانہ قبول کر لو۔"

رشیدہ نے ایک رومال میں بندھے ہوئے پانچ پانچ سو روپے کے دس نوٹ یوسف کو پیش کر دیے۔ یوسف نے تڑپ کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا " چچی جان! چچا جان! یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے مجھے کیا سمجھا ہے۔"

عبدالکریم نے کہا " بیٹا! تم نے روپے کے ساتھ ہماری عزّت اور جانیں بھی بچائی ہیں۔"

یوسف نے کہا۔ " چچا جی! میں نے جو کچھ کیا ہے وہ کسی معاوضے کے لیے نہیں کیا۔ رشیدہ نے مجھے سمجھایا تھا کہ میں آپ کو پانچ ہزار روپیہ پیش کر کے حماقت کر رہا ہوں۔ لیکن بیٹا یہ بات میرے ذہن میں نہیں آسکتی تھی کہ آپ میرے گھر سے خالی جائیں گے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو مجھے معاف کر دو۔"

یوسف نے کہا " چچی جی! میں خالی ہاتھ لے کر نہیں جا رہا۔ میں یہ یقین لے کر جا رہا

ہوں کہ اللہ نے مجھے کسی نیکی کی توفیق دی تھی۔"

رشیدہ بولی۔"لیکن بیٹا! آپ یہ تو نہیں چاہیں گے کہ مَیں آپ کے ساتھیوں کو کوئی انعام دوں۔"

"نہیں چچا جان!"

"جب ہم آپ کے گاؤں میں آئیں گے تو مَیں انہیں ایک ایک کر کے بلاؤں گا اور آپ انہیں کھلے دل سے انعام دے سکیں گے۔"

"اب مجھے اجازت دیجئے۔"

یوسف مصافحہ کر کے وہاں سے چل دیا۔ بارش تھم چکی تھی اور جسم کی گرمی سے اس کے کپڑے خشک ہو چکے تھے۔ گاؤں کی مسجد کے قریب پہنچ کر اس نے بلّو سے کہا۔

"بلّو! تم جاؤ اور ہمارے گھر سے روٹی منگوا کر کھانے کے بعد آرام کرو۔ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔"

جب وہ نماز پڑھ کر باہر نکلا تو بلّو دروازے سے چند قدم دُور کھڑا تھا۔

"بلّو، تم گئے نہیں؟"

"آپ کو معلوم تھا کہ مَیں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔"

چند منٹ بعد وہ ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہوتے ہوئے نوکر سے کہہ رہا تھا، "بلّو کو کھانا کھلا دو۔"

چراغ بی بی چند عورتوں کے درمیان چھت کے ایک حصّے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ گذشتہ چند گھنٹوں میں ڈاکوؤں، بھوتوں، چڑیلوں، جنوں اور سانپوں کے قصّے سُن کر کئی بار بیچارگی کی حالت میں آنسو بہا چکی تھی۔ اس سے اظہارِ ہمدردی کے لیے گاؤں کی وہ سیانی عورتیں بھی وہاں جمع ہو چکی تھیں جنہوں نے بذاتِ خود یا جن کے کسی جان پہچان والے نے اپنی آنکھوں سے کسی خوفناک چڑیل، کسی چھوٹے سے چھلاوے یا مہیب دیو کو دیکھا تھا۔ ایک ایسی بڑھیا کا

ذکر سن کر جس کھاٹ کے گرد سات خوفناک بھوت گدھوں کی صورت میں اپنی ٹانگوں کے ساتھ گھنگرو باندھ کر ناچا کرتے تھے، خوف سے چیخ مار کر بیہوش ہو گئی تھی۔ خوش قسمتی سے سائیں جی کا ایک مُرید اپنے تکیے میں موجود تھا۔ اُس نے اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار کر دم کیا اور اسے ہوش آ گیا۔ پھر اسے لیموں کے عرق میں پانی اور نمک ملا کر پلایا گیا تو وہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔ جب یوسف واپس آیا تو وہ اس سے کئی سوال پوچھنا چاہتی تھی۔ لیکن اس سے یوسف اتنا کہہ کر دوسری طرف چلا گیا کہ "انشاء اللہ صبح کو وہ سب یہاں آ جائیں گے۔ اور ڈاکو پکڑے جا چکے ہیں، ان کے متعلق فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

صبح ہوتے ہی میاں عبدالکریم اور اس کے بال بچّے یوسف کے گھر پہنچ گئے۔ قائم دین اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا اور تھوڑی دیر وہاں ٹھہر کر وہ یوسف کے چچا سے مشورہ کرنے کے بعد گھر کی حفاظت کے لیے ان کا ایک نوکر ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اپنی ماں کو رخصت کرتے ہوئے چراغ بی بی نے اچانک اس کے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر کے گھر کی عورتوں کو حیران کر دیا جن کا یہ خیال تھا کہ اب مُدّت تک اس کے دل پر ڈاکوؤں کا خوف طاری رہے گا۔

اس کے طرزِ عمل سے ان تمام باتوں کی نفی ہوتی تھی جو چراغ بی بی کے خوف و ہراس کے متعلق گھر کی لڑکیوں نے امینہ کو بتائی تھیں۔ امینہ کی ماں کو اس بات کا احساس ہُوا کہ وہ چڑ گئی ہے تو اس نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا "نہیں چراغ بی بی ہم تم کو نہیں جانے دیں گے۔ امینہ کا تمہارے بغیر جی نہیں لگے گا۔ کل پرسوں سب واپس چلے جائیں گے۔" چراغ بی بی کی ماں عالم بی بی نے کہا۔

"دیکھو لڑکی! جب شام ہو گی تو تم پھر چیخیں مارتی ہوئی واپس آ ؤ گی۔ آرام سے یہاں ہی رہو۔" چراغ بی بی کو اس کے تیور دیکھ کر کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔

یوسف باہر مہمان خانے میں عبدالکریم اور اس کے نوکر فضل دین سے تفصیلی باتیں کر رہا تھا۔ عبدالکریم اپنی کارگزاری کی پوری تفصیلات سنانا چاہتا تھا، لیکن یوسف نے یہ

کہہ کر بات مختصر کردی۔

"پہلے مجھے یہ بتایئے کہ انہوں نے آپ کو خط کا جواب کیا لکھا ہے۔ اگر وہ خط آپ کے پاس ہے تو میں پڑھ لیتا ہوں۔"

عبدالکریم نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر اُسے پیش کردیا۔

سیٹھ دینا ناتھ نے لکھا تھا "دوست مہربان جناب میاں عبدالکریم صاحب، شکر ہے کہ بھگوان کی کرپا نے آپ کو ڈاکوؤں سے بچا لیا۔ اس خوشی کے موقع پر آپ کو کچھ دان کرنا چاہیے۔ میں آپ کے حکم کے مطابق سردار سورن سنگھ کو لے کر پرسوں ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ امید ہے کہ ہم دوپہر تک رجسٹری کا کام ختم کرکے بس پر واپس آجائیں گے۔

زیادہ آداب

عبدالکریم نے اپنی جیب سے دوسرا خط نکالتے ہوئے کہا۔

برخوردار یہ بھی پڑھ لو۔ یہ اس خط کی نقل ہے جو میں نے اسے بھیجا تھا۔"

یوسف نے خط کھول کر اس پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحب! یہ آپ نے بہت ٹھیک کیا۔"

اس نے خط لپیٹ کر میاں صاحب کو واپس دیتے ہوئے فضل دین سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے منشی صاحب کے نام میاں صاحب کا خط لے لیا ہے۔"

"جی ہاں، انہوں نے زبانی مجھے ساری باتیں سمجھا دی ہیں۔"

عبدالکریم نے کہا "برخوردار میں نے اسے یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ لوہے کا ایک بھاری بکس لے کر آئے جس کو مضبوط تالا لگا ہوا ہو۔"

یوسف نے کہا۔ فضل دین، یہ تمہارا دوسرا کارنامہ ہوگا۔ تمہاری مدد کے لیے ہمارے آدمی ہر جگہ موجود ہوں گے۔ تم نے آرام سے اُترنا ہے۔ کچھ دیر کسی بہانے سٹیشن پر رُک جانا ہے اور نہیں تو پاس حلوائی کی دکان سے منشی کو گرم پکوڑے یا دودھ منگوا دینا

اور اُسے ویٹنگ روم میں بٹھا دینا۔ میاں صاحب کی ہدایت کے مطابق وہ امرتسر سے سیکنڈ کلاس میں آئے گا۔"

فضل دین نے کہا "جی میں سمجھ گیا ہوں۔"

"میاں جی یہ لڑکا بڑا ہوشیار ہے۔ ہماری تھوڑی سی نوازش ضائع ہوئی ہے، لیکن اس نے بہت سوچ کر یہ سب کچھ کیا ہے۔"

اچھا فضل دین تم جاؤ اور رات واپسی پر یہاں سے ہو کر جانا۔

یوسف عصر کی نماز کے بعد باہر کی حویلی میں اپنے چچا حیدر علی اور میاں عبدالکریم کے ساتھ ایک نئے اور کشادہ مکان کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وسیع صحن میں آم اور لیموں کے پودے تھے اور ایک کونے میں بیری کا ایک تن آور درخت تھا۔ نتو بھاگتا ہوا اندر آیا اور اس نے کہا "میاں جی، پولیس کا کوئی بڑا افسر آرہا ہے اور اس کے پیچھے حوالدار بھی ہے بڑے صاحب نے آتے ہی یہ پوچھا ہے کہ یوسف صاحب کہاں ہیں۔"

"اور تم اس کا گھوڑا پکڑ کے اور اسے اس طرف لانے کی بجائے وہاں سے بھاگ آتے ہو۔"

"نہیں جی، گھوڑے تو چوکیدار اور بوٹا عیسائی نے پکڑ لیے ہیں۔ حوالدار نے مجھے کہا تھا کہ فوراً بھاگ کر یوسف کو اطلاع کرو۔ حوالدار نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

یوسف اٹھ کر پھاٹک کی طرف بڑھا لیکن اتنی دیر میں ایک بارعب آدمی جو پولیس انسپکٹر کی وردی پہنے ہوئے تھا، اندر داخل ہوا۔ یوسف نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "جناب آپ غالباً انسپکٹر عبدالعزیز ہیں"!

آنے والے نے چند بار سر سے پاؤں تک یوسف کی طرف دیکھا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "میرے متعلق آپ کا اندازہ درست ہے لیکن اگر آپ کے نوکر مجھے یہ نہ بتاتے کہ آپ حویلی کے اندر موجود ہیں تو شاید میں آپ سے یہی پوچھتا کہ وہ بہادر

نوجوان کہاں ہے جس نے ایک انتہائی خطرناک ڈاکو کو گرفتار کیا ہے"۔

یوسف نے کہا" جناب یہ میرے چچا حیدر علی ہیں۔ یہ میاں عبدالکریم ہیں جن کے گھر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن آپ کے ساتھ شاید عملے کے کچھ لوگ اور بھی آئے ہیں"۔

"بھائی میرے ساتھ آنے والے کی فکر نہ کریں۔ میں نے اُسے باہر چارپائی پر بٹھا دیا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ وہ چوکیدار سے خاطر کروانا جانتا ہے۔ میرا مقصد صرف آپ کو مبارک باد دینا اور آپ سے چند باتیں کرنا ہے۔ آپ تشریف رکھیں"۔

"بلّو! بھاگ کر ہمارے نوکر سے کہو کہ لیموں کے شربت کا ایک جگ لے آئے اور پھر اس کے بعد چائے کا انتظام کر دے"۔

انسپکٹر نے کہا" بھئی ایک چیز کافی نہیں؟"

یوسف نے جواب دیا" نہیں جناب، شربت سے آپ کی پیاس بجھائی جائے گی اور اس کے بعد چائے سے آپ کی تھکاوٹ دُور ہو جائے گی"۔

عبدالعزیز نے کہا" ان دونوں چیزوں سے پہلے مجھے گھڑے کے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پلا دو"۔

یوسف نے اُٹھ کر قریب ہی پڑی ہوئی ایک مٹی کی صراحی اٹھائی اور یکے بعد دیگرے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس مہمان کو پیش کر دیے۔ جب تیسرا گلاس بھر کر پیش کرنے لگا تو عبدالعزیز نے کہا۔

نہیں بھئی ابھی نہیں یہ بعد میں پی لوں گا۔ آپ کا پانی ٹھنڈا بھی ہے اور میٹھا بھی، مَیں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی کارگزاری کی خبر آئی جی تک پہنچ چکی ہے اور ایس پی صاحب آپ پر بہت خوش ہیں۔ آپ کے لیے پولیس میں اور ترقی کا راستہ کھل گیا ہے"۔

یوسف نے جواب دیا" جناب، یہ جو کچھ ہُوا ہے اس میں میرا کوئی ذاتی مقصد

شامل نہیں تھا بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی ذاتی مقصد لے کر اس کام میں ہاتھ ڈالتا تو شاید معاملہ اتنی خوش اسلوبی سے انجام نہ پاتا"۔

بہر حال یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جسے کسی صورت میں حکومت نظر انداز نہیں کرے گی۔ آپ کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنے کے لیے سہولت فراہم کرنا پولیس کی ذمہ داری ہے۔ آپ اپنے ساتھیوں میں سے جن قابلِ اعتماد آدمیوں کی سفارش کریں گے انہیں بھی بندوق یا پستول کے لائسنس دے دیے جائیں گے۔ مَیں آپ کو یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی خواہش کے مطابق ہم نے تمام ملزموں کا ایک ہفتے کے لیے ریمانڈ لے لیا ہے اور اگر آپ نے ضرورت محسوس کی تو انہیں ہم مزید عرصے کے لیے بھی یہاں روک لیں گے"۔

یوسف نے کہا" جناب، جس مقصد کے لیے مَیں انہیں روکنا چاہتا تھا وہ انشاءاللہ بہت جلد پورا ہو جائے گا"۔

"آپ کو کسی مہم میں پولیس کے تعاون کی ضرورت ہے؟"

"جی ہاں، جن مقامی افسروں پر آپ پوری طرح اعتماد کر سکتے ہیں ان میں سے دو تین کو حکم دیں کہ وہ کل صبح نماز سے پہلے یہاں آئیں اور مجھ سے ملیں۔ میں خود تھانے اس لیے نہیں جانا چاہتا کہ میری بھاگ دوڑ سے ڈاکوؤں کے ساتھی چوکنے ہو جائیں گے"۔ عبدالعزیز نے کہا" مَیں سمجھ گیا۔ اب آپ سے یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ آپ کو ارجن سنگھ کی آمد کا پتہ کیسے چلا تھا"۔

یوسف نے کہا" جناب آپ کو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں لیکن دو دن بعد آپ ساری باتیں سنیں گے تو زیادہ لطف اندوز ہوں گے"۔

چائے کے دوران عبدالعزیز بار بار غور سے یوسف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چائے ختم کرنے کے بعد اس نے کہا" بیٹا یوسف، تمہیں دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں تمہاری والدہ اور بزرگوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اگر میری یہاں سے تبدیلی نہ ہوئی تو تم سے ملنے کے کئی مواقع

ملیں گے۔"

یوسف نے اس قوی الجثہ اور حلیم الطبع آدمی کو پہلی بار غور سے دیکھا اور کہا " سر، اس دنیا کا یہ بھی ایک المیہ ہے کہ جن لوگوں کو دیکھ کر ہمیں خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اچانک اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اگر ایس پی صاحب کے دل میں میری کوئی قدر و منزلت ہوئی اور مجھے کوئی انعام مانگنے کا موقع ملا تو میری پہلی اور آخری درخواست یہ ہوگی کہ انسپکٹر صاحب کو اس وقت تک یہاں رہنے دیا جائے جب تک کہ میں انہیں اچھی طرح نہیں دیکھ لیتا۔"

عبدالعزیز نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا "بیٹا، بات یہ ہے کہ ایس پی صاحب کی قدردانی کی وجہ سے ہی تو تبدیل کیا جا رہا ہوں، وہ خود تبدیل ہو رہے ہیں اور جس جگہ وہ جاتے ہیں مجھے ہمیشہ کچھ عرصہ پہلے وہاں بھیج دیتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد گاؤں کے آدمی حویلی سے باہر انسپکٹر عبدالعزیز اور حوالدار پریتم سنگھ کو گھوڑوں پر سوار ہوتا دیکھ رہے تھے۔

باب ۔ ۱۲

اگلی صبح یوسف گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گاؤں سے ایک میل دُور سردار بیلا سنگھ کے گاؤں پہنچا۔ لوگ بیلا سنگھ کی حویلی کو گاؤں سے باہر ایک کشادہ جھیل کے کنارے جایا کرتے تھے۔ اب اس گاؤں سے شہر کی طرف کھیتوں میں سے ایک مستقل راستہ بن گیا تھا۔

کھیتوں کے کنارے چلنے کی وجہ سے یہ راستہ ذرا لمبا ہو گیا تھا۔ لیکن اب لوگ اپنی عورتوں کے لیے یہی راستہ پسند کرتے تھے جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کبھی کبھی جھیل کا پانی گاؤں سے گزرنے والے راستے تک پہنچ جاتا تھا۔ سردار بیلا سنگھ نے لوگوں کی سہولت کے لیے کنارے کی مینڈھ کا کچھ حصہ اُونچا کر دیا تھا، لیکن اس کے کتے دُور سے آنے والے مسافروں کی بُو پا کر ہی بھونکنا شروع کر دیتے تھے اور کئی نسلوں کے کتوں کی مختلف آوازیں ایک ایسا سماں پیدا کرتی تھیں کہ لوگ گاؤں سے دُور ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ اِس لیے پڑوس کے دیہات کو اِس بات کا بہت کم علم ہوتا تھا کہ بیلا سنگھ کے گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔

یوسف نے جھیل کے دوسرے کنارے چکر لگانے کے بعد سردار بیلا سنگھ کی حویلی کے پھاٹک کے سامنے گھوڑا روکا اور کتے پورے زور شور سے بھونکنے لگے۔ یوسف گھوڑے سے اُترا اور اطمینان سے حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔

کشادہ صحن سے ایک نوجوان اور صحت مند لڑکی بھاگ کر آگے بڑھی اور اُس نے بلا جھجک اُس کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہا۔" ویرجی ! آپ کیسے راستہ بھول گئے ۔ وہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے یوسف کی طرف دیکھ کر اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی - ویرجی اگر آپ میرا نام بھول گئے ہیں تو بتا دوں؟

"جیتو چڑیل میں تمہارا نام کیسے بھول سکتا ہوں ۔ اپنے پتاجی کو بلاؤ۔"

"وہ اندر ہیں ۔ آپ سیدھے اندر چلے جائیں۔ وہ ابھی شکار کھیل کر آئے ہیں اور آپ میرا نام تو سیدھی طرح لیا کریں۔"

یوسف نے گھوڑے کی رسّی کھولتے ہوئے کہا۔"ہاں بہن اجیت کور مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا کہ اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ مَیں گھوڑا باندھتا ہوں تم جاکر اپنے پتاجی کو بتا دو کہ مَیں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

" ویرجی میں اتنی بڑی تو نہیں ہوگئی کہ آپ مجھے جیتو نہ کہہ سکیں ۔ کُتّے پتاجی کو خبر دے چکے ہیں کہ کوئی آیا ہے۔ میں گھوڑا باندھ دیتی ہوں آپ سیدھے اندر چلے جائیں وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے ۔ وُہ خود بھی آپ کے گھر جانا چاہتے تھے اور ماں جی تو بہت ہی خوش ہوں گی۔"

یوسف نے جلدی سے گھوڑے کا رسا کھونٹے سے باندھ دیا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہُوا حویلی کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔

سردار بیلا سنگھ بیری کے درخت کی چھاؤں میں ایک بھاری پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا اور اُس کا نوکر بُڈھا سنگھ اُس کے پاؤں دبا رہا تھا۔

وہ یوسف کو دیکھتے ہی اُٹھا اور ننگے پاؤں بھاگ کر اُس سے لپٹ کر بلند آواز میں بولا۔" اجیت کی ماں ۔ دیکھو کون آیا ہے"۔ اجیت کی ماں صحن کے کونے میں دری پر تین عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور ایک اُس کے

کھُلے بالوں کو کنگھی کر رہی تھی ۔ اس کی بیٹی بھاگتی ہوئی اُس کے قریب پہنچی اور بولی" ماں جی ! اُٹھ کر دیکھو تو سہی آپ کل سے اپنے شیر بھتیجے کو یاد کر رہی تھیں۔

ہرنام کور نے جلدی سے اپنے بال درست کیے اور سر پہ چادر لے کر آگے بڑھی اور اپنے دونوں ہاتھ یوسف کے سر پر رکھتے ہوئے بولی۔"آج چاند کہاں سے نکل آیا ہے۔ میرے سوہنے ، میرے گھبرو ، میرے شیر بھتیجے مَیں کل سے تمہارے گھر جاکر تمہاری ماں جی کو سلام کرنے کا سوچ رہی تھی ۔ او جیتو! اپنے ویر کے لئے دودھ لاؤ"۔

اجیت کور نے قریب آکر کہا۔"ماں جی! بھائی یوسف اس وقت دودھ نہیں پیا کرتا"

بیلا سنگھ نے کہا"بے وقوف دودھ ہر وقت پیا جاسکتا ہے اور دودھ سے بہتر کیا ہے ہمارے گھر میں تمہارے بھائی کے لئے"۔

"پتاجی ! یہ صبح ناشتے کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ دوپہر کے وقت لسّی، سادہ پانی یا لیموں کا شربت پیتے ہیں۔ شام کو چائے پیتے ہیں اور رات کو سوتے وقت دودھ پیتے ہیں"۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ یہ دودھ کس وقت پیتے ہیں اور کس وقت نہیں پیتے؟

"پتاجی اگر ویرجی ہمارے گھر نہیں آتے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ انہوں نے بہنوں کے لیے اپنے گھر کے دروازے بند کر لیے ہیں۔ میں دوڑا کرتی تھی تو سیدھی ان کے گھر جاتی تھی۔ ان کی ماں، چچیاں، بہنیں اور دادی سب مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اس لیے مجھے بھائی کی سب عادتیں معلوم ہیں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں کی لڑکیاں ان سے بہت ڈرتی تھیں لیکن میں اِن سے نہیں ڈرتی تھی ۔ پتاجی! مَیں آج بھی ان سے نہیں ڈرتی تھی۔ اگرچہ یہ مدّت کے بعد ہمارے گھر آئے ہیں"۔

"بھئی آج ان سے ڈرنے کی خاص بات کیا تھی"۔

"پتاجی! آپ ہی تو کہتے تھے کہ میرے شیر بھتیجے نے ڈاکو ارجن سنگھ کو گرفتار کیا ہے"

اب اِس علاقے پر اس کا رعب چھا جائے گا۔"

"پھر تم اِن سے ڈری کیوں نہیں۔"

"پتاجی میں اِن کی چڑیل بہن ہوں اِس لیے۔"

"اچھا تم جاؤ ہمیں باتیں کرنے دو۔" بیلا سنگھ نے یوسف کو بازو سے پکڑ کر کھاٹ پر بٹھاتے ہوئے کہا — "یار یوسف، آنا تو مجھے چاہیے تھا اور میں یہ خبریں سُن کر بے چین بھی ہوا تھا لیکن مَیں نے سوچا کہ جب تک تم میں سے کوئی نہ بلائے مجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ اگر مجھے کسی لڑائی کی اطلاع ہوتی تو مَیں اپنی برچھی چمکاتا اور بھاگتا ہُوا وہاں پہنچ جاتا۔"

"نہیں چچا، یہ ایک ایسا کام تھا جس کے لیے لڑائی کی ضرورت نہیں تھی اور اب بھی جس کام کے لیے میں آپ کے پاس آیا ہوں اس کے لیے کسی لڑائی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"او یار کام بتاؤ۔ مَیں یہ سوچ لوں گا کہ لڑائی کی ضرورت ہے کہ نہیں۔"

"چچا! بات یہ ہے کہ اب ایک بڑا شکار پکڑا جانے والا ہے۔"

"یار، اس کا نام بتا دو۔ ساری بات میری سمجھ میں آجائے گی۔ یہ ڈاکوؤں کی پارٹی کا کوئی اور آدمی تو نہیں؟"

"چچا، ڈاکو بھی پکڑے جائیں گے مگر بڑے شکار کو آپ بھی بڑا شکار ہی کہیں گے۔ آج آپ شکار سے کچھ تھک کر تو نہیں آئے؟"

"نہیں یار، شکار کہاں ہوتا ہے آج کل۔ لیکن یہ کُتے چند دن گوشت نہ کھائیں تو بیمار ہو جاتے ہیں۔ میں صبح ان کتوں کو لے کر نکلا تھا اور انھوں نے جو گیدڑ، خرگوش، بلّے مارے ہیں وہ انھی کے کام آئیں گے۔ آج کل اگر کبھی مچھلیوں کا شوق ہو تو مجھے پیغام بھیج دیا کرو۔ اب بڑے شکار کے متعلق بتاؤ۔"

یوسف نے کہا۔ "چچا، ڈاکوؤں کو یہ معلوم ہے کہ کل شام کی گاڑی پر امرتسر کی طرف سے ایک مالدار آدمی کا منشی ایک بڑی رقم لے کر آئے گا اور وہ راستے میں اُسے لُوٹنے کی کوشش کریں گے۔ ہم نے پولیس کی مدد سے ان ڈاکوؤں کو پکڑنا ہے۔"

بیلا سنگھ نے کہا۔ "یار میرے ساتھ سیدھی بات کیا کرو۔ یہ تو میں سمجھ گیا ہوں کہ ایسا مالدار آدمی عبدالکریم ہی ہوگا لیکن مجھے صاف بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"چچا عبدالکریم کا نوکر اور ہمارے چند آدمی اُس کے منشی کو اسٹیشن لینے جائیں گے چونکہ اب کچھ دنوں کے لیے وہ اور اُس کے بال بچے ہمارے گھر ہی رہیں گے۔ ڈاکو راستے پر کسی جگہ واردات کریں گے۔ یہ جگہ اسٹیشن سے پرانی نہر تک ہو سکتی ہے۔ راستے میں سردار مہنگا سنگھ کی حویلی بھی آتی ہے۔ آپ کے پاس ایسے کتے ہیں جن کو مہنگا سنگھ کی حویلی کے اندر بٹھا دیا جائے اور ضرورت کے وقت ان سے کام لیا جائے۔ میرا مطلب ہے۔ وہ بلاوجہ بھونکنا شروع کر دیں۔"

بیلا سنگھ بولا، "او بھتیجے میں تمھارا مطلب سمجھ گیا ہوں، میرے پاس آٹھ کُتے ایسے ہیں جو خاموشی سے میرے آدمیوں کے ساتھ رہیں گے اور وُہ صرف اسی وقت حملہ کریں گے جب انھیں شُشکارا جائے گا تمھیں جس جس جگہ حملے کا خطرہ ہوگا وہاں آس پاس ہم دو دو کُتے چھپا دیں گے۔ تم نے میری کتوں والی حویلی نہیں دیکھی چلو وہاں بارہ کتے ایسے ہیں جنھیں ہم نہر سے کچھ دُور بٹھا دیں گے۔ جب دوسرے کتے بھونکیں گے تو انھیں چھوڑ دیا جائے گا۔ پھر تم ایک عجیب تماشا دیکھو گے۔ چلو پہلے میرے کُتے دیکھ لو۔"

"چچا میں نے آپ کے کتے دیکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کے پاس چند ٹارچیں ضرور ہونی چاہئیں تاکہ میرے آدمیوں سے کتے چھوڑنے میں غلطی نہ ہو جائے۔"

"چچا یہ بندوبست میں پہلے کر چکا ہوں۔ جب گاڑی سے عبدالکریم کا منشی اُترے

گا تو میرے آدمیوں کے علاوہ پولیس کے آدمی بھی ساتھ چل پڑیں گے اور ان میں سے چند آدمیوں کے ہاتھ میں ٹارچیں ہوں گی۔ ڈاکو کسی مکئی یا کماد کے کھیت سے نکل کر حملہ کریں گے اور ان کی طرف ٹارچ کی روشنیاں کر دی جائیں گی۔ ہمارے باقی ساتھی مہنگا سنگھ کی حویلی میں ہوں گے۔ حوالدار صبح میرے پاس آیا تھا اور میں نے تمام پلان سمجھا دیا تھا۔ آپ ایک اور خبر سن کر خوش ہوں گے کہ وہ بہادر سنگھ جو آپ کا شکار دیکھنے آیا کرتا تھا۔ یہاں پہنچ جائے گا۔"

"یار وہ لڑکا جو پولیس میں بھرتی ہوا تھا۔ اس کی ترقی ہوئی کہ نہیں۔"

یوسف نے کہا "وہ ڈیرہ بابا نانک کے تھانے میں ہے وہاں سے وہ چار آدمی اپنے ساتھ لیکر آئیگا۔ میں نے اپنے تھانے دار سے اسے بلانے کے لیے کہا تھا اور اُس نے انسپکٹر سے کہہ کر اُسے یہاں بلا لیا ہے۔"

"اچھا اب تم اِس بڑے شکار کے متعلق بتاؤ گے یا نہیں بتاؤ گے وہ بھی پکڑا جائے گا یا نہیں۔"

بڑے شکار کو آپ دو تین روز میں دیکھ لیں گے اور حیران رہ جائیں گے۔"

"یار نام نہیں بتاؤ گے اُس کا؟"

"چاچا ابھی یہ آپ کسی پر ظاہر نہ کریں۔ ابھی میں آپ کو نہ بتاؤں تو بہتر ہو گا میں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

"اچھا جی، اگر بہت زیادہ خوشی کی بات ہے تو میں دو تین دِن صبر کر لیتا ہوں ورنہ تکلیف تو بڑی ہو گی اس بات سے کہ جو چیز مجھے پہلے معلوم ہو سکتی تھی وہ دو دن بعد میں معلوم ہو گی۔ لیموں تو ہمارے باغ میں ملیں گے نہیں۔ ٹھنڈا پانی پی لو اور شہر سے تمہیں سوڈا واٹر کی تین چار بوتلیں پلا دوں گا۔ جیتو پانی لاؤ ٹھنڈا جلدی کرو۔"

اجیت ٹھنڈے پانی کا ایک بڑا گلاس لائی اور یوسف نے پینے کے بعد کہا۔

" چچا میں شہر نہیں جا رہا اور کل تک مجھے جانا بھی نہیں چاہیے۔"

" اچھا میں سمجھ گیا ہوں کہ تم لوگوں کی نگاہوں سے دُور رہنا چاہتے ہو، لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اسٹیشن تک راستے پر ایک نظر ڈال آؤں۔"

" چچا وہاں تک تو میں آپ کے ساتھ جا سکتا ہوں۔ شاید آپ کوئی کام کی بات سمجھا سکیں۔"

" بیٹا چلو میں تمہیں بہت سی کام کی باتیں سمجھاؤں گا۔"

" جیتو نوکر سے کہو میرے گھوڑے پر زین ڈال دے۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اور بیلا سنگھ گھوڑوں پر سوار ہو کر حویلی سے باہر نکل رہے تھے۔

بیلا سنگھ نے اپنے گھوڑے کو آگے کرتے ہوئے کہا۔ "یوسف میرے پیچھے رہو۔ ہم گاؤں کے اُوپر سے چکر لگانے کے بعد پرانی نہر سے راستہ پکڑیں گے۔"

کوئی اڑھائی گھنٹے وہ اسٹیشن سے کوئی ایک فرلانگ تک اور پھر وہاں سے واپسی پر تمام ممکن راستوں کا معائنہ کرنے کے بعد واپس آئے تو ان کے گھوڑے پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔

یوسف نے بیلا سنگھ کے گھر سے ٹھنڈے پانی کے دو اور گلاس پینے کے بعد کہا "چچا شام ہوتے ہی آپ میرے گاؤں آجائیں۔ اگر پیدل آئیں تو بہتر ہو گا۔ ہماری باہر کی بیٹھک میں پہنچ جائیں وہاں حویلی کے اندر ہمارے گاؤں اور پولیس کے آدمی موجود ہوں گے۔"

" بہت اچھا بھتیجے، مَیں وہاں آجاؤں گا۔"

یوسف گھوڑے پر سوار ہونے لگا۔ تو بیلا سنگھ بولا :

" دیکھو بھتیجے اب بھی یہ نہیں بتاؤ گے کہ یہ بڑا شکار کون ہے؟"

یوسف مسکرایا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُس نے بیلا سنگھ کے کان میں کہا " جی میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔"

بیلا سنگھ چند قدم اس کے پیچھے آوازیں دیتا ہوا بھاگا: " او یوسف، ٹھہرو! ٹھہرو! مَیں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

لیکن یوسف نے مڑ کر نہ دیکھا۔

یوسف گاؤں پہنچا اور مسجد اور باہر کی حویلی کے درمیان ملکین کے ایک درخت کی چھاؤں میں بہادر سنگھ ایک کھاٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

یوسف اس کے قریب پہنچتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور گاؤں کے چوکیدار پیراں دِتہ نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

بہادر سنگھ بھاگتا ہُوا آگے بڑھا اور یوسف سے بغل گیر ہوتے ہوتے بولا:

"یار ہمیں تمہارے کارنامے کی خبر مل گئی تھی۔ ہمارے تھانے کے سب لوگ حیران تھے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ یوسف صاحب سے ہر بات ممکن ہے پھر جب انسپکٹر کی طرف سے ہمارے تھانے میں یہ فون آیا کہ کسی مہم میں بہادر سنگھ کی ضرورت ہے تو میں نے تھانے دار سے کہا کہ یقیناً میری سفارش یوسف نے کی ہوگی۔"

یوسف مسکرایا " یار میں نے ہی یہ درخواست کی تھی کہ مجھے ایک نئی مہم میں بہادر سنگھ کی ضرورت ہے۔"

بہادر سنگھ نے کہا " بھگوان تمہیں زیادہ عزت دے اور تمہیں بہت بڑا افسر بنائے مَیں یہاں تھانے میں حاضری دے کر اپنے گاؤں جانے کی بجائے سیدھا یہاں بھاگتا ہوا آیا تھا میں نے آپ کو ایک اور سوار کے ساتھ دیکھا تھا اور دور سے تمہارا گھوڑا پہچان لیا تھا لیکن تم اپنے گھر آنے کی بجائے دور سے ہی واپس چلے گئے تھے۔"

یوسف نے پیراں دِتہ سے مخاطب ہوکر کہا " پیراں دِتہ بہادر سنگھ کو بیٹھک میں لے جاؤ۔ میں ان کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

بہادر سنگھ نے کہا " یوسف جی! کھانا تو میں ڈیرہ بابا نانک سے کھا کر نکلا تھا۔ بٹالہ پہنچ کر بھی کچھ پیٹ پوجا کی تھی پھر یہاں تھانے میں حاضری دی تو حوالدار پریم سنگھ نے زبردستی لسی کے دو گلاس پلائے تھے اور مٹھائی بھی کھلا دی تھی یہاں پہنچ کر بھی میں نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پی لیا ہے۔"

یوسف نے پیراں دِتہ سے کہا " پیراں دِتہ تم ان کے لیے ہمارے گھر سے لیموں کے شربت کا ایک جگ لے آؤ۔"

" اچھا جی میں آپ کا گھوڑا باندھ کر لے آتا ہُوں۔"

یوسف نے بہادر سنگھ سے مخاطب ہوکر کہا " یار آؤ تم بھی بیٹھک میں کچھ دیر آرام کر لو۔ میں کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کروں گا اور پھر تمہیں ایسی باتیں سُناؤں گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

"یوسف جی! مَیں تو آپ کو دیکھ کر ہی خوش ہو جاتا ہوں۔"

یوسف نے کہا " تمہیں معلوم ہے کہ میرے ساتھ دوسرا سوار کون تھا؟"

" جی جب آپ نظر آرہے تھے تو میں دوسرے کو کیوں دیکھتا۔"

" یار وہ سردار بیلا سنگھ تھا اور آج یہیں پر اُس سے تمہاری ملاقات ہوگی۔"

" یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

" بہادر سنگھ یہاں اور لوگوں سے بھی تمہاری ملاقات ہوگی۔ اس لیے تم پانی پینے کے بعد سو جاؤ، جب وہ لوگ آجائیں گے تو تمہیں جگا دیا جائے گا۔"

یوسف بہادر سنگھ کو بیٹھک میں چھوڑ کر باہر نکلا تو اُسے سرپٹ گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ کشادہ راستے کے سامنے رُک گیا۔

چند ثانیے کے بعد سردار بیلا سنگھ نے گھوڑا روکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو یوسف جو بات تم چلتے چلتے کہہ آئے تھے اس کے بعد مجھے نیند کیسے آسکتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ تم نے جان بوجھ کر گھوڑا نہیں روکا تھا۔"

یوسف نے کہا "چچا چلو بیٹھک میں تھوڑی دیر آرام کرو آپ کے لیے لیموں کا شربت آرہا ہے۔"

"دیکھو بھتیجے اگر مجھے بڑے شکار کے متعلق سب کچھ نہیں بتاؤ گے تو میں لیموں کا شربت نہیں پیئوں گا۔"

"چچا اس وقت تو میں آپ کو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ کل رات اگر میاں عبدالکریم کے منشی کو راستے میں لوٹنے والے قابو میں آگئے تو اس علاقے کے بہت سے ڈاکوؤں کے ساتھ دینا ناتھ کا تعلق ثابت ہو جائے گا۔"

بیلا سنگھ نے کہا "یار یہ تو مجھے کئی سال سے معلوم ہے۔"

"لیکن چچا ابھی تک کسی نے یہ ثابت نہیں کیا لیکن پرسوں آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ اگر ڈاکو کے چہرے سے نقاب اتار دیا جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ آئیے بیٹھک کے اندر آپ کا ایک اور بھتیجا آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔"

وہ حویلی میں داخل ہوئے تو بہادر سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بیلا سنگھ نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

پیراں دتہ لیموں کے شربت کا جگ اٹھائے اندر داخل ہوا اور اس نے تپائی پر جگ رکھ کر بیٹھک کی الماری سے شیشے کے گلاس نکالے اور جگ کے ساتھ تپائی پر رکھ دیے۔

یوسف نے گلاس بھرتے ہوئے کہا "پیراں دتہ تم بھاگ کر ایک اور جگ لے آؤ۔" بیلا سنگھ نے کہا "یار یہ کافی ہوگا۔ دو گھنٹے بعد اگر ہمیں پیاس محسوس ہوئی تو ہم

اور منگوا لیں گے۔"

بہادر سنگھ نے کہا "بھائی صاحب آپ جا کر آرام کریں میں چچا جی سے باتیں کروں گا۔"

بیلا سنگھ نے کہا۔ "ہاں بھائی تم تھک گئے ہو گے۔ جاؤ آرام کرو۔"

یوسف نے کہا "چچا آپ بھی تھوڑی دیر سو جائیں، اس کے بعد ہم یہاں چائے پئیں گے۔"

بہادر سنگھ نے کہا "ہاں چاچا بھائی یوسف کے گھر کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے۔"

بیلا سنگھ نے اٹھ کر ایک کھاٹ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

"یار یوسف کے گھر کی ہر چیز اچھی ہوتی ہے۔ ایسی چھاؤں بھی تو نہیں ہے ہمارے گاؤں میں۔

بہادر سنگھ تم بھی تھک گئے ہو گے۔ کرسی آگے کر لو اور مجھے یہ بتاؤ کہ اب تمہارے حوالدار بن جانے میں کتنی دیر ہے؟"

یوسف نے باہر نکلتے ہوئے کہا "کوئی دیر نہیں، چچا جی۔"

بہادر سنگھ نے کہا:

"سردار جی یوسف جو بات کہا کرتے ہیں وہ ہو جایا کرتی ہے۔ کسی دن جب وہ یہ کہیں گے کہ میں تھانیدار بن جاؤں گا تو مجھے یقین ہو جائے گا۔"

بیلا سنگھ نے کہا "ارے یوسف تمہارا دوست ہے، تو تم بڑے خوش قسمت ہو۔"

"ہاں سردار جی، جب تک میں یوسف کا دوست نہیں بنا تھا۔ مجھے کافی بیوقوف سمجھا جاتا تھا۔"

"یار میں تو تمہیں بیوقوف نہیں سمجھتا تھا۔ جیتو کی ماں تمہیں بہت یاد کیا کرتی تھی۔ آج میں نے اسے بتایا کہ تم یوسف کے پاس آرہے ہو تو وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اب تو تم نے ہماری طرف آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ہے۔"

"سردار جی میں اور میرے پتاجی بھی آپ کو بہت یاد کیا کرتے ہیں کبھی دن شکار پر نکلیں تو ہمارے گاؤں کی طرف آجائیں نا۔"

"اچھا بیٹا اپنے پتاجی کو میرا پرنام کہنا۔"

بیلا سنگھ نے باتیں کرتے کرتے آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

اگلے روز شام کی گاڑی آنے سے دو گھنٹے پہلے بارش شروع ہو چکی تھی اور تیز ہوا کے جھونکوں کے باعث مسافر خانے کے چھپر کا زیادہ حصہ بارش کے چھینٹوں کی زد میں آچکا تھا اور مسافر درمیانی حصے میں سمٹ رہے تھے۔ گاڑی کوئی چالیس منٹ لیٹ تھی۔ آسمان پر بادل اس قدر گھرے تھے کہ پانچ بجے سے پہلے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ شام ہو چکی ہے۔

ٹھیک پانچ بجے گاڑی پہنچی — سوار ہونے والوں کی طرح اترنے والوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ فضل دین، منشی شمس الدین کو آوازیں دیتا ہوا گاڑی کے ساتھ ساتھ ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا کہ سیکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ سے منشی شمس الدین نے گرج کر کہا۔

"بیوقوف مجھے آوازیں کیوں دے رہے ہو۔ سامان اُتارو۔"

فضل دین نے لوہے کا بکس اتار کر پلیٹ فارم پر رکھ دیا اور چلایا۔

"منشی جی! آپ خدا کے لیے نیچے اُتریں۔ گاڑی جانے والی ہے۔"

شمس الدین نے کہا۔ "بھئی! تمہارا مطلب ہے کہ میں ابھی سے نکل کر پانی میں کھڑا ہو جاؤں۔ گاڑی چلنے لگے تو اُتر جاؤں گا۔"

"ویٹنگ روم میں آپ کے آرام کا بندوبست ہو چکا ہے۔ یہ بکس بھی وہیں رکھوا دیا جائے گا۔ جب بارش تھم جائے گی ہم چل پڑیں گے۔"

منشی نے اپنی چھتری کھول کر سر کے اُوپر لیتے ہوئے کہا

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ یہ بارش تھم جائے گی۔ میں تو امرتسر سے یہی حالت دیکھتا آرہا ہوں اور پچھلے اسٹیشنوں کے جو مسافر مجھے ملے تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ بارش دُور دُور تک ہو رہی ہے۔"

"منشی جی! آپ فکر نہ کریں آپ رات بھی ویٹنگ رُوم میں ٹھہر سکتے ہیں۔"

"اور اِس مصیبت کا کیا کریں گے۔" منشی جی نے بکس کی طرف اشارہ کرتے ہوتے کہا۔

"جناب اِس کی آپ فکر نہ کریں۔ اِس سے آگے اِس بکس کو گھر پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔ یہاں اسٹیشن ماسٹر بھی آپ کا خیال رکھیں گے اور ہمارا ایک آدمی آپ کے پاس موجود رہے گا۔"

منشی نے تلملا کر کہا "بے وقوف! میں کام کے لیے آیا ہوں۔ خدمت کروانے کے لیے نہیں آیا۔ ہم بارش ذرا کم ہوتے ہی یہاں سے چل پڑیں گے۔"

ہوا کا تیز جھونکا آیا اور منشی صاحب چھتری کے ساتھ اڑتے ہوئے چند قدم دُور چلے گئے۔ فضل دین نے اُسے بھاگ کر کلاوے میں لیتے ہوئے کہا۔ "منشی جی چھتری ہاتھ سے چھوڑ دیجیے اور آرام سے ویٹنگ رُوم میں بیٹھ جائیے۔"

منشی نے گرج کر کہا "بیوقوف اُس بکس کو کہاں رکھو گے۔"

"بکس کی فکر نہ کریں۔ منشی صاحب، وہاں میرے آدمی موجود ہیں اور اُنھیں معلوم ہے کہ اُس کے اندر کیا ہے انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ اگر یہ بکس کسی نے اُٹھا لیا تو ہماری سب کی شامت آجائے گی۔"

"لیکن میری چھتری؟"

"جناب وہ کہیں نہیں جا سکتی۔"

تیز ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور چھتری اُلٹ گئی۔ فضل دین منشی کو سہارا دے کر ویٹنگ رُوم کے اندر لے گیا۔ ایک آدمی نے بکس ویٹنگ رُوم میں لاکر رکھ دیا اور فضل دین سے مخاطب ہو کر کہا "فضل دین یہ بہت بھاری ہے۔ منشی جی نے اس کے اندر کیا ڈالا ہے؟"

"بھئی مجھے کیا معلوم اِس کے اندر کیا ہے"۔ ہو سکتا ہے کہ گھر سے کپڑوں کے ساتھ کوئی وزنی برتن یا کوئی اور چیزیں رکھ دی ہوں"

منشی نے کہا "فضل دین اِس وقت کہیں سے چائے مل جائے گی۔ میرا بُرا حال ہو رہا ہے"

"منشی جی! چائے اسٹیشن ماسٹر کے گھر سے آجائے گی اور تازہ برفی میں پاس ہی حلوائی سے لے آؤں گا"

"بھئی برفی ذرا زیادہ لانا مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے"

"جی آپ فکر نہ کریں برفی اتنی زیادہ آئے گی کہ سب پیٹ بھر کر کھائیں گے۔ میرے گاؤں کے آدمی بھی اور قلی بھی! یوسف صاحب نے ان سب لوگوں کی تواضع کرنے کے لیے کہا تھا"

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد بارش ذرا کم ہوئی تو منشی نے کہا "بھئی اب یہاں سے چلو"

فضل دین نے کہا "نہیں منشی جی یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنے میں ہمارا فائدہ ہے۔ بھیگ تو ہم ویسے ہی گئے ہیں"

ایک لمبا تڑنگا سکھ ویٹنگ رُوم میں داخل ہوا اور اس نے منشی جی سے مخاطب ہو کر کہا "بھائی صاحب اگر ریلوے کی طرف سے آپ کو سہولت مل رہی ہے

تو آپ اس سے پُورا فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے؟"

فضل دین نے منشی کے کان میں کہا "منشی جی یہ کوئی شرارتی آدمی ہے اس کے ساتھ بحث نہ کریں"

پھر اس نے سکھ سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہا "سردار جی اگر منشی صاحب یہاں ٹھہر سکتے تو بڑی اچھی بات ہوتی لیکن یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بھیگ تو گئے ہیں، رکنے سے کیا فائدہ"

منشی نے کہا "یار اب تو اندھیرا ہو رہا ہے"

"آپ کو اندھیرے سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔ مسافر خانے میں چند اور آدمی اس طرف جانے والے ہیں۔ تمہارے لیے ان کے ساتھ جانا بہتر ہوگا"

منشی نے کہا "نہیں جی، میں کسی کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ مجھے کیا معلوم کہ ان میں سے کوئی ڈاکو نکل آئے"

فضل دین نے کہا "سردار جی ہمارے منشی صاحب رات کے وقت کیچڑ اور پانی میں چلنے سے گھبراتے ہیں"

"تو پھر ٹھیک ہے اگر یہ کسی وجہ سے ناواقف لوگوں کے ساتھ چلنا پسند نہیں کرتے تو ابھی سے چل پڑیں۔ مَیں کب روکتا ہوں کسی کو؟"

فضل دین نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "یار اٹھاؤ یہ بکس اور چلو"

ایک آدمی نے بکس اٹھا کر دوسرے کے سر پر رکھ دیا منشی اور فضل دین ان کے پیچھے چل پڑے۔

وہ کوئی ایک فرلانگ گئے ہوں گے کہ جوار کے کھیت سے اچانک تین آدمی نمودار ہوئے اور ان کے آگے چل پڑے۔

منشی شمس الدین نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اُسے محسوس ہوا کہ چند آدمی اُس کے پیچھے بھی آرہے ہیں۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"یار ڈاکو ہمیں گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

فضل دین نے کہا "منشی جی اگر وہ ڈاکو ہیں تو ہمیں کیا کہیں گے۔ سامان میاں صاحب کا ہے ہم لڑے بغیر ان کے حوالے کر دیں گے"۔

منشی نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ ہم بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کریں گے"۔

"منشی جی یہ بوجھ اٹھا کر بھاگ کون سکتا ہے؟"

منشی نے کہا "یار میاں جی نے مجھے حکم بھیجا تھا کہ میں رقم کے ساتھ چاندی کے ایک ہزار سکے بھی لاؤں"۔

"منشی جی یہ انہوں نے اس لیے کہا ہوگا کہ دیہاتی نئے سکے لے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر آپ نے صرف نوٹ لے کر آنا ہوتا تو ہمارا کوئی آدمی گھوڑے پر آتا اور آپ سے رقم لے کر چند منٹ میں گھر پہنچ گیا ہوتا"۔

بکس اُٹھانے والے آدمی نے کہا "یار بوٹے میں تھک گیا ہوں، اب باقی راستہ تم یہ بوجھ اٹھاؤ"۔

دُوسرے آدمی نے بکس اُٹھا کر سَر پر رکھ لیا۔ اب وہ کماد اور مکئی کے کھیتوں کے درمیان پانی میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈی سے گزر رہے تھے۔ ان کھیتوں سے آگے ایک دھان کا کھیت تھا جس سے آگے کماد کے وہ کھیت تھے جو مانگا سنگھ کی حویلی سے ایک فرلانگ آگے تک نکل جاتے تھے۔

انھوں نے بمشکل دھان کا کھیت عبور کیا ہوگا کہ پچھلے کماد کے کھیت سے چار آدمی بھاگ کر آگے بڑھے اور ایک نے بلند آواز سے کہا "اگر جان بچانا چاہتے ہو تو یہیں رُک جاؤ"۔

بوٹا سنگھ بھاگ کر چند قدم آگے نکل گیا لیکن ایک آدمی نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے کہا "رُک جاؤ اور یہ بکس یہیں رکھ دو، ورنہ گولی مار دوں گا"۔ بوٹا نے کہا "جی مَیں تو ایک مزدور ہوں مجھے آپ گولی کیوں مارتے ہیں۔ یہ لیجیے بکس" اور اُس نے بکس اُچھال کر کھیت میں پھینک دیا۔

منشی سہمی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "جناب میری تلاشی لے لیں میں پرائے مال کے لیے نہیں مروں گا۔ میری جیب میں صرف بارہ روپے دس آنے ہیں"۔

ڈاکو نے کہا "اِدھر لاؤ بارہ روپے اور دس آنے اپنے پاس رکھ لو"۔

منشی نے اپنی جیب سے بٹوا نکال کر پیش کرتے ہوئے کہا۔

"جناب آپ خود ہی نکال لیجیے مجھے ڈر ہے کہ نمی کی وجہ سے دس کا نوٹ پھٹ جائے گا"۔

ڈاکو نے کہا "یار تم تو بڑے اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ بارہ آنے نکال لو اور بٹوہ ہمارے حوالے کر دو"۔

ڈاکو نے دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"تمہارے پاس کیا ہے؟"

"کچھ نہیں جناب میں نے برفی کی ایک ڈلی کاغذ میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لی تھی لیکن اس کی حالت منشی جی کے نوٹ سے زیادہ خراب ہو چکی ہوگی"۔

"تم دونوں یہیں ٹھہرو، اور اگر ہماری اجازت کے بغیر کوئی یہاں سے ہلا تو ہم گولی مار دیں گے"۔

دوسرے ڈاکو نے جو بوٹا کے ساتھ کھڑا تھا آواز دی:

"یاران سب کو یہاں لے آؤ۔ یہ بکس ایک مصیبت ہے"۔ ڈاکوؤں کے اشارے سے وہ آگے چل دیے اور بوٹا کے گرد کھڑے ہو گئے۔

ایک ڈاکو نے پوچھا "او منشی سچ بتاؤ اس میں کیا ہے۔ یاد رکھو ابھی ہم یہ بکس کھلوا کر دیکھیں گے۔"

منشی نے جواب دیا "جناب اس میں جو کچھ ہے وہ اب آپ کا ہے میاں صاحب کے گھر سے مجھے بند بکس دیا گیا تھا مجھے صرف اتنا معلوم ہے اس میں ایک ہزار چاندی کے روپے ہیں اور کچھ کپڑے ہوں گے۔"

ڈاکو نے بوٹا کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تم یہ بکس اٹھالو ہم پانی سے نکل کر کسی جگہ اسے کھلوائیں گے اور اگر یہ بات غلط نکلی تو ہم منشی کا سر کاٹ کر اس بکس میں بند کر دیں گے۔"

"سرکار مجھے تو آپ کچھ نہیں کہیں گے نا۔"

"بھئی تمہیں پوری مزدوری کے علاوہ انعام بھی ملے گا۔ اب جلدی سے اس پانی سے نکلو۔ آگے کماد کی مینڈھ پر ہم یہ بکس کھلوا کر دیکھ لیں گے۔"

فضل دین نے کہا "اٹھالو بوٹا اور سامنے کماد کے اُونچے کنارے کی طرف لے جاؤ۔"

ڈاکو نے کہا: "تم آگے آگے چلو ہم تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔ ہمارے ساتھ کوئی چالاکی کی تو ہم گولی مار دیں گے۔"

"بھائی ڈاکو جی ہمیں گولی کھانے کا کوئی شوق نہیں۔ ہم اتنے غریب ہیں کہ ہماری لاش بھی کوئی نہیں اٹھوائے گا۔"

"اچھا چلو ہم تم کو بھی انعام دیں گے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس بکس میں کیا ہے؟"

"جناب مجھے صرف یہ پتہ ہے کہ منشی کوئی رقم لے کر آ رہا ہے مجھے یہ نہیں معلوم کہ روپے کتنے ہیں اور نوٹ کتنے ہیں۔"

"اچھا ہم ابھی کھلوا کر دیکھ لیں گے۔"

فضل دین آگے آگے چل رہا تھا اور کماد کے قریب پہنچ کر مینڈھ کے ساتھ ساتھ

دائیں ہاتھ چلنے لگا۔

ڈاکو نے کہا "بس اب مینڈھ پر بکس رکھ دو ہم اسے کھلوا کر دیکھنا چاہتے ہیں۔"

فضل دین نے کہا "ڈاکو جی سرکار اُس طرف کھیت کا کونا بہت اُونچا ہے، آپ وہاں اطمینان سے دیکھ سکیں گے۔"

"اچھا چلو ہم خود بھی مہنگا سنگھ کی حویلی سے دُور رہنا چاہتے ہیں۔"

وہ کھیت کے کونے میں پہنچے تو فضل دین نے تین کھیتوں کے کونوں کے درمیان قدرے بلند جگہ پر بکس رکھ دیا۔

ایک ڈاکو نے اپنی ٹارچ جلاتے ہوئے کہا۔ "اِسے کھولو۔"

فضل دین نے جواب دیا: "تالا چابی کے بغیر نہیں کھلے گا۔ میں گھر سے کوئی ہتھوڑا ساتھ لے کر نہیں آیا تھا۔"

ڈاکو گرجا "او منشی کے بچے یہ تالا کھولو۔"

منشی نے جواب دیا "سرکار اس تالے کی ایک چابی امرتسر میں میاں صاحب کے گھر میں ہے اور دوسری میاں صاحب کے پاس ہے۔ میرے پاس جو پیسے تھے وہ میں نے آپ کو دے دیئے، چابی کے لیے آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔"

ڈاکو نے گرج کر کہا "بے وقوف ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

فضل دین بولا۔ "ڈاکو جی جناب منشی جی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ گاؤں کے راستے میں آپ ان کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ اب آپ تسلی سے ہم سب کی تلاشی لے لیں اور ہمیں چھوڑ دیں۔"

ڈاکو نے کہا۔ "اور یہ بکس تمہارا باپ اُٹھائے گا۔"

بوٹا نے کہا۔ "یہ بکس اتنا بھاری نہیں جناب میں اسے پچھلے کھیتوں تک

اپنے سر پر اُٹھا کر لایا ہوں۔"

ڈاکو نے کہا "تم بکواس نہ کرو، ہم یہ بکس کھلوائیں گے ورنہ تم سب کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔"

منشی نے کانپتے ہوئے کہا "جناب ڈاکو صاحب میں بوڑھا آدمی ہوں میری ہڈیاں توڑنے کی بجائے آپ اِس بکس کو کیوں نہیں توڑ ڈالتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے ہاتھ سے بھی یہ تالا توڑ سکتے ہیں۔"

ڈاکو نے جھک کر ایک ہاتھ سے تالا توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے غضب ناک ہو کر بولا "ایک منٹ کے اندر اندر چابی نکالو اور تالا کھول دو، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو گولی مار کر یہیں پھینک جائیں گے۔"

بوڑھا چلایا "سرکار میں ان کا ساتھی نہیں ہوں۔ میں مسلمان بھی نہیں ہوں، ایک غریب عیسائی ہوں، مجھے گولی مار کر آپ کیا لیں گے۔ مجھے جو ایک روپیہ مزدوری ملنی تھی وہ آپ منشی صاحب کے حساب سے کاٹ لیں۔"

"بیوقوف منشی صاحب کو ایک منٹ کے اندر اندر سارا حساب بھول جائے گا۔"

فضل دین نے کہا "ایسا نہ کیجئے جناب اگر منشی صاحب حساب بھول گئے تو ہمیں پچھلے مہینے کی تنخواہ کون دے گا؟"

قریب ہی سے ایک قہقہہ سنائی دیا۔ اِس کے ساتھ ہی تین آدمی بھونکتے ہوئے کتوں کی رسیاں پکڑے ہوئے نمودار ہوئے۔

ڈاکو بدحواس ہو کر پیچھے ہٹے تو چند اور کتے بھونکتے ہوئے پیچھے مکئی کے کھیت سے نکلے اور وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

پھر ایک سرپٹ گھوڑ سوار بائیں طرف سے کیچڑ اور پانی میں نمودار ہوا اور آن کی آن میں دھان کا کھیت عبور کرنے کے بعد اُن کے قریب آ پہنچا۔

انہوں نے دائیں ہاتھ نہر کی طرف بھاگنے کی کوشش کی لیکن اُدھر سے پستول چلنے کی آواز سنائی دی اور آن کی آن میں ایک اور گھوڑ سوار نمودار ہوا اور اس نے آواز دی "تم اس وقت چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو، اپنے ہتھیار پھینک دو، ورنہ سب مارے جاؤ گے۔"

اِس کے ساتھ ہی چاروں اطراف سے انھیں ٹارچوں کی روشنی دکھائی دینے لگی۔ ایک ڈاکو نے سوار کی طرف بندوق چلانے کی کوشش کی، لیکن کسی نے کماد کے کھیت کے کنارے سے فائر کیا گولی اس کے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی اور ڈاکو نے اپنی بندوق پھینک دی۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنی تلواریں اور برچھیاں پھینک دیں۔

فضل دین نے جلدی سے ایک ڈاکو کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔ صاحب جی اس ڈاکو کے پاس ایک چھوٹا سا پستول بھی ہے۔ کرتے کی جیب کے اندر، دوسروں کو بھی اچھی طرح دیکھ لیں۔ ان کے پاس چھرے بھی ضرور ہوں گے۔"

بندوق چلانے والا آگے بڑھا اور ایک آدمی جس نے بڑی مشکل سے ایک خونخوار کتے کو تھام رکھا تھا۔ بیلا سنگھ تھا جس کا آدھا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

سوار جو سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب آ چکا تھا۔۔ یوسف تھا۔

بیلا سنگھ نے ایک آدمی سے ٹارچ لے کر ڈاکوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

"اگر تمہارے کوئی ساتھی کماد کے اندر چھپے ہوئے ہیں تو انھیں آواز دے کر بلا لو ورنہ چند خونخوار کتے چھوڑ دیے جائیں گے اور وہ ان کی بوٹیاں نوچ ڈالیں گے۔"

ایک منٹ بعد ڈاکوؤں کو ہتھکڑیاں لگائی جا رہی تھیں۔ فضل دین نے کہا "سردار جی اپنے آدمیوں کو آواز دیں کہ وہ کتے چھوڑ دیں۔ میرا خیال ہے کہ پیچھے مکئی کے کھیت میں اِن کے کوئی اور ساتھی بھی موجود ہوں گے۔"

بیلا سنگھ نے آواز دی "اُدھر مکئی کے کھیت میں کتے چھوڑ دو، ہمیں روشنی

کرتا ہوں۔"

بیلا سنگھ کے آدمیوں کے ساتھ بہادر سنگھ اُس طرف بڑھا اور تھوڑی دیر بعد مکئی کے کھیت کی طرف کتوں کے بھونکنے کے ساتھ دو آدمیوں کے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بیلا سنگھ بھاگ کر آگے بڑھا اور اُس نے مکئی کے کھیت کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا" کتوں کو روکے رکھو لیکن ڈاکوؤں کو اپنے گھیرے سے باہر نہ نکلنے دو"

بلو کی آواز سنائی دی۔" سردار جی اب یہ نہیں نکل سکتے"

تھوڑی دیر بعد دو آدمی جن کی گردنیں بہادر سنگھ اور بیلا سنگھ نے دبوچ رکھی تھیں۔ مکئی کے کھیت سے نمودار ہوئے۔ کتے جن کی رسیاں سردار بیلا سنگھ کے آدمیوں کے ہاتھ میں تھیں ان پر جھپٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہادر سنگھ اپنی بندوق کے ساتھ اور بلو اپنی برچھی تانے ناچتا ہوا ان کے پیچھے آرہا تھا جب دھان کے کھیت میں داخل ہوئے اور ٹارچ کی روشنی ان کے چہرے پر پڑنے لگتی تو بلو ان کے گرد چکر لگانے کے بعد بھاگ کر برچھی تانے آگے بڑھتا لیکن جب برچھی ان کے جسم کے کسی حصے کو چھونے لگتی تو وہ اپنا ہاتھ روک لیتا۔ ڈاکو خوف سے چیختے ہوئے کبھی اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں اور کہنیوں میں چھپا لیتے تھے اور کبھی کیچڑ میں گر پڑتے تھے۔ دیکھنے والے قہقہے لگا رہے تھے۔

یوسف نے اپنا گھوڑا آگے کرتے ہوئے کہا" بلو بھئی اب یہ ناچ ختم کرو۔ تھک جاؤ گے، ابھی ہمیں بہت کام ہے۔ اگر موقع ملا تو پولیس کے بڑے افسروں کے سامنے تمہارے کرتب دیکھے جائیں گے"۔ پھر وہ بیلا سنگھ کی طرف متوجہ ہوا۔

" چچا اس دن بھی بلو اسی طرح ناچ رہا تھا۔ جب میں نے بندوق سے پردیسی درخت پر بلا مار ڈالا تھا"

بیلا سنگھ نے پریم سنگھ سے کہا" پریم سنگھ اب بارش رک گئی ہے۔ میرا خیال ہے

ہمیں تھوڑی دیر سردار مہنگا سنگھ کی حویلی میں ٹھہر جانا چاہیے۔ وہاں آپ سب کے لیے گرم گرم چائے تیار ہوگی۔ اگر مناسب ہو تو آپ ڈاکوؤں کو تھانے لے جانے کے لیے پولیس کے اور آدمی منگوا لیں"

بہادر سنگھ نے کہا" نہیں سردار جی پولیس کے اور آدمیوں کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکوؤں کو ہم اسی طرح ہانکتے ہوئے لے جائیں گے۔ بھائی یوسف جی! آپ تھک گئے ہوں گے۔ سیدھے گھر جائیں اور ہمیں بھی چائے اس وقت مزا دے گی جب ہم ڈاکوؤں کو حوالات میں بند کر دیں گے"

پریم سنگھ نے کہا" ہاں یوسف صاحب بہادر سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ آپ سردار مہنگا سنگھ کے نوکر سے کہتے جائیں کہ ہم اس کی چائے پھر کسی دن پی لیں گے"

یوسف نے کہا" ٹھیک ہے لیکن میں جانے سے پہلے آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں"

پریم سنگھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اُس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور چند قدم دُور جا کر کہا" یوسف جی فرمائیے کیا حکم ہے"

" حکم نہیں بھائی صاحب ایک مشورہ ہے"

حوالدار نے کہا" جناب ہمیں تمام بڑے افسروں کا حکم ہے کہ آپ کے مشورے کو حکم سمجھا جائے"

یوسف نے کہا" اچھا تو جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ تھانیدار اور انسپکٹر کے کانوں تک پہنچا دو کہ یہ کیس بڑے افسروں کے سامنے اور دینا ناتھ کی موجودگی میں کھولا جائے میاں عبدالکریم کے پاس اس کی ایک چابی ہوگی وہ صبح لیتا آؤں گا شاید میاں عبدالکریم خود بھی وہاں آجائے"

پریم سنگھ نے کہا" جناب آج جو کچھ ہوا ہے اُس کی بہت سی باتیں ہماری

سمجھ سے باہر ہیں۔ لیکن آپ سب انہیں سمجھتے ہیں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جو باتیں پولیس کے لیے جاننا ضروری ہیں وہ مجھے بتا دیں یا آپ ایک مفصل رپورٹ لکھ کر اپنے ساتھ لے آئیں۔ رپورٹ اس لیے بہتر ہوگی کہ جو بات آپ کہیں گے وہ پولیس کی سمجھ میں جلدی آجائے گی۔"

"میں کوشش کروں گا۔ شاید اس کی ضرورت بھی ہو۔ اب یہ سوچنا تمہارا کام ہے کہ دینا ناتھ کو کس طرح سے بلایا جا سکتا ہے۔"

پریم سنگھ نے بہادر سنگھ کو آواز دی۔ "بہادر سنگھ ذرا ادھر آؤ۔"

بہادر سنگھ بھاگتا ہوا آگے بڑھا اور پریم سنگھ بولا۔ "بہادر سنگھ یوسف صاحب چاہتے ہیں کہ تھانے میں یہ کیس سیٹھ دینا ناتھ کی موجودگی میں کھولا جائے مجھے یقین ہے کہ ان ڈاکوؤں کی گرفتاری کی اطلاع ملتے ہی انسپکٹر، ڈی ایس پی اور شاید ایس پی صاحب بھی صبح تھانے پہنچ جائیں۔ اب تم بتاؤ کہ دینا ناتھ کو صبح بلانے کا کیا طریقہ ہے؟"

بہادر سنگھ نے جواب دیا "کوئی خاص طریقہ نہیں جناب آپ ابھی اپنے ایک سپاہی کو بھیج دیں کہ صبح پولیس کے کوئی بڑے افسر تھانے میں علاقے کے معتبرین سے ملنا چاہتے ہیں۔

سردار بیلا سنگھ اُسے اپنے گاؤں سے کوئی گھوڑی دے دیں گے اور جب وہ دینا ناتھ کے گھر پہنچ کر یہ بتائے گا کہ مجھے شام سے کچھ دیر پہلے یہ حکم ملا تھا اور میں بس معتبر آدمیوں کے ساتھ دیہات کا چکر لگانے کے بعد یہاں پہنچا ہوں تو آپ دیکھیں گے کہ اُسے باقی رات نیند نہیں آئے گی۔ اگر یوسف صاحب کے گاؤں کا چوکیدار بیراں دتہ بھی اُس کے گھر یہ پیغام پہنچا دے کہ تھانیدار صاحب کا حکم آیا ہے تو بھی وہ حاضر ہو جائے گا۔"

پریم سنگھ نے جواب دیا "کہ اِس حالت میں تو وہ اور زیادہ جلدی کرے گا۔ اِس علاقے میں کوئی واردات اِس کے علم کے بغیر نہیں ہوتی اور یہ جاننا اس کے لیے بہت ضروری ہوگا کہ چھ اور ڈاکو گرفتار کیسے ہو گئے اور اُن میں سے ایک کے متعلق تو مجھے بلّو نے بتایا ہے کہ وہ دینا ناتھ کے اپنے گاؤں کا آدمی ہے۔"

یوسف نے پوچھا "تم نے اس کے گاؤں کے آدمی کو پہچان لیا ہے؟"

"جناب اُسے بلّو اور سردار بیلا سنگھ کے ایک ساتھی نے اچھی طرح پہچان لیا ہے۔"

سردار جی کے کُتّے نے اُسی کی ٹانگ سے تھوڑا سا گوشت نوچا تھا۔

"اُسے پٹّی کی ہے؟"

"جی بلّو نے اُسی کی پگڑی پھاڑ کر پٹّی باندھ دی تھی وہ یہ کہتا تھا کہ زخم پر تھوڑی سی سرخ مرچیں چھڑک دی جائیں تو یہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا اور اُسے باؤلا ہونے کا بھی خطرہ نہیں رہے گا۔"

یوسف نے کہا "نہیں نہیں جوالدار صاحب آپ جاتے ہی اُس کے لیے ٹیکے کا انتظام کریں اگر کتّوں نے کسی اور آدمی کو کاٹا ہے تو اُسے بھی ٹیکے لگوانے پڑیں گے۔"

بیلا سنگھ نے آگے بڑھ کر کہا "یار دیکھنا کہیں میرے کتوں کو نہ مار دینا کوئی ان بدمعاشوں کے حصّے کے ٹیکے میرے کتوں کو نہ لگا دے۔

بہادر سنگھ نے کہا "نہیں سردار جی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ کتوں کے ٹیکے آدمیوں کو نہیں لگائے جاتے۔ ویسے آپ کے کتے بہت قیمتی ہیں۔ اِس لیے ہر سال انہیں ٹیکے ضرور لگا دینے چاہئیں۔"

یوسف نے کہا "سردار جی بہادر سنگھ ٹھیک کہتا ہے۔ اِس علاقے میں اپنے کتوں

کو ٹیکے لگوانے اور آوارہ کتوں کو مارنے کا انتظام کریں۔"

بیلا سنگھ نے کہا "نا بابا ایسا نہ کرنا۔ جب ہیلتھ آفیسر صاحب کے آدمی آئیں گے تو یہاں سے کوئی بدمعاش انہیں میرے گھر بھیج دیگا۔"

یوسف نے کہا "نہیں سردار جی میں خود ہیلتھ آفیسر کے پاس جا کر اس بات کا بھی بندوبست کر دوں گا کہ آپ کے کتے محفوظ رہیں۔ اب اگر آپ بھی نو بجے کے قریب تھانے پہنچ جائیں تو اچھا ہوگا۔"

بیلا سنگھ نے کہا "وہ کس لیے، ہم نے جو کام کرنا تھا وہ کر دیا ہے۔"

"سردار جی وہ اس لیے کہ وہاں بڑا تھانیدار موجود ہوگا۔ بہادر سنگھ آپ کے ساتھ جائے گا اور رات آپ کے پاس رہے گا۔ صبح میں اپنے گاؤں کے چوکیدار پیراں دتہ کو بہادر سنگھ کے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ اسے ایک گھوڑی دے دیں۔ تاکہ یہ میرے گاؤں کا چکر لگانے کے بعد سیدھا وہاں سے پنڈت دینا ناتھ کی ملاقات کے لیے چلا جائے۔"

بیلا سنگھ نے کہا "گھوڑی تو میں دے دوں گا۔ مگر میں پنڈت دینا ناتھ سے اس کی ملاقات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

سردار جی جب آپ اطمینان سے کھانا کھا کر بیٹھیں گے تو بہادر سنگھ آپ کو بہت کچھ بتا سکے گا۔ اور جو باتیں اسے معلوم نہیں وہ تھانے میں آپ پر ظاہر ہو جائیں گی۔"

بیلا سنگھ نے عاجز ہو کر کہا "یار یہ پڑھے لکھے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں یوسف جی مطلب یہ ہے کہ مجھے آج رات بھی آرام سے نیند نہیں آئے گی۔ آخر وہ کیا بات ہے، جو مجھ سے چھپانا ضروری ہے؟"

یوسف نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا: "چچا ہو سکتا ہے کہ بہادر سنگھ اگر ساری نہیں تو کم از کم اتنی باتیں ظاہر کر دے کہ آپ آرام کی نیند سو سکیں۔

حوالدار صاحب آپ پولیس اسٹیشن پہنچ کر میرے آدمیوں کو چھٹی دے دیں۔ صبح اگر آپ

نے ضرورت محسوس کی تو یہ حاضر ہو جائیں گے۔"

پریم سنگھ نے کہا "یوسف صاحب میں شہر کے قریب پہنچتے ہی فضل دین اور بلو کے سوا آپ کے تمام آدمی واپس بھیج دوں گا۔ اگر انہیں چند گھنٹے ٹھہرنا ضروری ہوا تو ان کے آرام کا پوری طرح خیال رکھا جائے گا۔ آپ گھر جا کر آرام کریں اور بھگوان کے لیے رپورٹ لکھانا نہ بھولیے گا یہ ہو سکتا ہے کہ ایس پی صاحب خود وہاں پہنچیں اور ہماری الٹ پلٹ باتیں سن کر خفا ہو جائیں۔"

"تم فکر نہ کرو۔ چچا بیلا سنگھ مجھے اجازت ہے؟"

"ہاں بھئی جاؤ۔"

یوسف نے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے ایڑ لگائی آن کی آن میں پانی سے بھرے ہوئے کھیتوں میں اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہونے لگی

باب - ۱۳

اگلے دن نو بجے کے قریب تھانے میں اچھا خاصا میلہ لگا ہوا تھا۔ آسمان پر بادل تیر رہے تھے اور نمی سے لدی ہوئی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔

یوسف گھوڑا دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا۔ ایک کانسٹیبل نے بھاگ کر گھوڑے کی باگ پکڑلی اور وہ سیدھا تھانے دار کے کمرے میں چلا گیا۔ تھانے دار اُس سے بغل گیر ہوکر ملا اور بولا "یوسف صاحب انسپکٹر صاحب نے ٹیلی فون پر پورے تھانے کو ہی کارگزاری پر مبارک باد دی ہے وہ کہتے تھے کہ ایس پی صاحب بہت خوش ہیں ہوسکتا ہے کہ وہ خود یہاں تشریف لائیں اور آپ کو ملاقات کے لیے بلالیں۔ ورنہ آپ کو ان کے پاس گورداسپور جانا پڑے گا۔ انسپکٹر صاحب تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ جائیں گے حوالدار نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے مشورے دینا ناتھ کو دس بجے کے قریب یہاں پہنچنے کا پیغام بھیج دیا گیا ہے۔"

یوسف نے کہا "آج موسم خوشگوار ہے۔ آپ کرسیاں کسی ایسی جگہ ڈلوائیں جہاں سے حوالات کے اندر ڈاکو ہمیں اچھی طرح دیکھ سکیں۔ اگر ضرورت پڑی تو حوالات سے چند آدمیوں کو باہر لانا پڑے گا۔ آپ کو دینا ناتھ کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آنا چاہیے اور حوالات کے قریب سے گزرتے ہوتے اس کی زریں خدمات کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

تھانے دار نے کہا "یوسف صاحب ہمیں حکم ہے کہ آپ کے ہر مشورے پر سوچے بغیر عمل کیا جائے لیکن یہ معمّا اگر آپ تھوڑا سا حل کر دیتے تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی۔"

یوسف نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ تھوڑی دیر میں سارے معمّے حل ہوجائیں گے۔"

حوالدار نے آگے بڑھ کر کہا "یوسف صاحب آپ کا آدمی اور شاید پنڈت دینا ناتھ بھی ان کے ساتھ آرہا ہے۔"

یوسف نے سب انسپکٹر سے کہا "بیلا سنگھ بھی آرہا ہے وہ ایک بہادر آدمی ہے اور عزت کا مستحق ہے۔ میں تھوڑی دیر اپنے آدمیوں کے ساتھ بات کرکے آتا ہوں۔"

یوسف تیز چلتا ہوا آگے بڑھا اور کچھ دیر تھانے کے پھاٹک کے قریب اپنے گاؤں کے آدمیوں سے باتیں کرتا رہا۔ اتنی دیر میں موٹر سائیکل کی آواز آئی اور سڑک کے کنارے کھڑے ایک کانسٹیبل نے آواز دی "انسپکٹر صاحب آرہے ہیں۔"

انسپکٹر تھانے کے احاطے کے اندر داخل ہوکر رُکا اور موٹر سائیکل سے اُتر کر اُس نے یوسف کے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور اُس کے ساتھ باتیں کرتا اور اشاروں سے آس پاس کھڑے لوگوں کے سلام کا جواب دیتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔

چند منٹ بعد دینا ناتھ اپنی سست رفتار بھاری بھرکم گھوڑی پر سوار نمودار ہوا۔ تھانیدار کے اشارے پر ایک سپاہی نے بھاگ کر گھوڑی کی لگام پکڑلی اور دینا ناتھ کو اترنے کے لیے سہارا دیا۔ تھانیدار نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کرتے ہوتے کہا۔

"آؤ سیٹھ جی انسپکٹر صاحب تشریف لے آتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک آپ سے ملاقات کریں گے، انھوں نے مجھے ٹیلی فون پر کہا تھا کہ ڈاکوؤں کے نئے گروہ کی گرفتاری کے سلسلے میں سیٹھ جی کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جائے گا۔ آپ اُس طرف کرسی پر تھوڑی دیر کے لیے

بیٹھ جائیں۔ پریم سنگھ انہیں وہاں بٹھا دو۔"
دینا ناتھ حوالدار کے ساتھ چل دیا اور پریشانی کے عالم میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے
بولا۔" سردار پریم سنگھ جی انسپکٹر صاحب سے کسی نے شکایت تو نہیں کی؟"
"سیٹھ جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ انسپکٹر صاحب جی اچھے کو اچھا بُرے کو
بُرا سمجھتے ہیں اور سچ بات ظاہر کرنے سے بھی کبھی نہیں جھجکتے۔"
دینا ناتھ نے کہا" یار حاکموں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔ میں تو تھانے پہنچنے کا حکم
سُن کر ہی ڈر گیا تھا۔"
"پنڈت جی وہ کانسٹیبل جو آپ کے پاس گیا تھا، بہت سمجھدار ہے اگر اُس
نے آپ سے کوئی گستاخی کی ہے تو اُسے سخت سزا دی جائے گی۔"
"نہیں تھانیدار صاحب وہ تو بہت ہی شریف لڑکا ہے اور ساتھ والے گاؤں
کا چوکیدار پیراں دتہ جو اُن کے ساتھ آیا تھا وہ بھی بہت اچھا آدمی ہے۔"
پیچھے سے بہادر سنگھ نمودار ہوا اور اُس نے قریب آکر کہا۔" پنڈت جی جب
افسر اچھے ہوتے ہیں تو ماتحت بھی اچھے ہوتے ہیں۔ آپ ہمارے انسپکٹر صاحب
سے مل کر زیادہ خوش ہوں گے۔"
سردار بیلا سنگھ گھوڑا دوڑاتا ہوا احاطے میں داخل ہوا۔
ایک سپاہی نے اُس کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور بہادر سنگھ بھاگ کر آگے
بڑھا اور اس نے بیلا سنگھ سے مصافحہ کرتے ہوتے کہا۔
"چچا جی۔ آیئے بیٹھیں انسپکٹر صاحب تھوڑی دیر تک آپ سے ملاقات
کریں گے۔"
بیلا سنگھ اُس کے ساتھ آگے بڑھا اور دینا ناتھ کے قریب سامنے ایک
کرسی پر بیٹھ گیا۔

یہ ایک بکری کے ساتھ شیر کو بٹھانے والی بات تھی اور بہادر سنگھ بڑی مشکل
سے مسکراتے ہوئے دانت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیلا سنگھ اُسے بُری طرح
گھور رہا تھا۔ لیکن دینا ناتھ نے اُس کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنا سر دونوں ہاتھوں
سے دبا رکھا تھا وہ چاہتا تھا کہ دوسری طرف منہ موڑ لے لیکن اُس طرف حوالات کی
سلاخوں سے ڈاکو اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔



تھانے کے ایک کمرے میں جب انسپکٹر عبدالعزیز اور یوسف کے درمیان گزشتہ
رات کے واقعات پر گفتگو شروع ہوئی تو یوسف نے اُسے ایک لفافہ پیش کرتے ہوئے
کہا" جناب میں اس بات پر معذرت خواہ ہوں کہ میں نے دو دن قبل آپ کو گزشتہ رات
کے متوقع واقعات کے متعلق نہیں بتا دیا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ مسئلہ میرے
قیاس تک محدود تھا۔ اور یہ ہو سکتا تھا کہ میرا قیاس سراسر غلط ثابت ہوتا تو میرا مذاق اڑایا جاتا۔
آپ یہ مختصر سی رپورٹ جو میں نے رات کے وقت لکھی تھی پڑھ لیجئے۔ پھر اس سلسلے میں شاید
آپ کو کوئی مزید سوالات کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔"
انسپکٹر عبدالعزیز نے مسکراتے ہوئے لفافے سے چند فل سکیپ سائز کے کاغذات
نکال کر غور سے یوسف کی طرف دیکھا اور پڑھنا شروع کر دیا۔ یوسف میز پر سے اخبار اٹھا کر
دیکھنے لگا اور کوئی دس منٹ تک کمرے میں سکوت طاری رہا۔
انسپکٹر نے کاغذ تہ کر کے لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا" اگر ہمارے ایس پی صاحب
اردو پڑھ سکتے تو وہ آپ کو بڑے سے بڑے انعام کا مستحق سمجھتے۔ اب میں انگریزی میں ترجمہ
کرکے انھیں پیش کروں گا اور میرا خیال ہے کہ اُن کے ساتھ تمہاری ملاقات زیادہ ضروری
ہو جائے گی۔ آپ سے کئی سوال پوچھے جائیں گے اور اگر آپ کے جوابات اس تحریر کی طرح

موثر ہوئے تو ایس پی صاحب آپ کے لیے بہترین دوست ثابت ہوں گے اور میری طرح ان کی رائے بھی یہ ہو گی کہ ہماری پولیس کو آپ جیسے ہونہار نوجوانوں کی ضرورت ہے۔"

یوسف نے کہا "جناب میں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ میری زندگی کے کسی پروگرام کا حصہ نہیں۔ آپ یوں سمجھ لیجیے کہ چلتے چلتے میرے راستے میں ایک خطرناک موڑ آیا تھا اور اللہ کے کرم سے میں بے خوف و خطر اُس سے بچ کر نکل گیا۔"

عبدالعزیز نے کچھ دیر سوچ کر کہا "یوسف بیٹا تمہیں آج سے مجھے پولیس افسر کی بجائے اپنا دوست سمجھنا چاہیے اور اس بات پر کبھی حیران نہیں ہونا چاہیے کہ مجھے تمہاری زندگی کے ہر موڑ سے دلچسپی ہو گی۔"

"شکریہ چچا جان مجھے آپ ناشکر گزار نہیں پائیں گے۔"

"اور جن لوگوں کو تمہارے مشورے سے یہاں بلوایا گیا ہے۔ اُن کے متعلق ایس آئی نے میرے ساتھ مفصل گفتگو کی تھی اور میں بہت سی باتیں سمجھ گیا ہوں۔ اس کیس کو دینا ناتھ کے سامنے کھولنے کا معمّا مجھے آپ کی رپورٹ پڑھ کر سمجھ میں آیا ہے لیکن ان لوگوں سے ملاقات کرنے سے پہلے میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تم نے اپنی بہادرانہ کارگزاری سے کئی دشمن پیدا کر لیے ہیں اور کئی تمہارے حاسد بھی ہو سکتے ہیں۔ میں تمھیں پورے ملک کے لیے بندوق اور پستول کا لائسنس دلوا دوں گا۔ میرا خیال ہے کہ ایس پی صاحب خود بھی آپ کو ذاتی حفاظت کے لیے اسلحہ بطور انعام دینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کو کوئی ایسی پیش کش قبول نہیں کرنی چاہیے۔ جس سے آپ کا پولیس کے ساتھ کوئی تعلق بھی ریکارڈ میں آجاتے۔ مَیں یہ بھی مشورہ دوں گا کہ تعلیم کے دوران آپ کسی نئے کیس میں اُلجھنے کی کوشش نہ کریں۔ ایس پی صاحب اگر کسی انعام کی پیش کش کریں تو ادب سے انکار کر دیں۔ اس طرح اُن کے دل میں آپ کی عزت اور بڑھ جائے گی۔"

یوسف نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا "چچا جی میرا اپنا فیصلہ بھی یہی تھا کہ میں کوئی انعام قبول نہیں کروں گا۔ اگر ریوالور کا لائسنس مل جائے تو میں خرید سکتا ہوں لیکن مجھے اُن لوگوں کے متعلق بہت تشویش رہے گی جو میری وجہ سے ڈاکوؤں کی نظر میں آچکے ہیں۔

اِن بدمعاشوں کے متعلق میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ جس قدر لوگوں کو اپنے اسلحہ سے ڈرانا پسند کرتے ہیں اسی قدر زیادہ دوسروں کے اسلحہ سے ڈرتے بھی ہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا "تم ابھی ان کے نام لکھوا دو انھیں کسی دن بہت جلد ایس پی صاحب کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔

یوسف نے کہا "میرے گاؤں سے سب سے پہلے بُلّو کا نام لکھ لیجیے۔ دوسرا بوٹا عیسائی ہے۔ یہ دونوں اپنے وسائل سے بندوق کبھی نہیں خرید سکتے۔ تیسرا پیراں دتّہ چوکیدار ہے اور وہ ایک لحاظ سے حکومت کا ملازم بھی ہے۔ اُس کو بھی بندوق مل جائے تو اچھا ہو گا۔ ہمارے خاندان سے صرف تین آدمی ایسے ہیں جو لائسنس حاصل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اسلحہ اپنی جیب سے خرید سکتے ہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا "آپ اُن کی طرف سے درخواست لکھ کر مجھے بھجوا دیں۔"

یوسف نے کہا "میاں عبدالکریم کے پاس پستول ہے۔ ان کے ایک نوکر فضل دین کو بندوق کے لائسنس کی ضرورت ہو گی اور وہ اُسے خریدنے کے لیے پیسے بھی دے دیں گے۔

اُن کے گاؤں کا دوسرا آدمی جس کی میں پُرزور سفارش کرتا ہوں۔ اُس کے لیے جب آپ عبدالکریم سے بات کریں تو علیحدگی میں پوچھیں کہ وہ اُسے بندوق خرید کر دینا پسند کریں گے یا حکومت کی طرف سے بندوق بطور انعام مل جائے تو وہ کوئی اور انعام دے دیں گے۔ میں نے جن لوگوں کے نام لئے ہیں وہ علاقے کے امن کے لیے

بہت کارآمد ثابت ہوں گے۔

ہردیال سنگھ کے بیٹے جگجیت سنگھ کی عمر بہت چھوٹی ہے۔ لیکن وہ اگر ہوش اور عقل سے کام نہ لیتا تو ہمیں یہ دونوں کامیابیاں حاصل نہ ہوتیں۔"

عبدالعزیز مسکرایا" اُس کے متعلق جو آپ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے وہ بہت دلچسپ ہے اور میں کوشش کروں گا کہ اسے گورنمنٹ کے خرچ پر تعلیم دلوائی جائے اور اِس کے بعد پلیس میں لے لیا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ سردار بیلا سنگھ کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں وُہ ایک چھوڑ کر دو چار بندوقیں خرید سکتے ہیں لیکن اُن کو صرف کتّوں کا شوق ہے۔ وہ بڑے بہادر اور کارآمد آدمی ہیں اسلحہ کے سلسلہ میں آپ خود ان سے بات کریں تو وہ بہت خوش ہونگے۔ اپنی رپورٹ میں مَیں پریم سنگھ حوالدار اور بہادر سنگھ کانسٹیبل کی کارگزاری کے متعلق لکھ چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے تو آگے چل کر وہ اچھے افسر ثابت ہوں گے۔"

"ان دونوں کی سفارش کر دی جائے گی اور بہادر سنگھ کو ترقی دے کر اِس تھانے میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ آپ اُن دونوں کو یہ خوش خبری دے سکتے ہیں۔"

"چچا جی، یہ خوش خبری اگر آپ کی طرف سے ہو تو بہتر ہے۔ اب آپ باہر کھلی ہوا میں ان سے ملاقات کریں اور وہیں اس بکس کا تالا کھلوائیں۔ عبدالکریم صاحب اپنے ساتھ چابی لے آئے ہوں گے۔ روپے گننے کے لیے دینا ناتھ کو کہیں، کرسیاں اُس جگہ رکھوا دی گئی ہیں۔ جہاں سے حوالات کے قیدی اچھی طرح دیکھ سکیں۔ آپ جس قدر دینا ناتھ کے ساتھ تپاک سے ملیں گے۔ اُسی قدر وہ پریشان ہوگا۔"

عبدالعزیز نے پوچھا" تمہارا کیا خیال ہے۔ دینا ناتھ کو گرفتار کر لیا جائے۔ کیونکہ اِس بکس کو کھولنے کے بعد ثبوت ہمارے پاس کافی ہو جائیں گے اور شاید

گرفتار ہونے والے ملزموں میں سے کوئی اُس کے خلاف گواہی بھی دے دے۔"

یوسف نے کہا "جناب میں اُس کی گرفتاری کا مشورہ نہیں دوں گا۔ ویسے آپ مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُسے عزّت سے رخصت کیا جائے۔ اس کا فوری فائدہ یہ ہوگا کہ علاقے میں چوروں اور بدمعاشوں کا بڑا اڈّہ ختم ہو جائے گا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا کوئی اعتبار نہیں کرے گا اور اُس کی قدرتی سزا آج کے دن سے شروع ہو جائے گی۔ باہر ملاقات کرنے والے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

آسمان اَبر آلود ہے اور بڑی خوشگوار ہوا چل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ چند منٹ میں فارغ ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی اس ڈرامے میں میرا ذاتی پارٹ ختم ہو جائے گا اور میں اپنی تعلیم پر پوری توجہ دے سکوں گا۔"

انسپکٹر نے کہا "بیٹا یوسف میں خود یہ نہیں چاہتا کہ آپ کو ایسی الجھنوں کا دوبارہ سامنا کرنا پڑے۔ ایک بات سے مَیں بہت خوش ہوں کہ تم مضبوط اعصاب کے مالک ہو۔ لیکن گزشتہ واقعات کے بعد یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اگر کوئی خطرہ پیش آئے تو تم اپنے آپ کو بہترین نشانہ باز ثابت کر سکو۔ تمہیں نشانہ کی مشق کروانے کے لیے کسی ماہر استاد کی خدمات حاصل کرنا ہماری آولین ذمہ داری ہے مجھے یقین ہے کہ تمہیں بہترین نشانہ باز بننے کے لیے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اب میرے ساتھ تمہارا یہ معاہدہ ہونا چاہیے کہ تمہیں جب فرصت ملا کرے گی تم ہیڈ کوارٹر میں میرے پاس آیا کرو گے اور میں بھی کبھی کبھی چلتے پھرتے تمہارے ہاں پہنچ جایا کروں گا۔ شاید ابھی تم یہ نہ سمجھ سکو کہ میں تم سے اس قدر مانوس کیوں ہو گیا ہوں۔ لیکن کسی دن ہم ایک دوسرے کے لیے معمّا نہیں رہیں گے۔"

"چچا جان میرا خیال ہے کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے لیے معمّا نہیں ہیں۔"

"سنو بیٹا ایک بات میں تمہیں بتا ہی دوں کہ میں زیادہ عرصہ یہاں نہیں رہوں گا
ایس پی صاحب یہاں سے تبدیل ہو کر جا رہے ہیں اور وہ اپنی تبدیلی سے پہلے ہی مجھے
اُس جگہ بھیج دیا کرتے ہیں جہاں انھیں تبدیل ہو کر جانا ہوتا ہے۔

ہم دس گیارہ برس سے ساتھی چلے آرہے ہیں۔ وہ اس بات پر بہت خوش
تھے کہ تمہاری وجہ سے اس ضلع میں ان کے سروس ریکارڈ میں بہت بڑے کارنامے کا
اضافہ ہوا ہے۔ وُہ اِتنے کھلے دل کے آدمی ہیں کہ اگر کسی دن گھوڑے پر سوار ہو کر تمہارے
گاؤں کی طرف نکل آئیں تو بھی مجھے تعجب نہیں ہوگا۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور تھانے دار نے اندر آکر ریسیور اٹھایا اور کان سے لگانے
کے بعد انسپکٹر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"سر ایس پی صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں"

انسپکٹر نے ریسیور پکڑ کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"لیکن سر۔ سر یہ دونوں ڈاکے ایک ہی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا لیڈر
ارجن سنگھ تھا۔ سر مسٹر یوسف نے بڑی تفصیل کے ساتھ تمام واقعات لکھ دیئے ہیں۔ جو
آپ دلچسپی سے پڑھیں گے اور اس کا ترجمہ شام تک آپ کی خدمت میں پیش
کر دوں گا۔

سر مسٹر یوسف اِس وقت میرے پاس بیٹھے ہیں اور ڈاکوؤں کی گرفتاری کے
ساتھ تعلق رکھنے والے تقریباً تمام لوگ باہر بیٹھے ہوتے ہیں ـــ میں یہاں سے فارغ
ہوتے ہی ہیڈ کوارٹر پہنچ جاؤں گا ـــ سر میں پانچ بجے آپ کے بنگلہ پر حاضر ہو
جاؤں گا ـــ سر اگر یہ ممکن ہو سکے تو یوسف اور اِس کے گاؤں کے لوگ اسے اپنی عزّت
افزائی سمجھیں گے۔

لیکن ان دِنوں گاؤں میں کار لے کر جانا بہت مشکل ہوگا۔ یہاں سے ہمیں تقریباً

دو میل پیدل چلنا پڑے گا ـــ

بہت اچھا سر۔ جس دن آپ مناسب سمجھیں گے۔ اسے بلا لیا جائے گا۔

سر میں اسے کہہ دیتا ہوں کہ وہ جب چاہے آپ سے مِل سکتا ہے۔

انسپکٹر نے ریسیور رکھ دیا اور تھانیدار سے مخاطب ہُوا۔ "آپ ملاقاتیوں
سے کہہ دیں کہ میں اُٹھ کر ان کے پاس آنے والا تھا کہ ایس پی صاحب کا فون آگیا۔
ایس پی صاحب اِس بات پر خوش ہیں کہ پنڈت دینا ناتھ جیسے با اثر لوگ اس کیس
میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ بکس وہاں رکھوا دو اور اگر میاں عبدالکریم کے پاس اس کی چابی
موجود ہے تو اُسے کھلوا دو۔ ورنہ تالہ تڑوا دو اور پنڈت دینا ناتھ سے کہو کہ وہ روپے
گننا شروع کر دے میں یوسف صاحب کے ساتھ ابھی آتا ہوں۔"

تھانیدار کمرے سے باہر نکل گیا اور انسپکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا "یوسف صاحب
آپ یہ سمجھ گئے ہوں گے۔ کہ ایس پی صاحب مجھ سے کیا باتیں کر رہے تھے، وہ کل تمہارے
گاؤں آنا چاہتے تھے لیکن میں نے کہہ دیا ہے کہ راستہ خراب ہے اب وہ کسی دن فرصت
کے وقت آپ کو بلائیں گے لیکن انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ جب چاہیں اُن سے
مِل سکتے ہیں۔

یوسف نے کہا "چچا جان مجھے آپ یوسف صاحب کیوں کہتے ہیں۔ صرف یوسف
کیوں نہیں کہتے؟"

"اچھا یوسف ما چلو تمہارے ڈرامے کا اہم ترین سین بھی دیکھ لیں وہ باہر نکلے تو
دائرہ میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے درمیان چٹائی بچھا کر اس کے اُوپر بکس رکھا جا رہا تھا،
انسپکٹر یوسف کے ساتھ باتیں کرتا ہوا آگے بڑھا اور وُہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
انسپکٹر نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور دینا ناتھ کے ساتھ زیادہ گرمجوشی
دکھانے کے بعد کہا۔

"سیٹھ جی آپ کو تکلیف ہوئی، میں چند ضروری کاغذات دیکھنے کے بعد آپ کے پاس آنے والا تھا۔ کہ ایس پی صاحب کا فون آ گیا۔ وہ پولیس کے ساتھ آپ جیسے بااثر لوگوں کے تعاون سے بہت خوش نظر آتے تھے۔ انسپکٹر عبدالعزیز کی آواز حوالات تک پہنچ رہی تھی اور دینا ناتھ کا چہرہ اُتر رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا "بعض لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ڈاکوؤں کے انتقام کا نشانہ بنیں گے، آپ ایسے لوگوں کو حوصلہ دیں کہ حکومت ہر حال میں اُن کی حفاظت کرے گی اور کسی کا بال بیکا نہیں ہوگا۔" پھر وہ عبدالکریم کی طرف متوجہ ہوا۔

"میاں صاحب آپ کا بکس کھل جاتے گا، یا تالہ توڑنا پڑے گا؟"

"جی آپ حکم دیں ابھی کھل جاتے گا۔"

"اچھا تو تکلیف کیجئے۔"

عبدالکریم نے اُٹھ کر بکس کا تالا کھولا اور ڈھکنا اُوپر اٹھا دیا۔

انسپکٹر نے یوسف کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے تھانے دار سے مخاطب ہو کر کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ حساب کتاب کا کام پنڈت دینا ناتھ کے سپرد کر دیا جائے۔"

"ہاں جی اِس کام کے لیے اُن سے بہتر اور کون ہو سکتا ہے۔" "آئیے سیٹھ جی آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ رقم گنیں آپ کے ہاتھ بھی میلے نہیں ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سکّے ابھی ابھی ٹکسال سے نکل کر آئے ہیں۔"

انسپکٹر نے پوچھا "میاں صاحب آپ کو اِتنا وزنی بکس یہاں منگوانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

عبدالکریم نے کہا "جی پچھلی دفعہ میں نے زمین کا سودا کیا تھا تو فروخت کرنے والوں نے یہ کہا تھا کہ ہمیں نوٹوں کی بجائے چاندی کے روپے چاہئیں۔ میں نے گورداسپور کے بنک سے اُنھیں ایک ہزار نوٹوں کے بدلے سکّے لے دیئے تو انہوں نے وزن دیکھ کر باقی

رقم سکّوں میں لینا منظور کر لی۔ اس دفعہ میں نے منشی کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ ایک ہزار روپے اور باقی رقم گورداسپور کے بنک کے نام ڈرافٹ کی صورت میں لے آئے۔ کسی نے مشورہ دیا تھا۔ کہ گاؤں میں اتنا ہی کیش لے کر آنا تھا، لیکن میرے منشی کو کسی ضروری کام کے لیے کہیں جانا پڑا اور میں اُسے ہدایات دے کر یہاں اپنے گاؤں میں آ گیا تھا۔"

"تو آپ کے خیال میں ارجن سنگھ نے کہیں سے یہ سُن کر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ آپ رقم لے کر آنے والے ہیں۔"

"جی ہاں، لیکن یہ ایک معجزہ تھا کہ ارجن سنگھ اور اُس کے ساتھیوں کا یہ وار خالی گیا اور میری عزّت کے ساتھ میرا روپیہ بھی بچ گیا۔ ڈاکوؤں کی دوسری کوشش کی وجہ یہ تھی کہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ میرا منشی گاڑی پر رقم لے کر آ رہا ہے۔"

انسپکٹر نے دینا ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن جناب ڈاکوؤں کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ آپ کا منشی پیسے لے کر آ رہا ہے؟"

دینا ناتھ کا چہرہ بھیگے ہوئے جوتے کی طرح ہو رہا تھا اور وہ اِدھر اُدھر ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے گلے پر چھری رکھی جا رہی ہے۔

عبدالکریم نے جواب دیا "جناب ایسی باتیں پوشیدہ نہیں رہتیں میرے لیے زمین بیچنے والے کو یہ یقین دلانا ضروری تھا کہ میرا منشی پیسے لے کر آ رہا ہے اور وہ شام کی گاڑی پر پہنچ جائے گا اور اگلے دن ہم کچہری میں رجسٹری کروانے چلے جائیں گے۔ میں نے پنڈت دینا ناتھ سے بھی کہا تھا کہ وہ زمین کے مالک کو یقین دلائیں کہ میری طرف سے کوئی وعدہ خلافی نہیں ہوگی اور میں نے زیادہ احتیاط اس لیے بھی نہیں برتی تھی کہ منشی نقد صرف ایک ہزار روپیہ لے کر آ رہا تھا۔ باقی رقم میرے نام گورداسپور بنک میں کیش ہونے والے ایک ڈرافٹ کی صورت میں تھی اور وہ اگر ڈاکو لے بھی جاتے تو میرا کچھ نہ بگڑتا۔ ویسے لوہے کا بکس اُٹھا کر کسی ڈاکو کے

لیے بارش اور کیچڑ میں بھاگنا آسان نہ تھا۔ یوسف صاحب نے میرے منشی کو حفاظت سے پہنچانے کے کافی انتظامات کر رکھے تھے اور پولیس بھی بہت چوکس تھی۔

انسپکٹر نے کہا "پنڈت جی آپ پیسے گنتے جائیں تاکہ یہاں میرا کام جلدی ختم ہو جائے۔ پہلے اِس بکس میں سے وہ ڈرافٹ نکال کر دیکھ لیں۔ میاں صاحب اِس سلسلے میں آپ اِن کی مدد کریں۔"

میاں عبدالکریم نے اُٹھ کر بکس سے ایک چھوٹا سا چمڑے کا تھیلا نکالا۔ اُسے اطمینان سے کھولا اور ڈرافٹ نکال کر انسپکٹر کو پیش کر دیا۔

دینا ناتھ جس کے ہاتھ لرز رہے تھے، اب ذرا اطمینان سے روپے گننے لگا۔ بالآخر اُس نے کہا۔

"جناب یہ پورا ایک ہزار روپیہ ہے۔"

انسپکٹر نے کہا "شکریہ سیٹھ صاحب اب آپ آرام سے کرسی پر بیٹھ جائیں اگر آپ تھک گئے ہیں تو گھر جا کر آرام کریں۔"

تھانیدار نے کہا "ہاں جی میں بھی یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ بہت تھک گئے ہیں۔"

انسپکٹر بیلا سنگھ کی طرف متوجہ ہوا

"سردار بیلا سنگھ حکومت آپ کی کارگزاری پر بہت خوش ہے۔ ممکن ہے کہ ایس پی صاحب آپ کو اچانک بلا لیں۔ تھانیدار صاحب آپ اپنی تفتیش جاری رکھیں۔ ایسے مقدمات میں وعدہ معاف گواہوں سے بہت کچھ معلوم ہو جایا کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ جو پھندا لگ چکا ہے اس میں اور بھی کئی ڈاکو پھنس جائیں۔ میں ایک ضروری کام سے واپس جا رہا ہوں، لیکن میں آپ سے نئی اطلاعات پوچھتا رہوں گا۔"

انسپکٹر نے اُٹھ کر اپنی موٹر سائیکل کا رخ کرتے ہوئے پریم سنگھ کو اشارہ کیا۔ وہ بھاگ کر تیزی سے آگے بڑھا۔"

انسپکٹر نے اطمینان سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

پریم سنگھ تمہارے اور بہادر سنگھ کے متعلق مسٹر یوسف نے بہت اچھی باتیں کہی ہیں۔ امید ہے کہ تم بہت جلد کوئی اچھی خبر سنو گے۔

انسپکٹر کے روانہ ہوتے ہی تھانیدار نے کہا "بھئی سیٹھ دینا ناتھ بہت تھک گئے ہیں۔ تم ان کی گھوڑی لے آؤ اور انہیں عزت کے ساتھ رخصت کرو۔

اور گھوڑی لانے والے سپاہی نے سیٹھ جی کی عزت افزائی یوں کی کہ گھوڑی حوالات کے بالکل قریب کھڑی کر دی۔ یہاں ڈاکو سلاخوں سے منہ لگائے اُسے غضبناک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

حوالدار اور بہادر سنگھ نے دینا ناتھ کے بھاری بھرکم وجود کو سہارا دے کر اٹھایا اور اُسے کشاں کشاں گھوڑی کے قریب لے گئے۔ جب دینا ناتھ گھوڑی پر سوار ہونے لگا تو حوالاتیوں نے بلند آواز میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ سب سے بلند آواز دوسری واردات میں پکڑے جانے والے اس آدمی کی تھی جسے سردار بیلا سنگھ کے کتوں نے پکڑ کر اس کی پنڈلی کا کچھ گوشت بھی نوچ لیا تھا اور جسے صبح سویرے پیٹ پر ٹیکہ لگایا گیا تھا اور ڈاکٹر نے جو گورداسپور سے ٹیکہ لگانے آیا تھا۔ یہ کہا تھا کہ ایسے چودہ ٹیکے لگیں گے۔

ایک سپاہی دینا ناتھ کی گھوڑی کی باگ پکڑ کر سڑک پر لے گیا لیکن حوالات سے بدستور گالیوں کی آواز آتی رہی۔ دینا ناتھ کے ہونٹ لٹکے ہوئے تھے۔ گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ اپنے دل میں کہہ رہا تھا "بھگوان یہ کیا ہوا؟ —— کیوں ہوا؟ —— بھگوان میری مدد کر —— میں بہت دان کروں گا۔ میں کبھی تھانے کا رخ نہیں کروں گا۔ میں کسی کے خلاف جھوٹی گواہی نہیں دوں گا۔ دینا ناتھ اپنے گرد و پیش سے بے خبر بڑبڑاتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے یہ احساس نہ تھا کہ وہ بازار اور نہر کے پل سے گزر چکا ہے۔ کئی لوگوں نے راستے میں اُسے سلام کیا لیکن سیٹھ جی نے کسی کی طرف توجہ نہ دی۔ اُسے ایک انجانے خوف

سے پسینہ آرہا تھا۔ گھوڑی ریلوے سٹیشن کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی اُس جگہ سے کچھ آگے دائیں طرف مڑی جہاں پلیٹ فارم ختم ہوچکا تھا اور ریلوے لائن عبور کرنے کے بعد جب وہ کھمبے کے قریب سے گزر رہا تھا تو اچانک تین آدمی سامنے آگئے۔ گھوڑی اپنا راستہ بند پاکر اچانک کھمبے کی طرف ہٹ گئی اور اطمینان سے کھمبے اور اسے سہارا دینے والی تار کے درمیان سے گزر گئی۔

دینا ناتھ کو اَب اپنے گردوپیش کا ہوش نہ تھا۔ اُس نے سامنے کے آنے والوں کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا تھا اور نہ ہی اُس تار کا کوئی نوٹس لیا تھا جو کھمبے سے کوئی چھ سات قدم دُور ایک کھونٹے کے سات بندھی تھی۔ سیٹھ جی کی عافیت پسند گھوڑی نے اپنے لیے نئی گزرگاہ دیکھ لی تھی لیکن جب گھوڑی کی گردن آگے نکل گئی تو تار پہلے سیٹھ جی کی ٹھوڑی کو لگی۔ وہاں سے پھسلی تو اُوپر کے چار دانت نکالنے کے بعد ناک کو بُری طرح زخمی کر گئی سیٹھ جی کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ ایک طرف لڑھک گئے۔

دیہاتیوں نے بھاگ کر پنڈت جی کو سہارا دیا لیکن وہ بے ہوش ہوچکے تھے اور منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ایک آدمی نے ہمت کی، وہ گھوڑی کے پیچھے بیٹھ گیا اور دوسرے نے لگام پکڑلی۔ گھوڑی اپنی سست رفتاری کے باعث بہت مشہور تھی لیکن اب اُسے بھوک لگی ہوئی تھی۔ اور وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

سیٹھ جی گھر پہنچے تو وہاں کہرام مچ گیا۔ انھیں گھوڑی سے اتار کر بستر پر لٹا دیا گیا۔ اُن کا منہ اس قدر سوجا ہوا تھا کہ شکل بھی پہچانی نہیں جاتی تھی۔ پہلے اُن پر دیسی ٹوٹکے آزمائے گئے اور جب انھیں کچھ ہوش آیا تو اُنھوں نے پُوچھا میں کہاں ہوں؟"

گھر والی سے جواب مِلا" مہاراج اپنے گھر میں"۔

"میں زندہ ہوں؟"

مہاراج بھگوان کی کِرپا سے آپ زندہ ہیں"۔

"اوہ مرگیا ـــــ مرگیا، مجھ پر کس نے حملہ کیا تھا؟"

اُن کے بیٹے روپ چند نے جواب دیا" پتا جی دوسرے گاؤں کے، وہ آدمی جو آپ کو لے کر آئے تھے۔ یہ کہتے تھے کہ آپ کھمبے کے قریب سے گزرتے ہوئے تار سے زخمی ہوگئے تھے۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں آپ کو یہاں لائے تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے وہ پتا جی، میں نے انھیں دو دو روپے انعام دیے تھے"۔

دینا ناتھ نے درد سے کراہتے ہوئے کہا" اُن کو گولی مارو، وہ مجھے پاس ہی ہسپتال کیوں نہ لے گئے"۔

تھوڑی دیر بعد پنڈت جی کو گڈے پر لاد کر ہسپتال پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ہسپتال پہنچتے ہی تین بار بے ہوش ہوچکے تھے۔

شام تک یہ قصّہ آس پاس کے تمام دیہات میں مشہور ہوچکا تھا۔

پڑوس کے گاؤں کا ایک سِکھ جیون سنگھ جسے دینا ناتھ کے ساتھ خدا واسطے کا بیر تھا ہر محفل میں اس واقعہ کی یہ تشہیر کرتا تھا کہ دینا ناتھ اتنا بدمعاش اور مغرور ہے کہ جب لوہے کی تار سامنے آگئی تب بھی یہ اپنی گھوڑی پہ اکڑ کر بیٹھا رہا۔ اُس نے چار دانت نکلوا لیے۔ ناک زخمی کروا لیا لیکن اِس کی اکڑ میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں اُس سے پوچھتا ہوں کہ "بیوقوف کے بچّے اگر تو سر جھکا لیتا تیرا یہ حشر تو نہ ہوتا۔ یہ بھی اِس کی خوش قسمتی تھی کہ تار اِس کی گردن کو نہیں لگی تھی، ورنہ دینا ناتھ جی کا بولو رام ہوگیا ہوتا"

اگلا دِن یوسف کے لیے بڑا اہم تھا۔ آسمان ابر آلود تھا اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آٹھ بجے ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوچکی تھی۔

دس بجے کے قریب جب بارش ذرا تیز ہوچکی تھی۔ پریم سنگھ گھوڑا بھگاتا ہوا گاؤں پہنچا اور اُس نے یوسف کو اطلاع دی "جناب مبارک ہو۔ انسپکٹر عبدالعزیز کا فون آیا ہے کہ آج شام چار بجے ایس پی صاحب اور ڈپٹی کمشنر صاحب نے آپ کو ملاقات

کے لیے بلایا ہے۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا "مبارک کس بات کی سردار جی؟"

پریم سنگھ نے جواب دیا "جناب آپ کو خوشی ہو یا نہ ہو، لیکن ہمارے تھانے کا ہر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اُس کے لیے خوشی کا دن ہے۔ ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ ہمارے تھانے کے سپاہیوں سے لیکر افسروں تک کو بہت جلد ترقیاں مل جائیں گی۔ کسی علاقے میں ایک نیک بخت پیدا ہوتا ہے تو سب کا بھلا ہوتا ہے۔"

یوسف مسکرایا "حوالدار صاحب، آپ یہی سننا چاہتے ہیں کہ آپ اے ایس آئی کب بنیں گے؟"

پریم سنگھ مسکرایا "میرے لیے آپ کا مسکرا دینا ہی کافی ہے لیکن اگر آپ زبان سے کہہ دیں تو میں سمجھوں گا کہ میں اے ایس آئی ہو گیا ہوں۔"

"اچھا بھئی میں کہہ دیتا ہوں کہ تم جلد اے ایس آئی ہو جاؤ گے۔ اب آرام سے یہاں بیٹھ جاؤ اور بارش رُکنے کا اِنتظار کرو۔ آج تم کھانا یہیں کھاؤ گے۔"

پریم سنگھ نے کہا "میاں جی یہ بارش رُکنے والی معلوم نہیں ہوتی۔ میں کل سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ بادل جب برسنا شروع کر دیں گے تو خوب برسیں گے اور مجھے تھانیدار کا یہ حکم ہے کہ میں پیغام دے کر فوراً واپس پہنچوں تاکہ وہ انسپکٹر صاحب کو اطلاع دے سکیں کہ آپ ان کے پاس جا رہے ہیں۔ دیکھئے بارش اب آہستہ آہستہ تیز ہو رہی ہے۔ آپ دو بجے کے قریب تھانے پہنچ جائیں۔ ہم وہاں سے آپ کو لاری پر رخصت کریں گے۔ بہادر سنگھ خاص طور پر یہ کہتا تھا کہ آپ ذرا پہلے آئیں۔"

"اگر بارش کی یہی حالت رہی تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھے لاری کی بجائے گھوڑے پر یہاں سے گورداسپور پہنچ جانا چاہیئے اِس لیے آپ انسپکٹر صاحب کو فون پر یہ اطلاع دے دیں کہ میں سیدھا ایس پی صاحب کے دفتر پہنچ کر انھیں تلاش کروں گا۔"

"جناب آپ کی ایس پی اور ڈی سی سے ملاقات ہے۔ آپ خیال رکھیں کہ آپ کے کپڑے بھیگے ہوئے نہیں ہوں گے۔"

یوسف نے کہا "ایس پی اور ڈی سی کو معلوم ہوگا کہ بارش پر میرا کوئی کنٹرول نہیں اور اگر میں بس پر جاؤں تو بھی بھیگ جاؤں گا۔"

"بہت اچھا جیسے آپ کی مرضی لیکن بہادر سنگھ کو بہت افسوس ہوگا۔ وہ آپ کو دینا ناتھ کے متعلق بہت کچھ سنانا چاہتا تھا۔"

"وہ دینا ناتھ کے پاس گیا تھا؟"

"جناب وہ دینا ناتھ کو ہسپتال میں تین بار دیکھ چکا ہے اور ہر مرتبہ اپنے ساتھ نئے لوگوں کو لے جاتا ہے۔ میرا مطلب ہے تھانے کے لوگوں کو نہیں، علاقے کے لوگوں کو اور جب وہ اس کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ رکھتا ہے تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ کل شام وہ مجھے بھی لے گیا تھا۔ دینا ناتھ کی واقعی بُری حالت ہے۔ چہرے کی سوزش سے اُس کی آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں۔ وہ مشکل سے بولتا ہے۔ صبح بہادر سنگھ اُسے دیکھ کر آیا تھا تو اُس نے بتایا تھا کہ دینا ناتھ کو بولنے کی تکلیف سے بچانے کے لیے ڈاکٹر نے اُس کے منہ پر پٹی باندھ دی ہے۔ اُس کے دل میں ایک ہی پچھتاوا ہے کہ اُس نے سیٹھ دینا ناتھ کو تار میں پھنس کر دانت نکلواتے نہیں دیکھا۔"

یوسف نے کہا "بہادر سنگھ ایک سیدھا سا آدمی ہے۔"

"ہاں جی سیدھا تو بہت ہے۔ لیکن اُس نے ایک کمال کیا ہے کہ صبح ہوتے ہی کہیں سے فوٹوگرافر کو تلاش کر کے تین چار آدمیوں کے ساتھ وہاں لے گیا تھا اور انہوں نے دینا ناتھ کے تیمارداروں کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر اُسے بستر سمیت اُٹھوا کر باہر روشنی میں رکھ دیا تاکہ فوٹوگرافر اُس کی تصویریں لے سکے۔ دینا ناتھ کو خبر نہیں

تھی کہ اُس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ بہادر سنگھ اُٹھا اُٹھا کر اُس کے پوز بناتا تھا اور جب ہسپتال کے ڈاکٹر اور نرسیں متوجہ ہوئے تو بہادر سنگھ بڑے اطمینان کے ساتھ اس کا بستر اندر رکھوا کر روانہ ہو چکا تھا۔

بیوقوفی تو دراصل دینا ناتھ کے بیٹے کی تھی۔ اُس نے تھانے میں یہ رپورٹ لکھوائی تھی کہ اُس کے پتا جی اِس لیے تار میں پھنس کر زخمی ہو گئے تھے کہ وہ غلط جگہ لگی ہوئی تھی اور انھیں یہ بھی شبہ ہے کہ اُن کی گھوڑی سیدھے راستے جا رہی تھی لیکن کسی دشمن نے ہانک کر اُس کا رُخ بدل دیا تھا۔

بہادر سنگھ نے اُس کھمبے اور تار کی تصویریں بھی بنوائی ہیں اور جو کچھ وہ رپورٹ میں بیان کرے گا، بہت دلچسپ ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ گوردا سپور سے واپس آئیں گے۔ بہادر سنگھ آپ کا انتظار کر رہا ہو گا۔"

باب - ۱۴

شام کے وقت یوسف کے مہمان خانے میں کافی چہل پہل تھی۔ اس کے والد شام کی گاڑی سے گھر پہنچ گئے تھے۔ گاؤں کے سرکردہ اور آس پاس کے دوسرے لوگ بمعہ عبدالکریم، فضل دین پہلے ہی وہاں موجود تھے اور انہیں بہادرانہ کارناموں پر مبارک باد دی جا رہی تھی۔ سردار بیلا سنگھ اور بہادر سنگھ بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ جیون سنگھ نمک مرچ لگا کر دینا ناتھ کے زخمی ہونے کا قصہ بیان کر رہا تھا۔

یوسف کے والد اور حویلی میں جمع ہونے والے دوسرے لوگوں کو یوسف کے آنے کا انتظار تھا۔ جوں جوں اندھیرا ہو رہا تھا اُن کا اضطراب بڑھ رہا تھا۔ بہادر سنگھ نے اُٹھ کر کہا "چچا جی میں تھانے جا کر فون کرواتا ہوں کہ وہ اب تک کیوں نہیں آتے"۔

یوسف کے والد نے کہا "بیٹا تھوڑی دیر اور انتظار کرو۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا"۔

اچانک بلّو نے کہا "جناب یوسف صاحب آ رہے ہیں" اور چند ثانیے بعد حویلی میں سکوت طاری تھا اور گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دے رہی تھی۔

دو منٹ بعد یوسف حویلی میں داخل ہو کر ہانپتے ہوئے گھوڑے سے اُترا۔ میاں عبدالرحیم اُسے پیار سے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھے لیکن یوسف نے کہا۔

"اباجی میرے کپڑے کیچڑ سے بھرے ہوئے ہیں"۔

باپ نے اُسے گلے لگا کر بوسہ دیتے ہوئے کہا "ارے بیٹا مجھے اُس وقت بھی تم پر اسی طرح پیار آیا کرتا تھا۔ جب تم بہت چھوٹے تھے اور بھاگتے ہوئے گر کر مٹی میں لت پت ہو جایا کرتے تھے ——— مجھے تمہارے کارنامے پر فخر ہے۔" یوسف سے یہ بات سننے کے لیے سب بے چین تھے کہ ایس پی اور ڈی سی سے اُس کی ملاقاتوں کا کیا نتیجہ نکلا ہے۔ بہادر سنگھ زیادہ دیر تک ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے کہا "بھائی صاحب یہ تو بتایئے کہ گورداسپور میں کیا ہوا۔ آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی؟"

"بھئی میں پہلے انسپکٹر صاحب سے ملا تھا۔ انھوں نے میرے لباس پر کیچڑ دیکھا تو نہلا دھلا کر اپنے نئے کپڑے پہنا دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارا قد برابر ہے۔ ورنہ میں کارٹون دکھائی دیتا۔ وہ مجھے ایس پی صاحب کے پاس لے گئے۔ ایس پی صاحب نے کچھ دیر دونوں وارداتوں کے متعلق باتیں کیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ پھر وہ چند آدمیوں کو ٹیلی فون کرنے کے بعد مجھے ڈی سی کے پاس لے گئے۔ جب میں انسپکٹر صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا تو پولیس اور محکمہ مال کے افسر بھی، ڈی سی کے گھر آئے ہوئے تھے۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ مجھے ان دونوں ڈاکوؤں کے متعلق دوبارہ ان کے سوالات کے جوابات دینے پڑے اور وہاں کافی وقت لگ گیا اور ایک عجیب بات ہوئی۔ ڈی سی نے اچانک پوچھا "تمہاری حفاظت کے لیے تمہارے گاؤں سے یا پولیس اسٹیشن سے کتنے آدمی آئے ہیں؟" میں نے جواب دیا "جی میں اکیلا گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہوں۔" دوسرا سوال مجھ سے یہ پوچھا گیا کہ تمہارے پاس کوئی اسلحہ ہے؟" میں نے جواب دیا "میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں خطرے کے وقت صرف اپنے گھوڑے پر بھروسہ کر سکتا تھا۔" ڈی سی نے چند منٹ ایس پی سے باتیں کیں اور وہیں یہ فیصلہ ہوا کہ میرے لیے اسی وقت ایک ریوالور کا انتظام کیا جائے۔

میری یہ بات ایس پی صاحب سے پہلے ہو چکی تھی کہ میں کوئی انعام کسی صورت میں نہیں لوں گا۔ اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ ایس پی صاحب نے اپنے ذاتی اسلحہ سے تحفہ کے طور پر ایک خوب صورت ریوالور منگوایا اور مجھ سے یہ کہا کہ میں آپ کو ذاتی طور پر یہ تحفہ پیش کر رہا ہوں حکومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اس بات کا خیال رکھو گے کہ میں یہاں سے تبدیل ہو کر جا رہا ہوں اور جب کسی دن تم میرے پاس کوئی تحفہ لے کر آؤ گے تو میں اُسے بخوشی قبول کروں گا۔ ڈی سی صاحب نے بھی مجھ سے پوچھا تھا کہ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن میں نے اُن سے صاف کہہ دیا تھا کہ اپنے لئے سب کچھ میں خود کروں گا۔ اور اگر میں نے دوسروں کے لیے یا اس ملک کے لیے کوئی اچھا کام کیا تو کبھی اُس کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو ڈی سی صاحب نے کہا تھا کہ تم نے اپنی رپورٹ میں جو سفارشات کی ہیں، وہ سب منظور کر لی جائیں گی اور ایس پی صاحب نے بھی مجھے یہی کہا تھا۔ کہ جب تمہیں کوئی کام پڑے سیدھا ڈی سی کے پاس چلے آنا۔"

بہادر سنگھ نے پوچھا "جی میرے اور حوالدار کے متعلق بھی۔"

"ہاں بھئی امید ہے کہ تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔"

پریم سنگھ نے کہا "یار ذرا اپنا پستول تو دکھاؤ۔" یوسف نے ریوالور پیٹی سمیت اتار کر اس کو پیش کر دیا۔ اُس نے چراغ کی روشنی میں ریوالور نکال کر ایک ہی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "یار بہت خوب صورت ہے، یقیناً بہت قیمتی ہوگا۔"

"بہادر سنگھ نے کہا "یار ایس پی کا ذاتی ریوالور کوئی کم قیمت کا تو نہیں ہو سکتا۔" یوسف نے کہا "حوالدار صاحب دو تین دن تک انسپکٹر صاحب میرے لیے بہت سی گولیاں لے کر آئیں گے تاکہ میں مشق کر سکوں۔ اُن کے ساتھ ایک نشانہ باز بھی

آئے گا۔ جو ایک دو دِن میرا مہمان ہو گا۔ اور انسپکٹر صاحب شاید آپ کے
لیے بھی کوئی اچھی چیز لے کر آئیں۔"

عبدالرحیم نے کہا۔"اچھا بیٹا اب اندر جا کر کھانا کھا لو۔"

یوسف نے پوچھا" اباجی آپ کھانا کھا چکے ہیں۔"

"ہاں بھئی مَیں نے نمازِ مغرب کے بعد میاں عبدالکریم کے ساتھ کھانا کھا لیا تھا۔
میرا خیال ہے کہ تمہاری امّی اور دادی کے سوا گھر کے باقی سب لوگ کھا چکے ہیں
یقیناً وہ تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

پریم سنگھ نے پستول چمڑے کے غلاف میں بند کر کے پیٹی واپس دیتے
ہوئے کہا:"یوسف جی پستول دینے والوں نے آپ کو یہ نہیں سمجھایا تھا کہ رات کو
چلتے وقت اِسے لوڈ کر کے رکھنا چاہیے۔"

یوسف نے جواب دیا۔" رات کے وقت میری ساری توجہ اپنے راستے پر تھی۔
اور اگر کوئی اچانک نظر آ جاتا تو میرے لیے راستہ بدل کر نکل جانا آسان ہوتا۔ میں بلا وجہ
آج نشانہ بازی کے موڈ میں بھی نہیں تھا ——
آپ نے کھانا کھا لیا ہے۔؟

"جی ہاں، ہم سب کھا چکے ہیں۔ آپ جائیں۔"

یوسف نوکر کو گھوڑے کے متعلق ہدایات دے کر تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا
گھر پہنچا۔ اس کی ماں حسبِ معمول ڈیوڑھی کے دروازے پر موجود تھی اور اس مرتبہ اس
کے دائیں بائیں امینہ اور اُس کی ماں بھی کھڑی تھی۔

یوسف نے حسبِ معمول سلام کہہ کر ماں کے سامنے سر جھکا دیا اور وہ اُس کی پیشانی
چُومنے لگی۔

رشیدہ نے کہا:

"بہن یوسف کی بہت بڑی کامیابی مبارک ہو۔"

امینہ بولی" چچی جان میں بھی آپ کو مبارک باد دیتی ہوں اور یوسف صاحب
آپ کو بھی۔"

"شکریہ، لیکن مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کیا کامیابی ہوئی ہے۔"

رشیدہ نے کہا" بیٹا خدا کا شکر ادا کرو۔ ایس پی اور ڈی سی کا آپ کو
اتنی عزت سے بلانا کوئی معمولی بات نہیں۔"

"جی یہ ایک رسمی سی بات تھی۔"

"لیکن تمہارے چچا تو کہتے تھے کہ اس ملاقات کے بعد تمہارے لیے کامیابی
کے دروازے کھل جائیں گے۔"

"جی یہ ایک معمولی سی بات تھی —— امّی جان مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"چلو بیٹا۔ تمہارا کھانا ابھی تیار ہو جائے گا۔ میں نے تمہارے لیے صاف کپڑے
غسل خانے میں رکھوا دیے ہیں۔ تم نہا لو اتنی دیر میں تمہارا کھانا گرم ہو جائے گا۔"



یوسف نے کھانے کے بعد نماز پڑھی تو اُس کے باپ نے اُوپر سے آواز دی:

"بیٹا یہاں آ جاؤ مَیں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

یوسف جلدی سے اُوپر پہنچا اور ایک کرسی اُٹھا کر کھلی چھت پر باپ کے قریب
بیٹھ گیا۔ باپ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"یوسف مجھے سچ سچ بتاؤ کہ ڈی سی اور ایس پی نے صرف تمہارے پستول کا ذکر
کیا تھا یا تمہارے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی باتیں کی تھیں؟"

"جی میرے مستقبل کے متعلق وہ اِس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے کہ آگے چل کر
اگر تمہیں کسی ملازمت کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک میرے پاس چلے آنا۔ ایس پی صاحب

نے تو یہاں تک کہا کہ تم بی اے کرتے ہی میرے پاس آؤ اور میں پولیس سروس کے لیے تمہاری مدد کروں گا۔ ڈی سی صاحب نے کہا تھا تمہیں سول یا فوجی سروس میں ہماری ضرورت پڑی تو تمہاری پوری مدد کی جائے گی۔"

"اور تم نے کیا جواب دیا تھا۔"

"جی میں نے یہی کہا تھا کہ میں بی اے یا ایم اے کرنے کے بعد اپنے مستقبل کا فیصلہ کروں گا۔"

"برخوردار جو پروگرام تمہارے ذہن میں ہے۔ وہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے دماغ پر اب تک رائٹر بننے کا بھوت سوار ہے۔ میرا خیال تھا کہ کالج کے نئے ماحول میں تمہارے خیالات بدل جائیں گے۔ وہاں تمہارے پروفیسر تمہیں یہ سمجھا سکیں گے کہ ہمارے ملک میں کوئی رائٹر ایسا نہیں جس نے عزت اور فراغت کی روزی کمائی ہو لیکن تمہارے خیالات میں شاید کوئی فرق نہیں آیا۔ اب تمہیں ایک زریں موقع ملا تھا اور تم نے یہ کہہ دیا کہ آگے چل کر سوچوں گا۔ جیسے وہ لوگ اس بات کا انتظار کرتے رہیں گے کہ تم اچھی طرح سوچ لو اور پھر وہ تمہیں تمہاری پسند کی ملازمت دلوا دیں گے۔"

یوسف نے کہا"اباجی میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں۔"

"نہیں پہلے میرے سوال کا جواب دو کہ تم زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"اباجی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"باپ نے غصے سے پوچھا" تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا کرنا چاہتے ہو۔"

"اباجان اِس وقت میں آپ سے صرف ایک وعدہ کرسکتا ہوں کہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو کچھ میں کروں گا آپ اس پر فخر کیا کریں گے اور میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ کو ندامت ہو۔"

"دیکھو یوسف ایسی باتیں تمہاری ماں کو خوش کرسکتی ہیں۔ مجھے نہیں۔ میں ایک حقیقت پسند آدمی ہوں۔"

یوسف نے جواب دیا" اباجی آپ مطمئن رہیں۔ میں بھی پوری حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرتا ہوں۔"

قدسیہ بیگم دودھ کا ایک جگ لے کر اُوپر آئیں اور ایک گلاس بھر کر یوسف کے والد کو پیش کرتے ہوئے کہا"لیجئے دودھ پیجئے اور میرے بیٹے کو پریشان نہ کیجئے۔ آپ کو دنیا میں اس کی وجہ سے کسی جگہ شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

عبدالرحیم نے کچھ کہے بغیر گلاس پکڑ لیا اور ماں نے بستر پہ بیٹھتے ہوئے یوسف کی طرف متوجہ ہو کر کہا" بیٹا تم نے اپنے اباجی کو بہت پریشان کیا۔ اتنی دیر نہیں لگانی چاہیے تھی تمہیں۔ عبدالکریم کی بیٹی کہتی ہے کہ ہمیں کچھ بانٹنا چاہیے۔ امینہ کی ماں بھی بہت خوش تھی۔"

"امی جان مجھے اُن کی خوشی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ انہوں نے ملاقات کے لیے بلایا تھا اور میں ان سے مل کر آیا ہوں۔ کچھ باتیں عبدالکریم صاحب سے بھی تعلق رکھتی ہیں وہ صبح بتا دوں گا۔"

عبدالرحیم نے پوچھا" عبدالکریم سے کون سی باتیں تعلق رکھتی ہیں؟"

"جناب ایک تو یہ ہے کہ اُنھیں فضل دین اور اپنے ایک مزارع کو بندوقیں خرید کر دینی پڑیں گی۔ انھیں لائسنس مل جائے گا۔ ہمارے گاؤں سے تلّو اور بوٹا عیسائی اور پیراں دتہ چوکیدار کو بھی بندوق کے لائسنس مل جائیں گے اور سرکاری اسلحہ خانے سے بہت سستی قیمت پر بندوقیں نکلوا دی جائیں گی۔ گاؤں کے لوگ بخوشی ان کے لیے چندہ جمع کر دیں گے۔"

عبدالرحیم نے کہا"بیٹا میں لاہور تبدیل ہو گیا ہوں اور مجھے پندرہ دن کی چھٹی

ملی ہے اور تم اِن دس دنوں میں اتنا کچھ کر چکے ہو کہ اُسے جلد سمیٹنے کی صورت نظر نہیں آتی۔ مَیں نے لاہور میں مکان لے لیا ہے اور چپڑاسی کو چھوڑ آیا ہوں اور پرسوں وہ یہاں آجائے گا اور دو دن بعد تمہیں بھی اُس کے ساتھ لاہور چلے جانا چاہیے تاکہ کالج کھلنے سے پہلے کچھ تیاری کر لو۔"

قدسیہ نے کہا۔ "آپ اپنے بیٹے کو کوئی خوشی کی بات بھی بتا دیا کریں۔"

"بیٹا خوشی کی بات یہ ہے کہ اب ہم لاہور میں اکٹھے رہا کریں گے۔"

یوسف نے کہا "ابّا جی یہ بات تو مجھے آتے ہی معلوم ہو جانی چاہیے تھی۔"

باپ نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹا مجھے معلوم ہے کہ تم یہ سُن کر خوش ہو گئے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جب تمہیں یہ بتایا جائے گا کہ ہم سب لاہور جا رہے ہیں تو تم مجھے اپنی ملاقات کے متعلق تمام باتیں بتانا بھول جاؤ گے۔ اب تمہاری ماں کی موجودگی میں بھی میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تمہاری باتوں سے خوش نہیں ہوں۔ تمہیں ایک سنہری موقع ملا تھا لیکن تم نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔"

"ابّا جی مَیں نے وہی کیا ہے جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ جب میں گیا تھا تو وہ سب مجھ سے اُٹھ کر ملے تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جب میں اُن سے رخصت ہونے لگوں تو میرا قد و قامت اُن کی نگاہوں میں چھوٹا ہو جائے۔"

"سچ کہو تم نے اُنھیں بھی یہ بتا دیا تھا کہ تم ناول لکھنے کے لیے پیدا ہوئے ہو۔ اِس لیے اور کچھ نہیں کرو گے۔"

قدسیہ نے فوراً مداخلت کی ضرورت محسوس کی اور کہا "اب بلاوجہ اپنا موڈ مت خراب کیجیے۔ اگر یوسف نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو آتے ہی بتا دیتا۔ اِس نے اپنی تعلیم کے بارے میں آپ سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب پورے کیے ہیں اور تعلیم کے بعد میرا بیٹا جس کام میں ہاتھ ڈالے گا اُس میں کامیاب ہوگا۔ آپ اس کے لیے

دعا کیا کریں ——— میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ رشیدہ اور اس کی بیٹی بہت اصرار کرتی ہیں کہ ہم پرسوں یا اس سے اگلے روز اُن کے ہاں کھانا کھائیں۔ انہوں نے ہمارے علاوہ آپ کے بھائیوں اور اُن کے بیوی بچّوں کو بھی بلایا ہے۔"

یوسف نے کہا "امی جان آپ نے اُنھیں یہ نہیں بتایا کہ ہم لاہور جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"بیٹا میں نے انھیں بتایا تھا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں اور انھوں نے ایک اور درخواست کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ایک روز پہلے روانہ ہوں اور ایک رات امرتسر میں اُن کے ہاں قیام کریں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ امرتسر میں آپ کی دعوت پھر کبھی کھا لیں گے۔ ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں یوسف اور اُس کے ابّا جان کی مصروفیات کیا ہوں گی۔"

عبدالرحیم نے کہا "عبدالکریم نے تو مجھے دیکھتے ہی دعوت کھانے کا وعدہ لے لیا تھا اور وہ کئی بار کہہ چکا ہے کہ جب میں امرتسر سے گزروں اُن کے ہاں ضرور ٹھہرا کروں۔ وہ خواہ کہیں ہوں مکان پر نوکر میری خدمت کے لیے موجود ہوں گے۔ انہوں نے لاہور میں بھی مکان کے لیے کافی زمین خریدی ہوئی ہے اور جب مکان مکمل ہو جائے گا تو وہ لاہور میں منتقل ہو جائیں گے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ میں لاہور تبدیل ہو کر جا رہا ہوں تو بہت خوش ہوا تھا۔ آدمی تو بہت سادہ سا معلوم ہوتا ہے لیکن جائیداد بہت بنائی ہے اُس نے۔ کئی جگہ ٹھیکے لے رکھے تھے۔ دو مربع ایک کوٹھی لائل پور میں ہے اور اب یہاں بہت سی زمین خریدنا چاہتا ہے۔"

نیچے سے یوسف کی دادی کی آواز سنائی دی "یوسف تم کہاں ہو؟"

یوسف اُٹھ کر بھاگتا ہوا نیچے اُترا اور دادی کو فرش سے تین چار سیڑھیاں اُوپر روکتے ہوئے بولا "دادی جان مَیں نے سلام کہا تھا لیکن آپ نماز پڑھ رہی تھیں۔"

"عبدالرحیم سو گیا ہے؟"

یوسف نے سرگوشی کے انداز میں جواب دیا" دادی جان آپ آرام سے میری بات سُنیں۔ آپ اِس وقت اُوپر جاکر جو موضوع چھیڑنا چاہتی ہیں۔ اس سے بہت بدمزگی پیدا ہوگی۔"

"نالائق میں کون سا موضوع چھیڑنا چاہتی ہوں۔"

"دادی جان خدا کے لیے آہستہ بولیے۔ ابّا جان آپ کی آواز سنیں گے تو آپ کو اُوپر بلالیں گے اور پھر وہ تماشہ شروع ہو جائے گا —— میرے ساتھ آیئے ہم چچی جان کے گھر میں آرام سے باتیں کریں گے۔"

دادی کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن یوسف اُسے ہاتھ سے پکڑے برابر کے مکان کے صحن میں لے گیا۔

چچی نے پوچھا "کیا ہوا بیٹا دادی کو اِس طرح کیوں لیے پھرتے ہو۔"

"چچی جی خدا کیلئے انھیں منع کریں یہ آدھی رات کے وقت تماشہ شروع کروانا چاہتی ہیں۔"

دادی نے یوسف کو کان سے پکڑ کر ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف کیا بکتے ہو۔"

"چچی جان خدا کے لیے دادی جان کو سمجھایئے، ابا جی تھکے ہوئے ہیں انھیں نیند بھی آرہی ہے اور غصّہ بھی۔ دادی جان اُوپر جاکر وہی پرانا مسئلہ چھیڑنا چاہتی ہیں۔ پہلے تو آپ سب اِس پر ہنسا کرتے تھے لیکن آج دادی جان کچھ زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور مجھے ڈر ہے کہ جب میں کچھ کہوں گا تو ابّا جان آپے سے باہر ہو جائیں گے۔"

دادی نے کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا "مکّار کہیں کا۔ شرم نہیں آتی۔ بے وقوف میں اُس دن ہی سمجھ گئی تھی جب تم سر ہتھیلی پر رکھ کر ڈاکوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔"

چچی نے ہنستے ہوئے کہا "دادی آپ کیا سمجھ گئی تھیں۔"

"بکو مت۔ یہ تم سب جانتے ہو اور اس کی ماں بھی جانتی ہے کہ یہ لڑکا رشیدہ کی لڑکی کے سوا کسی کو پسند نہیں کرے گا۔"

یوسف نے جلدی سے دادی کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "دادی خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا۔"

"بے وقوف یہ کوئی انوکھی بات ہے۔ کوئی یہ تو نہیں کہے گا کہ لڑکی اور لڑکا ایک دوسرے کے ہم پلّہ نہیں تھے۔"

"دادی جان جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ آپ کو میرے لیے لڑکیاں پسند کرنے اور لڑکیوں کے لیے مجھے پسند کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں رہا۔ اگر امی جان مداخلت نہ کرتیں تو خدا جانے کتنی بار میری منگنی ہو چکی ہوتی۔"

"بے وقوف اِس دفعہ وہ مخالفت نہیں کرے گی۔ وہ دِل سے خوش ہے"

یوسف نے اپنا منہ دادی کے کان کے قریب لے جا کر کہا "دادی جان اگر سارا زمانہ خوش ہو جائے تو بھی میں خوش نہیں ہوں۔ خدا کے لیے مجھے زندگی میں کوئی کام کرنے دیجئے۔ آپ اگر مجھے ابّا جی سے گالیاں دلوانا چاہتی ہیں اور گھر آئے مہمانوں کی بے عزتی بھی کروانا چاہتی ہیں تو آپ اپنا شوق پورا کر لیجئے۔ وہ آپ کی مبارک تجویز سنتے ہی مجھے بلالیں گے۔ اِس کے بعد آپ میرا انکار اور ان کی گالیاں سنیں گی۔ شاید وہ دو چار تھپڑ مارنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں۔ لیکن وہ بات نہیں ہوگی۔ آپ کو میری منگنی کے لیے کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ چچی جان آپ بھی جائیں دادی جان کے ساتھ، گالیاں سُن لیں اور پھر مہمانوں کو بھی بلالیں تاکہ انھیں یہ گلہ نہ رہے کہ دادی جان نے اُن کا مقدمہ پُوری طرح نہیں لڑا۔"

دادی نے تلملا کر کہا "میں لعنت بھیجتی ہوں اُن سب پر میں تمہارے ایک بال کے بدلے ان سب کو قربان کر سکتی ہوں۔ اگر تمہاری مرضی نہیں تھی تو تم نے مجھے پہلے کہہ

دیا ہوتا۔"

یوسف نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا" دادی جان میری مرضی ہوگی تو سب سے پہلے آپ کو ہی کہوں گا۔" دادی نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔"بیٹا خدا سے ہر اچھی چیز میں تمہارے لیے مانگا کرتی ہوں اور میں یہ دُعا کرتی ہوں جو لڑکی تمہیں پسند آئے اُس جیسا دنیا میں کوئی نہ ہو۔ یہ امینہ جیسی لڑکیاں اُس کے قریب کھڑی ہوں تو لوگ کہیں کہ یہ اُس لڑکی کی نوکرانی ہے۔ میں تو یہی سمجھتی رہی تھی کہ تم اس لڑکی کو پسند کر چکے ہو۔"

"دادی جان آپ سونے سے پہلے میرے لیے دعا کریں گی نا۔"

"کیوں نہیں کروں گی۔ تمہارے لیے دعا کیے بغیر مجھے نیند کیسے آسکتی ہے۔"

"چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔"

"جاؤ زیادہ خوشامد نہ کرو۔ میں اپنا راستہ دیکھ سکتی ہوں۔" دادی نے روکھے پن سے کہا اور اُٹھ کر دوسرے مکان میں چلی گئی۔

یوسف کی چچی نے کہا"خدایا تیرا شکر ہے ورنہ میں تو محسوس کر رہی تھی کہ آج کوئی آندھی آرہی ہے۔ یوسف تم بہت خوش قسمت ہو، اتنا کچھ کہہ جاتے ہو لیکن دادی بُرا نہیں مانتیں۔"

"چچی جان بات یہ ہے کہ دادی جان ہی بہت اچھی ہیں۔"

صبح یوسف کے گھر سے رخصت ہوتے وقت عبدالکریم نے کہا۔

"میاں جی میں چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ آپ کے سارے گاؤں کے لوگوں کی دعوت کا انتظام کروں۔ میرے گاؤں کی تھوڑی سی آبادی ہے۔ انھیں بھی بلا لیا جائے گا۔ مسلمانوں کے لیے تو کھانا پکانے والے نائی کا انتظام ہو جائے گا۔ لیکن دوسروں کے لیے ہمیں سکھ یا ہندو باورچی کا انتظام کرنا پڑے گا۔"

عبدالرحیم نے کہا"یار بلاوجہ کیوں ان الجھنوں میں پڑتے ہو۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اس دعوت کو زیادہ سے زیادہ بیس افراد تک محدود کردو۔ اس میں ہمارے گھر کے چیدہ چیدہ افراد آجائیں گے۔ اگر زیادہ تکلیف کرنا چاہتے ہو تو ڈاکوؤں سے بچ جانے کی خوشی میں مٹھائی بانٹ دینا یہ بہتر ہوگا کہ مٹھائی دعوت سے پہلے تقسیم کردی جائے۔"

" میاں جی کیا یہ اچھا نہیں ہوگا کہ مٹھائی کی ایک ٹوکری میں تھانے میں بھی بھیج دوں؟"

"میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میاں صاحب لیکن آپ کے خاندان کے تمام مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے دعوت میں شریک ہونے چاہئیں۔ میرے پاس پچاس آدمیوں کا انتظام ضرور ہوگا۔"

تیسرے دن یوسف باہر کی حویلی کی ایک دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے تختے پر پستول کے نشانے کی مشق کر رہا تھا اور اس کا والد، انسپکٹر عبدالعزیز اور پولیس کا ماہر نشانہ باز جسے عبدالعزیز ساتھ لے کر آیا تھا تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے جب اس نے یکے بعد دیگرے چند گولیاں نشانے پر لگائیں تو نشانہ باز نے کہا" یوسف صاحب آپ نے انسپکٹر صاحب کو یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ آپ اس کام میں بھی ماہر ہیں۔"

یوسف نے جواب دیا" معاف کیجئے آج شروع کرنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا تھا کہ پرسوں جتنی گولیاں میں اس پستول کے ساتھ لایا تھا انھیں استعمال کرکے مجھے کافی مشق ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ میں کبھی کبھی ابا جی کا ریوالور چلا کر بھی دیکھا کرتا ہوں۔ ریوالور اور بندوق چلانے سے پہلے میں نے ہوائی بندوق کے ساتھ بہت مشق کی جو ابا جی نے مجھے ساتویں جماعت میں لاکر دی تھی۔"

عبدالعزیز نے یوسف سے پوچھا" یوسف اب تمہاری چھٹیاں کتنی رہ گئی ہیں۔"

"جی میری چھٹیاں کوتی پندرہ دن تک ختم ہوجائیں گی لیکن اباجی کی تبدیلی لاہور ہوچکی ہے۔ اِس لیے مجھے چند دن پہلے ہی یہاں سے جانا پڑے گا۔"

میاں عبدالرحیم نے کہا" انسپکٹر صاحب اگر اسے یہاں کوئی کام ہو تو میں اپنی رخصت میں دو چار دن کا اضافہ کروا سکتا ہوں۔"

" میاں صاحب کوئی خاص کام نہیں ۔میرے دل میں خیال آیا تھا کہ یوسف جیسے نوجوان کو ہر وہ کام آنا چاہیے جس کا بیسویں صدی کے نوجوانوں کے لیے جاننا بہت ضروری ہے ۔میرا خیال تھا کہ یوسف کو موٹر چلانا بھی سیکھ لینا چاہیے۔ اگر یہ چند دن میرے پاس آجایا کرے تو اس کے لیے کار اور ڈرائیور کا انتظام ہوسکتا ہے۔آپ کو اس بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے کہ میرے پاس کار کہاں سے آگئی۔ وہ میری بیوی کو جہیز میں ملی تھی جس کا اس کے سوا کوئی مصرف نہیں کہ کوئی ڈرائیونگ سیکھنا چاہے تو میں اسے دے دیا کروں، مجھے ڈرائیور کو بھی تنخواہ نہیں دینا پڑتی۔ وہ میرے سُسر کا پرانا ملازم ہے اور تنخواہ بھی وہیں سے حاصل کرتا ہے۔"

فضل دین حویلی میں داخل ہوا۔ اور ایک ہی نظر میں صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ یوسف اور اُس کے والد کھانے کے متعلق بھول چکے ہیں۔ بلّو نے اسے دیکھ لیا اور آگے بڑھ کر پوچھا" کیوں فضل دین خیر تو ہے؟"

فضل دین نے جواب دینے کی بجائے سوال کیا" انسپکٹر صاحب کب آئے ہیں؟"

"ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہے وہ آتے ہی یوسف صاحب کی نشانہ بازی دیکھنے لگ گئے تھے۔ تمہیں معلوم ہے۔ کہ مجھے بندوق ملنے والی ہے اور یوسف صاحب کہتے تھے کہ اگر میاں عبدالکریم تمہاری مدد کرنے پر تیار ہوگئے تو تمہیں اور بریال سنگھ کو بندوق کا لائسنس مل جائے گا۔"

" انسپکٹر کب تک یہاں ٹھہریں گے؟"

"معلوم نہیں۔لیکن میرا خیال ہے کہ وہ جلدی چلے جائیں گے۔"

فضل دین نے کہا" سنو بلّو اگر ایک کام کرو تو ہمارے ٹھیکیدار صاحب تم پر بہت خوش ہوں گے اور انعام بھی دیں گے۔"

"یار کام تو سناؤ۔"

فضل دین نے کہا" دیکھو بلّو تم بہت تیز بھاگتے ہو۔تم فوراً ہمارے گھر پہنچ کر میاں صاحب کو اطلاع دو کہ انسپکٹر صاحب یہاں آتے ہوئے ہیں اگر وہ اسی وقت یہاں آجائیں تو انھیں دعوت میں شریک کیا جاسکتا ہے۔جھوٹ موٹ تو کوئی پیغام میں بھی دے دوں گا لیکن شاید وہ مانیں یا نہ مانیں۔

دیکھو بلّو جلدی کرو۔ میاں صاحب تمہیں انعام دیں گے۔"

بلّو وہاں سے کچھ کہے بغیر بھاگ نکلا۔

حویلی میں جمع ہونے والے بڑے انہماک سے نشانہ بازی دیکھ رہے تھے۔یوسف کے انسٹرکٹر کے علاوہ انسپکٹر عبدالعزیز اور یوسف کے والد نے بھی باری باری چند فائر کیے اور اختتام پر انسپکٹر نے یوسف سے کہا" میرا خیال ہے اب بارود ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔آپ اس امتحان میں پاس ہوگئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ڈرائیونگ سیکھنے میں بھی آپ کو دیر نہیں لگے گی ۔ یہاں آس پاس کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آتی ورنہ اپنی کار میں یہاں بھیج دیتا ۔ اب دو چار دن کے لیے تمہیں گورداسپور آنا پڑے گا۔"

عبدالکریم ہانپتا ہوا حویلی میں داخل ہوا اور اُس نے آگے بڑھ کر انسپکٹر سے مصافحہ کرنے کے بعد یوسف سے شکایت کے لہجے میں کہا" دیکھئے آپ نے مجھے اطلاع ہی نہیں دی کہ انسپکٹر صاحب یہاں تشریف لائے ہوتے ہیں۔"

یوسف کے والد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" یار پریشانی کی کوئی بات نہیں جو بات آپ کہنا چاہتے تھے وُہ اب بھی کہی جاسکتی ہے۔"

انسپکٹر نے پوچھا "کیا بات ہے عبدالکریم صاحب ہم نے آپ کے دو آدمیوں کے لیے اسلحہ کے لائسنس حاصل کرنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ ایک فضل دین ہے اور دوسرا ہردیال سنگھ۔ آپ کے گھر کی حفاظت کے لیے کسی اور کو اسلحہ کی ضرورت ہو تو ڈپٹی صاحب اس کے لیے بھی منظوری دے دیں گے۔"

"صاحب بہت شکریہ، یوسف نے بتایا تھا کہ اسلحہ ملنے کی صورت میں ان کے لیے اسلحہ خریدنے کا مسئلہ ہو گا۔ میں نے اس وقت کہہ دیا تھا کہ میں پوری قیمت ادا کر دوں گا۔ لیکن اس وقت ایک اور درخواست لے کر آیا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ میرے گھر کھانا کھائیں۔"

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ "اگر میں نے ٹھہرنا ہوتا تو آتے ہی یوسف کو کہہ دیتا کہ کھانا کھا کر جاؤں گا لیکن مجھے ذرا جلدی ہے۔"

عبدالکریم نے کہا۔ "جناب کھانے کا وقت تو ہونے والا ہے اور کھانا تیار ہے۔ یوسف کے خاندان کے سب لوگ وہاں تشریف لائیں گے۔ اگر آپ دعوت میں شریک ہو جائیں تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔"

عبدالرحیم نے کہا "یہ دعوت اِس خوشی میں ہو رہی ہے کہ ٹھیکیدار صاحب کو ایک مصیبت سے نجات ملی ہے۔ ارجن سنگھ ڈاکو کا پکڑے جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اگر کوئی خاص بات مانع نہ ہو تو آپ اِن کی دعوت ضرور قبول کریں۔"

یوسف نے کہا "یہ دونوں گاؤں میں آج مٹھائی بھی تقسیم کروا رہے ہیں اور انھوں نے ایک اور بڑا اچھا کام کیا ہے اور وہ یہ کہ ہردیال سنگھ کا لڑکا جگجیت سنگھ جس کے متعلق آپ نے بھی حکومت سے سفارش کی ہے کہ اُسے تعلیم دلوائی جائے اور پھر اسے پولیس میں ملازمت دلوائی جائے۔ جب یہ بات میں نے میاں صاحب کو بتائی تھی تو انھوں نے فوراً کہا تھا کہ اُس کی تعلیم کا سارا خرچہ میں برداشت کروں گا۔"

عبدالعزیز نے کہا "میں عام حالات میں شاید نہ رکتا لیکن میاں صاحب اگر اُس لڑکے کو اس قدر نیکی کا مستحق سمجھتے ہیں تو میں ان کی دعوت سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن میں کھانا کھاتے ہی چلا جاؤں گا۔"



ڈیڑھ گھنٹہ بعد یہ سب لوگ عبدالکریم کے گھر میں دعوت کھا رہے تھے۔ عبدالکریم نے بیس پچیس ہندو اور سکھ مہمانوں کی دعوت کا انتظام ہردیال سنگھ کے گھر کروا رکھا تھا۔ جب انسپکٹر عبدالعزیز دعوت سے فارغ ہو کر حویلی سے باہر نکلا تو آس پاس کے دیہات کے کئی آدمی اسے سلام کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے اور جب وہ روانہ ہوا تو عبدالکریم نے چپکے سے ایک طرف ہو کر پانچ روپے کا نوٹ بلّو کو تھما دیا اور اس کے بعد فضل دین اور ہردیال سنگھ وہاں جمع ہونے والوں میں مٹھائی تقسیم کرنے لگے۔

دس دن بعد صبح نو بجے یوسف کے والدین اپنے بال بچوں سمیت لاہور جانے والی گاڑی پر سوار ہو رہے تھے۔ گھر کا سامان ان کا ملازم ٹرک پر دو گھنٹے پہلے لے جا چکا تھا۔ اسٹیشن پر ان کے اپنے گاؤں اور آس پاس کے دیہات کے کئی لوگ جن میں خواتین بھی تھیں۔ انھیں رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ عورتیں باری باری قدسیہ سے گلے مل کر یہ تاکید کر رہی تھیں۔ "دیکھو آپا جی ہمیں بھول نہ جانا ہر دوسرے تیسرے مہینے پھیرا ضرور رکھنا جب اطلاع ملا کرے گی تو ہم سب آپ کو لینے کے لیے اسٹیشن پر آیا کریں گے۔" سردار بیلا سنگھ کی بیوی عبدالرحیم سے کہہ رہی تھی۔ "بھائی جی ہماری بہن کو وہاں قید نہ کر دینا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے ان کو یہاں بھیج دیا کرنا ورنہ قدسیہ بھابی کی تمام سہیلیوں کو لے کر میں کسی دن لاہور پہنچ جاؤں گی۔"

گاڑی چلنے میں ابھی دس منٹ تھے کہ اسٹیشن پر عبدالکریم، رشیدہ، امینہ اور اُس کا بھائی علی اکبر نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے فضل دین اور ہردیال سنگھ سامان اٹھائے

آرہے تھے۔ عبدالرحیم نے حیران ہوکر پوچھا" میاں صاحب آپ اب کہاں جا رہے ہیں؟
جی رات اچانک بچوں نے چھٹیوں کے باقی دن امرتسر میں گزارنے کا پروگرام بنایا تھا۔ زیادہ خوشی تو اِس بات کی تھی کہ وہ امرتسر تک آپ کے ساتھ جائیں گے ۔ رشیدہ تو یہ امید بھی لے کر آئی ہے کہ آپ ایک دن امرتسر رکنے پر رضامند ہوجائیں گے۔"

"یار اس وقت تو ممکن نہیں، پھر کبھی سہی۔"

عبدالکریم کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن گارڈ نے سیٹی بجائی اور امینہ اور اس کی ماں انٹرکلاس کے زنانہ کمپارٹمنٹ کی طرف بھاگیں، جہاں قدسیہ بیگم اور اس کی لڑکی انھیں اشاروں سے بُلا رہی تھیں۔ عبدالکریم اور عبدالرحیم یوسف کے ساتھ اُس سے پچھلے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئے ــــــ گاڑی چل پڑی اور قدسیہ جو ہر وقت مسکرانے کے لیے بیتاب رہتی تھی اب خلافِ معمول سنجیدہ اور مغموم نظر آرہی تھی۔

امینہ نے پوچھا "خالہ جان کیا بات ہے۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں بیٹی"۔ قدسیہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"مجھے گھر چھوڑتے ہوئے ایک اُلجھن سی محسوس ہوتی ہے اور گاؤں سے نکلتے وقت مجھے یہ خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں یہ درخت اور کھیت دوبارہ نہ دیکھ سکوں۔"

رشیدہ بولی "بہن جی! اصل میں آپ سفر کی تیاری میں تھک گئی ہیں۔ ویسے گھر سے نکلتے وقت ایسی باتیں ہر آدمی کے ذہن میں آتی ہیں۔ آپ لیٹ جائیں میں آپ کا سَر دباتی ہوں۔"

"رشیدہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"نہیں بہن لیٹ جاؤ کافی جگہ ہے۔"

رشیدہ نے اُسے بازوؤں سے پکڑ کر لٹا دیا اور خود ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی۔

امرتسر میں عبدالکریم اپنے بال بچوں کے ساتھ اتر گیا لیکن جاتے جاتے اُس نے عبدالرحیم اور اُس کے بال بچوں کے لیے سوڈا واٹر کے علاوہ چند درجن کیلے اور سیب رکھوا دیے اور گاڑی کی روانگی تک خواتین آپس میں باتیں کرتی رہیں۔ جب گاڑی وہاں سے روانہ ہوئی تو قدسیہ اُٹھ کر ایک کھڑکی کے سامنے بیٹھ گئی۔ اگلے اسٹیشن پر یوسف نے آکر پوچھا۔

"امی جان آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ امینہ اور اُس کی ماں نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

ماں نے جواب دیا "بیٹا میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن ان لوگوں کو اتنا تکلف نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پانی تو خیر ہم نے پینا ہی تھا لیکن وہ کیلے اور سیب بھی زبردستی یہاں رکھوا گئے ہیں اور ماں بیٹی اس بات پر بھی اصرار کرتے تھے کہ ہم کسی دن لاہور سے امرتسر آئیں اور ایک دو دن ان کے گھر میں رہیں۔"

یوسف نے جواب دیا "امی آپ پریشان نہ ہوں لاہور میں ہمیں اور بہت سے کام ہوں گے اتنی دیکھنے والی جگہیں ہوں گی کہ آپ کسی اور شہر کا رُخ کرنا پسند نہیں کریں گی۔" گاڑی نے وسل دی اور یوسف اپنے ڈبے میں چلا گیا۔

———— ○ ————

اگلے دن یوسف اپنی امی کو لاہور کی تاریخی عمارات دکھا رہا تھا۔ دو دن میں وہ شاہی مسجد، شاہی قلعہ، جہانگیر کا مقبرہ اور چڑیا گھر دیکھ چکے تھے۔ تیسرے دن وہ شالامار باغ کی سیر کر رہے تھے اور کھانا اپنے ساتھ لاتے ہوتے تھے۔ قدسیہ بیگم کو لاہور کی ہر اچھی عمارت میں بھی اپنے بیٹے کی کوئی نہ کوئی خوبی نظر آتی تھی۔
شالامار باغ میں وہ کھانا کھانے کے بعد ایک جگہ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سستا رہے تھے کہ قدسیہ نے اچانک کہا "بیٹے جب میں شیش محل دیکھ رہی تھی تو

مجھے خیال آیا تھا۔ کہ یہاں کبھی شہزادے اور شہزادیاں رہتی ہوں گی۔ بیٹا! لاہور دیکھ کر تم نے تو یہ کبھی نہیں سوچا کہ اگر تم کسی بادشاہ کے گھر پیدا ہوتے تو تمہارے والدین تمہارے لیے دنیا کی سب سے خوب صورت شہزادی تلاش کرتے۔"

یوسف نے زخم خوردہ سا ہو کر ماں کی طرف دیکھا اور کہا "امی جان یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ اگر آپ کسی جھونپڑی میں ہوتیں تو بھی مجھے کسی کے محل پر رشک نہ آتا۔" اور اِن الفاظ کے ساتھ اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

ماں نے مغموم لہجے میں کہا "ارے بیٹا تم آزردہ ہو گئے میں تو مذاق کر رہی تھی لیکن بیٹا میں یہ دعا ضرور کرتی ہوں کہ میری بہو ایسی ہو جس پر شہزادیاں رشک کریں۔ تم نے ایک دن کہا تھا، کہ کسی دن جالندھر والوں کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کرو گے اور پھر انھیں خط لکھو گے۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ان کا خیال نہیں آیا۔"

"امی جان جب مناسب وقت آئے گا تو میرے لیے ان کا ایڈریس معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔"

"بیٹا مناسب وقت کب آئے گا؟"

"امی جان جب میں اپنی زندگی کی اہم ذمہ داریاں پوری کر لوں گا: میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گا۔ پھر مجھے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ضرورت ہو گی اور اس کے بعد آپ اطمینان سے شہزادیاں تلاش کر سکیں گی۔"

"بیٹا تمہارے لیے شہزادیاں اپنے گھروں میں بیٹھی نہیں رہیں گی۔ تم کوئی ایسا طریقہ سوچ سکو گے کہ میری ان کے گھر تک رسائی ہو سکے؟"

"امی جان اگر آپ اِس بات پر خوش ہو سکتی ہیں تو میں بی اے فائنل کے دوران آپ کو ان کا ایڈریس معلوم کر دوں گا۔ زیادہ بہتر تو یہ ہوتا کہ میں بی اے کا امتحان پاس کر لیتا تو آپ اس مسئلے کی طرف توجہ دیتیں۔ لیکن چند مہینوں میں میری زندگی کا

ایک اہم پروگرام شروع ہو چکا ہو گا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہیں آپ دیکھنے کے لیے بے قرار ہیں۔ خود مجھے تلاش کر لیں گے۔ سرِدست آپ صرف یہ دعا کیا کریں کہ وہ لوگ ہمیں صرف اسی صورت میں ملیں جب کہ ہماری اور ان کی کوئی بہتری ہو۔"

ماں نے کہا "بیٹا میں نے صرف ایک بچی اور ایک معمر خاتون کے متعلق تمہارے منہ سے جو باتیں سُنی ہیں اُن سے میں جو کم از کم توقع رکھ سکتی ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اُن کے خاندان کا ہر فرد ایک اچھا انسان ہو گا۔"

"امی جان! جب آپ کسی کو اچھا سمجھیں گی تو میں سوچے سمجھے بغیر اسے اچھا سمجھنے لگ جاؤں گا۔ لیکن اگر آپ نے ابھی سے دادی جان کی طرح سوچنا شروع کر دیا۔ تو مجھے بڑی الجھن ہو گی۔ وقت آنے پر میری ہر بات آپ کی خواہش کے عین مطابق ہو گی۔"

ماں نے کہا "بیٹا میں تمہیں دادی جان کی طرح پریشان نہیں کروں گی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اِس بات سے خوف محسوس ہوتا ہے کہ وقت بڑی جلدی گزر جاتا ہے اور ہمارے سارے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ بیٹا! جب مجھے کبھی اچانک یہ خیال آتا ہے کہ کسی دن میرا وقت بھی گزر جائے گا تو میں تمہارے متعلق بہت بےچین ہو جاتی ہوں۔ میں اِس بات سے بھی خوف کھاتی ہوں کہ تم میرے بعد کوئی غلط فیصلہ قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جاؤ۔"

"امی جان خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آپ کی پسند کے خلاف کوئی فیصلہ قبول نہیں کر سکتا اور میں اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ آپ کیا پسند اور کیا ناپسند کرتی ہیں۔"

"بیٹا مجھے تمہاری عقل پر بھروسہ ہے اور میرے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ تم اپنے متعلق کوئی غلط فیصلہ قبول کرنے پر تیار ہو جاؤ گے لیکن میں ایک ماں ہوں نا

اور میرے دل میں بُرے بُرے خیالات آتے رہتے ہیں۔"

یوسف نے کہا "امی جان، میرے متعلق آپ اپنے دل میں بُرے خیالات نہ لایا کریں۔ میں جو کچھ دنیا میں کرنا چاہتا ہوں۔ اُس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے کہ میں آپ کی دعاؤں سے برسوں تک ہمت حاصل کرتا رہوں گا۔

امی جان! مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ سو برس تک میرے لیے دُعا کرنے کے لیے زندہ رہیں گی۔ آپ کے تمام خواب پورے ہوں گے اور مَیں اپنے مستقبل کے متعلق جو خواب دیکھا کرتا ہوں آپ ان سب کی تعبیریں دیکھیں گی۔"

"بیٹا! تم پھر مجھے دادی کی طرح سوچنے کا طعنہ دو گے لیکن یہ مان لو کہ میرا سب سے پیارا خواب یہی ہے کہ میں ایک بار اپنی ہونے والی بہو کو دیکھ لوں۔"

"امی جان! آپ صرف یہ دعا کیا کریں کہ وہ جس کا آپ کو انتظار ہے آپ کی بہترین توقعات پوری کر سکے اور ہم سب کے لیے اللہ کی رحمتیں لے کر آئے ابھی یہ فیصلہ نہ کریں کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے، بزرگوں کو ایسے معاملات اپنی دُعاؤں کے بعد اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ چلیں اب دیر ہو رہی ہے۔"



کالج کھلنے کے بعد یوسف کچھ وقت اپنے امتحان کی تیاری کے لیے نکال لیتا تھا۔ لیکن جو وقت وہ پہلے افسانوی ادب کا مطالعہ کرنے پر صرف کیا کرتا تھا وہ اب تحریکِ پاکستان کی نذر ہو رہا تھا۔ وہ اخبارات اور رسائل کے لیے مضامین بھی لکھا کرتا تھا اور کالج کے مباحثوں میں حصہ بھی لیا کرتا تھا۔ وہ کالج کے سینئر طلبا کے اُس گروہ میں شامل ہو چکا تھا جن کے ذہنوں پر علامہ اقبال کے افکار چھائے ہوتے تھے۔ وہ جس قدر تاریخ پڑھ چکا تھا اسی قدر شدت سے وہ مسلمانوں کے مستقبل کے

لیے ہندوؤں کے جارحانہ عزائم کے خطرات کو محسوس کرتا تھا۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں واشگاف الفاظ میں یہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کا حصول کسی کی پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں ہے یہ برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ کانگریس کی گزشتہ چند برس کی تاریخ اُسے ازبر تھی۔ وہ مسلم اقلیت کے صوبوں میں کانگرسی حکومت کے مظالم کی داستانیں بیان کرتا تو اُسے پڑھنے یا سننے والے ایسا محسوس کرتے کہ پچھلے دنوں کی داستانیں اُن کی آنکھوں کے سامنے دُہرائی جا رہی ہیں

اُس کے والد اخباروں میں اُس کی تحریریں پڑھ کر اور اُن کی تعریف میں لوگوں کی باتیں سُن کر بہت خوش ہوا کرتے تھے لیکن وہ اس بات پر خفا ہو جایا کرتے تھے۔ کہ میرے لڑکے نے آگے پڑھنے کے بہترین مواقع ضائع کر دیے ہیں۔ اب بھی وہ چاہے تو فوج اور پولیس میں اُس کے لیے ترقی کے راستے کھلے ہیں لیکن یہ بات اُس کے ذہن میں نہیں آتی کہ دنیا میں روزی کمانے کے لیے کچھ کام بھی کرنا پڑتا ہے اور جب کبھی یوسف کی موجودگی میں اس قسم کی بحث شروع ہو جاتی تو وہ نرمی سے یہ کہہ کر بحث ختم کر دیتا۔ "ابّا جی! اس وقت ہماری پہلی ضرورت پاکستان ہے۔ جب پاکستان بن جائے گا تو مجھے چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں بھی روحانی تسکین حاصل ہو گی۔ لیکن اگر میں ہندو کی غلامی میں رہ کر لاکھوں کما لوں تو بھی خوشحالی کی وہ زندگی میرے لیے موت سے بدتر ہو گی۔ ابّا جی! جب پاکستان بن جائے گا۔ تو میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی سب سے بڑی توقع پوری کر سکوں گا۔"

امتحان سے چند ہفتے قبل ایک اخبار میں "راہ نجات" کے عنوان سے لاہور کے ایک اخبار نے اُس کی تصویر کے ساتھ اس کا ایک طویل مضمون تین قسطوں میں شائع کیا۔

اخبار کے ایڈیٹر نے مضمون نگار کے بارے میں جو تعارفی سطور لکھی تھیں۔ ان میں اُس کے گاؤں اور خاندان کا خاص طور پر ذکر کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ یہ ہونہار

طالب علم کشتی رانی، پیراکی اور شاہ سواری میں بھی مہارت رکھتا ہے۔ تحریک پاکستان کے ساتھ اُس کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ جب کالج سے فرصت ملتی ہے تو وہ پاکستان کے رضا کاروں کے ساتھ قرب وجوار کے دیہات میں تقریریں کرنے چلا جاتا ہے۔

جس دن مضمون کی آخری قسط شائع ہوئی اُس دن اُس نے اپنی ماں سے کہا "امی جان! مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کی ایک بہت بڑی خواہش جلد پوری ہونے والی ہے۔"

ماں نے کہا "بیٹا میں تمہارے مضمون بار بار پڑھا کرتی ہوں لیکن تم یہاں بھی وہی نالائقی کر گئے جو تم نے گاڑی میں کی تھی۔ یہ پڑھ کر تو کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ہم لاہور میں کہاں رہتے ہیں۔"

"امی جان! میرا کالج اس گھر سے زیادہ مشہور ہے۔ گر کسی نے صرف میرا نام اور اسلامیہ کالج لکھ کر بھی بھیج دیا تو مجھے خط مل جائے گا۔"

ایک دن عبدالکریم اور اُس کی بیوی اُن کے گھر مٹھائی لے کر آئے۔

قدسیہ نے کہا "بہن مٹھائی کا شکریہ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہمیں کس بات کی مبارک باد دینی چاہیے؟"

رشیدہ نے جواب دیا "بہن یہ مٹھائی ہم لاہور میں اپنی نئی کوٹھی کی بنیاد رکھنے کی خوشی میں تقسیم کر رہے ہیں اور اُس کے مکمل ہوتے ہی امرتسر سے یہاں آجائیں گے، جو زمین ہم نے خریدی تھی وہ دو کوٹھیوں کے لیے کافی ہے۔ یہ جو کوٹھی ہم نے بنوانی شروع کی ہے امینہ کی ہوگی اور دوسری اکبر کے لیے بنے گی۔"

"قدسیہ نے کہا "بہن یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے قریب آجائیں گی۔"

رشیدہ نے کہا: "امینہ کے ابو نے امینہ سے دو وعدے کیے تھے۔ ایک یہ کہ

جب وہ میٹرک کرلے گی تو ہم لاہور میں اپنی نئی کوٹھی میں آجائیں گے اور دوسرا یہ کہ اُس کا انعام ایک نئی کار ہوگی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جب میں اداس ہوا کروں گی تو امینہ سے کہا کروں گی: "بیٹی چلو تمہاری خالہ سے مل آئیں۔" قدسیہ نے بڑی کوشش کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا "بہن اگر خدا توفیق دے تو ہمیں بچوں کی ہر اچھی خواہش پوری کرنی چاہیے۔"

"بہن امینہ کو موٹر چلانے کا بے حد شوق ہے۔ اگر امتحان سر پر نہ ہوتا تو آج وہ ہماری موٹر چلا کر یہاں لاتی۔ ہمارا نوکر فضل دین کہتا تھا کہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب نے یوسف کو ڈرائیونگ سکھانے کا انتظام گورداسپور میں کر دیا تھا اور وہ یہاں آنے سے پہلے کافی حد تک سیکھ چکے ہیں۔"

"بہن! یوسف ہر کام بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔ آپ نے اسے دریا میں کشتی چلاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُس نے اتنی مہارت پیدا کر لی ہے کہ ملاح بھی دنگ رہ جاتے ہیں۔"

رشیدہ نے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن قدسیہ نے اُسے یہ کہہ کر روک لیا "بہن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو کھانے کے وقت رخصت کر دوں۔ جاؤ صغریٰ بیٹھک میں جا کر امینہ کے ابو سے کہو کہ آپ کو کھانے کے لیے رکنا پڑے گا۔"

باب ۔ ۱۵

گزشتہ چند ہفتوں میں نسرین کئی بار فہمیدہ کو کوئٹہ سے امرتسر تک کے اپنے سفر کے واقعات سُنا چکی تھی ۔ فہمیدہ کے لیے یہ ایک ایسی داستان تھی جس کے بار بار دہراتے جانے سے اُس کی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا وہ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہونے کے بعد جب کبھی اچھے موڈ میں ہوتی تو کہتی ۔

"ہاں نسرین سناؤ نا تمہارے یوسف بھائی نے اُس دیوقامت اور بدتمیز ملّاح کو ایک ہی تھپیڑے سے کیسے چت کر دیا تھا؟ اور تمہارے یوسف بھائی نے گاڑی میں اُس خوفناک صورت باگڑی کی کیسے مرمت کی تھی ـــــــــ اچھا نسرین یہ بتاؤ کہ اگر تمہیں وہ سانپ نظر آجاتا جسے تمہارے بھائی جان یوسف نے درخت کے ساتھ لٹکا ہوا دیکھا تھا تو پھر تم کیا کرتیں؟" اور نسرین ان واقعات کو ایک بار پھر دہراتے ہوئے اپنی ذہانت سے اُن کی دلچسپی میں کوئی نہ کوئی نیا اضافہ کر دیتی ۔

عام طور پر دونوں بہنیں بالائی منزل کے کشادہ کمرے میں رہا کرتی تھیں ۔ فہمیدہ خود بھی محنتی تھی اور نسرین سے بھی محنت کروایا کرتی تھی ۔ لیکن رات کے وقت پڑھائی ختم کرنے کے بعد انھیں تفریحی گفتگو کرنے کا موقع ملتا تو اِدھر اُدھر کے واقعات ، اخباری یا

ریڈیو کی خبروں کے متعلق مختصر سی گفتگو کے بعد وہ یوسف کا ذکر شروع کر دیتیں ۔

ایک دن نسرین نے کہا "آپا جان! ہم نے سکول کا کام کر لیا ہے اور اب چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں ۔ اگر آپ کو بھائی جان یوسف کے پسند کی کوئی چیز پڑھنے کا شوق ہو تو وہ آپ کو مل سکتی ہے ۔"

"کہاں سے مل سکتی ہے؟"

"آپا جی! بھائی جو تھیلا بھول گئے تھے ۔ اُس میں چار کتابیں ہیں ۔ جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ کوئی اچھے ناول ہوں گے ۔ ایک بڑے سائز کی کاپی پر اُن کے ہاتھ کی تحریر ہے ۔ آپا جان! میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ ایسی کتاب جو کسی کی امانت ہو، اُس کی اجازت کے بغیر پڑھنا گناہ ہے نا!"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟"

"آپا جی! میں نے ان کا تھیلا کھول کر کاپی کے چند صفحے پڑھے تھے اور پھر مجھے احساس ہوا تھا کہ جب بھائی جان کو یہ معلوم ہوگا کہ میں چوری چھپے ان کی کتاب پڑھتی رہی ہوں تو وہ بہت خفا ہوں گے اور شاید خدا بھی مجھ سے خوش نہ ہو۔"

فہمیدہ پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "نسرین تمہارے بھائی جان اگر اتنے اچھے ہیں تو انھوں نے کوئی اچھی بات ہی لکھی ہو گی ۔ اِس لیے اگر انھوں نے تمہیں پڑھنے سے منع نہیں کیا تھا، تو تم پڑھ سکتی ہو۔"

"آپا جان! بھائی جان کی باتیں سمجھنا مجھے ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے ۔ شاید آپ بہتر سمجھ سکیں۔"

"اچھا! نکالو وہ مسوّدہ کہاں ہے؟ میں دیکھتی ہوں تمہارے بھائی کو لکھنا بھی آتا ہے کہ نہیں۔"

"آپا جان! ابھی لاتی ہوں۔" نسرین بھاگتی ہوئی عقبی کمرے میں گئی اور وہاں سے

مسودہ نکال کر لے آئی۔

"لیجئے آپا جان"۔ اس نے کہا "میں نے اُن کا تھیلا الماری میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ نے اُن کی یہ کتاب پسند کی تو مجھے امید ہے کہ آپ انگریزی زبان کی چار اور کتابیں بھی پسند کریں گی جو اُن کے تھیلے میں پڑی ہوئی ہیں۔"

فہمیدہ نے مسودہ کھول کر پہلے صفحے پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر پورے انہماک سے پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔ نسرین اپنی بہن کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ جب آدھ گھنٹہ فہمیدہ اُس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو اُس نے کہا۔ "آپا جان! میں آپ کے لیے گرم دودھ لاتی ہوں۔"

فہمیدہ نے بولنے کی بجائے صرف ہاتھ سے اشارہ کر دیا۔ وہ بھاگتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے دودھ کا گلاس لا کر فہمیدہ کو پیش کیا۔ فہمیدہ نے اُس کی طرف دیکھے بغیر گلاس پکڑ لیا اور دودھ پینے کے دوران بھی وہ پڑھنے میں مصروف رہی۔ نسرین اُس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ کر اُس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔ جب اُسے نیند آنے لگی تو اُس نے کہا۔

"آپا جان! آپ تھک جائیں گی۔ باقی کل پڑھ لیں۔" فہمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اِدھر آؤ نسرین"۔ نسرین آگے بڑھی اور اُس نے مسودہ ایک طرف رکھ کر اُسے گود میں بٹھا لیا اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نسرین! تم نے آتے ہی یہ مسودہ مجھے پڑھنے کے لیے کیوں نہ دیا؟"

"آپا جی مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کو یہ پسند آئے گا۔"

فہمیدہ نے کہا "تم اگر اس کے چند صفحات پڑھ لیتیں تو اب تک کئی بار پورا مسودہ پڑھ چکی ہوتیں۔ اگر تمہیں نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں شروع کا کچھ حصہ

پڑھ کر سناتی ہوں۔"

نسرین نے اُس کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"آپا جان! خدا کیلئے مجھے ضرور سنائیے۔" اور فہمیدہ اپنی بہن کو مستقبل کے ایک ناول نگار کی تحریر پڑھ کر سنا رہی تھی:۔



——— "میں اپنے ماضی کے راستوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو مہینوں اور برسوں کی وسعتوں سے آگے، میرے پاؤں کے نشان زندگی کے اُس کنارے تک پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں سے میرے شعور کی ابتدا ہوتی ہے۔ سپنے اور حقیقتیں آپس میں گڈمڈ ہونے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اُس دَور میں ہواؤں کی لرزش سے گاؤں کے اِرد گرد پھیلے ہوئے درختوں میں جو سرسراہٹ پیدا ہوتی تھی وہ میرے لیے جدا جدا راگنیوں کی حیثیت رکھتی تھی۔

جب ہم رات کے وقت کھیلا کرتے تھے تو میں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر یہ سمجھ جایا کرتا تھا کہ میں فلاں درخت کے نیچے یا قریب کھڑا ہوں۔

——— میں نے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوش سنبھالا تھا جسکے شمال مشرق میں بلند برفانی پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ دکھائی دیتا تھا جنوب کی طرف ایک تاریخی نشیب تھا، جہاں برسات کے دنوں میں جھیلیں اور جوہڑ بھر جاتے تو پانی کی چمکتی ہوئی چادر دُور تک پھیل جاتی تھی۔ جب غروب آفتاب کے قریب، سُرخ بدلیاں سورج کے قریب آجاتی تھیں اور اُن کے عکس میں ایک طرف کانگڑہ کی برفانی چوٹیاں سونے اور شنگرف کے انبار دکھائی دیتی تھیں اور دوسری طرف اُن سے پیدا ہونے والی روشنی سطح آب پر منعکس ہو کر ایک دل کش منظر پیش کرتی تھی۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ کبھی بہت قریب آجاتے ہیں اور کبھی بہت دُور دکھائی دیتے ہیں۔

جب برف پگھل جاتی تھی تو ان پہاڑیوں کی شکل کچھ اور دکھائی دیتی تھی اور جب برف پڑتی تھی تو وہ پھر اپنی پہلی صورت پر آنے لگتی تھیں۔ جب گرمیوں میں خوب بارش ہوتی تھی اور پھر یکایک دُھوپ نکل آتی تھی تو سہ پہر کے وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ پہاڑ بھاگ کر یکایک ہم سے بہت قریب آگئے ہیں۔ ہمیں نئے نئے غار اور نئی نئی چوٹیاں نظر آتی تھیں۔

جب بارش آنے والی ہوتی تھی، تو بادل عام طور پر مشرق سے مغرب کا رُخ کیا کرتے اور جتنے زیادہ دن اُن کے قافلے سفر کرتے رہتے تھے اتنی ہی زیادہ بارش ہوتی تھی۔ کافی عرصہ تک میں بوڑھے لوگوں کی ان باتوں پر یقین کرتا رہا کہ یہ بادل گھوڑے ہاتھی اور اونٹ بن کر پہاڑوں پر جاتے ہیں وہاں پیٹ بھر کر چشموں اور جھیلوں سے ٹھنڈا پانی پیتے ہیں اور پھر میدانوں میں بارش ہوتی ہے۔

——— میں سوچا کرتا تھا کہ یہ بادل واقعی گھوڑے ہاتھی اور اونٹ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا کہ میں ان پر سواری کر کے دُور دُور کے پہاڑوں کی سیر کیا کرتا۔ پھر میں چند سال بڑا ہو کر یہ پڑھا کرتا تھا کہ سمندروں سے پانی کے بخارات اُٹھتے ہیں اور پہاڑوں کی بلندیوں پر بادل بن کر برستے ہیں تو مجھے پرانی باتوں پر ہنسی آیا کرتی تھی اور اُس کے ساتھ ہی کبھی کبھی مَیں اس بات پر اداس ہو جایا کرتا تھا کہ جس قدر زیادہ مجھے اِس دنیا کا علم ہوتا جائے گا اُسی قدر اس کے اَن گنت عجائبات میرے دماغ سے اُوجھل ہوتے جائیں گے اور وہ گاؤں جسے میں پُوری دنیا سمجھا کرتا تھا کرۂ ارض کا ایک چھوٹا سا نقطہ بن کر رہ جائے گا۔

گاؤں کے جنوب مشرق میں جھیل سے آگے بڑے بڑے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیتا تھا۔ لوگ اس جھنڈ کے درختوں کو پردیسی درخت کہتے تھے۔ یہ درخت صرف کوئی ایک میل لمبے اور نصف میل چوڑے علاقے پر پھیلے ہوئے تھے اور علاقے میں کسی اور جگہ اس قسم کے درختوں کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں نے اپنے پورے ضلع میں اور اُس کے آگے دُور دُور تک ان درختوں سے ملتا جلتا کوئی درخت نہ دیکھا تھا۔ ان "پردیسی درختوں" کے متعلق میری طرح

گاؤں کے ہر بچے نے یہی کہانی سُنی ہوئی تھی کہ رات کے پچھلے پہر ایک عورت اپنی چکی سے آٹا پیس رہی تھی اچانک اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور صبح کے دھندلکے میں اسے بڑے بڑے درخت شمال مشرق سے جنوب کی طرف بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ باہر نکل کر دہائی دینے لگی "لوگو باہر نکل کر دیکھو درخت بھاگ رہے ہیں۔ بہت بڑے بڑے درخت بھاگ رہے ہیں۔ انہیں روکو ورنہ چھوٹے درخت بھی، اُن کے پیچھے چل پڑے تو گاؤں اجڑ جائے گا۔ درختوں نے اُس کی چیخ پکار سُنی تو جس جس جگہ پہنچے تھے وہیں رُک گئے۔

اس کے بعد لوگوں نے صبح کی روشنی میں گاؤں کے آس پاس ایک نئی قسم کے درخت دیکھے تو انھوں نے چکی پیسنے والی عورت کی باتوں پر یقین کر لیا کہ وہ درخت پردیس سے بھاگ کر آتے ہیں اور اُس دن سے اُن درختوں کو پردیسی درخت کہا جانے لگا۔ اِن درختوں کی عمر کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاتا تھا کہ جن لوگوں تک یہ کہانی بچپن میں اُن کے باپ دادوں سے پہنچی تھی وہ بھی بوڑھے ہو چکے تھے۔

علاقے کے ہندو "پردیسی درختوں" کو دیوتا سمجھ کر اُن کی پوجا کے لیے جایا کرتے تھے۔ کسی کو ان درختوں کی شاخ کاٹنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ پردیسی درختوں کے درمیان چار سمتوں سے آ کر راستے ملتے تھے اور دن کے وقت ایک کشادہ راستے پر تانگے بھی وہاں سے گزرتے تھے لیکن شام کے بعد بہت کم لوگ "پردیسی درختوں" کے قریب جانے کی ہمت کرتے تھے۔ اور اوپر سے چکر کاٹ کر نکل جاتے تھے۔ "پردیسی درختوں" کے متعلق ایک بات بہت مشہور تھی کہ آج تک اُن کی صحیح گنتی نہیں ہو سکی۔ اگر انہیں دوبارہ گنا جائے تو تعداد ہمیشہ مختلف ہوتی ہے۔ تین بار گنا جائے تو بھی تعداد مختلف ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ ہمارے ماسٹر جی بچوں کو لے کر گئے تھے اور ہر درخت کے نیچے ایک ایک بچہ بٹھا دیا گیا تھا۔ جو تین چار درخت بڑے جھنڈ سے باہر کھڑے تھے، اُن کی علیحدہ گنتی کر لی گئی تھی۔ پھر سکول کے تمام بچوں کو ایک جگہ جمع کر کے اُن کی گنتی کی گئی۔

اُن کا خیال تھا کہ درختوں کی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ بچّوں کو دوبارہ نمبر دے کر درختوں کی طرف بھیجا گیا تو اتفاق سے ایک برہمن لڑکے کو قے آگئی اور ہندو ماسٹر نے شور مچا دیا بھاگو! دیوتا ناراض ہو گئے ہیں، کچھ لڑکے بھاگ آتے۔ اُدھر مسلمان ماسٹر نے کہا "چلو! آئندہ ہم تارکول لے کر آئیں گے اور ہر درخت کا چھلکا اُتار کر تارکول سے نمبر لگائیں گے، پھر میں دیکھوں گا کہ غلطی کیسے ہوتی ہے؟" گاؤں میں یہ بات مشہور ہوئی تو ہندوؤں نے اعتراض کیا، کہ یہ درخت دیوتا ہیں اور دیوتا کا چھلکا اتار کر تارکول لگانا پاپ ہے۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

ایک سکھ گیانی نے علاقے کے ہندو اور مسلمان معززین کو جمع کر کے یہ تقریر کی کہ ان درختوں کو نہ کوئی ایسا پھل لگتا ہے جسے انسان یا کوئی پرندہ کھا سکے۔ نہ اس کی لکڑی کسی کام آتی ہے۔ اِس کو دیوتا سمجھنا پرلے درجے کی بے وقوفی ہے۔ اِس لیے انہیں کاٹ کر اِن کی جگہ کوئی اور کام کے درخت لگائے جائیں۔

ہندوؤں کے ایک بااثر رہنما پنڈت ودیا رام نے اُٹھ کر کہا "کوئی مائی کا لال ایسا ہے جو ان درختوں کو کاٹنے کی جرأت کر سکے؟"

مولوی محمد شفیع امام مسجد اُٹھ کر بولا "مَیں تین دن کے اندر اندر یہ تمام منحوس درخت کٹوا دینے کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ لیکن میری یہ شرط ہے کہ وہ لوگ جو انہیں دیوتا سمجھتے ہیں۔ وہ اُس کی لکڑی کی تقسیم میں حصہ نہیں لیں گے۔"

اِس مرحلہ پر پنڈت دینا ناتھ پہنچ گیا اور اس نے کہا "لوگو! یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ درخت کہیں بہت دور جا کر غائب نہیں ہو گئے اور اس پوِتر دھرتی پر ٹھہر گئے تھے۔ جہاں ہمارے باپ دادوں کے باپ دادے اِن کی سیوا کے لئے موجود تھے۔ ہمارے لیے یہ درخت دیوتا ہیں اور یہ زمین جو کسی کنہیا کی آواز سن کر انہیں پسند آگئی تھی۔ ان دیوتاؤں کا مندر ہے"

گیانی کرتار سنگھ نے کہا ـــــ "یہ تم اس لیے کہہ رہے ہو کہ یہ ساری زمین سردار پورن

سنگھ اور سردار منگل سنگھ کی ملکیت ہے ورنہ اگر یہ ٹکڑا تمہاری ملکیت ہوتا تو تم اِن منحوس درختوں کا نشان تک نہ چھوڑتے ـــــ"

منحوس کے لفظ پر ہندو جوش میں آگئے اور درخت کاٹنے کا مسئلہ آگے نہ بڑھ سکا۔

بچپن میں مجھے گھر کے اندر اور باہر اپنی اہمیت کا احساس دلانے کے کئی سامان موجود تھے۔ مجھ سے بڑی عمر والے مجھے کندھوں پر اُٹھایا کرتے تھے اور چھوٹے بچّوں اور بچیوں کا میرے گرد ہجوم رہتا تھا۔

رات کو سونے سے پہلے میری بہنوں کی طرح برادری کی دوسری لڑکیاں بھی میرے گرد جمع ہو جایا کرتی تھیں اور مجھ سے کہانی سنانے کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔ مَیں جو کہانی دادی جان سے سنا کرتا تھا وہ معمولی سے ردّ و بدل کے بعد اُنہیں سنا دیا کرتا تھا۔ پھر دادی جان آتیں اور مجھے گود میں اُٹھا کر اپنے بستر پر لے جاتیں۔ جب مجھے نیند آنے لگتی تو وہ مجھے اپنے بستر پر چھوڑ دیتیں۔ امّی دیر تک باورچی خانہ میں مصروف رہتی تھیں اور میں نیم خوابی کی حالت میں اُن کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یہ انتظار بڑا صبر آزما ہوتا تھا لیکن میں یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ مَیں انتظار کر رہا ہوں۔ شاید میرے کان بہت تیز تھے اور مجھے دیکھے بغیر یہ معلوم ہو جایا کرتا تھا کہ وہ وضو کر رہی ہیں ـــــ پھر وہ اپنے گرد چادر لپیٹتی ہوئی آتی تھیں اور مَیں سانس روک کر یہ ظاہر کرتا تھا کہ میں سو رہا ہوں۔ وہ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتیں۔ ارے! آج میرا بیٹا میرے پیار کے بغیر ہی سو گیا میں کوئی جواب نہ دیتا۔ وہ جھک کر میری پیشانی پر بوسہ دیتیں اور کہتیں۔ ارے یوسف تم سچ مچ سو رہے ہو۔ پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ تمہاری آنکھیں کھلی ہیں۔ اچھا بیٹا! سو جاؤ۔ میں چراغ کی روشنی میں انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھتا اور مجھے نیند آجاتی۔ صبح دادا جان مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو مجھے اٹھا کر اپنے بستر پر لے جاتے، وہ مجھے اپنی گود میں بٹھا کر بار بار یہ دعا مانگا کرتے تھے "یا اللہ! میرے پوتے کو نیکی اور پاکیزگی دے" کبھی کبھی وہ میری دادی

سے کہا کرتے تھے ہاجرہ غور سے دیکھو! یوسف کے ماتھے پر مجھے کوئی روشنی نظر آتی ہے۔
اُن کی یہ بات اُس وقت بھی دہرائی جاتی تھی۔ جب کہ میں بڑا ہو چکا تھا اور وہ اِس دنیا سے
رحلت فرما گئے تھے۔

بچپن کی جو بات مجھے خاص طور پر یاد آتی ہے وہ یہ ہے کہ سردیوں کے پچھلے پہر گھر
کی عورتیں چرخہ لے کر ایک کشادہ کمرے میں بیٹھ جاتیں اور سوت کاتنے کا مقابلہ شروع ہوجایا کرتا
تھا۔ چرخہ کی آواز میں اُن کے میٹھے اور مدھم سے راگ بھی شامل ہوتے تھے میں کبھی بھی یہ نہیں سمجھ
سکا کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ بہرصورت چرخے کی آواز کے ساتھ مل کر یہ راگ جو تاثر پیدا کرتے تھے
وہ میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہُوا۔

رات کے پچھلے پہر جب تاج دین دُھنیا روئی دھنکنا شروع کرتا تھا تو سُننے والوں
کے کان اُس کے گھر کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی اچانک میری آنکھ کھلتی تھی تو مجھے دُور
سے اُس پُراسرار جوگی کی دل کش لے بھی سُنائی دیتی تھی جو گاؤں میں ایک طرف سے داخل
ہوتا تھا اور دوسری طرف سے گیت گاتا ہُوا نکل جاتا تھا۔

کھیڈن دے دن چار نی مائے، کھیڈن دے دن چار

اِس جوگی کے بارے میں عجیب و غریب باتیں مشہور تھیں کہ بھونکنے والے کُتے
جب اُسے دیکھتے ہیں تو بھونکنا بند کر دیتے ہیں۔ لڑکے اُس کے متعلق باتیں کیا کرتے تھے کہ اُسے
کسی نے نہیں دیکھا وہ رات کے اندھیرے میں آتا تھا اور اندھیرے میں ہی چلا جاتا تھا۔
ایک دن مجھے بخار تھا چونکہ ملیریا کا موسم تھا۔ اِس لیے ابا جان گھر میں کونین کی بہت
سی گولیاں رکھ چھوڑتے اور میرے متعلق یہ تاکید کر جاتے تھے کہ اگر مجھے بخار ہو جائے تو کسی تاخیر
کے بغیر کونین کھلا دی جائے۔ بخار کے موسم میں یوں بھی ہر ہفتے ایک گولی ضرور کھانی پڑتی تھی۔
ایک دن میں نے بہت ضد کی تو ماں جی نے چچا شیر علی سے کہا، اور وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا
اور کہنے لگا" دیکھو یوسف تم نے کئی بار مجھ سے کہا ہے کہ تم اُس جوگی کو دیکھنا چاہتے ہو، جو

گاتا ہوا آیا کرتا ہے۔
مَیں نے کہا۔" ہاں میں دیکھنا چاہتا ہوں لیکن کہتے ہیں کہ وُہ کسی کو نظر نہیں آتا۔
" دیکھو! یوسف" تمہیں وہ نظر بھی آئے گا اور تمہارے ساتھ باتیں بھی کرے گا اور
پھر تم سارے گاؤں کے لڑکوں پر رعب ڈالا کرو گے کہ وہ تم سے مل کر گیا ہے لیکن میری ایک
شرط ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ تم فوری طور پر یہ گولی منہ میں ڈالو اور پانی کا گھونٹ پی لو۔ بالکل
اِس طرح" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک گولی منہ میں ڈالی اور پانی کے گھونٹ کے ساتھ نگل
گئے۔

مَیں نے کہا" چچا جان! آپ وعدہ کرتے ہیں؟" "ہاں بھئی! میں وعدہ کرتا ہوں"
مَیں نے گولی منہ میں ڈالی اور پانی کے ساتھ نگلتے ہوئے کہا۔
"چچا جان! اگر آپ کہیں تو مَیں ایک اور گولی بھی کھا لیتا ہوں"
چچا شیر علی نے کہا۔" اب ایک گلاس دودھ پی لو" میں نے دودھ پی لیا، تو چچا نے
کہا" بیٹا ایک گلاس اور پی لو اگر پورا نہیں تو آدھا پی لو۔ زیادہ دودھ پینے سے تمہیں بخار بھی
نہیں ہوگا اور جوگی بھی اچھی طرح نظر آئے گا"
"وہ کیوں چچا جان؟"
"بیٹا وہ اِس لیے کہ تمہاری آنکھوں میں بخار کا اثر نہیں رہے گا اور نظر تیز ہو جائے
گی"

مَیں نے ایک گلاس اور پی لیا اور سو گیا۔
شام کے وقت میرا بخار ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے بعد میں نے چچا کو خوش کرنے
کے لیے ایک اور گولی کھالی اور دودھ بھی خوب پیا۔ پھر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج چچا
جان! میرے پاس رہیں گے۔ ورنہ بخار دوبارہ ہو جائے گا۔
رات کے تیسرے پہر میں مزے سے سو رہا تھا۔ چچا شیر علی میرے سرہانے کے پاس آئے

اور کہا۔"یوسف! اُٹھو اور میرے ساتھ چلو"۔ میں کچھ پوچھے بغیر اُٹھ کر ان کے ساتھ چل دیا۔ گلی میں باہر نکل کر وہ پیپل کے درخت کے نیچے رُک گئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دُور سے آواز سنائی دی۔

"کھیڈن دے دن چار نی مائے

کھیڈن دے دن چار!"

گاؤں کے کتے بھونک رہے تھے۔ آواز قریب آتی گئی اور کتوں کے جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا۔ پھر چچا شیر علی نے مجھے بازو سے پکڑ کر درخت کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔"یہاں چپکے سے کھڑے رہو"۔ چچا شیر علی خود بھی تنے کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

جوگی کے ہاتھ میں بلم تھا جس کے پھل سے نیچے کپڑے کی دھجیاں لٹک رہی تھیں۔ جب وہ گاتا ہوا قریب سے گزرا تو شیر علی نے ایک ہاتھ سے اُس کا بازو پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی گردن دبوچ لی اور کہا۔

"ٹھہر جاؤ! ڈرو نہیں! میں شیر علی ہوں"۔

"چودھری شیر علی"۔

"ہاں یار اگر تم سے آج ہی ملنا ضروری نہ ہوتا تو ہم پیغام بھجواتے۔ بات یہ ہے کہ میرا بھتیجا! تمہیں دیکھنے کے لیے بہت بے چین تھا۔ یوسف آگے آجاؤ! اور جوگی کو اچھی طرح سے دیکھ لو۔ تم اس کے ساتھ ہاتھ بھی ملا سکتے ہو، باتیں بھی کر سکتے ہو۔ یہ میرا دوست ہے"۔ میں نے آگے بڑھ کر جوگی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔"اگر چچا جان نے تمہیں تکلیف دی ہے تو مجھے بہت افسوس ہے"۔

"نہیں جی! تمہارے چچا جان میرے دوست ہیں"۔

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"یہ میں تمہیں اس وقت نہیں بتاؤں گا۔ لیکن جب تم اپنے چچا کی طرح بڑے

ہو جاؤ گے تو تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ چودھری جی مجھے آپ کے بھتیجے سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ اب اگر اجازت ہو تو مجھے یہاں سے بھاگنا چاہیے"۔ "ہاں تم جاؤ!"

وہ کھیڈن دے دن چار نی مائے۔ کھیڈن دے دن چار" گاتا ہوا چل دیا۔ لیکن وہ کتے جو دیر سے بھونک رہے تھے۔ اب خاموش ہو گئے تھے۔

میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ سخت بیمار ہوا۔ ابا جان گھر پر موجود نہیں تھے۔ مقامی حکیموں اور سنیاسیوں نے یہ طے کیا کہ میرا بخار کم کرنے کے لیے میرا خون کم کر دیا جائے اور اس مقصد کے لیے میرے جسم پر جونکیں لگا دیں۔

آنکھوں پر پٹی باندھنے تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے جونکیں لگائی جائیں گی لیکن جب پٹی باندھ دی گئی تو کسی نے مجھے مضبوطی سے بازو میں جکڑ لیا اور اس کے ساتھ ہی میں نے جونکیں لگانے والوں کی بات چیت سنی تو میرا مدافعانہ شعور اچانک بیدار ہوا اور میں نے اچانک آنکھوں سے پٹی اتار ڈالی۔ اتنی دیر میں چچا شیر علی اچانک بھاگتا ہوا آیا، اور اس نے کہا بھائی جان آرہے ہیں اور ڈاکٹر کو ساتھ لائے ہیں۔ ایک جونک میرے گھٹنے سے ذرا اوپر چمٹ چکی تھی اُسے چچا نے جلدی سے مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا۔ اور جونکوں والے کو ایک تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔"یہاں سے بھاگ جاؤ۔ ورنہ جوتے کھاؤ گے"۔

ڈاکٹر نے دو دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ اِس عرصہ میں میرا بخار جسے ڈاکٹر ٹائیفائڈ کہتے تھے اُتر گیا۔ جاتے ہوتے اُس نے تاکید کی کہ مجھے تین دن صرف دودھ اور اس کے بعد بہت ہلکی غذا دی جائے۔

گاؤں کے شمال مشرق میں سائیں بڈھے شاہ کا تکیہ تھا۔ وہاں ایک قبر اپنے دائیں بائیں کی دو عام قبروں سے کوئی تین گنا بڑی تھی اور اُس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہاں سائیں

جمال شاہ دفن ہیں۔ جو بڈھے شاہ کے پردادا تھے اور دوسری قبریں سائیں بڈھے شاہ کے باپ اور دادا کی تھیں لوگ دُور دُور سے جمال شاہ کے لیے چڑھاوے لایا کرتے تھے اور انہیں عام طور پر بڑا سائیں کہا جاتا تھا۔

سائیں بڈھے شاہ اور خوبیوں کے علاوہ ایک اچھا کاشتکار بھی تھا تکیے کے ساتھ اس کی دس کنال زمین میں اتنی سبزی پیدا ہوتی تھی کہ آس پاس کے دیہات کے لوگوں کو شہر جا کر خریدنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بڈھے شاہ کے کھیت کے کریلے اپنے غیر معمولی سائز کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ اُن کے بزرگ بابا جمال شاہ کا عرس جون کے مہینے میں ہوتا تھا جب کہ کریلوں کی بہتات ہوتی تھی۔ اس لیے عقیدت مندوں کو روٹیوں کے ساتھ سرسوں کے تیل میں تلے ہوئے کریلے تقسیم کیے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کسی ملنگ نے بھنگ کے نشے میں اپنی روٹی سے ایک بہت بڑا کریلا اٹھا کر بلند کرتے ہوئے نعرہ لگایا

ڈم ڈم کریلا   بڈھے شاہ دا میلہ

اور اس کے بعد یہ نعرہ اس میلے کا اہم گانا بن گیا جو خاص کر بچوں میں بہت مقبول تھا۔

بڈھے شاہ کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ لوگوں کو بالخصوص عورتوں کو جنوں، بھوتوں اور ہر قسم کے آسیب سے نجات دلا سکتے ہیں اور مریض یا مریضہ کو دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے کہ اس پر کس چیز کا سایہ ہے۔ گاؤں کے اندر اُس کا ایک مرید پیراں دتہ چوکیدار تھا اور دوسرا اللہ رکھا موچی تھا جو دُور دُور تک اُن کا پرچار کیا کرتا تھا اور سائیں بڈھے شاہ بھی ان کے حال پر مہربان تھا اور جو نذرانے اُس کی ضرورت سے زائد ہوتے تھے۔ وہ اللہ رکھا اور پیراں دتہ کے گھر بھیج دیے جاتے تھے۔ سائیں جی کے طریقِ علاج کے چشم دید گواہ ہمیشہ اُن کے عقیدت مند ہوتے تھے۔ آسیب کے مریضوں کو جس کوٹھڑی میں لٹایا جاتا تھا۔ اُس کا دروازہ جن یا بدروح نکالتے وقت دوسروں کے لیے بند کر دیا جاتا تھا اور بڈھے شاہ

کے مرید ہی یہ بتا سکتے تھے کہ جن بھوت یا بدروح کیسے جاتی ہے۔

سائیں بڈھے شاہ بانس کا ایک موٹا ڈنڈا اُٹھا لیتا جو اندر سے کھوکھلا ہوتا تھا اور کسی نامعلوم زبان کے الفاظ دہرانے کے بعد ڈنڈا اُٹھا کر گرجتی ہوئی آواز میں کہا کرتا تھا۔

"او کالے منہ والے میں نے تمہیں پہچان لیا ہے تم کئی بار یہ وعدہ کر چکے ہو ——— کہ آئندہ تم اِس علاقے میں کسی کو تنگ نہیں کرو گے۔ اب بھاگ جاؤ، ورنہ جلا کر بھسم کر دوں گا" اور کوئی بدروح مریض کی زبان سے جواب دیتی "میں بالکل نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے بے آرام کرنے والے کون ہو؟"

بڈھے شاہ جوش میں آجاتا اور ڈنڈا ہوا میں لہراتا ہوا زیادہ بلند آواز میں کوئی منتر پڑھتا اور پھر غصہ سے کانپتا ہوا چلاتا "ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ یہاں سے فوراً نکل جاؤ۔ ورنہ ہم تمہیں زمین کے پاتال میں پہنچا دیں گے۔ جہاں سے تمہاری چیخیں بھی سنائی نہیں دیں گی۔ تم تاریکی میں اُن خوفناک سانپوں اور بچھوؤں کو بھی نہیں دیکھ سکو گے جو ہر گھڑی باری باری تمہیں کاٹا کریں گے۔"

اور مریض کے منہ سے سہمی ہوئی آواز نکلتی

"بابا جی میری طرف اتنے غصے سے نہ دیکھیے۔ آپ کی سرخ آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ پھر یہاں نہیں آؤں گا۔ بالکل نہیں آؤں گا۔ بابا جی مجھے معاف کر دو۔"

اِس کے بعد مریض اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور سائیں نڈھال سا ہو کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کہتا۔

"یار مار ڈالا اِس کالے بھوت نے اتنی لڑائی کی ہے کہ میرے جسم میں ہلنے کی طاقت نہیں رہی۔"

عجیب بات یہ تھی کہ جب سائیں بڈھے شاہ غصے میں آکر جنوں بھوتوں کو دھمکیاں دیا کرتے تھے تو اُن کی آنکھیں سُرخ ہو جایا کرتی تھیں اور چہرہ اتنا خوفناک کہ صبح و شام

اُن کے پاس رہنے والے مریض بھی ڈر جایا کرتے تھے۔



سائیں بڈھے شاہ کے تکیے سے کچھ فاصلے پر ایک ہندو جوگی جانکی داس رہتا تھا۔ اُس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ جنوبی ہندوستان سے آیا تھا اور چند سال قبل ایک سکھ کے کھیت میں دھونی رما کر بیٹھ گیا تھا۔ اتفاق سے اِس کھیت کا مالک بیمار تھا۔ جانکی داس نے اُسے اپنی گٹھڑی سے کوئی دوائی نکال کر کھلا دی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ اور جانکی داس ایک بہت بڑے سنیاسی کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔ زمیندار نے چند دن اسے اپنی حویلی میں رکھا اور پھر گاؤں کے لوگوں کے تعاون سے اُس کے لیے اسی کھیت میں ایک جھونپڑا تعمیر کر دیا۔ جہاں آکر وہ ٹھہرا تھا۔ اور باقی کھیت بھی اسے دان کر دیا۔

جانکی داس باتوں میں بُڈھے شاہ کے مقابلے میں بہت تیز تھا۔ ایک سال کے اندر اندر اُس نے گاؤں کے لوگوں کے چندے سے کنواں بھی کھدوا لیا تھا۔

کاروباری رقابت کے باوجود گاؤں کی یہ دو شخصیتیں آپس میں میل ملاپ رکھتی تھیں بڈھے شاہ کا پلڑا اس لیے بھاری تھا کہ اس کا کاروبار برسوں سے چل رہا تھا اور عورتوں میں وہ زیادہ مقبول تھا۔



اللہ رکھا موچی بڈھے کے ایک مستقل مرید کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ وہ دُور دُور دورے پر جایا کرتا تھا۔ اور اُس کا طریقِ واردات یہ تھا کہ وہ کسی مریض کے بارے میں شبہ پیدا کرتا تھا کہ وُہ جن بھوت کے قابو میں ہے اور پھر جب لوگ وہم میں مبتلا ہو جاتے تو انہیں سائیں بُڈھے شاہ اور اُن کے بزرگوں کے کارناموں کی حیرت انگیز داستانیں سُناتا۔

گاؤں میں دوسرا مرید پیراں دتہ چوکیدار تھا جو بوقت ضرورت ایسے لوگوں کے پاس

اللہ رکھا کی باتوں کی تصدیق کے لیے جایا کرتا تھا۔ اور اتنا کامیاب تھا کہ جب وہ کسی سفر سے واپس آتا تھا تو کوئی نہ کوئی اہم مریض بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

باب - ۱۶

پردیسی درختوں کے ساتھ سکول والے گاؤں میں نعمت علی ایک خاندانی حکیم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھا اور اس کے دیہات میں جب کوئی زیادہ بیمار ہو جاتا تھا تو لوگ علاج کے لیے اسی کی طرف بھاگا کرتے تھے۔

نعمت علی ہمارے گاؤں بھی آیا کرتا تھا اور بڈھے شاہ اور جانکی داس دونوں تکلیف کے وقت اس سے دوائیاں لیا کرتے تھے۔ اِن تینوں میں سے کوئی کسی کا مدِمقابل یا رقیب نہ تھا۔ وُہ ہنسی خوشی ملا کرتے تھے اور اگر ان کے دل میں کوئی بات ہوتی تھی تو وہ ظاہر نہیں کرتے تھے۔ لیکن دریائے بیاس کے پار کسی گاؤں سے ایک نیا طالع آزما حکیم حسین بخش نمودار ہوا اور اُس نے علاقے کے لوگوں کی پرسکون زندگی تہ و بالا کر دی۔

کہتے ہیں کہ حسین بخش پردیسی درختوں سے کچھ دُور جنوب کی طرف اپنے ایک شاگرد کے ساتھ ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ ایک حویلی کے سامنے اُس کی ملاقات گاؤں کے نمبردار سے ہو گئی۔ نمبردار پریشانی کی حالت میں ایک آدمی سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھو دلیپ سنگھ تم دیر نہ کرو۔ فوراً جاؤ اور حکیم نعمت علی کو یہاں بھیج دو۔ اُسے کہہ دینا کہ تمہاری بھابی کو بہت تکلیف ہے اور فوراً یہاں پہنچے۔ تم یہ گھوڑی اُس کے حوالے کر دینا اور پھر اگلے گاؤں میں سائیں بڈھے شاہ اور جانکی داس کو بھی کہہ دینا کہ وہ یہاں آ جائیں۔"

حسین بخش وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا اور اُس نے اپنے ہوشیار شاگرد کو اشارہ کیا۔

شاگرد نے آگے بڑھ کر نمبردار سے پُوچھا۔

"سردار جی حکیم صاحب پوچھتے ہیں کہ آپ کے گھر میں کیا تکلیف ہے؟"

"کون حکیم صاحب؟" نمبردار نے حسین بخش کی طرف دیکھتے ہوئے پُوچھا۔

شاگرد نے جواب دیا "سردار جی آپ حکیم حسین بخش کو نہیں جانتے؟ ان کی شہرت تو بیاس سے لے کر راوی تک گاؤں گاؤں پہنچ چکی ہے اور اُدھر بیاس کے پار جالندھر اور ہوشیار پور کے مریضوں کا ان کے پاس تانتا بندھا رہتا ہے۔ یہ ایک قیمتی بُوٹی کی تلاش میں نکلے تھے اور اتفاق سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس میں قدرت کا بھید ہے۔"

نمبردار نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "حکیم جی قیمتی بُوٹی بعد میں تلاش کر لینا۔ بھگوان کے لیے پہلے میری بیوی کو بچاؤ۔ اس کے دو بچے پہلے ضائع ہو گئے تھے۔ اگر آپ نے میرے تیسرے بچے کو بچا لیا تو عمر بھر آپ کی سیوا کروں گا۔ ورنہ میری بیوی مَر جائے گی۔"

جب یہ باتیں ہو رہی تھیں تو اللہ رکھا موچی جو پچھلے گاؤں میں جوتے فروخت کرنے کے بعد واپس جا رہا تھا۔ وہاں سے گزرا۔ وہ سائیں بڈھے شاہ کی سفارش کرنا چاہتا تھا لیکن حکیم حسین بخش اور اُس کا شاگرد نمبردار کے ساتھ حویلی کے اندر چلے گئے۔

اللہ رکھا کچھ تو نمبردار کے ساتھ ہمدردی کی وجہ سے اور کچھ ایک نئے حکیم کے ساتھ دلچسپی کے باعث وہاں سے تھوڑی دُور ایک تیلی دوست کے گھر چلا گیا۔

تیلی نے اُسے کھانے کے لیے روک لیا اور اس کی بیوی نے نمبردار کے گھر کسی نئے حکیم کی آمد کے متعلق سُن کر کہا۔ "بھائی اللہ رکھا کو اُس بیچاری پر بہت ترس آتا ہے لیکن حکیم خواہ کوئی ہو اس کے بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ وہ پہلے ہی دو مرتبہ ضائع ہو جانے والے بچوں کے غم میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی ہے۔"

○

جس وقت تیلی کے گھر میں یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ نمبردار کے گھر میں حکیم حسین بخش ایک تڑپتی ہوئی عورت کی نبض دیکھ رہے تھے اور چند منٹ بعد مریضہ نے دودھ کے ساتھ اُن کی دوائی کھا کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

نمبردار چلایا "حکیم جی کہیں یہ مر تو نہیں گئی؟"

حسین بخش نے اطمینان سے جواب دیا "میری دوائی کھانے کے بعد یہ مر نہیں سکتی۔ اگر گاؤں میں کوئی دائی ہے تو اُسے بُلا لیجیے۔ مَیں باہر درخت کی چھاؤں میں لیٹ جاتا ہوں۔"

ایک گھنٹہ بعد جب حکیم نعمت علی گھوڑا دوڑاتا ہوا پہنچا تو اُس نے حویلی کا دروازہ بند پایا۔ جب شور مچایا تو اندر سے نمبردار کی گرجتی ہوئی آواز آئی۔ "بھئی شور نہ مچاؤ۔ حکیم صاحب کا حکم ہے کہ کوئی اندر نہ آئے۔"

"نمبردار جی! میں حکیم نعمت علی ہوں۔" دروازہ کھٹکھٹانے والے نے فریاد کی۔

"بھئی مجھے معلوم ہے لیکن تم رہٹ پر چلے جاؤ اور وہاں گھوڑا باندھ دو اور اگر سائیں بڈھے شاہ اور جانکی داس بھی پہنچ جائیں تو انھیں بھی بٹھا لو۔"

"نمبردار جی وہ کس لیے آئیں گے؟"

اندر سے گرجتی ہوئی آواز آئی۔ "وہ اس لیے آئیں گے کہ مَیں اُلّو کا پٹھا ہوں۔"

نعمت علی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "سردار جی خیر تو ہے، بھابی جی کیسی ہیں؟"

"بھابی جی کی فکر نہ کرو۔ ایک بچہ پیدا ہو چکا ہے اور دوسرا پیدا ہونے والا ہے۔ بھگوان کا شکر ہے کہ اُس نے میرے گھر ایک فرشتہ بھیج دیا ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو تم سب کو انعام ملے گا۔"

کچھ دیر بعد حکیم جی اور اُس کا شاگرد نمبردار کے گھر سے پراٹھے کھا رہے تھے۔

گاؤں کے لوگ مبارک باد دینے آتے تھے تو نمبردار اُنہیں کہتا تھا۔

"پہلے اِس دیوتا کو سلام کرو، جو میرے گھر میں خوشیاں لے کر آیا ہے۔ میں ایک لڑکے سے نا امید تھا۔ بھگوان نے دو دے دیے ہیں۔"



رہٹ پر حکیم نعمت علی، سائیں بڈھے شاہ اور جانکی داس بیٹھے ہوئے تھے اور دبی آواز میں سردار اُدھم سنگھ اور اُس اجنبی حکیم کو گالیاں دے رہے تھے جس کی وجہ سے اُن کی توہین ہو رہی تھی۔

اللہ رکھا جو تیلی کے گھر کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد نمبردار کی خیریت پوچھنے کا ارادہ لے کر نکلا تھا کسی سے کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر پھرتا پھراتا رہٹ پر جا نکلا۔

سائیں بڈھے شاہ اور اُس کے ساتھیوں کو دیکھتے ہی پوچھا "آپ یہاں کیوں بیٹھے ہیں۔ نمبردار ادھم سنگھ کے گھر کیوں نہیں گئے۔ وہاں آپ کی سخت ضرورت ہے۔" جانکی داس نے کہا "نمبردار بے وقوف ہے اور تم اُس سے زیادہ بے وقوف ہو۔"

"جی میں نے کیا بے وقوفی کی ہے۔ جب وہ ایک نئے حکیم کے سامنے ہاتھ باندھ کر منتیں کر رہا تھا کہ میری بیوی کو بچاؤ تو مجھے خیال آیا تھا کہ میں اپنے سائیں پیر کو بلانے کا مشورہ دوں لیکن وہ نمبردار کے ساتھ اندر چلے گئے تھے اور مجھے موقع ہی نہیں ملا۔"

حکیم نعمت علی نے پُوچھا۔ "لیکن وہ نیا حکیم ہے کون؟"

اللہ رکھا نے جواب دیا۔ "جی مجھے پتہ نہیں۔ لیکن مَیں نے اُس کے شاگرد کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ دریا کے آر پار میلوں سے لوگ اُس سے دوائی لینے آتے ہیں۔"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا۔ "یار ایسے بدمعاش آدمی کے شاگرد لوگوں پر اسی طرح سے رعب ڈالتے ہیں۔"

"لیکن سائیں جی میں نے گلی میں دو عورتوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکا پیدا ہو چکا ہے اور دوسرا ابھی پیدا ہو رہا ہے لیکن آپ جب یہاں آئے تھے۔

تو آپ کو اندر جا کر دیکھنا تو چاہیے تھا حکیم جی بھلا کوئی ایسی دوائی بھی ہے جس سے اٹھرا کا مرض ٹھیک ہو جائے اور ایک کی بجائے دو بچے پیدا ہو جائیں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ شاید اس بے وقوف حکیم نے یہ نہیں سوچا کہ اگر اُس کے متعلق یہ مشہور ہوگیا ہے کہ اس کی دوائی کھانے والی عورت ایک کی بجائے دو بچوں کو جنم دیتی ہے تو بیوقوف عورتیں بھی اُس کی دوائی سے کوسوں دور بھاگیں گی۔"

جانکی داس نے کہا "یار میں تو چاہتا ہوں کہ دو کی بجائے تین چار پیدا ہو جائیں اور لوگ اسے لاٹھیاں مار مار کر گاؤں سے نکال دیں۔"

"یار دیکھو شاید نمبردار آرہا ہے" اللہ رکھا نے کہا۔ وہ خاموشی سے گلی کی طرف دیکھنے لگے۔ نمبردار کے ساتھ ایک آدمی گڑ کی ٹوکری اٹھائے ہوئے تھا۔ انہوں نے اُٹھ کر اسے مبارکباد دی۔ نمبردار نے انہیں گڑ کی دو دو بھیلیاں تقسیم کیں اور پھر تینوں کو پانچ پانچ روپے کا ایک ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھ پر بڑی کرپا کی ہے۔ میں ایک بیٹے کے متعلق فکر مند تھا۔ اب بھگوان نے مجھے دو بیٹے دے دیے ہیں۔ میں آپ کی اور بھی خدمت کروں گا۔"

حکیم نعمت علی نے کہا "نمبردار جی آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اب ہمیں اجازت دیجیے۔"

نمبردار نے اُن کے ساتھ باری باری مصافحہ کیا۔ جب اللہ رکھا کی باری آئی تو اُس نے کہا "ارے یار تم اللہ رکھا موچی ہو؟ — شاید میں نے پہلے بھی تمہیں دیکھا تھا۔"

"جی حویلی کے دروازے پر جب آپ حکیم صاحب سے باتیں کر رہے تھے تو میں باہر ہی کھڑا تھا۔ اور پھر اس لیے رُک گیا تھا کہ آپ کے گھر سے کوئی اچھی خبر سُن کر جاؤں۔"

"بھئی میں تم پر بہت خوش ہوں۔ شاید تمہارے درشن کر لینے سے ہی میری مصیبت دُور ہوگئی تھی۔ تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔"

اللہ رکھا نے بڈھے شاہ کی طرف دیکھ کر کہا "سائیں جی مجھے یہاں تیلی کے ساتھ بھی کچھ

کام ہے۔ اگر شام کو نہ آسکا تو کل آؤں گا۔"

وہ تینوں وہاں سے چل پڑے اور اللہ رکھا نمبردار کے ساتھ ہولیا۔

گاؤں سے نکل کر بڈھے شاہ نے ساتھیوں سے کہا۔ "اُس بیوقوف کو تیلی کے ساتھ کوئی کام نہیں تھا۔ وہ صرف اس نئے حکیم کو اچھی طرح دیکھنے اور اپنی بیوی کے لیے دو لڑکے پیدا کرنے والی دوائی حاصل کرنے کے لیے رُک گیا ہے۔"

حکیم نعمت علی نے کہا "سائیں جی اِس گاؤں کے لوگ کافی بے وقوف ہیں۔ اُس چالاک آدمی کا کاروبار خوب چلے گا۔"

جانکی داس نے کہا "یار مجھے تو خود نمبردار سب سے زیادہ بیوقوف معلوم ہوتا ہے۔"

نعمت علی نے کہا "نہیں یار وہ بیوقوف ہوتا تو ہمیں پانچ پانچ روپے کیوں دیتا۔ کام تو اُس کا ہوگیا تھا اور اب میرا خیال ہے کہ وہ اللہ رکھا کو بھی کچھ دے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل کا کھرا ہے اور کسی سے بگاڑ پیدا نہیں کرتا۔"



اللہ رکھا اگلے روز سہ پہر کے وقت سر پر ایک گٹھڑی اُٹھائے اپنے گھر میں داخل ہُوا تو بیوی نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔

"آپ کہاں غائب ہوگئے تھے۔ سائیں بابا نے آپ کا دو بار پتہ کیا ہے۔ ابھی ابھی جانکی داس بھی آپ کے متعلق پوچھ کر گیا ہے۔"

اللہ رکھا نے گٹھڑی ایک کھاٹ پر رکھتے ہُوئے کہا۔

"وہاں ٹھہر کر میں گھاٹے میں نہیں رہا۔ نمبردار نے دو بچوں کی خوشی میں مجھے تین روپے اور دس سیر چاول دیے ہیں لیکن یہ بات کسی کو نہ بتانا کہ وہ حکیم جس نے اُس کی بیوی کا علاج کیا تھا اور جس کے علاج سے دو بچے پیدا ہوئے ہیں۔ اُس نے بھی مجھے ایک روپیہ دیا تھا۔"

"حکیم جی نے تمہیں دیا تھا؟"

"ہاں! میں نے ہاتھ باندھ کر اُس سے کہا تھا۔ کہ میری گھروالی کے لیے بھی کوئی دوائی عنایت کردیں۔ ہماری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں اور ابھی تک ہمیں بچے کی خوشی نصیب نہیں ہوئی"۔ حکیم صاحب نے جواب دیا کہ دوائی میں تمہاری بیوی کی نبض دیکھ کر دوں گا۔ میں نے پوچھا کہ حکیم جی نبض دکھانے کے لیے میں اُس کو یہاں لے آؤں گا۔ میں ایک غریب آدمی ہوں لیکن آپ کو خوش ضرور کروں گا۔" جانتی ہو اُس نے کیا جواب دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا "بھئی ہم غریب آدمیوں سے کچھ نہیں لیا کرتے۔ اُسے یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ مَیں خود کسی دن تمہارے گاؤں آؤں گا۔ پانچ سات دن بعد آؤ اور مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ اگر تمہارے گاؤں میں کسی اور کے اولاد نہ ہوتی ہو یا اٹھرا کا مرض ہو تو اُسے بتا دینا۔ مَیں نے سردار لشمن سنگھ کا بتایا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اُس کی شادی کو پندرہ سال ہو چکے ہیں اور ابھی تک وہ اولاد کے لیے ترس رہا ہے۔ حکیم صاحب کہتے تھے کہ ایسی حالتوں میں کبھی کبھی ہمیں میاں بیوی دونوں کا علاج کرنا پڑتا ہے اور علاج بھی چند دن کے لیے نہیں چند مہینوں کے لیے ہوتا ہے۔ اگر ان لوگوں نے اطمینان سے علاج کروایا۔ تو مجھے یقین ہے کہ ایک سال کے اندر اندر اُن کی خواہش پوری ہو جائے گی ———

مَیں اب بابا سائیں کے پاس جانے سے پہلے سردار لشمن سنگھ کو خوش خبری سنانے جا رہا ہوں۔ حکیم کہتا تھا کہ بعض دوائیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ مَیں نے اُسے بتایا تھا کہ سردار لشمن سنگھ کے گھر کسی چیز کی کمی نہیں، وہ سردار ادھم سنگھ سے زیادہ مالدار ہے۔ مَیں نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ نمبردار ادھم سنگھ اور گاؤں کے دوسرے زمینداروں نے حکیم صاحب کو وہیں ٹھہرا لیا ہے۔ اور چند دن تک گاؤں سے باہر اُس کے لیے ایک مکان بننا شروع ہو جائے گا۔

آج صبح ہوتے ہی سردار اُدھم سنگھ کا سُسر اور سالے وہاں پہنچے تھے اور انہوں نے میرے سامنے حکیم حسین بخش کو پچاس روپے دیے تھے۔ اُدھم سنگھ کے چچا کے بیٹے دلیپ سنگھ نے حکیم کو ایک گائے دی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ اگر سائیں جی کی طرف سے کوئی بلانے آئے

تو اُسے کہہ دینا کہ میں بہت جلد اُن کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ اِن چاولوں اور تین روپے کے متعلق بے شک کہہ دینا لیکن یہ کسی سے نہ کہنا کہ حکیم نے مجھے بھی کچھ دیا ہے"۔

اللہ رکھا لشمن سنگھ سے ملاقات کر کے تکیہ میں پہنچا تو وہاں سائیں بڈھے شاہ کے پاس چند اور آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے سردار اُدھم سنگھ کے گاؤں میں ایک نئے حکیم کی آمد کا قِصّہ کچھ اِس انداز سے سنایا کہ شام تک حکیم حسین بخش گاؤں کی ہر محفل میں گفتگو کا موضوع بن چکا تھا۔

پانچویں دن لشمن سِنگھ نے اللہ رکھا کو اپنی گھوڑی دے کر کہا کہ "تم حکیم صاحب کو لے آؤ"۔

تین گھنٹے بعد گاؤں کے لوگ حکیم حسین بخش کا استقبال کر رہے تھے۔ اُس نے پہلے اللہ رکھا کے گھر جا کر اُس کی بیوی کی نبض دیکھی اور پھر سردار لشمن سنگھ کی حویلی چلا گیا۔ وہاں اُس نے پہلے سردار جی کی نبض دیکھی اور چند سوالات پوچھ کر اُس کی گھروالی کو دیکھنے چلے گئے۔ پھر رات بھر وہ ان کے مہمان رہے اور صبح جاتے وقت چند دوائیوں کے ساتھ یہ خوش خبری بھی دے گئے کہ "آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگر آپ باقاعدہ دوائی کھاتے رہے۔ تو ایک سال کے اندر اندر آپ کی گود میں ایک خوب صورت بچہ کھیل رہا ہو گا۔ آپ کے لیے چند اور دوائیاں تلاش کرنے کے لیے مجھے لاہور جانا پڑے گا۔ اس لیے دس دن بعد پھر آؤں گا۔"

———○———

ایک سال کے اندر اندر حسین بخش ایک بہت بڑے حکیم کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ جو لوگ اسے ایک حریف سمجھ کر مقابلے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے، اُس کا احترام کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ حسین بخش ایسے لوگوں کو تھپکی دے کر کام لینا جانتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اُس کی ایک بڑی کامیابی یہ تھی کہ سائیں بڈھے شاہ اُس سے علاج کروایا کرتے تھے ———

جانکی داس چند مہینے اُس سے دور رہا لیکن ایک دن وہ بڈھے شاہ کے تکیے میں بیٹھا ہُوا تھا کہ جانکی داس نے بھی نبض دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔

حکیم نعمت علی کو اُس کی وجہ سے کافی نقصان پہنچ چکا تھا لیکن ایک تفصیلی ملاقات کے بعد اُسے یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ یہ شخص بنیادی طور پر جاہل اور طب کے متعلق کچھ نہیں جانتا اِس لیے وہ اس اطمینان کے ساتھ اُس سے الگ تھلگ رہتا تھا کہ کسی دن ضرور کوئی ایسی حماقت کرے گا کہ لوگ اُس سے متنفر ہو جائیں گے اور اُس کی یہ امید اگلے سال پوری ہو گئی۔

پہلا واقعہ یہ تھا کہ سردار ادھم سنگھ نمبردار کا چچازاد دلیپ سنگھ جس نے اس کے گھر دو لڑکوں کی پیدائش کی خوشی میں حکیم حسین بخش کو گائے کا نذرانہ دیا تھا۔ اچانک بیمار ہو گیا۔ حسین بخش نے تین دن تک چند دوائیں آزمائیں لیکن جب اس کا بخار بڑھ گیا تو رات کے وقت اُس کی فصد کھول دی اور اس وقت تک اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا۔ جب تک کہ اس کے جسم کی تپش دور نہیں ہو چکی تھی اور جب یہ تپش دُور ہو گئی تو پتہ چلا کہ دلیپ سنگھ کے دل کی حرکت بھی بند ہو چکی ہے۔ شاگرد ہوشیار تھا وہ خون والی بالٹی اٹھا کر چپکے سے باہر نکل گیا اور حسین بخش دو گھنٹے یہی ظاہر کرتا رہا کہ مریض کو بخار اترنے میں نیند آگئی ہے۔

عام حالات میں ادھم سنگھ کے گاؤں میں یہ رات اُس کی آخری رات ہوتی لیکن اُس نے یہ احتیاط کی تھی کہ فصد کھولنے سے پہلے دروازہ بند کر لیا تھا۔ ہوشیار شاگرد خون والی بالٹی ریت سے اتنی صاف کر کے لایا تھا کہ وہ چمک رہی تھی۔ جب گھر والوں کو دلیپ سنگھ کی موت کا علم ہوا تو حسین بخش اُن سے زیادہ دھاڑیں مار رہا تھا۔ اُدھم سنگھ بھاگا ہوا آیا تو اُس نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ سردار جی جس کا وقت آ چکا ہو اُسے کوئی دوائی نہیں بچا سکتی۔ کاش میں جان دے کر اِس خوب صورت نوجوان کو بچا سکتا۔ سردار جی میں نے بہت جتن کیے تھے لیکن انسان تقدیر کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔

یہ میرے خاندان کی بدقسمتی تھی کہ اتنا بڑا واقعہ دب گیا۔ حکیم نعمت علی نے لاش دیکھ کر جو شبہات ظاہر کیے اُن پر کسی نے توجہ نہ دی اور حکیم حسین بخش کی شہرت میں کوئی کمی نہ آئی اُن کے شاگرد عطا محمد نے ایک دن اللہ رکھا کو یہ کہہ دیا کہ اگر ملک الموت سے پانچ منٹ پہلے بھی حکیم حسین بخش کسی کے گھر پہنچ جائیں تو مریض کی جان بچ سکتی ہے۔ اللہ رکھا کو یہ بات پسند آگئی۔ اور جب بھی وہ حکیم کا ذکر کرتا تھا تو یہ فقرہ ضرور دہراتا تھا۔ چنانچہ یہ بات اتنی عام ہو گئی تھی کہ جہاں لوگ موت کے فرشتے کا ذکر کرتے تھے وہاں حسین بخش کا ذکر بھی ضرور آتا تھا۔

ہمارے گاؤں کے مولوی صاحب نے بڑے غصّے میں آکر یہ اعلان کیا تھا کہ ایسی بات کہنا کفر ہے اور سائیں بڈھے شاہ نے بھی اللہ رکھا کی سرزنش کی تھی لیکن ایسی باتوں سے لوگوں کے اعتقاد میں کوئی فرق نہ آیا۔



چچا شیر علی جو تئیس سال کی عمر میں دور دور تک اپنی جسمانی قوت کا لوہا منوا چکے تھے۔ ان کی ایک خوب صورت گھوڑی اچانک غائب ہو گئی تھی۔ ہمارے علاقے میں اکثر چوری کا مال عام طور پر دریا کے پار پہنچا دیا کرتے تھے اور پھر اس کا کہیں پتہ نہیں ملتا تھا۔

چچا شیر علی نے گھوڑی کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا اور اُس کا سراغ لگاتے ہوئے دریائے بیاس کے پار پہنچ گئے۔ وہاں ہمارے خاندان کے کچھ لوگ آباد تھے۔ انہوں نے چچا شیر علی کو اپنے پاس ٹھہرا لیا۔

بیس دن بعد واپس آئے تو میں نے گاؤں سے باہر لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوتے انہیں دور سے دیکھ لیا۔ مَیں پوری رفتار سے ان کی طرف بھاگا۔ چچا کے ایک ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ مَیں اُن سے لپٹ گیا تو انہوں نے میرا بازو پکڑ کر اُٹھایا اور مجھے

اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے۔ تو جو بھی چچا شیر علی کو دیکھتا تھا اس قسم کے سوالات پوچھتا تھا۔

"شیر علی تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ — تم اتنے کمزور کیوں ہو گئے ہو؟ — یار تم تو پہچانے بھی نہیں جاتے۔"

میں ایسے سوالات پر حیران ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھے کسی حالت میں بھی چچا شیر علی کمزور نظر نہیں آ سکتے تھے۔ میں نے اپنے دل میں اُس وقت ایک دھچکا محسوس کیا۔ جب چچا جی مجھے کندھے سے اتارتے ہی کھلے صحن میں ایک کھاٹ پر لیٹ گئے تھے۔

"چچا جی میں آپ کی ٹانگیں دبا دوں؟" میں نے پُوچھا۔ انہوں نے لیٹتے لیٹتے ہاتھ بڑھا کر میرا بازو پکڑ لیا، اور اپنے ساتھ لٹا لیا۔ دادی اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر چلّا اُٹھیں۔

"بیٹا تم تو بخار میں جل رہے ہو۔"

تھوڑی دیر میں گھر کی خواتین وہاں جمع ہو گئیں۔ میں نے چچا کی کھاٹ سے اُٹھ کر اُمّی جان سے پُوچھا۔

"چچا کو کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹا وہ ٹھیک ہو جائیں گے، تم باہر جا کر اپنے دادا سے کہو کہ وہ کسی کو حکیم کی طرف بھیج دیں۔"

میں نے دادا جی کو باغ میں تلاش کیا اور انہوں نے ایک آدمی حکیم نعمت علی کی طرف بھگا دیا۔ لیکن بدقسمتی سے اُس وقت حکیم حسین بخش گاؤں میں کسی مریض کو دیکھنے آیا ہوا تھا، اور چچا کے بیمار ہو کر کئی دنوں کے بعد گھر آنے کی اطلاع گاؤں میں پھیل گئی تھی۔

اللہ رکھا بھاگتا ہوا پہلے چچا حیدر علی کے پاس پہنچا پھر میرے پر دادا کے پاس

گیا۔ جو ایک سو دس سال کی عمر میں نظر کمزور ہو جانے کے باعث عام طور پہ باہر کی حویلی میں اپنے کمرے سے بہت کم نکلتے تھے۔

دادا جی نے اپنی لاٹھی پکڑ کر اُٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا شیر بیمار ہے۔ چلو مجھے گھر لے چلو"

میری ایک چچا زاد نے ان کا دوسرا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔

اِتنی دیر میں اللہ رکھا گھر پہنچ کر میری دادی سے فریاد کر رہا تھا۔

"ماں جی شیر علی بخار سے بے ہوش ہو رہا ہے۔ حکیم حسین بخش یہاں آئے ہوئے ہیں وُہ جس کی نبض پہ ہاتھ رکھتے ہیں وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اگر با با جی اجازت دیں تو میں انہیں بُلا لاتا ہوں۔ آپ کو ایسا حکیم کوسوں دُور جا کر بھی نہیں ملے گا۔"

میری چچی نے اُن کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شیر علی کو بہت بخار ہے، اور اُس کا باپ اُس کا دشمن نہیں ہے، تم حکیم کو بُلا لاؤ۔"

اِتنی دیر میں میرے پر دادا بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے کہا۔

"اللہ رکھا تم بہت بے وقوف ہو۔ اگر حکیم گاؤں میں آیا ہوا تھا تو تمہیں اُسے ساتھ لے کر آنا چاہیے تھا۔"

اللہ رکھا بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد حکیم حسین بخش اپنے شاگرد عطا محمد کے ساتھ وہاں پہنچ چکا تھا۔ اُس نے چچا کی نبض دیکھتے ہی دوائی کی پڑیا نکال کر دودھ کے ساتھ کھلائی اور یہ مشورہ دیا کہ مریض کو کمرے کے اندر لٹا دیا جائے۔

حکیم کے مشورہ پر عمل کیا گیا اور چچا کو کمرے کے اندر بستر پر لٹا دیا گیا۔ حکیم دوبارہ نبض پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا لیکن چچا جان کسی تکلیف سے کراہ رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ دادی نے چچا کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"حکیم جی اس کے پاؤں جل رہے ہیں۔"

حکیم حسین بخش نے کہا۔ "ماں جی اِن کا سارا جسم جل رہا ہے۔ بیماری کے ساتھ جوانی کے خون کی تپش کے باعث ان کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ مَیں ایک اور دوائی دیتا ہوں۔ اگر اِس کا اثر نہ ہوا تو ہمیں کچھ خون کم کرنا پڑے گا۔"

حکیم صاحب کی دوسری پڑیا کا بھی کوئی اثر نہ ہُوا۔ اور حسین بخش نے چچا حیدر علی دادی جان اور دادا جان کے سوا سب کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی خوفناک بات ہونے والی ہے اور میں چچا کے پاس رہنا چاہتا تھا لیکن امّی جان مجھے بازو سے پکڑ کر باہر میرے پردادا کے پاس لے گئیں جو اب اُسی کھاٹ پر لیٹے ہوتے تھے جس پر تھوڑی دیر پہلے چچا شیر علی لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔

"یوسف اللہ سے دُعا کرو کہ تمہارا چچا ٹھیک ہو جائے۔ کہو یا اللہ میرے پیارے چچا کو صحت دے۔"

اور مَیں یہ فقرہ بار بار دہرا رہا تھا۔

میں نمازِ مغرب کی اذان سُن کر مسجد چلا گیا تو وہاں نمازی بھی چچا شیر علی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ میں نماز کے بعد گھر آیا تو حکیم نعمت علی وہاں پہنچ چکا تھا اور دادا جان کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس کے لیے مریض کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور اُس نے خود بھی کہہ دیا تھا کہ ایک طبیب کو دوسرے طبیب کے کام میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ لیکن جب اندر سے دادی کی آواز سنائی دی۔

"حکیم جی میرے بچے کا بہت خون نکل چکا ہے۔ خدا کے لیے اِس کو بند کرو لیکن شاید اب یہ بند بھی نہیں ہوگا۔ اگر میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو تم زندہ اِس گھر سے نہیں نکلو گے۔"

حکیم کہہ رہا تھا "ماں جی آپ حوصلے سے کام لیں اب ذرا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر

دیکھیں۔ آپ کے بیٹے کا بخار اتر گیا ہے۔ تھوڑا سا خون ضائع ہو جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

نعمت علی چلّایا۔

"خدا کے لیے بند کرا دو اور مجھے دیکھنے دو۔ ماں جی دروازہ کھلوایئے۔"

اندر سے دروازہ کھلا حکیم اور اس کا شاگرد زخمی کلائی پر پٹی باندھ رہے تھے جس پر رِستے ہوئے خون کا نشان نظر آ رہا تھا۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے لیکن حکیم نعمت علی نے نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد چچا کی آنکھ کھول کر دیکھی تو چلّا اُٹھا۔

"بھئی اب سب دعا کرو۔ حسین بخش تم یہ خون نکالنے کے بعد اب کون سی دوائی دو گے؟"

حکیم حسین بخش نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"آپ ان لوگوں کو پریشان نہ کریں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اَب مَیں صرف تین پُڑیاں دُوں گا اور پھر آپ کے سامنے مریض اُٹھ کر بیٹھ جائے گا۔"

حکیم نعمت علی چلّایا۔ "خدا تمہیں غرق کرے۔ اب تم کون سی دوائی دینا چاہتے ہو؟ تمہیں معلوم ہے کہ شیر علی بابا رحمت اللہ کا پوتا ہے اور عبدالرحیم کا بھائی ہے جو تمہیں بھاگنے کا موقع نہیں دے گا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ شیر علی کے ایک ایک بال کے لیے تم جیسے دس حکیم قربان کیے جا سکتے ہیں۔ ظالم کے بچّے میں دلیپ سنگھ کی لاش دیکھنے لگا تھا کہ تمہارے شاگرد نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا تھا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کسی نے اُس کا خون نچوڑ لیا ہے۔"

پھر حکیم نعمت علی باہر نکلا اور میرے پردادا سے مخاطب ہوا۔

"بابا جی! آپ کسی لڑکے کو کہیں کہ وہ گھوڑے پر جائے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔"

○

یہ رات ہمارے لیے قیامت کی رات تھی۔ حکیم حسین بخش کی پُڑیوں کا کوئی اثر نہ

ہوا تھا۔

حکیم نعمت علی سے دادا جان، دادی جان اور چچا غلام نبی نے اصرار سے کہا کہ وہ کوئی دوائی دیں اور حکیم حسین بخش نے بھی دبی زبان میں کہہ دیا۔

"حکیم جی ہمارا مقصد اس نوجوان کی جان بچانا ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی بہتر دوائی ہو تو آپ فوراً دے دیں۔"

حکیم نعمت علی نے کہا "میں اپنے ساتھ ایک معجون لایا ہوں۔ خدا کرے کہ اُس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔"

دادا جان نے کہا "حکیم صاحب جلدی سے وہ معجون نکالو میں اپنے ہاتھ سے کھلاتا ہوں۔"

جب دادا جان انھیں معجون کھلا رہے تھے۔ تو میں چچا کے بستر کے پاس پہنچ گیا۔ اور ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچان نہیں رہے۔ میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"چچا جان میں یوسف ہوں۔"

اُنھوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"یوسف بیٹا جیتے رہو۔ خدا تمہیں بڑی عمر دے اور بھائی جان تمہاری تمام خوشیاں دیکھیں۔"

میں رو پڑا تو دادی جان مجھے پکڑ کر باہر لے گئیں۔ دادا جان نے چچا جان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹا شیر علی آنکھیں کھولو۔ تمہاری تکلیف اب کچھ کم ہوئی ہے یا نہیں۔"

چچا جان نے آنکھیں کھولیں۔ اپنا ہاتھ ذرا بلند کیا پھر وہ آنکھیں جن کے اندر میں نے زندگی کی روشنی، توانائی اور اَن گنت شفقتیں دیکھی تھیں۔ کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اُن کا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے آگیا۔ گھر کے بچے اور بوڑھے کلمہ پڑھ رہے تھے۔

میں خوف زدہ ہو کر پردادا جی کے پاس آگیا تھا! وہ میری سسکیاں سُن کر کہہ رہے تھے۔

"یوسف شیر علی تم سے بہت پیار کرتا تھا نا؟"

"جی بابا جی"

"اگر تم روئے تو انہیں تکلیف ہو گی نا"

میں نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "بابا جی میں اب نہیں رُوؤں گا۔ میں انہیں تکلیف نہیں دوں گا۔"

صبح کے چار بج چکے تھے جس سوار کو ڈاکٹر کے لیے بھیجا تھا۔ وہ اُس کے ساتھ پہنچ چکا تھا۔ اُس نے ایک ہی نظر میں سب کچھ دیکھ لیا اور خون سے بھرے ہوئے برتن پر نگاہ ڈالتے ہی دادا جان سے کہا۔

"میاں جی ہم کسی مرض کے لیے دوائی دے سکتے ہیں لیکن قاتلوں کے ساتھ نہیں لڑ سکتے جس نے یہ خون نکالا ہے وہ قاتل ہے۔ مجھے دکھاؤ وہ کون ہے" اور جب قاتل اور اُس کے شاگرد کی تلاش شروع ہوئی تو وہ دونوں کہیں غائب ہو چکے تھے اور پھر میلوں تک ان کا کوئی سراغ نہ ملا تھا۔

لوگ کہتے ہیں کہ جب گھر کا ہر فرد ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا تو انہیں باہر نکلنے کا موقع مل گیا تھا، اور وہ بھاگ کر اُدھم سنگھ کے گاؤں پہنچ گئے تھے اور اُدھم سنگھ نے انہیں فرار ہونے کے لیے ایک گھوڑی دے دی تھی۔ پھر ایک مُدت تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔

میرے پردادا شیر علی کے جنازے میں چلتے ہوئے گر پڑے۔ لیکن ہوش آنے پر وہ دو آدمیوں کا سہارا لے کر قبرستان پہنچ گئے تھے۔

اِس علاقے کی تین نسلوں نے اُن کی ہمت اور طاقت کی اَن گنت داستانیں

سُنی تھیں۔ وہ ایک سو دس سال کی عمر تک پہنچنے پر بھی سیدھے چلا کرتے تھے۔ لیکن وُہ چچا شیر علی کی موت کے بعد تین ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔

جب مَیں اُن کا جنازہ پڑھ کر واپس آ رہا تھا تو دادا جان نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ یہ سمجھا رہے تھے۔

"بیٹا اب دعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ قبرستان ایسی جگہ ہے جہاں کسی نہ کسی دن ہر انسان کو اُٹھا کر لایا جاتا ہے۔ کسی کی فریاد، کسی کے آنسو اور کسی کی چیخیں اس دنیا سے جانے والوں کا راستہ نہیں روک سکتیں۔"

دادا جان کی باتوں سے مجھے بہت ڈھارس ہوتی تھی۔ امی، دادی اور میری چچیاں میرا دل بہلانے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ دادا جان کی نصیحتیں سُن کر مَیں گھر میں کسی کے سامنے نہیں روتا تھا اور اپنے آنسو اور سسکیاں بھی ضبط کر لیا کرتا تھا لیکن گاؤں سے باہر میں چھُپ چھُپ کر چچا شیر علی اور پردادا جان کے لیے رویا کرتا تھا۔

باب ۔ ۱۷

گاؤں میں جنوں، بھُوتوں اور چڑیلوں کی کئی داستانیں مشہور تھیں لیکن ایک قصہ جسے پُورے علاقے میں دلچسپی سے سُنا جاتا تھا اور خاصی اہمیت دی جاتی تھی وہ جمعہ شاہ کا تھا۔ جمعہ شاہ کی کہانی جو میں نے متعدد لوگوں کی زبانی سُنی تھی۔ یہ تھی کہ وُہ ایک جنّ تھا۔ اور ایک مولوی صاحب کے پاس تعلیم حاصل کیا کرتا تھا۔ ایک رات مولوی صاحب نے سبق پڑھانے کے بعد اپنے شاگردوں سے کہا "اب تم سب چلے جاؤ اور چراغ بجھا دو۔ کمرے کے کونے سے جواب آیا۔" بہت اچھا جناب! آپ اطمینان سے سو جائیں۔ میں چراغ بجھا دوں گا۔ پھر تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے نیم خوابی کی حالت میں دیکھا کہ دُور کونے میں بڑے شاگرد کا بازو بڑھنا شروع ہُوا۔ اور اس کے ہاتھ نے چراغ کے قریب پہنچ کر اُسے گُل کر دیا۔ مولوی صاحب ایک صاحب کرامت انسان تھے۔ انہوں نے کہا "تم ایک جنّ ہو اور انسان کے بھیس میں مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ تمہاری سزا یہ ہے کہ تم ہمیشہ ہماری قید میں رہو گے۔" جنّ بولا۔

"جناب! اگر آپ مجھے ہر سال آٹھ پہر کے لیے آزاد کر دیا کریں تو میں خوشی سے آپ کی قید قبول کرتا ہوں۔"

بُزرگ نے اُس کی یہ درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ موسم گرما کی بڑی آندھی کو جو

مسلسل آٹھ پہر یا اس سے زیادہ دیر چلتی تھی۔ اسے "جمعہ شاہ" کہا جاتا تھا اور اس جن کی رہائی کا دن سمجھا جاتا تھا جو اس مولوی کی قید میں تھا۔ ویسے آٹھ پہر کی کوئی پابندی نہ تھی۔ جو آندھی بھی زیادہ نقصان کر جاتی۔ لوگ اُسے "جمعہ شاہ" ہی کہہ دیتے تھے۔ گاؤں میں ایک کسان چودھری محمد رمضان کی تو یہ حالت تھی کہ وہ جونہی مطلع گرد آلود دیکھتا دہائی دینا شروع کر دیتا تھا۔

"بھئی! جمعہ شاہ چلا آ رہا ہے"۔

عام طور پر جمعہ شاہ جون کے آخری اور جولائی کے ابتدائی ایام میں آیا کرتا۔ لیکن ایک دفعہ یوں ہوا کہ۔

مئی کے ابتدائی دن تھے اور محمد رمضان ابھی اپنی گندم کاٹ کر فارغ ہوا تھا کہ آندھی آ گئی اور محمد رمضان دہائی دیتا پھرتا تھا۔ "لوگو! جمعہ شاہ کی آزادی کے لیے کوئی دن مقرر نہیں! اسے صرف میرا کھلیان اڑانے کا شوق ہے"۔

فروری میں لوگ پودے لگایا کرتے تھے۔ شہر میں میرے ایک چچا کے دوست کے گھر انگور کی بیل تھی۔ میں اُس کی ایک ٹہنی کٹوا کر لے آیا اور مکان کے صحن کے اندر زمین کھود کر کھاد ڈالی اور وہاں گاڑ دی اور نہایت بے تابی سے اس کی کونپلیں پھوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ امی جان عام طور پر اس کے قریب بیٹھ کر وضو کیا کرتی تھیں جب گرمیاں شروع ہوئیں تو میرے چچا نے بڑھتی ہوئی بیل کو سہارا دینے کے لیے ارد گرد ٹہنیاں گاڑ دیں۔ برسات میں بیل بہت پھیل گئی اور چچا نے اُسے سہارا دینے کے لیے لکڑیوں کا ایک چھپر سا بنوا دیا۔ اگلے سال بیل چھپر کو اتنی تیزی سے ڈھانپ رہی تھی کہ اس چھپر کے رقبہ میں اضافہ کرنا پڑا۔

جب پھل کا موسم آیا تو بیل پر سیاہ انگوروں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ ہمارے علاقے کی آب و ہوا ایسی نہیں کہ وہاں اچھا انگور پیدا ہو سکے۔ لیکن امی جان اس انگور کی بہت تعریف کیا کرتی تھیں اور وہ خود کھانے کی بجائے اِسے تقسیم کر کے

زیادہ خوش ہوا کرتی تھیں اور یہ کہنا کبھی نہیں بھولتی تھیں کہ اس میٹھے انگور کا پودا یوسف نے لگایا تھا"۔ تین چار سال کے اندر یہ بیل اتنی پھیل گئی تھی کہ صحن میں دلان کے اس حصے کے سامنے ایک اچھا خاصا سائبان بن چکا تھا اور گھر کی خواتین کو جب مکان کے اندر حبس محسوس ہوتا تھا تو بیل کی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے بیٹھ جایا کرتی تھیں۔



ہمارے گاؤں کے ایک باغ میں اچھی قسم کی ناشپاتیاں تھیں جنھیں عبدالمجید باغبان کشمیری ناشپاتیاں کہا کرتا تھا۔

ستمبر میں گاؤں سے پانچ میل دُور ایک میلہ لگا کرتا تھا۔ عبدالمجید نے اس میلے میں ناشپاتیاں لے جانے کے لیے چچا غلام نبی سے ایک دن کے لیے اُن کی ایک گھوڑی مانگی تھی۔ چھوٹے قد کی اِس گھوڑی سے سواری کی نسبت بار برداری کا کام لیا جاتا تھا۔ اور چچا غلام نبی کسی ضرورت مند کو مایوس نہیں کیا کرتے تھے۔ رات کے وقت مکان کی چھت پر اس میلے کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ کوئی مداریوں اور کوئی بازی گروں کے حیرت انگیز کرتبوں کا ذکر کر رہا تھا۔ کوئی کشتی لڑنے والے پہلوانوں اور کبڈی کے کھلاڑیوں کے متعلق بتا رہا تھا۔ میری عمر کے چار اور لڑکے بھی وہاں موجود تھے۔ جب بڑی عمر کے آدمیوں نے میلہ دیکھنے کا شوق ظاہر کیا تو وہ بھی تیار ہو گئے۔ میں نے کہا میں بھی جاؤں گا۔ فوراً دوسرے کونے سے دادا جان کی آواز آئی۔ "یوسف ادھر آؤ"۔ میں اُن کے پاس چلا گیا "تم کہاں جانا چاہتے ہو؟" دادا جان نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جی میں اُن کے ساتھ میلہ دیکھنے جاؤں گا"۔

"ذرا قریب آؤ"۔ میں بلا جھجک اُن کے قریب چلا گیا۔ انھوں نے ایک ہاتھ سے میرا کان پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے چپت رسید کرتے ہوئے کہا "شرم نہیں آتی تمہیں؟"

چپیت بہت ہلکی تھی لیکن یہ دادا جان کی پہلی چپیت تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا کہ میری دنیا میں کوئی انقلاب آ گیا ہے۔

دادا جان نے کہا "جاؤ سو جاؤ"۔

میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ جن لوگوں نے مجھے میلے جانے پر آمادہ کیا تھا اُن کی مجلس اُسی وقت برخاست ہو گئی تھی۔ جب میں نے دادا جان سے چپیت کھائی تھی۔ لیکن میں دیر تک غم و غصہ کی حالت میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میں اپنی چھت سے عبدالمجید کے گھر کے صحن کی طرف دیکھ سکتا تھا۔ پچھلے پہر مجھے اس گھر میں چند آوازیں سنائی دیں۔ اُٹھ کر دیکھا تو عبدالمجید اُس کا بھائی اور بیٹا گھوڑے پر بورا لاد رہے تھے۔ میں نے جُوتا پہنا اور دبے پاؤں نیچے اُتر آیا۔ تھوڑی دیر بعد میں ڈیوڑھی کے نیم وا دروازے سے گلی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک مجھے گھوڑی کی آہٹ سنائی دی۔ عبدالمجید کہہ رہا تھا "بیٹا روشن دین۔ اب تم واپس جا کر سو جاؤ۔ اِن ناشپاتیوں کے لیے مجھے تمہیں ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں"۔

جب عبدالمجید لدی ہوئی گھوڑی کی لگام پکڑے آگے نکل گیا تو میں قدرے توقف کے بعد اُس کے پیچھے چل پڑا۔ کوئی ایک گھنٹہ میں خاموشی سے چلتا رہا۔ جب ہم ایک گاؤں کی مسجد کے قریب سے گزر رہے تھے تو میں نے آگے بڑھ کر کہا "چچا عبدالمجید ٹھہرو میں نماز پڑھ کر آتا ہوں"۔

عبدالمجید نے مُڑ کر دیکھا تو سخت پریشان ہُوا۔

"تم اس طرف کیا لینے آئے ہو؟"

"میں بھی میلہ دیکھنے جا رہا ہوں"۔

عبدالمجید نے کہا "خدا کے لیے مسجد میں بیٹھے رہو۔ صبح ہوتے ہی واپس چلے جانا۔ ورنہ میری شامت آ جائے گی"۔

میں نے جواب دیا "نہیں اب میں واپس نہیں جاؤں گا۔ میں ابھی آتا ہوں"۔ میں یہ کہہ کر مسجد کے اندر چلا گیا۔ میں نے مسجد کے اندر جا کر وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر عبدالمجید کے ساتھ ہو لیا۔

ہم میلے والے گاؤں میں وقت سے پہلے ہی پہنچ گئے۔ دکاندار ابھی اپنی دکانیں سجا رہے تھے کہ عبدالمجید نے بیری کے ایک درخت کے ساتھ گھوڑی باندھی۔ پاس ہی ایک چادر بچھائی اور دو آدمیوں کی مدد سے بورا اُتار کر وہاں ڈھیر کر دیا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اُسے اچھی جگہ مل گئی ہے۔ مجھے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی اور میلے سے میری ساری دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں۔ مجھے اسی عید پر دادا جان نے ایک روپیہ دیا تھا اور یہ نصیحت کی تھی کہ اسے سنبھال کر رکھنا اور انتہائی ضرورت کے بغیر اسے خرچ نہ کرنا۔ امّی جان نے بھی مجھے دادا جان کا روپیہ سنبھال کر رکھنے کی نصیحت کی تھی۔ میں تھوڑی دیر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد عبدالمجید کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ جب مجھ پر نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تو میں خالی بورے کے اُوپر لیٹ گیا۔ جب صبح دُھوپ آئی تو میری آنکھ کھلی اور گاؤں کے چند آدمی پاس کھڑے عبدالمجید کو ملامت کر رہے تھے کہ تم اِسے ساتھ کیوں لائے ہو۔ عبدالمجید قسمیں کھا رہا تھا کہ میں بے قصور ہوں۔ اس سے پُوچھ لو کہ مجھے گاؤں سے نکلتے وقت معلوم نہیں ہُوا تھا کہ یہ میرے پیچھے آ رہا ہے۔

انہوں نے مجھ سے پُوچھا تو میں نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ میں اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ لیکن اس بات سے مجھے بہت پریشانی ہوتی کہ ان لوگوں میں سے کوئی بھی میلے پر نہیں آیا تھا جن کی باتیں سُن کر میں نے دادا جان سے چپیت کھائی تھی۔

ہمارے گاؤں کے ایک سکھ ہربنس سنگھ نے کہا "میاں یوسف اُٹھو، میلہ چل پھر کر دیکھا جاتا ہے۔ جب گرمی محسوس کرو تو اس طرف آموں کی چھاؤں بہت ٹھنڈی ہے۔ وہاں حلوائی کی دکان بھی ہے اور سوڈا واٹر بھی ملتا ہے۔ وہاں تمہیں

تازہ پکوڑے بھی ملیں گے۔ گرم گرم پکوڑے کھاؤ اور پھر برف ڈال کر خوب سوڈا پیئو۔ ساری تھکاوٹ دُور ہو جائے گی۔"

مَیں اُٹھ کر وہاں سے آموں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ دو چھابڑی والے پکوڑے بھی بیچ رہے تھے۔ مَیں نے ایک سے ایک آنے کے پکوڑے مانگے اور اُسے ایک روپیہ دے دیا۔ دکاندار نے ایک پیتل کی طشتری سے پیسے نکال کر گننا شروع کر دیے تو مَیں نے کہا "مجھے پیسوں کی بجائے ایک اٹھنّی اور باقی دوانیاں یا آنے دے دو۔" دوکاندار نے غور سے میری طرف دیکھا اور ایک اٹھنّی اور سات آنے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ مَیں نے تمام سکّے غور سے دیکھ کر اپنی جیب میں ڈال لیے اور ایک کاغذ میں لپٹے ہوئے گرم گرم پکوڑے کھا کر کچھ فاصلے پر ایک شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ پکوڑے بہت لذیذ تھے اور میری ضرورت سے بہت زیادہ تھے۔ ضرورت سے زائد جو بچ گئے تھے وُہ مَیں نے اُسی کاغذ میں لپیٹ لیے۔ کنویں پر جا کر پانی پیا اور واپس جا کر باقی پکوڑے عبدالمجید کے آگے رکھ دیے۔ اور اس کے بعد میلہ دیکھنے لگ گیا۔ یہاں میرے لیے پریشانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے لیے دھوپ میں مداریوں اور بازیگروں کے تماشوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ یہ ناشپاتی کا موسم تھا۔ اِس لیے کئی جگہوں پر دیسی ناشپاتیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور لوگ دھڑا دھڑ ایک پیسہ فی سیر خرید رہے تھے۔ میرے لیے سب سے پریشان کن مسئلہ یہ تھا کہ عبدالمجید اپنی اعلیٰ قسم کی ناشپاتیاں جنہیں وہ کشمیری ناشپاتیاں کہتا تھا ایک آنے فی سیر سے کم بیچنے پر تیار نہ تھا اور دوپہر تک اس کے ڈھیر کے حجم میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ خریدار آتے تھے اور جھگڑا کر کے چلے جاتے تھے۔ مَیں نے کہا "چچا عبدالمجید خدا کے لیے انہیں بیچو۔ جب میلہ ختم ہو جائے گا تو اِن کا کیا کرو گے؟"

عبدالمجید نے اطمینان سے جواب دیا "میاں جی یہ شہر میں بھی دو تین پیسے سیر بک جاتی

گی۔ مَیں انہیں سستی بیچنے کی بجائے واپس لے جاؤں گا اور کل انہیں شہر میں جا کر بیچوں گا۔"

اِس جواب سے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مَیں نے پانچ میل چلنے کے بعد ہی یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ کہ مجھے داداجان کی حکم عدولی کی سزا مل رہی ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں گھر پہنچتے ہی سب کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا اور داداجان سے معافی مانگوں گا۔ پھر میں یہ یقین لے کر آیا تھا کہ واپسی پر مجھے پیدل چلنے کی بجائے سواری کے لیے گھوڑی مل جائے گی۔ مَیں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ گھوڑی پر پھر ناشپاتیاں لدی ہوئی ہوں گی اور مجھے پیدل چلنا پڑے گا۔ مَیں نے اپنے گاؤں کے آدمی تلاش کیے اور انہیں سمجھایا کہ مجید چچا غلام نبی کی گھوڑی مار ڈالنے پر تُلا ہوا ہے۔ اس کا ارادہ ہے کہ پھر ناشپاتیوں کا بورا اُس پہ لاد دے اور گاؤں لے جائے۔ یہ کتنی بے وقوفی کی بات ہے کہ دوسرے لوگ ایک پیسے سیر بیچ رہے ہیں اور یہ ایک آنہ مانگتا ہے۔ دو پیسے لینے کے لیے بھی تیار نہیں اور چار پانچ آدمی اس کے گرد جمع ہو کر کہہ رہے تھے "یار تم عجیب پاگل ہو۔" اور وہ چلّا رہا تھا "دیکھو جی پاگل میں نہیں ہوں۔ پاگل یہ لوگ ہیں جو دیسی ناشپاتیوں اور کشمیری ناشپاتیوں میں تمیز نہیں کرتے۔"

ایک سِکھ نے کہا "بے وقوف یہ گل جائے گی۔"

"گل جائے گی تو میری گل جائے گی نا تمہیں اس سے کیا؟ یہ بے وقوف لوگ بھی تو مفت نہیں کھائیں گے۔"

عبدالمجید کو سمجھانے والے اپنا سا منہ لے کر پیچھے ہٹ گئے اور اُس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد پہلی بار یہ نعرہ لگایا "لے لو کشمیر کی جنت کا پھل تین پیسے سیر۔ ایک بار کھاؤ گے ساری عمر یاد کرو گے اور پھر دیسی ناشپاتی کو ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔ یہ ناشپاتی سیب کی بہن ہے۔"

کچھ گاہک اِس امید پر اس کے گرد جمع ہو گئے کہ شاید یہ اور نیچے آجائے۔

مَیں نے محسوس کیا کہ سورج بڑی تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔

جب عبدالمجید اپنے گاہکوں کے ساتھ سر کھپا رہا تھا تو میں نے بیری کے پیچھے جا کر اطمینان سے گھوڑی کو لگام دی۔ اس کا رسّہ کھول کر گردن سے لپیٹا اور اُسے بیری سے کچھ فاصلے پر باغ کی طرف لے گیا۔ وہاں ایک درخت سے شاخ توڑی پھر اطمینان سے گھوڑی پر سوار ہو گیا اور اسے ہانکتا ہوا واپس مجید کی طرف لے گیا آٹھ دس قدم کے فاصلے سے میں نے بلند آواز سے کہا۔ "چچا مجید السلام علیکم میں جا رہا ہوں۔"

مجید چلایا "میاں جی، خدا کے لیے ٹھہرو۔ میرا بیڑا غرق نہ کرو۔"

"چچا! اب رات ہونے والی ہے تم میرے ساتھ جانا چاہتے ہو تو جلدی سے کام ختم کرلو۔"

گاؤں کے دو آدمی یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک نے کہا "یوسف تم جاؤ۔ اس بے وقوف کا علاج یہی ہے۔"

مجید کسی توقف کے بغیر چلایا "جنت کا پھل لوٹ لو۔ دو دو پیسے۔ دو دو پیسے۔"

اور ہجوم اس پر ٹوٹ پڑا۔ جب یہ ڈھیر بہت چھوٹا سا ہو چکا تھا تو "لے لو۔ لے لو ایک ایک پیسے لے لو" کی آواز سنائی دی اور مجید کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ پیسے کون دیتا ہے اور ناشپاتی کون اُٹھاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ اُس کی مدد کر رہے تھے۔

میں اُس کے قریب آ گیا تو اُس نے اپنی چادر اُٹھا کر جھاڑتے ہوئے کہا۔ "یار! میں واقعی بے وقوف ہوں۔ یہ بات پہلے میری سمجھ میں کیوں نہیں آئی کہ لوگ دُگنی قیمت تو دے سکتے ہیں۔ چار گنا کبھی نہیں دیتے۔"

مَیں نے گھوڑی سے اُترتے ہوئے کہا "چچا یہ بورا گھوڑی کی پیٹھ پر ڈال دو۔ مَیں

تمہیں اپنے پیچھے بٹھا لوں گا۔"

ایک منٹ کے بعد ہم دونوں گھوڑی پر سوار ہو چکے تھے۔ ایک سکھ نے پیچھے سے آواز دی "میاں یوسف کمال کرتے ہو تم بھی۔ اس کی سزا کم از کم یہ تھی کہ یہ بورا سر پر اُٹھا کر گاؤں میں پہنچتا۔"

مَیں نے جواب دینے کی بجائے گھوڑی کو چھڑی مار دی۔

مجید نے کہا یہ گھوڑی بڑی مٹھی ہے۔ اگر میں تھک نہ گیا ہوتا تو پیدل چل کر جلدی گھر پہنچ گیا ہوتا۔"

میں نے جواب دیا "جب جانور بھوکا ہو اور اس کا رُخ گھر کی طرف ہو پھر رات بھی آ رہی ہو تو اس کی رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے۔"

اب گھوڑی مجید کی توقع کے خلاف بہت تیز چل رہی تھی لیکن اس کی چال ایسی تھی کہ ایک میل چلنے کے بعد مجید کے جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں:

"میاں جی۔ ایسا کرو کہ یہاں مجھے اتار دو ورنہ میں مَر جاؤں گا۔"

مَیں نے اُسے ایڑ لگائی۔ ایک دو چھڑیاں ماریں اور وہ بھاگنے لگی۔

رات ہو چکی تھی اور میں جس راستے آیا تھا مجھے قطعاً یاد نہیں تھا۔ تاہم گھوڑی کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ مجھے سیدھا گھر لے جائے گی۔ ایک جگہ گھوڑی نے ایک چھوٹی سی کھائی کے اُوپر سے چھلانگ لگائی اور مجید ایک طرف لڑھک گیا۔ اُس نے میری کمر میں مضبوطی سے ہاتھ ڈال رکھے تھے اور مَیں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو گرنے سے بچایا اور پوری قوت سے گھوڑی کی باگ کھینچ کر اُسے روکا۔ مجید نے چند قدم گھسٹنے کے بعد مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اور ہائے کہہ کر زمین پر گر پڑا۔

"چچا ٹھیک ہو نا؟" مَیں نے گھوڑی سے کودتے ہوئے پوچھا۔

"میاں جی میں ٹھیک ہوں۔ خدا کی قسم گاؤں میں چودھری غلام نبی بھی یہ بات

نہیں مانے گا کہ جب مجید کی جان پر بنی ہوتی ہو تو اس کی گھوڑی بھی ہرن کی طرح چھلانگیں مار سکتی ہے۔"

میں نے کہا "چچا بیٹھ جاؤ۔ اب ہم آہستہ چلیں گے۔"

"میری توبہ میں اس کے قریب بھی نہیں جاؤں گا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے وہ ناشپا بکوا دی تھیں ورنہ وہ کسی گڑھے میں پڑی ہوتیں۔ میاں یوسف خدا کے لیے تم جلد سے جلد گھر پہنچو لیکن وہاں یہ نہ کہہ دینا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"

میں جب گھوڑی کو سرپٹ دوڑاتا ہوا گاؤں میں داخل ہُوا تو وہاں بچے بوڑھے، مرد اور عورتیں میرا انتظار کر رہے تھے۔ دادا جان مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں سیدھا اُن کے پاس پہنچا۔ اور اُن کے قریب دو زانو ہو کر سر جھکاتے ہوئے کہا "دادا جان! میرے منہ پر ایک اور چپت مار دیجئے اور مجھے معاف کر دیجئے۔"

دادا جان نے پیار سے دونوں ہاتھ میرے سر پر رکھ دیے۔ "بیٹا۔ مجھے معلوم ہے کہ میری چپت سے تمہیں بہت تکلیف ہوئی تھی۔ یہ سراسر میری غلطی تھی، ورنہ تم کبھی گھر سے نہ نکلتے۔ اب میں اپنے خاندان کو یہ نصیحت کر کے جاؤں گا کہ کوئی تمہاری دلآزاری نہ کرے۔ دیکھو مجھ سے زیادہ تمہاری امی اور دادی کو تکلیف ہوئی ہے۔ اُن کے پاس جاؤ میں نفل پڑھ کر گھر آؤں گا۔ اور اگر تم سو نہ گئے تو ہم بہت سی باتیں کریں گے۔"

اُس رات میں دیر تک باتیں کرنے کے بعد دادا جان کے ساتھ ہی سو گیا اور اُس کے بعد جب تک وہ زندہ رہے مَیں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ اُن کی ایک چپت کھانے کے بعد میں یکایک اُن کے دِل سے اِتنا قریب ہو گیا یا ہمارے درمیان ایک ایسا رشتہ استوار ہو گیا جو اُس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

ہائی سکول کے ابتدائی دِنوں میں مجھے جن لوگوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اُن میں سے ایک

بہادر سنگھ تھا۔ قد و قامت میں وہ عام آدمیوں کے لگ بھگ معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ابھی تک چھٹی جماعت میں تھا اور فیل ہونے کی وجہ سے سکول کے معاملات کا کافی تجربہ رکھتا تھا وہ نئے لڑکوں سے بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔

مجھے اپنی عمر کے لحاظ سے بلند قامت لڑکوں میں شمار کیا جاتا تھا، لیکن بہادر سنگھ جو مجھ سے عمر میں پانچ چھ سال بڑا تھا۔ قد میں چار انچ زیادہ تھا۔ اس کے اُوپر کے دانت ذرا لمبے تھے اور ہنستے ہوئے اتنے نمایاں ہو جاتے تھے کہ اُسے اپنے ہاتھ کی انگلی کی مدد سے بار بار اُوپر کا ہونٹ نیچے لانا پڑتا تھا۔ اپنے دانتوں کی بدولت وہ ہر حالت میں مسکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ اُس نے پرائمری تعلیم کوئی پانچ میل دُور بڑی نہر کے کنارے ایک گاؤں میں حاصل کی تھی۔ اُس کے باپ کی حویلی گاؤں سے کوئی تین فرلانگ باہر تھی۔

سات سال کی عمر تک اُس کی تمام دلچسپیاں اپنے مویشی چرانے اور اُن کی دیکھ بھال کرنے تک محدود تھیں۔ اُس کے گھر میں دو بھینسیں، دو گائیں تھیں۔ جن کے باعث دودھ اور گھی کی کوئی کمی نہ تھی۔ اِس کے باوجود جب اُس نے دوسرے گاؤں کے کسی کسان کے گھر کی خوب صورت بکریاں پسند کیں۔ تو اُس کا باپ دو چار ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد اُسے ساتھ لے گیا اور وہاں سے بکری کے دو بچے خرید لایا۔ اُس کے گھر میں کتوں کا ایک جوڑا بھی تھا۔ جنہیں سارا دن بند رکھا جاتا تھا اور رات کے وقت چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ کتے اتنے خونخوار تھے کہ رات کے وقت کوئی اُن کی حویلی کے قریب سے نہیں گزرتا تھا۔

بہادر سنگھ کے گھر میں ایک گھوڑی تھی۔ جس کی ایک سال کی بچھیری سے اسے بہت پیار تھا۔ جب کبھی وہ حویلی سے باہر نکل جاتی تھی تو بہادر سنگھ کے سوا کوئی اسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ چھ سال کی عمر میں بہادر سنگھ اس بات پر خوش تھا کہ اگلے سال وہ اپنی بچھیری پر سواری کیا کرے گا۔ لیکن ساتویں سال یکایک ایک دِن اُس کے باپ نے یہ فیصلہ سنایا ______ "بیٹا بہادر سنگھ میں نے ماسٹر جی سے بات کر لی ہے۔ تم کل سکول

میں داخل ہو جاؤ گے۔ پنڈت اُوم پرکاش کہتے تھے کہ بہادر سنگھ کے قد کاٹھ کے لڑکے کو تعلیم حاصل کر کے تھانے دار بننا چاہیے۔ کل میں تمہیں سکول لے جاؤں گا۔ اور پنڈت جی کے سپرد کر دوں گا۔ کچھ پڑھ لو گے اور ان کا حکم مانو گے تو کسی دن بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ ورنہ ساری عمر میری طرح ہل چلاتے رہو گے ——

میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ ہمارا گھر گاؤں سے باہر ہے۔ یہاں تمہاری چھوٹی سی بہن کے سوا تمہارے ساتھ کھیلنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ سکول میں تم بہت سے بچوں کے ساتھ خوش رہا کرو گے۔ میں نے زمینداری کے کام کے لیے ایسر عیسائی سے بات کر لی ہے۔ اُس کو فصل میں سے بیس من دانے دینے پڑیں گے۔ اُس کا لڑکا بھی ہمارے پاس کام کرے گا۔ اناج کے علاوہ ایک کھیت میں نے اُن کو کاشت کے لیے دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

بہادر سنگھ نے بدحواس ہو کر کہا "باپو میں اپنے گھر رہنا چاہتا ہوں۔ میں سکول نہیں جانا چاہتا۔ میری بھیڑی کا کیا ہو گا؟ میری بکریاں کہاں جائیں گی؟ اور گائے کی بچھیا کون سنبھالے گا؟"

"بیٹا جب تم سکول سے چھٹی کے بعد گھر واپس آیا کرو گے تو تمہیں اپنے جانوروں سے پیار کے لیے کافی وقت مل جایا کرے گا۔ اور ایسر کا لڑکا بھی کافی ہوشیار ہے۔ وہ تمہارے جانوروں کی بہت حفاظت کرے گا۔ تمہاری ماں اور بہن بھی تو تمہارے جانوروں سے بہت پیار کرتی ہیں —— "بیٹا میں تمہارے فائدے کی سوچ رہا ہوں —— تم نے کبھی سکول جا کر دیکھا ہے کہ بچے وہاں کتنے خوش ہوتے ہیں؟"

"پتا جی میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ میں بہت ڈرتا ہوں اور سکول سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔ انسان ایک جگہ بند ہو کر کیسے بیٹھ سکتا ہے؟"

"بیٹا جب سکول میں دِل لگ جائے گا تو تم گھر آنے کا نام نہیں لیا کرو گے۔ پنڈت اوم پرکاش بڑا اچھا اُستاد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے دو شاگرد تھانیدار تین فوج میں جمعدار اور چار پٹواری بن چکے ہیں۔ دس سے زیادہ کارخانے میں کلرک ہیں۔ بیٹا اگر تم حوالدار بن جاؤ گے تو میں اِس گاؤں میں اپنے آپ کو بادشاہ سمجھوں گا۔ تم نے اپنے اُستاد کا ہر حکم ماننا ہے۔ اگر وہ کہے کہ کنوئیں میں چھلانگ لگا دو تو بھی تمہیں یہی سمجھنا چاہیے کہ تمہارا اس میں ہی فائدہ ہو گا۔ اُداسی تو مجھے بھی بہت ہو گی۔ لیکن زندگی میں ایسی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ پرائمری کرنے کے بعد تم ہائی سکول جاؤ گے اور اُس کے بعد میں نے سنا ہے کہ اُس سے بھی بڑے سکول ہوتے ہیں جنہیں کالج کہا جاتا ہے۔"

بہادر سنگھ نے عاجز آ کر کہا "باپو جی میں تمام عمر پڑھتا ہی رہوں گا؟"

"بیٹا کُل دس سال کی تو بات ہے کہ تم دسویں جماعت پاس کر لو گے۔ اس کے بعد تمہیں اچھی نوکری مل جائے گی۔ اور اگر تم چار اور جماعتیں پڑھ لو گے تو بڑے صاحب بن جاؤ گے۔"

———— ○ ————

اگلے دِن بہادر سنگھ اپنے باپ کے ساتھ سکول گیا تو ایسر اُن کے ساتھ گھی کا ایک چھوٹا سا ٹین اُٹھائے ہوئے تھا۔ پنڈت اُوم پرکاش نے بہادر سنگھ کا قد و قامت دیکھ کر پریشانی کا اظہار کیا۔ لیکن گھی کا ٹین دیکھ کر اُن کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ بہادر سنگھ کے باپ سورن سنگھ نے پنڈت جی کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "مہاراج بہادر سنگھ میرا بچہ ہے لیکن اِسے انسان بنانا آپ کا کام ہے۔ اور اگر آپ اس کی چمڑی ادھیڑ ڈالیں تو بھی مجھے اعتراض نہیں ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ انسان بڑی مشکل سے بنتے ہیں۔"

پنڈت جی نے کہا "سردار جی آپ فکر نہ کریں اگر یہ میرا کہا مانتا رہا۔ تو کسی دن بہت

بڑا آدمی بن جائے گا۔"

"جناب جس دن یہ آپ کا کہا نہیں مانے گا تو اُس دن اِس کی مرمت کیا کروں گا۔

کیوں بہادر سنگھ تم یہ وعدہ کرتے ہو کہ پنڈت جی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دو گے۔"

"جی نہیں بالکل نہیں۔"

"اچھا سردار جی اب آپ جائیں اور اِس لڑکے کے متعلق بے فکر رہیں۔"

سورن سنگھ سکول کے احاطہ سے باہر نکلا تو اُسے پٹواری دکھائی دیا اور اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا

پٹواری نے پوچھا۔" سردار جی آج آپ اِدھر کیسے آ گئے ہیں؟"

"پٹواری جی آپ سب کہا کرتے تھے کہ بہادر سنگھ کو سکول بھیجو۔ آج مَیں نے آپ کا کہا مان لیا ہے۔"

پٹواری نے کہا۔" بہت اچھا کیا آپ نے، یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔"

پھر وہ باتیں کرتے ہوئے پاس ہی برگد کے درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھ گئے۔

اُدھر سکول کے اندر بہادر سنگھ کے تعلیمی دَور کا پہلا مرحلہ شروع ہو چکا تھا ــــ

پنڈت اُوم پرکاش نے پوچھا۔

"بہادر سنگھ تم بتاؤ کہ یہاں کیوں آئے ہو؟"

"جی مجھے باپو جی نے حکم دیا تھا۔"

"بھئی میرا مطلب ہے کہ یہاں تم کیا کرو گے؟"

"جی جو آپ کہیں گے۔"

"اچھا اگر میں یہ کہوں کہ بھاگ کر نہر میں چھلانگ لگا دو تو؟

"جناب اگر آپ یہ کہیں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی۔ میں ہر روز نہر میں چھلانگیں لگایا کرتا ہوں۔"

"اچھا بہادر سنگھ تم کان پکڑ کر دکھاؤ۔"

"جی کان پکڑ کر؟"

"ہاں۔"

بہادر سنگھ نے غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھا اور سر نیچے کر لیا اور ہاتھ کی انگلی سے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بے وقوف کس بات پر ہنس رہے ہو! تمہیں معلوم ہے کہ یہاں حکم نہ ماننے کی سزا ملتی ہے۔"

"ہاں جی یہ مجھے پتا جی نے بتایا تھا۔"

"اچھا تو پکڑو کان۔"

بہادر سنگھ نے غور سے پنڈت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔" جناب اسی طرح؟"

"بے وقوف اور کس طرح ــ میری طرف اُلو کی طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟"

جناب میرا مطلب ہے کہ اِسی طرح بیٹھے بیٹھے کان پکڑ وائیں گے؟

عجیب گدھے ہو تم، تمہارا مطلب ہے میں تمہارے سامنے کھڑا ہو کر ناچوں؟ جلدی کرو۔"

بہادر سنگھ نے اپنی قمیض سے ہاتھ صاف کیئے ایک بار پھر پنڈت کی طرف دیکھا اور پھر اچانک گھٹنوں کے بَل ہو کر پنڈت جی کے دونوں کان پکڑ لیے۔ اُس کی انگلیوں کی گرفت اِتنی مضبوط تھی کہ پنڈت جی کرب کی حالت میں چلّا اُٹھے۔

"بھئی اس پاگل کو ہٹاؤ۔"

"ایک لڑکے نے بھاگ کر اُس کے باپ کو آواز دی۔ پنڈت جی بے بسی کی حالت میں تھے کہ بہادر سنگھ نے کہا۔" ماسٹر جی اگر اجازت ہو تو چھوڑ دوں؟"

پنڈت جی خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اُس کا باپ بھاگتا ہوا اندر آیا اور چلّایا۔

"بہادر سنگھ یہ کیا کر رہے ہو؟"

"پتا جی اِنہوں نے مجھے کان سے پکڑنے کا حکم دیا تھا" بہادر سنگھ نے گھبرا کر کان چھوڑ دیتے۔

پنڈت اُدم پرکاش چند ثانیے سر پکڑ کر بیٹھا رہا اور پھر وہ سورن سنگھ پر برس پڑا۔

"اس پاگل کو تم کہاں سے لے آئے تھے میرے پاس؟"

پنڈت جی پہلے میری بات سُنیئے۔ اگر اِسے آپ نے کان پکڑنے کا حکم دیا تھا تو یہ بالکل بے قصور ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں ہے کہ سکول میں اپنے کان پکڑے جاتے ہیں۔ یہ گھر میں بھاگنے والی بکریوں کو یا اپنی بچھیا کو کان سے پکڑ کر روک لیتا ہے اور اس کام میں اتنا ہوشیار ہے کہ جب گائے کا کان پکڑ لیتا ہے تو بھی اُسے بھاگنے نہیں دیتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ میں گائے یا بچھیا ہوں؟"

"نہیں پنڈت جی اِسے کانوں سے غلطی لگی تھی۔ اگر آپ اِسے سمجھا دیتے کہ کان کس طرح پکڑے جاتے ہیں تو یہ کبھی اس طرح نہ کرتا۔ یہ بیچارا کبھی سکول نہیں آیا۔ آپ جوتے ماریں لیکن اِسے معاف کر دیجئے۔ میں بھی آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ میرے سکول سے نکلتے ہی اسے کان پکڑنے کا حکم دیں گے اور یہ اپنے کان پکڑنے کے بجائے آپ کے کان پکڑ لے گا۔ پہلے آپ اسے کان پکڑنا سکھا دیں۔ پھر اگر اس نے حکم عدولی کی تو میں اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

پنڈت جی نے ایک لڑکے کو آواز دی۔

"او پیارے لال اِدھر آؤ۔ اِس بے وقوف کو کان پکڑ کر دکھاؤ۔"

پیارے لال نے جھٹ اپنے کان پکڑ لیے۔ اس کے بعد پنڈت جی نے بہادر سنگھ سے کہا۔

"اب تم اِسی طرح ٹانگوں کے نیچے سے ہاتھ گزار کر کان پکڑو اور جب تک میں

چھوڑنے کے لیے نہ کہوں اُس وقت تک پکڑے رکھو۔"

سورن سنگھ نے کہا "پنڈت جی یہ اگر مر بھی جائے تو آپ کے حکم کے بغیر کان نہیں چھوڑے گا۔"

یہ پہلا تجربہ بہادر سنگھ کے لیے کافی تکلیف دہ تھا۔ لیکن اُس نے آدھ گھنٹہ انتہائی سکون کے ساتھ یہ تکلیف برداشت کی۔ پنڈت جی نے پوچھا

"کیوں نالائق۔ اب پتہ چلا کہ کان کیسے پکڑے جاتے ہیں؟"

بہادر سنگھ نے مُرجھائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"جی جناب مجھے پتہ چل گیا ہے۔"

"اچھا چھوڑ دو اور سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔"

بہادر سنگھ نے کان چھوڑ کر بڑی مشکل سے اپنی کمر سیدھی کی تو پنڈت جی نے کہا۔

"چونکہ تم نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی تھی۔ اس لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ اب جاؤ۔ آج تمہیں چھٹی ہے۔ لیکن گھر جانے سے پہلے وہاں دکان سے قاعدہ تختی، قلم، دوات خرید لو۔"

—o—

یہ واقعہ بہادر سنگھ کے گاؤں کے لڑکوں میں ہی نہیں بلکہ آس پاس کے دیہات کے لڑکوں نے بھی مشہور کرنے میں کافی دل چسپی لی تھی۔ اِس کے باوجود مجھے ایسی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ جب بہادر سنگھ سے پوچھا جاتا تھا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنس دیا کرتا تھا۔ اُسے کسی بات کی تردید کرنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن ایک واقعہ اُس سال پیش آیا جب میں چھٹی جماعت میں بہادر سنگھ سے جا ملا تھا۔ ماسٹر جگن ناتھ بہت سے معاملات میں بہادر سنگھ کی ضد تھے۔ بہادر سنگھ جس قدر لمبا تھا وہ اسی قدر

چھوٹے نظر آتے تھے۔ جگن ناتھ کے سر کے پیچھے کے بال بہت چھوٹے تھے لیکن اگلے حصے کے بال اتنے لمبے تھے کہ جب وہ بکھرتے تھے تو ہونٹوں تک ان کا منہ چھپ جاتا تھا۔ بہادر سنگھ اس بات پر بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کیا کرتا تھا۔ ایک دن آخری ہفتہ اتوار کی چھٹیاں گزارنے کے بعد بہادر سنگھ سکول آیا تو اُس نے سکول کا کام نہیں کیا ہوا تھا۔ ویسے بھی بہادر سنگھ کی عادت تھی کہ گھر جاکر سکول کے کام کو بہت کم ہاتھ لگاتا تھا۔ اِس دفعہ کام نہ کرنے والوں کو چار چار بید مارے گئے۔ بہادر سنگھ کی باری آئی تو ماسٹر جگن ناتھ نے اِتنے غصے کی حالت میں بید بلند کیا تو اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا بید ڈیسک پر لگا اور اِس کے ساتھ ہی سَر کی جنبش کے باعث ماسٹر جگن ناتھ کے بال ماتھے پہ بکھر گئے۔ ماسٹر جی نے بید والے ہاتھ سے اپنے سر کے بکھرے ہوئے بال ٹھیک کیئے اور دوبارہ زیادہ زور سے بید مارنے کی کوشش کی لیکن بہادر سنگھ نے پہلے سے زیادہ پھرتی سے ہاتھ پیچھے کر لیا اور ماسٹر جی آپے سے باہر ہو گئے۔ اُن کی تیسری کوشش یہ تھی کہ بہادر سنگھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ کے اُوپر رکھ لیا اور بید مارنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اگر اب تم نے ہاتھ پیچھے کیا تو چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ لیکن بہادر سنگھ اس مرتبہ بھی ہاتھ پیچھے کرنے سے نہ رہ سکا۔ بید پھر ڈیسک پر لگا اور ساری کلاس ہنس پڑی۔ ماسٹر جگن ناتھ نے ہانپتے کانپتے اپنے بال ٹھیک کیے پھر مضبوطی سے بہادر سنگھ کے دائیں ہاتھ کی کلائی اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور ایڑیاں اُٹھا کر پوری قوت سے بید مارا۔ بہادر سنگھ نے عین وقت پر اپنا ہاتھ کھینچ لیا او بید ماسٹر صاحب کی کلائی پر لگا اور انہوں نے درد سے کراہتے ہوئے "تیرا بیڑا غرق" کہہ کر اپنی کلائی پکڑ لی۔ ماسٹر جگن ناتھ غصے کی حالت میں کانپتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے اور سیدھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ ہیڈ ماسٹر نے اُن کی کلائی سے رِستا ہوا خون دیکھا تو پوچھا

"اُوہو ایسا زخم آپ کو کیسے آیا؟"

"جناب یہاں بید لگ گیا تھا۔"

"کس نے مارا آپ کو بید سے؟"

"جی میرا اپنا بید لگ گیا تھا۔ وہ بدمعاش جو بہادر سنگھ ہے نا جی۔ اُس سے میں بہت تنگ آ گیا ہوں۔ اُس کا کوئی بندوبست کریں ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اطمینان سے جواب دیا "اِس وقت آپ کو خودکشی کی نہیں بلکہ ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ آپ فوراً ہسپتال جائیں اور اس کی مرہم پٹی کروائیں۔ اگر بہادر سنگھ نے کوئی شرارت کی ہے تو اُسے اِس کی پوری سزا دی جائے گی، لیکن آپ اپنے زخم کے علاج کی فکر کریں۔"

اِس عرصے میں سائنس ماسٹر کمرے میں آ گیا اور اُس نے ماسٹر جگن ناتھ کی کلائی دیکھتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا۔

"سر ان کو چوٹ کی وجہ سے زیادہ تکلیف ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس پر سپرٹ لگا دی جاتے تو درد کم ہو جائے گا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "تو پھر جلدی کیجیے اور سپرٹ لگا کر انھیں ہسپتال لے جائیے۔"

سائنس ماسٹر انھیں لیبارٹری میں لے گیا اور وہاں رُوئی کا پھاہا سپرٹ میں تر کر کے اُن کی کلائی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"ماسٹر جی صرف ایک منٹ تکلیف ہو گی پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور ماسٹر جگن ناتھ کی یہ حالت تھی کہ جو غصہ اُسے بہادر سنگھ پر آیا تھا اسی قدر سائنس ماسٹر پر آ رہا تھا۔ اُس نے پھاہا اتارنے کی کوشش کی لیکن سائنس ماسٹر نے اُس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ چلاّ رہا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

ایک گھنٹہ بعد ماسٹر جگن ناتھ ہسپتال سے پٹی کروا کر واپس آیا تو اُسے پتہ چلا کہ

ہیڈ ماسٹر صاحب خود کلاس روم میں جا کر اس معاملے کی تحقیقات کر چکے ہیں اور انہوں نے
بہادر سنگھ کو کچھ نہیں کہا۔ لڑکوں نے جو کچھ بتایا تھا اُس سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو جگن ناتھ
کی بجائے بہادر سنگھ سے کچھ ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم ماسٹر جی کی دلجوئی کے لیے بہادر سنگھ
دوسرے سیکشن میں بھیج دیا گیا تھا۔

باب ۔ ۱۸

گاؤں کے گرد پھلدار درختوں کے باغوں کے علاوہ کئی دوسرے درخت پھیلے ہوتے
تھے۔ جن پر مختلف اقسام کے پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ بعض پرندے خاص خاص موسم
میں آیا کرتے تھے اور پھر موسم کی تبدیلی کے ساتھ فصل کے کھیتوں اور درختوں میں غائب ہو جاتے
تھے۔ اُن کی آمد اور واپسی کے ایام میں اُن کے غول بڑی توجہ سے دیکھے جاتے تھے۔

گاؤں کی آبادی میں ایک عنصر ایسا بھی تھا جس کی آمد و رفت کے ساتھ کبھی کسی کو کوئی
دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ عنصر شہد کی بڑی مکھیاں تھیں جنھیں پنجابی زبان میں ڈومنا کہا جاتا ہے۔
شہد کی عام مکھیوں اور ڈومنے میں فرق یہ تھا کہ عام مکھی جب کسی درخت یا جھاڑی کے ساتھ
چھتہ لگاتی تھی تو لوگ بہت خوش ہوتے تھے اور کچھ عرصہ بعد جب وہ اطمینان سے شہد اُتار
لیتے تھے تو مکھیاں کہیں اور چلی جاتی تھیں۔

گاؤں میں دو چار آدمی ایسے ہوتے تھے جو چھوٹی مکھی کا شہد نکال کر بیچا کرتے تھے
لیکن بڑی مکھی ڈومنا کی بات اور تھی۔ اُس سے شہد حاصل کرنا جان جوکھوں کا کام تھا اور جو شہد حاصل
کرنا چاہتے تھے ایک مستقل دشمن سے نجات حاصل کرنے کے لیے ان کی آؤ بھگت کرتے تھے اور
وہ نصف سے زیادہ شہد بھی لے جاتے تھے اور یہ بلاوجہ نہیں تھا۔ بڑی مکھی کسی درخت کے ساتھ
گھر بنا لیتی تھی تو آس پاس کے رہنے والوں کو اپنی سلامتی کے لیے اس بات کا خیال رکھنا پڑتا تھا۔
کہ کوئی بڑی مکھی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ کیونکہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنا ایک خطرناک دشمن کو بھرپور

حملے کی دعوت دینے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں بڑی نسل کی مکھیوں کا ایک طاقتور قبیلہ مستقل طور پر موجود رہتا تھا۔ جو کبھی اپنے پرانے گھر سے اچانک غائب ہو جاتا اور پھر اچانک یہ دیکھا جاتا کہ کسی دوسری جگہ اس نے ایک نئے چھتے کی تیاری کے کام کی ابتدا کر لی ہے۔

ایک سال انہیں گاؤں کی مسجد کا مینارہ پسند آگیا۔ اور امام مسجد مولوی عبداللہ بہت فکرمند رہتے تھے کہ یہ مکھیاں اذان سن کر اُن پر حملہ نہ کر دیں۔ چنانچہ وہ اپنا کھیس اپنے پاس رکھتے تھے تاکہ بوقتِ ضرورت کام آسکے۔ دوسرے سال ڈومنے کو پاس ہی پیپل کا ایک درخت پسند آگیا، ایک سال اُس نے جامن کے اُس درخت پر قبضہ کر لیا تھا جس کا پھل باقی درختوں سے زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ لوگ یہ بہت سوچا کرتے تھے کہ جب بارشیں شروع ہوں گی اور جامن پکنے کا موسم آئے گا تو ڈومنا خود بخود کہیں چلا جائے گا لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی اور اُسے یہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ سردیوں کے آغاز تک وہیں رہا۔ پھر ایک دن اچانک اُسے سوجھی کہ چوہدری غلام نبی کے باغیچے کے گرد گھرنے کی باڑ[1] کے اندر چھتہ لگا لیا۔

گاؤں سے دو اطراف کو جانے والے راستے اس باڑ کے قریب آکر گذرتے تھے اِس لیے اِس چھتے کی حفاظت گاؤں کی سلامتی کے لیے اہم مسئلہ بن گئی۔ ایک دن مولوی محمد عبداللہ وہاں سے گذرے اور انہوں نے چھتہ دیکھ کر کہا "چوہدری غلام نبی ! ان مکھیوں سے بچ کر رہنا، بڑی ظالم ہوتی ہیں۔ مَیں نے ایک میلے میں انہیں تباہی مچاتے دیکھا تھا۔ ابھی تو سردیوں میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ اُونچے درخت چھوڑ کر ان جھاڑیوں میں چھتہ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سال سردیاں بہت پڑیں گی، بارشیں خوب ہوں گی

اللہ تعالیٰ نے ہر جاندار کو اپنے بچاؤ کے لیے عقل دی ہے

---

[1] ایک کانٹے دار جھاڑی جسے پھل بھی لگتا ہے۔ جو بچے شوق سے کھاتے ہیں۔

لیکن جب گرمیاں آئیں گی تو یہ مکھیاں بہت خطرناک بن جائیں گی۔ خدا کرے اس سے پہلے پہلے انہیں اپنا گھر تبدیل کرنے کا خیال آجائے۔

چودھری غلام نبی نے کہا۔ "مولوی جی ! اِن کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ جن لوگوں کو یہ علم ہو چکا ہے کہ یہاں ڈومنا لگا ہوا ہے۔ وہ دُور سے ہی راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ دیکھئے ساتھ والے کھیت میں کتنی پگڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں۔ کل صوبہ سنگھ دہائی دے رہا تھا کہ یہ مکھیاں میرا کھیت برباد کر دیں گی۔ جانکی داس نے اسے سمجھایا تھا کہ شہد کی مکھیوں کو سردیوں میں چھیڑنا پاپ ہے۔ جب گرمیاں آئیں گی تو مَیں تمہیں ایک چیز دوں گا وُہ چھتے کے نیچے سلگا دینا تم دیکھو گے کہ مکھیاں کوسوں دُور چلی جائیں گی۔ مولوی محمد عبداللہ نے کہا۔ "یار وہ جانکی داس پاگل ہے:

دھواں سلگانے کے لیے ان جھاڑیوں میں سے اُن کے چھتے کے نیچے کون جاسکتا ہے ؟"

"مولوی جی ! سردیوں میں تو ان مکھیوں سے کوئی خطرہ نہیں اور اس کے بعد یہ خود ہی کسی اُونچے درخت پر چلی جائیں گی۔ ورنہ انہیں کسی نہ کسی طرح اڑا دیا جائے۔ جانکی داس کہتا تھا میں انہیں اڑانے کے کئی طریقے جانتا ہوں ۔شہد نکالنے سے پہلے انہیں اڑا دینا بے وقوفی ہے۔ سائیں بڈھے شاہ کہتا تھا کہ شہد نکالنے کے لیے میں اپنے ایک مرید کو بلا لوں گا۔"



مارچ کے آخری دن تھے۔ گاؤں سے باہر حدِ نگاہ تک گندم کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ ہوا خوشگوار تھی۔ سائیں بڈھے شاہ اور اللہ رکھا صبح کے وقت گھر سے نکلے تو اللہ رکھا جو تھوڑی دیر پہلے چوہدری غلام نبی کی حویلی سے گنے کا تازہ رس پی کر آیا تھا۔ اس کے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ جانکی داس کے ڈیرے کے قریب سے گذرا تو حسبِ معمول وہ سر کے بل کھڑا تھا۔ سائیں بڈھے شاہ نے کہا۔ "کیسا بے وقوف معلوم ہوتا ہے یہ"۔

سائیں جی یہ روز اسی طرح کرتا ہے۔ ابھی جب میں پہلے یہاں سے گذرا تھا تو یہ ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ "دوسری ٹانگ کہاں گئی تھی ؟" بڈھے شاہ نے پوچھا۔

" جناب دوسری ٹانگ بھی ساتھ ہی تھی، لیکن وہ اُس نے اُوپر اٹھا رکھی تھی۔ سائیں نے کہا۔ "وہ میں بھی اٹھا سکتا ہوں"

" جناب! سب ٹانگ اٹھا سکتے ہیں اور سر کے بل بھی سب ہی کھڑے ہو سکتے ہیں صرف لوگوں کے سامنے ایسا کرنا بے وقوفوں کا طریقہ ہے"

جانکی داس وہیں سے چلایا " او اللہ رکھے کے بچے کیا بک رہے ہو؟"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا "بھئی جانکی داس غصہ نہ کرنا۔ اللہ رکھے کو یہ معلوم نہیں تھا کہ تم سر کے بل کھڑے ہو کر سن بھی سکتے ہو۔

میں غلام نبی کے رہٹ پر جا رہا ہوں تم بھی آجاؤ۔ وہاں کھلی جگہ بیٹھ کر خوب باتیں کریں گے۔ تمہیں گنے بھی بہت اچھے ملیں گے"۔

جانکی داس نے بازوؤں پر وزن ڈال کر سر آگے کرتے ہوئے کہا۔

" ساجن! اس ورزش سے کان بھی تیز ہوتے ہیں اور آنکھیں بھی روشن ہو جاتی ہیں اور عقل بھی بڑھتی ہے" "صرف الٹا کھڑا ہونے سے"! سائیں بڈھے شاہ نے طنز کرتے ہوئے کہا

"یہ ہنسنے کی بات نہیں ساجن!

عمر بھی بڑھتی ہے" ——— یہاں تک کہہ کر جانکی داس پاؤں کے بل کھڑا ہو گیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ساجن! حیران کس بات پر ہو۔ اگلے سال میری عمر پچاس سال ہو جائے گی تو میں یہ لٹیں کٹوا دوں گا"

"کسی پہچان والے کو بلا کر دکھا دینا! وہ ان کی لمبائی دیکھ کر بتا دے گا۔ کہ میری عمر کتنی ہے؟ اس کے باوجود میرا ایک بال سفید نہیں ہوا۔ دانت مضبوط ہیں۔ اگر آزمانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ بھاگ کر دیکھ لو۔ کسی درخت پر چڑھ کر آزما دیکھو۔ ورنہ بڑی نہر یا دریا میں میرے ساتھ تیر کر دیکھ لو۔ سردیوں میں صرف راکھ مل لینے سے مجھے کوئی کپڑا پہننے کی ضرورت نہیں

محسوس ہوتی"

اللہ رکھا نے کہا" اگر تم پچاس کے ہونے والے ہو تو مجھ سے بارہ تیرہ سال بڑے ہو گے لیکن یہ عقل کیسے مان سکتی ہے کہ صرف الٹا کھڑا ہونے سے انسان اِتنا کچھ حاصل کر لیتا ہے؟"

"ساجن! صرف اُلٹا کھڑا ہونے سے نہیں! اس کے لیے کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ ہم سنیاسی لوگ ہیں اور جنگل کی بوٹیوں سے ہماری دوستی ہے۔ اُلٹا کھڑا ہونے کے علاوہ ہم کئی اور ورزشیں بھی کرتے ہیں اور ہر ورزش سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ اُس کے ساتھ کوئی خاص بوٹی استعمال میں لائی جائے"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا" یار کچھ ایسی باتیں ہمیں بھی بتا دو۔ آخر ہم تمہارے پڑوسی ہیں"

جانکی داس نے کہا۔ "ساجن! یہ دنیا ایک بازار ہے یہاں نقد سودا ہوتا ہے۔ کچھ لینے کے لیے کچھ دینا پڑتا ہے۔ باتوں سے کام نہیں چلتا"

سائیں بڈھے شاہ کو پہلی بار اپنے پڑوسی کی اہمیت کا احساس ہوا۔ اُس نے کہا۔

"یار! آج تک جو کام تم نے کہا ہے کیا وہ ہم نے نہیں کیا؟"

"ساجن! آپ نے ہم سے کوئی چیز مانگی ہے۔ جو میں نے نہیں دی؟ اگر آج سے ہم ایک دوسرے کے کام آنے میں اپنا فائدہ سمجھ لیں تو پھر جو میرا ہے وہ آپ کا ہے۔ جو آپ کا ہو گا وہ میرا ہو گا۔ جب میں کسی بوٹی کی تلاش میں نکلا کروں گا تو آپ کو ساتھ لے لیا کروں گا۔ اور جب کوئی آپ سے جن اور بھوت نکلوانے آیا کرے تو مجھے بلوا لیا کریں"

سائیں بڈھے شاہ نے کہا" بلانے کی کیا ضرورت ہے تم ہر وقت میرے پاس آسکتے ہو۔ اب میں کچھ گھومنے پھرنے کے بعد چوہدری غلام نبی کے رہٹ پر جاؤں گا۔ تم

بھی وہاں آجاؤ۔ وہاں کھلی جگہ بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے"۔

"سائیں جی میں بھوجن کرتے ہی وہاں آجاؤں گا"۔ جانکی داس نے کہا۔

وہاں سے چلتے ہوئے اللہ رکھا نے کہا۔ "سائیں جی آپ تازہ رس نہیں پئیں گے؟"

"اگر چوہدری غلام نبی کا بیلنا چل رہا ہو تو میں رس بھی پیوں گا اور یار تھوڑا سا گرم گڑ بھی لے آنا!"

"اس وقت میں گنے چوسنا چاہتا ہوں"۔

—— ○ ——

تھوڑی دیر بعد سائیں بڈھے شاہ ایک کھلی جگہ رہٹ کے چھوٹے سے حوض کے قریب بیٹھا ہوا تھا جس کے اندر رہٹ سے نکلنے والے پانی کی دھار گر رہی تھی۔ اُس کے نیچے پرالی بچھی ہوئی تھی جو اُسے ہر بچھونے سے زیادہ آرام دہ محسوس ہوتی تھی۔

غلام نبی نے سائیں کو دیکھتے ہی کہا۔

"آؤ سائیں جی! تشریف لاؤ۔ آج تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ عید کا دن ہے۔ یہ بتایئے کہ آپ کو کیا کھلایا جائے؟"

سائیں نے کہا۔ چوہدری جی بات یہ ہے کہ آپ کے گھر کی دال بھی دوسروں کی مُرغی سے زیادہ لذیذ ہوتی ہے۔ جب میں یہاں سے کوئی چیز کھا کر جاتا ہوں تو مدّت تک کسی کے ہاں کھانے کا لطف نہیں آتا"۔

اپنے گھر کے کھانے کی تعریف سُننا چوہدری غلام نبی کی شخصیت کا ایک کمزور پہلو تھا۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ آج خاص طور پہ کیا کھانا پسند کرو گے۔ یہاں ہوا بہت اچھی ہے۔ آپ کا اور اللہ رکھا کا کھانا یہیں پکایا جائے اور آپ کے ساتھ کوئی اور ہُوا تو اُسے بھی یہیں بلا لیا جائے گا"۔

سائیں نے کہا۔ "آپ کے گھر سے جو کچھ بھی آئے گا۔ وہ بہت اچھا ہوگا"۔

"سائیں جی! آج آپ کی پسند کی چیز چلے گی"۔

سائیں بڈھے شاہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

"ایک دفعہ میں نے آپ کے گھر سے مولی والے پراٹھے کھائے تھے"۔

"سائیں جی وہ مجھے بھی بہت پسند ہیں!

جس وقت بھوک محسوس کریں اللہ رکھا یا پیراں دتہ کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ اور وہ آپ کے گھر میں بھی یہ پیغام پہنچا دے کہ پراٹھے وہاں پہنچ جائیں گے"۔

اللہ رکھا نے کہا۔ "چوہدری جی! میں نے رات ایک خواب دیکھا تھا جو بہت خوفناک تھا لیکن بزرگوں نے کہا ہے کہ کسی نیک بخت کو دیکھنے کے بعد پہلی تمام نحوستیں ختم ہو جاتی ہیں"۔

"وہ نیک بخت کون تھا؟" غلام نبی نے پوچھا؟

"جناب! آپ سے زیادہ نیک بخت اور کون ہو سکتا ہے، جن کا چہرہ دیکھتے ہی مولی کے پراٹھوں کی خوش خبری مل گئی"۔

غلام نبی نے کہا "میرا چہرہ آپ دیکھتے یا نہ دیکھتے جو چیز آپ کے نصیب میں لکھی ہے، وہ آپ کو ضرور ملے گی"۔

"آج موسم کچھ ایسا ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ بہت سے مہمان آجائیں اور مولی کے پراٹھے کھائے جائیں"۔

"سائیں جی! آج کوئی خاص دن ہے؟"

"خاص تو نہیں! لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی خاص بات ہونے والی ہے۔ میں بار بار سوچتا ہوں کہ جانکی داس صبح سویرے سر کے بل کیوں کھڑا تھا"۔

تھوڑی دیر بعد اللہ رکھا گنّے کے رس کا برتن اور ایک پتے پر گرم گڑ ڈالے

ہوتے کماد کی اوٹ سے نمودار ہُوا اور غلام نبی نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اچھا سائیں جی! مَیں ذرا کیاری دیکھ آؤں۔ اللہ رکھا تم بھاگ کر ہمارے گھر میں کہہ دو کہ فوراً مولی کے پراٹھے تیار کئے جائیں۔ سائیں بڈھے شاہ اور ان کے مرید یہاں کھانا کھائیں گے اور کچھ پراٹھے اُن کے گھر بھی جائیں گے جو تم لے جاؤ گے۔ تازہ لسی کی بالٹی بھی یہاں بھیج دی جائے۔"

غلام نبی بیلچہ اٹھا کر چلا گیا تو اللہ رکھا نے کہا "سائیں جی رس کا کٹورا بھر دوں؟"

"نہیں بے وقوف! رس پڑا رہنے دو مولی کے پراٹھے کھانے سے پہلے رس کون پیتا ہے؟"

"اور یہ تازہ گڑ بھی نہیں کھائیں گے۔ بہت اچھا ہے ابھی گرم ہے"۔

"یہ بھی ایک طرف چھپا کر رکھ دو، ورنہ جانکی داس آتے گا اور آتے ہی سب کچھ چٹ کر جائے گا!"

اللہ رکھا نے کہا "پھر وہ مولی کے پراٹھے بھی چٹ کر جائے گا"

"نہیں بھئی گنے کے رس کی اور بات ہے! لیکن ہندوؤں کے خوف سے وہ مسلمان کے گھر کا پکا ہُوا نہیں کھاتے گا۔

مَیں نے دیکھا ہے کہ در پردہ بعض اوقات سکھ بھی مسلمانوں کے کھانے میں شریک ہو جاتے ہیں لیکن ہندوؤں نے اِس قدر تعصب پھیلا رکھا ہے کہ جانکی داس اس بات سے بہت جھجکتا ہے کہ اگر ہندو اُس کے مخالف ہو گئے، تو سکھ بھی اس سے منہ پھیر لیں گے"۔

"سائیں جی! چوہدری غلام نبی کے گھر والی بہت اچھا پراٹھا پکاتی ہے بس اُن سے ایک پراٹھا چھپا کر جانکی داس کو لا دوں گا، اور اُس سے کہوں گا کہیں چُھپ کر کھا لو، وہاں تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا اور پھر سائیں جی دیکھنا وہ آپ سے ہر روز پوچھا کرے گا، سائیں جی چوہدری جی کے گھر سے پھر پراٹھے نہیں آئیں گے؟"

"اچھا ٹھیک ہے۔ آج سے ہماری دوستی پکی ہو جائے گی"



بچن سنگھ اور تیجا سنگھ گاؤں کے سادہ دل لڑکے تھے۔ جنہوں نے رو پیٹ کر اپنی ماؤں سے ایک ایک آنہ حاصل کیا تھا اور اس کے عوض گاؤں کے پرچون فروش پیارے لال سے ربڑ کے غلیل حاصل کئے تھے۔ صبح سے اِدھر اُدھر نشانہ بازی کی مشق کرتے ہوئے شہد کے چھتے کے قریب جا پہنچے۔

ایک نے دوسرے سے کہا۔ "دیکھنا بھتی! کہیں اُس طرف غلیل نہ چلا دینا!" دوسرے نے کہا۔ "بھتی میں بے وقوف نہیں ہوں! پتا جی کہتے تھے۔ انہیں چھیڑا جائے تو یہ جنگل کے شیروں اور چیتوں سے زیادہ خطرناک ہو جاتی ہیں"۔ پہلے نے کہا "ہمیں سامنے سے چھیڑنے کی کیا ضرورت ہے! چلو! اُدھر کماد کے کھیت سے نشانہ باندھتے ہیں۔ وہاں سے اگر کسی چالاک مکھی نے ہمیں دیکھ لیا تو بھی پاس ہی چچا ہری سنگھ کی حویلی ہے"۔ یہ تدبیر دوسرے نے پسند کی اور دونوں نے کماد کے کھیت کے کنارے سے پودوں کی اوٹ میں چھپ کر غلیل چلا دیے

یہ دونوں کا پہلا نشانہ تھا۔ جو سیدھا چھتے پر جا کر لگا۔ اچانک بے شمار مکھیاں اُڑیں اور فضا میں پھیل گئیں ۔ نشانہ بازی کرنے والے اُن کی گونج سے خوفزدہ ہو کر حویلی کی طرف بھاگے تو مکھیوں نے اُن پر حملہ کر دیا ___ لیکن انہوں نے ڈیوڑھی کے اندر پہنچتے ہی دروازہ بند کر لیا۔

دوسرے لوگوں کی بدقسمتی تھی کہ اللہ رکھا پراٹھوں کا چھابہ اور لسی کی دیگچی اٹھائے اُس راستے سے گذر رہا تھا اور مکھیوں کا پہلا بھرپور حملہ اُس پر ہُوا۔

رہٹ پر کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ چند منٹ بعد ان کا کیا حال ہونے والا ہے؟ دو عورتیں سائیں جی کے گھر کا پتہ پوچھتی ہوئی رہٹ پر پہنچ گئیں اور ان کے پیچھے پیچھے سائیں جی

گنے چوس رہے تھے اور بڑی بے تابی سے پراٹھوں کا انتظار کر رہے تھے۔

عورتوں کا مسئلہ یہ تھا کہ اُن کی بھینسیں دودھ دینے کے وقت اَڑ جاتی تھیں اس لیے وہ سائیں جی سے آٹے کا پیڑا دم کروانے آئی تھیں۔ سائیں نے بیٹھے بیٹھے آٹے کے پیڑے پر تین پھونکیں ماریں اور عورتوں سے کہا "اب جاؤ بھینسیں اَڑی نہیں کریں گی۔ اور دیکھو! دودھ دوہنے سے کچھ دیر پہلے اُسے کچھ گڑ بھی کھلا دیا کرو۔" اچانک غلام نبی نمودار ہوا۔ اور اُس نے کہا۔ "سائیں جی آپ کو بھوک لگ رہی ہے اللہ رکھا تو نہیں آیا میں خود گھر جاتا ہوں۔ غلام نبی وہاں سے چل پڑا لیکن پندرہ بیس قدم اٹھانے کے بعد اچانک رک گیا اور مڑ کر سائیں بڈھے شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ سائیں جی! ایسا لگتا ہے کہ آپ کا مُرید باؤلا ہوگیا ہے۔"

عورتیں چند قدم دُور جا چکی تھیں، وہیں رُک گئیں اور سائیں اور جانکی داس اُٹھ کر گندم کے کھیت کی طرف دیکھنے لگے۔

اللہ رکھا کے دونوں ہاتھوں میں گندم کے پودے تھے جنہیں اکھاڑ کر وہ اپنے جسم کے کبھی دائیں کبھی بائیں طرف مار رہا تھا۔ اُس کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

"بچاؤ! بچاؤ! سائیں جی!"

سائیں جی نے جلدی سے گنا پھینک کر اپنا خاندانی ڈنڈا اٹھایا اور اُس کے ایک سرے سے اپنے گرد ایک دائرہ بنا لیا اور پھر اس انداز سے کھڑا ہوگیا جیسے لڑائی کے لیے تیار ہو۔ اُس کا ڈنڈا تلوار کی طرح ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ کبھی دایاں پاؤں آگے کر دیتا اور کبھی بایاں پاؤں۔ اُس کا چہرہ اِتنا سرخ ہوگیا تھا کہ جانکی داس اُسے دیکھ کر گھبرا گیا اور اضطراری حالت میں جلدی سے اُس دائرے کے اندر آگیا جسے اپنے ڈنڈے کی کرامت سے بڈھے شاہ نے ہر خطرے سے محفوظ کر لیا تھا۔

غلام نبی پر اُس کا اُلٹا اثر تھا۔

وہ اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا اور پھر چلایا "مارے گئے! بی بیو! یہاں سے دوڑو۔ اُدھر نہیں! میرے ساتھ آؤ۔ عورتیں جنہیں اللہ رکھا کی چیخ پکار نے خوف زدہ کر دیا تھا۔ کچھ سوچے سمجھے بغیر غلام نبی کے پیچھے بھاگنے لگیں۔ اس نے پرالی کے ڈھیر سے ایک گٹھا اٹھاتے ہوئے کہا۔ بی بیو! یہ ڈُومنا ہے، پرالی کے اندر گھس جاؤ اور وہاں بیٹھی رہو۔" عورتیں سہم کر پرالی کے اندر بیٹھ گئیں اور غلام نبی نے انہیں پرالی سے اچھی طرح ڈھانپ دیا۔ پھر پرالی کے ڈھیر میں چھُپ کر اطمینان سے باقی منظر دیکھنے لگا۔

اللہ رکھا دہائی دے رہا تھا۔ "جس بھوت کو آپ نے ڈنڈے مار کر اُس دن نکالا تھا وہ واپس آگیا ہے۔ وہ مجھ سے انتقام لے رہا ہے۔ سائیں جی بچاؤ! اُس کے نیزے بڑے تیز ہیں۔ سائیں نے اُسے قریب آتا دیکھ کر زیادہ تیزی سے پینترے بدلتے ہوئے پوری قوت سے ڈنڈا گھمایا لیکن پھر اُس نے ہائے ہائے کہہ کر چیخیں مارنا شروع کر دیں اور وہ خاندانی ڈنڈا جو سب سے مؤثر ہتھیار تھا اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُدھر اللہ رکھا نے سائیں جی بچو کہہ کر حوض میں چھلانگ لگا دی۔

جانکی داس پوری قوت سے بھاگا چلا آ رہا تھا۔ "بے وقوفو یہ شہد کی مکھیاں ہیں کسی نے ان کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے جو میرے ڈیرے کے قریب لگا ہوا تھا۔" اور اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا اور ہائے وائے کرتے ہوئے سائیں بڈھے شاہ سے لپٹ گیا۔ بڈھے شاہ نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے مرید سمیت حوض میں چھلانگ لگا دی۔ اب حوض تین آدمیوں کے لیے بہت ناکافی تھا۔

وہ جب بھی سانس لینے کے لیے جسم کے اوپر کا حصہ باہر نکالتے تھے تو مکھیاں منہ پر ڈنگ مارتی تھیں۔

اپنے ساتھیوں پر جانکی داس کو یہ سبقت حاصل تھی وہ کافی چھریرا جسم رکھتا تھا،
اور پیر و مرید دونوں کے نیچے گھس جاتا تھا۔ آس پاس کے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ
یہ سمجھ چکے تھے کہ سائیں اور اُس کے مُرید کا آخری وقت آگیا ہے۔ غلام نبی پرالی میں سر چھپا
کر انہیں آوازیں دے رہا تھا۔ لوگو سائیں بڈھے شاہ کو بچاؤ، جانکی داس بھی مرنے والا ہے
کوئی ٹاٹ لے آؤ اور اِن کے اُوپر ڈال دو ورنہ انہیں ڈومنا زندہ نہیں چھوڑے گا۔"
جانکی داس کو ایک تدبیر سوجھی اور اُس نے دونوں ہاتھوں سے پانی اچھالنا
شروع کر دیا۔ سائیں اور اللہ رکھا بھی اُس کی تقلید کرنے لگے اور مکھیاں ذرا دُور ہٹ
گئیں۔

پنڈت دینا ناتھ اپنی گھوڑی پر سوار ہو کر اِس خیال سے نکلا تھا کہ اس خوشگوار
موسم میں جانکی داس سے گپ شپ لگاؤں گا
چوہدری غلام نبی کے رہٹ کی طرف دینا ناتھ نے گھوڑے کی باگ موڑ لی۔
راستے میں بپھری ہوئی مکھیوں نے اُن پر بھرپور حملہ کر دیا اور انہوں نے گھوڑے کی رفتار
تیز کر دی۔ رہٹ کے قریب پہنچ کر وہ کماد کے کھیت کے پاس گھوڑی سے گر پڑے۔
پنڈت جی کا دماغ جو پہلے سویا ہوا تھا اب تیزی سے کام کرنے لگا۔ جب
انہوں نے دیکھا کہ اُن کے گر جانے سے گھوڑے کی باگ ہاتھ سے نکل چکی ہے۔
ابھی تک مکھیاں اُوپر انتظار کر رہی ہیں کہ وہ ذرا ہلیں اور وہ بھرپور حملہ کر دیں۔
وہ اُٹھ کر آہستہ آہستہ رینگتے ہوتے کماد تک پہنچ گئے اور پھر بھاگ کر جان بچائی۔
حوض کے اندر سائیں جی پانی اچھالتے ہوئے تھک گئے تھے اور انہیں ہر
لمحہ اس بات کا احساس تھا کہ اُن پر وار کرنے والی مکھیوں کی تعداد لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی
ہے۔ جانکی داس نے کہا "سائیں جی! اگر آپ کے پاس کرامت ہے تو اُس کے دکھانے

کا وقت اب ہے"!
اللہ رکھا چلایا۔ "ہاں سائیں جی! یہ ساری مستی! اُس بھوت کی ہے۔ خدا کے
لیے کچھ کیجئے۔"
جب حوض سے پانی کا اچھالنا بند ہوا تو چند مکھیاں حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئیں
سائیں بڈھے شاہ چلایا۔ "بھوت کے بچّے پانی اچھالتے رہو۔"
"سائیں جی میں آیا"۔ دیوار کے کونے سے اللہ رکھا کی آواز آئی۔
سائیں چلایا۔ "اللہ رکھے کے بچّے! اِدھر آنے سے پہلے کوئی بڑا سا ٹاٹ لیتے آؤ
اور حوض کے اُوپر ڈال دو۔"
"سائیں جی! میں ٹاٹ لے آیا ہوں"۔ میں نے چوہدری غلام نبی کی آوازیں سُن لی تھیں۔
"اب جلدی کرو۔ ہمارے اُوپر ڈال دو اور اپنے آپ کو بھی بچاؤ!"
"سائیں جی! میں دو ٹاٹ لے کر آیا ہوں!"
چوہدری غلام نبی کی باتیں سننے والوں نے کئی ٹاٹ جمع کر دیے۔
"اچھا! وہ دونوں ٹاٹ یہیں ڈال دو اور خود بھی یہیں ایک کونے میں دبک
جاؤ اور جب تک مکھیاں چلی نہ جائیں اِدھر اُدھر مت جاؤ۔ سُن لیا تم نے!"
"سائیں جی! ایک ٹاٹ چھوٹا ہے۔ وہ میں اپنے اُوپر لے کر آؤں گا۔ ورنہ مکھیاں
مجھے آپ تک نہیں پہنچنے دیں گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ خطرناک بھوت جو آپ نے نکالے
ہیں۔ یہ ڈومنا بن کر واپس آ گئے ہیں۔"
"لوگ بکواس کرتے ہیں اور تم بے وقوف ہو۔
اب جلدی کرو۔ ایک ٹاٹ ہمارے اُوپر ڈال دو اور دوسرا بھاگ کر لے آؤ۔"
حوض کے اُوپر ٹاٹ ڈالتے ہوئے دو تین مکھیوں نے اللہ رکھا کو کاٹ لیا
اور اُس نے ہائے ہائے کہتے ہوئے کماد میں پناہ لی۔ جب ڈنک کی جلن ذرا کم ہو گئی

تو اُس نے کمزور آواز میں کہا۔

"سائیں جی! یہ ٹاٹ جو میں نے آپ کے اُوپر ڈالا ہے۔ کافی موٹا ہے۔ آپ کو مکھیوں نے ڈنک تو نہیں مارا؟"

"نہیں! تم جاؤ!"

"سائیں جی"! اُس نے ڈرتے ہوئے پُوچھا ———

"اللہ رکھا مر تو نہیں گیا؟"

"نہیں! بے وقوف نظر نہیں آیا۔"

"نہیں میں نے آپ کے ساتھ جانکی داس کو دیکھا تھا۔

چوہدری جی! پنڈت دینا ناتھ آپ کے پاس ہیں؟

ڈومنے نے پنڈت دینا ناتھ پر بڑا سخت حملہ کیا تھا۔

وہ کہیں گھوڑی سے گر کر مر گیا ہے!"

"لوگ اتنے دہشت زدہ ہیں کہ اس کی لاش تلاش کرنے کے لیے بھی اس طرف آنے کے لیے تیار نہیں۔"

کماد سے آواز آئی "سائیں بڈھے شاہ! میں کماد میں چھپا ہوا ہوں۔ اپنے آدمی سے کہہ دیں کہ میرے لیے بھی ایک ٹاٹ لیتا آئے جو موٹا بھی ہو اور بڑا بھی!"

سائیں نے اللہ رکھا کو آواز دی

"اللہ رکھا ٹھہرو! میری بات غور سے سنو! ایک ٹاٹ دینا ناتھ کے لیے لے آؤ اور ایک اپنے اوپر ڈال لو۔ دیکھو ہمارے لئے دو اور ٹاٹ ضرور لانا۔"

"پنڈت جی میں ابھی ٹاٹ لاتا ہوں۔ کھیت کے کنارے رکھ دوں گا۔ اس کے بغیر باہر جھانک کر دیکھا تو تم مارے جاؤ گے۔ سُن لیا پنڈت جی؟"

"ہاں بھئی سُن لیا۔ آپ کی بڑی مہربانی!"

"ہمارے گاؤں سے کوئی میرا پتہ چلانے آئے تو انہیں بتا دینا کہ میں زندہ ہوں۔"

"سائیں جی! آپ نے دو اور ٹاٹ کس لیے مانگے تھے؟"

"اوگد ہے! ہم نے باہر بھی نکلنا ہے یا یہیں سردی میں ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔"

"فکر نہ کرو سائیں جی! آپ کو مرنے نہیں دوں گا۔ مَیں ابھی آتا ہوں۔"

مکھیوں کی توجہ کسی اور محاذ پر مبذول ہو گئی اور غلام نبی نے کچھ دیر غور سے رہٹ کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔

"بی بیو! یہاں سے نکلو اور سیدھے راستے پر جانے کی بجائے چری اور کماد کے کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اپنے گاؤں پہنچ جاؤ۔ ان مکھیوں کا کوئی بھروسہ نہیں، کہ کس وقت اِس طرف آجائیں۔"

سائیں بڈھے شاہ کی آواز سنائی دی۔

"چوہدری جی آپ کہاں چھپے ہوئے ہیں؟"

"سائیں جی! وہ کالا بھوت حملہ کرنے سے پہلے میرے کان میں کہہ گیا تھا کہ تم چپکے سے پرالی کے ڈھیر میں چھپ جاؤ اور مجھے ان لوگوں کا دماغ ٹھیک کرنے دو۔ جنہوں نے مجھے بہت ستایا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ ڈومنے کی فوج لا رہا ہے۔ ورنہ میں آپ کو خبردار ضرور کر دیتا۔"

"لیکن اللہ رکھا کو آپ نے مجھ سے پہلے دیکھا تھا۔"

"سائیں جی! میں سچ مچ یہی سمجھا تھا کہ یہ باؤلا ہو گیا ہے۔

اور کالا بھوت اس سے پہلے میرے کان میں یہ کہہ گیا تھا کہ آج اُس کے دشمنوں کی شامت آنے والی ہے۔"

"باقی لوگ زندہ ہیں یا مر گئے ہیں؟"

"ابھی تک وہ زندہ ہیں، لیکن تھوڑی دیر اور یہاں رہنا پڑا تو ہم تینوں مر جائیں گے۔"

"چوہدری جی! ان خوفناک مکھیوں کو یہاں سے ہٹائیے!"

"اس وقت تو وہ یہاں نظر نہیں آتیں لیکن شام تک یہ جگہ محفوظ نہیں۔"

جانکی داس کی آواز آئی۔ "چوہدری جی! اچھی طرح دیکھ کر بتانا! تاکہ میں تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل آؤں۔"

"تم تھوڑی دیر کے لیے کیوں باہر آنا چاہتے ہو؟"

"چوہدری جی! میرا جسم سن ہو گیا ہے۔ اپنے ڈیرے پہنچ کر علاج معالجہ کراؤں گا۔ وہاں میرے لیے کئی من جلانے کی لکڑی جمع ہے۔

میں ڈیرے پہنچ کر اتنا بڑا الاؤ جلاؤں گا کہ مکھیاں دور سے دیکھ کر ڈر جائیں گی۔

اگر آگ زیادہ ہو تو بھوت بھی بھاگ جاتے ہیں۔

مجھے سردی اتارنے کے لیے کئی گھنٹے تک آگ کے سامنے بیٹھنا ہو گا۔"

جانکی داس نے غلام نبی کے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک طرف سے تھوڑا سا ٹاٹ سرکا کر باہر دیکھا اور پھر اچانک حوض سے باہر نکلا تو وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ وہاں بچھی ہوئی پرالی سے کچھ دور جا کر اس نے سر ڈھانپ لیا اور چند قدم ڈگمگاتا ہوا آگے بڑھا۔ اور پھر قدرے تیز رفتاری سے اپنے ڈیرے کی طرف چل دیا ———

سائیں بڈھے شاہ اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

"جانکی داس! مکھیاں چلی گئی ہیں؟

ارے بولتے کیوں نہیں؟"

غلام نبی نے ہنستے ہوئے ٹاٹ اٹھا کر ایک طرف کر دیا اور کہا۔

"جانکی داس اپنے ڈیرے پر پہنچ چکا ہے۔ آپ بھی باہر آ سکتے ہیں۔"

پیر اور مرید دونوں بری طرح کانپتے ہوئے باہر آتے اور زمین پر لیٹ گئے

چند ثانیے بعد بڈھے شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور فکر مند ہو کر بولا۔

"چوہدری جی وہ پھر تو نہیں آ جائے گا؟"

غلام نبی کا برا حال ہو چکا تھا۔ اس نے کہا

"کالا بھوت! آ بھی جائے تو اب آپ کی شکل اتنی بدل چکی ہے کہ وہ آپکو نہیں پہچان سکے گا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کے ہاں بچے بھی آپ کو دیکھ کر بھاگ جائیں گے اور ابھی تو آپ کے چہرے پر سوجن آنی شروع ہو گئی ہے اور سائیں جی اپنے مرید کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں آتا اس سے؟"

سائیں جی نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "وہ مکھیاں پھر آئیں گی؟"

اتنے میں پنڈت دینا ناتھ نے سر نکالا تو اللہ رکھا نے کہا۔ "پنڈت جی! پنڈت جی اب آ جاؤ! ڈومنا یہاں سے جا چکا ہے"۔ پنڈت دینا ناتھ کماد سے بڑی احتیاط سے ادھر ادھر دیکھ کر باہر نکلا۔ اس کا چہرہ اس قدر بری طرح سوجا ہوا تھا کہ اللہ رکھا بھی اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔

پنڈت دینا ناتھ نے چوہدری غلام نبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چوہدری جی! یہ ڈومنا نہیں تھا کوئی آفت تھی جس نے مجھے گھوڑی سے اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ یوں تو بھگوان کا شکر ہے کہ میرے اندر اتنی عقل تھی کہ میں زمین پر رینگتا ہوا، کماد کے اندر چھپ گیا تھا۔ ورنہ آج میرا بولو رام ہو گیا تھا۔"



اُس کے گاؤں کی عورتیں وہاں پہنچ کر عجیب وغریب داستانیں سنا رہی تھیں۔

انہوں نے غلام نبی کے مشورے پر پرالی کے ڈھیر میں چھپنے کے بعد آنکھیں کھول کر بہت کم اِدھر اُدھر دیکھا تھا۔ مگر جتنا کم دیکھا تھا اتنی ہی زیادہ اُس کے متعلق داستانیں نمک مرچ لگا کر بیان کر رہی تھیں۔

مثلاً کالے بھوت کا تذکرہ، مہیب صورت بھوت کے ناقابلِ یقین کارنامں کی تفصیلات میں تبدیل ہو گیا جس کے آگے پیچھے ڈومنے کی فوجیں تھیں۔

اللہ رکھا کو شہد کی مکھیاں ڈنک ماریں تو وہ دہائی دیتا تھا۔

"سائیں جی! کالے بھوت کو اپنے ڈنڈے سے مار بھگائیے"!

پھر کچھ خواتین سائیں بڈھے شاہ کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر اتنی متاثر ہوئیں کہ اُس کے مرید اللہ رکھا اور بدقسمت سادھو جانکی داس کی حرکات ۔۔۔ خصوصاً سر کے بل کھڑا ہونے کے مضحکہ خیز رویہ کا پرچار ہونے لگا۔

خواتین نے کہا "خدا بھلا کرے۔ چوہدری غلام نبی کا جس نے ہمیں پرالی کے ڈھیر میں چھپا دیا اور ہم بچ گئیں۔

پنڈت دینا ناتھ کی گھوڑی سوار کے بغیر گھر پہنچی تھی، اِس لیے یہ خبر دُور دُور تک پھیل چکی تھی۔ کہ دینا ناتھ مر چکا ہے۔ شام تک گاؤں کے لوگ اپنے گھروں میں چھپے رہے۔ رات کے وقت دیر تک وہ ڈومنا کے واقعات ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ اگلی صبح یہ خبر پھیل گئی کہ ڈومنے نے گاؤں کے شمال میں پیپل کے بہت بڑے درخت کے ایک موٹے سے تنے کے ساتھ اپنا نیا گھر بنا لیا ہے۔

تیسرے دن سائیں بڈھے شاہ نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں وہ اپنی کشادہ بیٹھک کے اندر بستر پر پڑا ہوا تھا اور کمرے کے اندر و باہر اُس کے چند تیماردار نیچے چٹائی پر بیٹھے ہوتے تھے اور چند پیچھے کھڑے تھے۔ بیٹھک کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کھاٹ پر اللہ رکھا اپنے اوپر رضائی لیے اُونگھ رہا تھا۔ لوگ ان دونوں کو بے ہوشی کی حالت میں رہٹ سے اٹھا کر لاتے تھے۔ اِس لیے بیر جی جنہیں خود تیز بخار تھا۔ کچھ دیر حیرت میں ڈوبے رہے پھر اچانک ان کی نظر تیمارداروں میں سے ایک ایسے آدمی پر مرکوز ہو کر رہ گئی جو دوسروں کے لیے اجنبی تھا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"لوگو! سچ بتاؤ کہ یہ مرے ہوتے ہیں یا زندہ؟"

"سائیں جی! ایک آدمی نے جواب دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کو ہوش آ گیا ہے۔ پرسوں سے جب کہ آپ کو چوہدری غلام نبی اُٹھا کر یہاں لاتے تھے۔ آپ بے ہوش تھے۔ اللہ رکھا بھی بے ہوش تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ حکیم نے آپ کو دیکھتے ہی نائی بلوا لیا"!

"سائیں بڈھے شاہ" تم صاف بات کیوں نہیں کرتے" کہ تم سب مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے کہیں سے اس قاتل کو تلاش کر کے میرے لیے لے آئے ہو۔ یہ ظالم فصد کھول دیتا ہے تو ہاتھی بھی چند سانس نہیں لے سکتا۔ میرے لئے نائی اس نے اِس لیے بلوایا ہو گا کہ میرے مریدوں نے مجھے اگر تڑپتا ہوا دیکھ لیا تو اس کی شامت آ جائے گی"!

ایک آدمی نے کہا۔

"سائیں جی! نائی نے آپ کے جسم سے صرف شہد کی مکھیوں کے ڈنگ نکالے تھے۔ اور اس کے لیے فصد نہیں کھولا گیا صرف موچنا استعمال کیا گیا ہے"!

"یار! کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ تم اِسے نہیں پہچانتے۔ مگر میں اس بدمعاش کو خوب سمجھتا ہوں۔ یہ وہ حکیم ہے جو صرف فصد کھولنا جانتا ہے۔ مَیں اپنی آنکھوں سے اس کا کارنامہ دیکھ چکا ہوں۔ یہ وہی بدمعاش ہے جو چوہدری شیر علی کی جان لینے کے بعد کہیں غائب ہوگیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ مر گیا ہے۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا کہ یہ مر گیا ہوگا اَب اگر میرے بُرے دن آتے ہوتے تھے اور یہ ایسے وقت میں وہاں پہنچا تھا جبکہ میں بخار میں بے ہوش ہو چکا تھا۔ اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا اور اس کے ہاتھوں موت میرے نصیب میں لکھی جا چکی ہے اور یہ کہہ کر میرا علاج کرنا شروع کر دیا ہے کہ اس بدمعاش نے نائی کو شہد کی مکھیوں کے ڈنک نوچنے کے لیے بلایا تھا۔ نائی نے کمرے کے اندر جھانکتے ہوتے دیکھا۔

"سائیں جی! آپ مجھ سے ناراض کیوں ہوتے ہیں؟ مجھے اللہ رکھا نے ڈنک نکالنے کے لیے کہا تھا۔ آپ کے بعد میں نے اللہ رکھا اور جانکی داس کے جسم سے بھی ڈنک نکالے ہیں۔

صبح پنڈت دینا ناتھ کے گھر بھی مجھے بلایا گیا تھا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک حسین بخش کو کسی کی فصد کھولنے کا موقع نہیں ملا۔"

حسین بخش نے کہا۔

"سائیں جی مَیں نے فصد کھولنے سے توبہ کر لی ہوئی ہے اور یہاں سے چار کوس دُور دوکانداری کرتا ہوں۔"

"لیکن میرے گھر کا راستہ تمہیں کس نے بتا دیا؟"

"جناب! مَیں نے کسی صورت اس کام کو نہیں کرنا تھا۔ وہ جو آپ کا مُرید اللہ رکھا ہے یہ کل میرے پاس پہنچ گیا تھا اور میرے پاؤں پر گر پڑا تھا کہ خدا کے لیے

ہمارے سائیں جی کی جان بچاؤ۔"

بڈھے شاہ نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اللہ رکھا او اللہ رکھا!"

"جی سائیں جی!" اللہ رکھا نے کہا۔

"بدمعاش تمہیں کب سے اِس کے متعلق معلوم تھا؟"

"سائیں جی! مَیں نے اپنی بیوی کے علاج کے لیے انہیں پچھلے سال بڑی مشکل سے تلاش کیا تھا۔"

"بدمعاش تم میری فصد کھلوانے کے لیے اسے بلانے گئے تھے؟"

"نہیں سائیں جی! اِس نے میرے سامنے قسم کھائی تھی کہ مَیں اب کسی مریض کا خون نہیں نکالتا۔"

سائیں بڈھے شاہ نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ کا شکر کرو کہ حسین بخش نے آٹھ پہر یہاں گذارے ہیں اور اس گاؤں کے لوگ بال بال بچ گئے ہیں۔ اَب اِسے روٹی کھلا کر یہاں سے روانہ کردو، اور اس بات کا خیال رکھو کہ جاتے جاتے کسی کو کوئی دوائی نہ دے جائے۔ ایسے حکیم کے پاس ایسی دوائیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ جو فصد کھولنے سے زیادہ خطرناک ہوں۔ ہم پر ایک مصیبت تو ڈوبنے کی آئی تھی اور پھر تم حسین بخش کو لے آتے ہو۔ اِس بدمعاش کو جلدی سے یہاں سے نکالو ورنہ گاؤں کے لوگ اسے مار ڈالیں گے اور پولیس ہمیں پکڑ لے گی۔ او بدمعاش کے بچّے بھاگ جاؤ، ورنہ مَیں غلام نبی کو اطلاع دیتا ہوں۔"

حسین بخش اٹھا اور بھاگتا ہُوا کماد میں روپوش ہوگیا پھر یہ کسی کو معلوم نہ ہُوا کہ وہ کہاں گیا ہے۔

گاؤں کے مغرب کی طرف گرم کپڑے کا ایک بہت بڑا کارخانہ ریلوے سٹیشن اور ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں جب حکومت نے مزدوروں کی کمی محسوس کی، تو جنوبی ہندوستان سے کچھ بھیل وہاں بھیج دیے گئے۔ شروع شروع میں انہیں ایک وسیع چار دیواری کے اندر رکھا جاتا تھا اور پھر چند برس بعد ان میں سے کچھ واپس چلے گئے تھے اور کچھ پنجاب میں ہی اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔

بھیلوں کے جس گھرانے کو ہمارے گاؤں کے ایک سکھ زمیندار نے مکان بنانے کے لیے کچھ جگہ دی تھی۔ اس کے سرکردہ آدمی کا نام بلّو تھا۔ بلّو کتوں کے ساتھ شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور جب کبھی وہ جنگلی بلا مار کر لاتا تھا۔ تو بھیل خوشی سے ناچتے اور گاتے، ویسے ہر جانور کھا جایا کرتے تھے۔ لیکن جنگلی بلے کی خاص خوشی منائی جاتی تھی۔ جب علاقے کے بڑے شکاری نکلتے تھے۔ تو بلّو اُن کے ساتھ ہو جایا کرتا تھا۔ خرگوش شکاری لے جاتے تھے اور گیدڑ یا جنگلی بلا بلّو کو مل جاتا تھا۔ میں بھی کبھی کبھی شکار دیکھنے جایا کرتا تھا۔

شکاری عام طور پر پردیسی درختوں کے آس پاس کھلی جگہ میں جمع ہوتے تھے۔ پھر مختلف سمتوں سے ہانکے شکاری کتے شکار گھیر کر لاتے تھے۔ جب کوئی جانور کماد کے کھیت سے نمودار ہوتا تھا۔ تو تازی کتوں کو چھوڑ دیا جاتا، جو تھوڑی سی دوڑ کے بعد شکار پکڑ لیتے تھے۔ اور اگر پکڑے جانے والا جانور جنگلی بلا ہوتا تھا تو بلّو خوشی سے ناچتا تھا وہ ہر شکاری اور اس کے باپ دادا کا نام لے لے کر اُسے دعائیں دیتا تھا۔ ہم اُس کی حرکتوں پر ہنسا کرتے تھے۔

اسکول والے ہندوؤں، خاص کر دینا ناتھ برہمن کو اس بات پر اعتراض تھا کہ پردیسی درختوں کی پوتر دھرتی پر پاپ کیا جاتا ہے لیکن شکار کرنے اور شکاریوں کو دیکھنے والے اُس کے اعتراضات پر کوئی توجہ نہ دیتے تھے۔

پڑوس کے گاؤں کا سردار بیلا سنگھ جس نے دس پندرہ کتے پال رکھے تھے اور جسے تیتر اور بٹیر پکڑنے کا بھی بے حد شوق تھا، دینا ناتھ کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ایک دن اُس نے

کہا تھا: "تمہیں یہ دُعا کرنی چاہیے کہ خدا وہاں تمہیں اگلے جنم میں جنگلی بلا نہ بنائے، ورنہ بلّو بھیل تمہارے لئے اتنا خطرناک ہے۔ کہ اگر تم چوہے کے بل میں بھی چھپ جاؤ تو تمہیں نکال کر کھا جائے گا۔"

دینا ناتھ کو غصّہ تو بہت آتا تھا۔ لیکن بیلا سنگھ سے کسی کو بحث کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ میں اس کی وجہ شاید نہیں بتا سکتا لیکن پردیسی درختوں سے مجھے اُس دن ہی سے دلچسپی ہو گئی تھی، جب میں نے یہ سُنا تھا۔ کہ وہ کسی نامعلوم ملک سے بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ اور جب پچھلے پہر چکی پیسنے والی عورت نے انہیں دیکھ کر دہائی مچانی شروع کی تھی تو وہ جس جگہ تھے وہیں رُک گئے تھے۔

میں اسکول سے چھٹی کے بعد لبا اوقات اپنے ساتھیوں کو پردیسی درختوں کی طرف لے جایا کرتا تھا۔ ہم وہاں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ چند درختوں کے گرد چبوترے بنے ہوئے تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ چند سادھو یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ پھر ایک رات وہ کسی چیز سے ڈر کر بھاگ گئے۔

میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا تھا، لیکن رات کے وقت اگر مجھے بھی کوئی کہتا کہ تم کسی پردیسی درخت کو ہاتھ لگا آؤ تو شاید میں یہ جرأت نہ کرتا۔ وہاں ہر شام عجیب سی اداسی چھا جاتی تھی۔

میں شہر کے اسکول میں ساتویں جماعت میں تھا۔ ایک دوپہر میرے چچا جان نے مجھے ڈیوڑھی کی طرف سے آواز دی۔ میں باہر نکلا تو اُن کے سامنے بلّو بھیل رو رہا تھا۔

"چوہدری صاحب" وہ کہہ رہا تھا "میں تباہ ہو گیا ہوں، اُس ظالم نے ایک کتا جان سے مار دیا ہے۔ دوسرے کو بُری طرح زخمی کیا ہے۔ میں سردار بیلا سنگھ کے پاس گیا تھا۔ وہ اپنا ایک چھوٹا کتا اور ایک بڑا کتا ساتھ لے کر خود میرے ساتھ گئے لیکن چوہدری صاحب' بڑی مشکل سے سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا "مجھے سردار بیلا سنگھ بھی طعنے دیں گے اُس کے چھوٹے کتے کی صرف ایک ہی چیخ سُنائی دی اور وہ یہ کہہ کر گالیاں دے کر چلے گئے کہ اندر کوئی

بلا ہے۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ کھوکھلے تنے کو آگ لگا دی جائے مگر پردیسی درخت کو
مَیں آگ لگانے کا پاپ نہیں کر سکتا۔ آئندہ میں اس طرف شکار کھیلنے بھی نہیں آؤں گا۔
اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میں مر جاؤں گا۔ سردیاں سر پہ آ رہی ہیں مجھے اگر بلا نہ ملا
تو میں بیمار ہو جاؤں گا۔

چودھری جی! وہ باہر ضرور نکلے گا۔ آپ چھوٹے چودھری کو اجازت دے دیں میں انہیں
ساتھ لے جاؤں گا"۔ "بھئی تم یوسف کو راضی کر لو، اگر یہ تمہاری مدد کرنا چاہے تو میں اِسے نہیں
روکوں گا"۔ بلّو نے جلدی سے آگے بڑھ کر میرے پاؤں پکڑ لئے گھٹنوں کے بل آگے بڑھ کر کہا:
"سرکار! آپ کی تھوڑی سی تکلیف سے میری جان بچ جائے گی۔
وہ جنگلی بلا پنڈت دینا ناتھ سے بھی موٹا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو اس کی آواز دُور
دُور تک سنائی دیتی ہے بس آپ کو صرف ایک فائر کرنا پڑے گا"۔ مَیں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا:
"بلّو! میں نے تمہیں کئی بار پاؤں پکڑنے سے منع کیا ہے۔ آئندہ ایسا کیا تو اچھا نہیں ہو گا۔
تم بلّے کا خیال رکھو! میں اطلاع ملتے ہی تمہارے ساتھ چل پڑوں گا"۔
بلّو نے کہا۔
"جناب وہ جس وقت ہلے گا ہمیں یہاں اطلاع پہنچ جائے گی۔ میں اپنے دو ساتھی وہاں
چھوڑ آیا ہوں"۔
مَیں صبح کی نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تو بلّو راستے میں کھڑا تھا۔
"جناب! چودھری جی وہ نکل آیا ہے"۔ اس نے کہا۔
"میں آپ کے نوکر سے بھی کہہ آیا ہوں کہ وہ آپ کے گھوڑے پر زین ڈال دے"۔
"اچھا بلّو تم بھاگو میں آتا ہوں"۔
تھوڑی دیر بعد میں بندوق اٹھائے سرپٹ گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ راستے میں
بلّو کو دیکھ کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور کہا "بلّو میرے پیچھے بیٹھ جاؤ"۔

بلّو ہچکچایا۔ "نہیں! سرکار! میں ابھی پہنچ جاؤں گا اور میرے آدمی آپ کے انتظار
میں کھڑے ہوں گے"۔
میں نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔
کچھ دیر بعد بلّو ہانپتا ہوا پردیسی درختوں کے قریب پہنچا تو میں بلے پہ فائر کر چکا تھا اور
اس کے ساتھی نعرے لگا رہے تھے۔ مار لیا، مار لیا! اور بلّو نے وہیں سے
ناچنا شروع کر دیا۔ اس بلّے کی لاش کا جلوس نکالا گیا۔ پہلے بلّو اور اس کے ساتھی اُسے
سردار بیلا سنگھ کے گاؤں میں لے گئے اور پھر اپنے گاؤں میں اسے لے آئے۔
اگلے روز دو مُردہ کتوں کی لاشیں ملیں جن میں سے ایک بلّو کا تھا اور دوسرا بیلا سنگھ کا۔
لاشیں کھوکھلے تنے سے نکالی گئیں۔ اسی روز سردار بیلا سنگھ میرے چچا سے
گاؤں آ کر ملا۔ چچا نے مجھے بلایا تو سردار جی نے ایک پنجرہ مجھے دیتے ہوئے کہا:
"بیٹا! اس میں بیس بٹیرے ہیں اور وہ سب تمہارے لیے ہیں"۔
میں نے چچا کی طرف دیکھا اور اُس کا اشارہ پا کر پنجرہ پکڑ لیا اور بھاگتا ہوا اندر
چلا گیا۔

آٹھویں جماعت کے آخری ایام میں اپنے گاؤں کے ساتھیوں کی ایک حماقت کے
باعث میری زندگی میں ایک غیر متوقع انقلاب آیا۔ بورڈنگ ہاؤس کی عمارت بن چکی تھی اور اس
عمارت میں اب داخل ہونے والے طلبا کی ضرورت تھی۔ وہ لڑکے جن کے گھر دُور تھے، اُن
کے لیے ہاسٹل میں داخلہ لینا ایک مجبوری تھی لیکن ہمارے امریکی پرنسپل نے جو چار کشادہ
کمرے بنوائے تھے اُن میں سے ایک بھی پوری طرح نہیں بھرا تھا۔ اب اُستاد صاحبان نے
ان لڑکوں پر بھی توجہ دینا شروع کر دی تھی جن کے گاؤں اسکول سے تین میل کے دائرہ کے باہر تھے۔
میرا گاؤں اسکول سے بمشکل ڈیڑھ دو میل تھا۔ اِس لیے مجھے اس سے کوئی پریشانی

نہ تھی۔ بہر صورت ہر طالب علم کو بورڈنگ ہاؤس میں داخلہ لینے کی ترغیب دلانے کا یہ طریقہ نکالا گیا۔ کہ کبھی رات کو اسکول کی کوئی تقریب منعقد کی جاتی یا کوئی "خاموش فلم" دکھائی جاتی۔ تو لڑکوں کو یہ بتا دیا جاتا تھا کہ اگر وہ چاہیں تو رات بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہر سکتے ہیں۔ کبھی کوئی مُعلّم یا اُستاد چند دن کے لیے اپنے مضمون کی خاص کلاسز لیتا تھا اور لڑکے اِسے بھی ایک مشغلہ جان کر اپنے بستروں اور کھانے کے برتنوں سمیت بورڈنگ ہاؤس میں پہنچ جاتے تھے اور اِس عارضی قیام کے بعد ان پر بورڈنگ ہاؤس کا خوف کم ہو جاتا تھا۔

ایک دن ہمارے اسکول کی ہاکی ٹیم نے کسی دوسرے شہر میں میچ کھیلنے کے لیے جانا تھا۔ اور پروگرام کچھ یوں مرتب ہوا تھا کہ ہماری ٹیم کے کھلاڑی میچ کھیلنے کے بعد واپسی پر بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہریں گے۔

اگلی شام شہر میں متحرک فلم (MOVIE) دکھائی ۔ ہی تھی اور اُسے دیکھنے والوں کو بھی بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ میں نے نوکر کو اپنا بستر دے کر بھیج دیا۔ مجھے رخصت کرتے ہوئے امی جان نے کہا۔

"دیکھو یوسف ! تمھاری غیر حاضری کے دو دن مجھے بہت طویل محسوس ہوں گے۔ بورڈنگ میں کھانے کے پیسے دے دیا کرنا لیکن تمھارا کھانا میں خود تیار کیا کروں گی اور نوکر کے ہاتھ بھیج دیا کروں گی۔"

مجھے رخصت کرتے ہوئے ہمیشہ امی جان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتی تھیں۔

گاؤں میں میرے ساتھ کھیلنے والے کسی طالب علم کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں دو دن غیر حاضر رہوں گا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا تو انھوں نے کانفرنس بلا لی اور اس کانفرنس میں جو فیصلہ ہوا، اُس کی عملی صورت یہ تھی۔

میں میچ کھیلنے سے اگلے روز کلاس روم میں بیٹھا ہوا تھا۔ حساب کے ماسٹر صاحب بلیک بورڈ پر ایک سوال حل کر رہے تھے کہ گاؤں کے چھ سات لڑکے سہمے سہمے اور شرماتے شرماتے

اسکول کے صحن میں وارد ہوئے، ہرنام سنگھ اُن کا لیڈر بنا ہوا تھا اور پیش پیش تھا۔ وُہ کس کمرے کے اندر جھانکتا اور پھر مڑ کر اپنے ساتھیوں کو اپنے ہاتھ سے اشارہ کرتا اور اگلے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ سامنے برآمدے میں چلمن پڑی ہوئی تھی اور ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب بڑی دلچسپی سے چلمن کی اوٹ سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ہرنام سنگھ کے پیچھے لڑکوں کی ٹولی میں بوہڑ مسیح جو سب لڑکوں سے زیادہ تنومند اور مضبوط تھا۔ کوئی ایک مَن گنّے اپنے کاندھے پر اُٹھائے ہوئے تھا۔ ہرنام سنگھ ہمارے کلاس رُوم کے باہر آکر رُک گیا۔ اُس نے باقی لڑکوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ بھی وہاں پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے بوہڑ مسیح کو ہاتھ سے کچھ اشارے کیے۔ بوہڑ مسیح جھجکا لیکن ایک لڑکے نے اُس کا بازو پکڑ کر اندر دھکیل دیا۔ بوہڑ مسیح نے آگے بڑھ کر گنّوں کا گٹھا ایک ڈیسک پر دے مارا۔ ساتھ ہی ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا

ماسٹر صاحب نے یہ منظر دیکھا تو اُس پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ دیہاتی لڑکوں نے ایسا قہقہہ نہیں سُنا تھا۔ بوہڑ مسیح بدحواس ہو کر بھاگا اور وُہ اُس کے آگے بھاگ گئے۔ اُن کی رفتار کا یہ عالم تھا کہ آناً فاناً نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر اور چند دوسرے اُستاد اُن کے پیچھے پیچھے چند قدم گئے پھر انھوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ یوسف کے گاؤں کے لڑکے ہیں بھائی ! یہ بہت بڑی بات ہے کہ وہ تمھارے لیے اِتنی دُور سے تحفہ لے کر آئے تھے اور تم نے اُن کی پذیرائی اور تواضع کرنے کی بجائے انھیں بھگا دیا ہے۔"

"جناب مَیں نے انھیں نہیں بھگایا۔"

ہیڈ ماسٹر صاحب طبعاً بہت نیک نفس تھے۔ وہ مسکرائے اور کہا "ارے تم پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے اُنھیں نہیں بلایا۔ اب گاؤں میں جا کر ان کے ساتھ لڑائی نہ کرنا۔

یہ لوگ بہت مخلص ہیں اور تمھارے بہی خواہ ہیں" میں نے کہا۔ "سر اگر آپ یہ سمجھتے

ہیں کہ یہ کوئی بُرائی نہیں تو مَیں ان سے لڑائی نہیں کروں گا۔ لیکن سَر اِن گنّوں کے گٹھے کا کیا کیا جائے ؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا۔"جتنے چوس سکتے ہو اپنے پاس رکھ لو۔ باقی اپنے دوستوں میں تقسیم کر دو۔"

"بہت اچھا سر!" مَیں نے کہا۔

چھٹی کے بعد میں نے آٹھ دس بہترین گنّے چھانٹ کر الگ کر لیے اور باقی کچھ اپنے استادوں اور کچھ اپنے شہری ہم جماعتوں میں تقسیم کر دیئے۔ کیونکہ دیہاتی لڑکوں کے لیے یہ کوئی قابلِ قدر تحفہ نہیں تھا۔

پھر مَیں نے بہترین آٹھ دس بچے ہوئے گنّے اٹھائے اور ہیڈ ماسٹر صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے تھے ان کا نام شیر الدین تھا۔ جب نوکر نے میری اطلاع دی تو انہوں نے فوراً بلا لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر گنّے پیش کر دیئے۔"جناب یہ لیجیے! آپ نے کہا تھا کہ میں یہ گنّے اپنے دوستوں میں تقسیم کر دوں۔ یہ ان میں سے بہترین گنّے ہیں جنھیں مَیں نے چھانٹ کر الگ کر لیا تھا۔ اور مجھے کچھ دیر یہ سوچنا پڑا کہ یہاں میرا بہترین دوست کون ہے ؟"

ہیڈ ماسٹر صاحب کے اشارے سے گنّے نوکر نے پکڑ لئے اور وہ بولے: "یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم مجھے اپنا "دوست" سمجھتے ہو۔ اب تم اندر جاؤ اور میرے کمرے کی دوسری الماری سے کوئی دلچسپ کتاب پڑھنے کے لیے نکال لو اور مطالعہ کرنے کے بعد لا کر خود ہی وہ کتاب اس الماری میں رکھ دینا اور دوسری لے جانا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب پہلے ہی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے تھے اور دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیاں جو مجھے اُن کے گھر سے ملتی تھیں۔ میں نے اُن سے پُورا فائدہ اُٹھایا تھا۔

چند دن بعد ابا جان گاڑی سے اترے تو ریلوے اسٹیشن پر اُن کی ملاقات ماسٹر جگن ناتھ سے ہو گئی۔

ابا جان ہر اُستاد کا احترام کرتے تھے، اِس لیے وہ ماسٹر صاحب کے لیے رُک گئے۔ ماسٹر صاحب نے گفتگو کا آغاز ہی کچھ اس طرح کیا۔

جناب! آپ کا لڑکا ابھی سے چوہدری بن گیا ہے۔ حالت یہ ہے کہ گاؤں میں اُس کے ساتھ کھیلنے والے لڑکوں کی ٹولیاں بے دھڑک اسکول میں آگھستی ہیں ایک دن آوارہ لڑکوں نے کلاس روم میں جا کر اُس کے سامنے گنّوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔"

ابا جان نے گھر پہنچتے ہی مجھے بُلایا اور کہا۔

"یوسف بیٹا! کل تم بورڈنگ ہاؤس میں داخل ہو جاؤ گے اور وہاں گاؤں کے کسی لڑکے کو تم سے ملنے کی اجازت نہیں ہو گی۔" یہ حکم انہوں نے کچھ اس طرح تحکمانہ انداز سے دیا ـــــ کہ کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ شام تک کھُسر پھُسر ہوتی رہی۔ پھر میری حمایت میں آوازیں اُٹھنے لگیں۔ اور دادی جان بہت غصّے میں آگئیں تو ابا جان نے سب کو اطمینان سے سمجھایا کہ میں یہ سب کچھ یوسف کی بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں اُس کا کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے اور اگر اُس کا ماحول تبدیل نہ کیا گیا تو ان لڑکوں جیسا ہو جائے گا جو اس کا وقت ضائع کرنے کے لیے اسکول میں بھی جا گھستے ہیں۔ اب تک میں نے اس حادثے کا کسی سے ذکر نہیں کیا ہوا تھا۔ اِس لیے میرے حق میں کوئی آواز نہ اُٹھ سکی۔"

اگلی صبح ابا جی میرے ساتھ اسکول تشریف لے گئے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور دوسرے انتظامیہ کے افراد سے ملے اور پھر مجھے ہوسٹل میں داخل کروا دیا۔ اُس روز مجھے چھٹی کے بعد گھر آنے کی اجازت مل گئی لیکن اگلے دن مجھے اپنے سامان و اسباب کے ساتھ ہوسٹل میں منتقل ہونا پڑا۔

بورڈنگ ہاؤس کے وسیع اور کشادہ ہال میں چارپائیوں کی دو قطاریں تھیں۔ ابّاجی خود مجھے بورڈنگ ہاؤس میں چھوڑنے کے لیے آئے تھے۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھ سے یہ رعایت کی کہ ہال میں وہ ہمارے ساتھ آئے اور بولے"اب تم اپنی پسند کی جگہ بستر جمالو"۔ مَیں نے بورڈنگ ہاؤس کی شمال کی طرف ایک کھڑکی کے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" جناب! وہ چارپائی خالی پڑی ہے اجازت ہو تو مَیں اپنا بستر وہاں لگا لوں؟" اباجی نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔" بیٹا! مجھے معلوم تھا کہ تم وہ جگہ پسند کروگے جہاں سے پہاڑ نظر آتے ہوں۔ اب دل لگا کر پڑھا کرو۔ اگر تم نے اچھے نمبر حاصل کیے اور اچھی پوزیشن لی تو ہوسکتا ہے کہ میں تمہیں ان پہاڑوں کی سیر کرا دُوں"۔

مَیں نے جواب دیا " اباجی! میں بہت اچھے نمبر لوں گا۔ لیکن مَیں آپ سے ایک بات کی اجازت لینا چاہتا ہوں"۔

"کیا بات ہے وہ؟"

" اباجان! جس دن امی جان مجھے نہ دیکھیں تو وہ بہت بے چین ہو جاتی ہیں"۔

" ہاں! مجھے معلوم ہے!"

انہوں نے درشت لہجے میں جواب دیا۔" لیکن وہ تمہارے ساتھ بورڈنگ ہاؤس میں نہیں آسکتیں"۔

" ابا جان! میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ خفا نہ ہوں تو میں بھاگ کر چند منٹ کے لیے انہیں دیکھ آیا کروں۔ دادی جان بھی خوش ہو جایا کریں گی"۔

اباجان نے کہا۔" اگر تم بھاگ سکو۔ تو دونوں وقت جا سکتے ہو۔ اس سے تمہاری صحت اچھی ہو جائے گی اور ٹانگیں مضبوط ہوں گی۔ میں تمہارے سپرنٹنڈنٹ صاحب کو یہ کہہ دوں گا لیکن سکول میں بروقت حاضر ہونا اور بورڈنگ ہاؤس میں مطالعہ کے وقت

موجود رہنا تمہاری پہلی ذمہ داری ہوگی۔

تمہیں گھر جانے کی اجازت دینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاؤ اور وقت ضائع کرو"

اسکول سے چھٹی ہوئی تو میں ایک منٹ ضائع کیے بغیر ہوسٹل گیا۔ وہاں مَیں نے اپنی کتابیں رکھیں اور پھر گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

امّی جان! چھت کے اُوپر موہڑے پر بیٹھی ہوتی تھیں مَیں نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر پیچھے سے دونوں ہاتھ اُن کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ انہوں نے پیار سے میری کلائیاں ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو شاید یوسف کی خوشبو آرہی ہے"۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا" آپ کو اباجی نے بتایا ہوگا۔ کہ میں آؤں گا"۔

امّی جان نے باری باری میرے ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

"وہ یہ کہتے تھے کہ تم کبھی کبھی مجھے دیکھنے کے لیے آجایا کروگے لیکن مجھے یقین تھا کہ تم آج ضرور آؤگے۔ میں چھت پر تمہارا راستہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اور یہ سوچ رہی تھی کہ اُدھر مغرب کی جانب جو چند درخت ہیں وہ کٹوا دیے جائیں تا کہ مَیں تمہیں دُور سے آتا ہوا دیکھ سکوں"۔

" امّی جان!" میں نے جواب دیا۔" اب آپ کو کبھی میرا راستہ دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جب آپ کے دل میں میری یاد آیا کرے گی تو مَیں یہاں پہنچ جایا کروں گا"۔

امی جان نے دونوں ہاتھوں سے میرے کان پکڑتے ہوئے کہا" بے وقوف! تمہیں معلوم نہیں کہ میرا دل کبھی بھی تمہاری یاد سے خالی نہیں ہوتا"۔

"امّی جان! میں نے اباجان سے یہاں آنے جانے کی اجازت لے لی ہے۔ اب میں

صبح و شام آپ کے پاس آیا کروں گا۔"

"نہیں بیٹا! تم تھک جایا کرو گے"۔ امی جان نے کہا۔

"امی جان"! میں نے جواب دیا۔ "آپ کو دیکھنے کے لیے میں کئی میل بھاگ سکتا ہوں۔

نماز مغرب کے بعد میں گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ کھانے پر بیٹھا تو معلوم ہوا کہ امی جان کی نسبت ابا جان کو اس بات کا زیادہ یقین تھا کہ میں شام کو چھٹی ہوتے ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔

اُس دن وہ کھانے خاص طور پر دستر خوان پر موجود تھے جو میں بڑے شوق سے کھایا کرتا تھا۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو امی جان نے کچھ دودھ اور مکھن دے دیا۔ اچانک ابا جی کے دل میں کوئی خیال آیا تو انہوں نے کہا۔ "یوسف! تم نے آج اپنی گھوڑی کی طرف توجہ نہیں دی"۔

"نہیں! ابا جان! میں صرف چھٹی کے دن اُسے دیکھا کروں گا"۔

"تمہیں معلوم ہے کہ اگر باقاعدہ توجہ نہ دی جائے تو گھوڑی کی حالت خراب ہو جاتی ہے"۔

"مجھے معلوم ہے لیکن ......"! ابا جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہارا چچا عبدالکریم اس گھوڑی پر سواری کر سکتا ہے"۔

"ہاں ابا جان!"

"پھر بیٹا! میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم صبح کے وقت تو پیدل یہاں آیا کرو گے لیکن شام کے وقت عبدالکریم تمہارے ساتھ بیٹھ جایا کرے گا اور تمہیں بورڈنگ ہاؤس تک پہنچا کر واپس آجایا کرے گا۔ اور جب فرصت ہوا کرے گی تو کبھی کبھی صبح کے وقت بھی وہ تمہیں گھوڑی پر پہنچا دیا کرے گا۔ میرا مطلب یہ ہے سواری تم کیا کرو گے اور وہ گھوڑی واپس لانے کے لیے تمہارے پیچھے بیٹھ جایا کرے گا"۔

میرے پاس اپنے احساسات کی ترجمانی کے لئے کوئی الفاظ نہ تھے اور میں بے اختیار ابا جی سے لپٹ گیا۔

اندر رام اسکول میں مجھ سے ایک جماعت آگے تھا۔ وہ بورڈنگ ہاؤس میں میرے نام سے چڑتا تھا۔ اُس کا رنگ سیاہی مائل تھا، منہ پر چیچک کے داغ تھے، ماتھا حد سے زیادہ چھوٹا تھا اور آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ چوٹی کافی لمبی اور موٹی تھی اور اُسے نمایاں کرنے کے لیے باقاعدگی سے سر منڈوایا کرتا تھا۔ ہاتھ چھوٹے چھوٹے تھے۔

ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ پادری آئیزک کے ساتھ اُس کے گہرے مراسم تھے۔ پادری ایک سادہ دل آدمی تھا اور اُسے یہ جاننے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہوسٹل کے اندر اُس کی نظروں سے بالا بالا کیا ہو رہا ہے؟ اور اندر رام اُس کی یہ ضرورت پوری کیا کرتا تھا۔ مثلاً وہ اُسے اَن دیکھے خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے غیر متعلق واقعات کو اس طرح جوڑ دیا کرتا تھا کہ پادری صاحب کی نیند خراب ہو جایا کرتی تھی اور پادری صاحب نیند خراب کرنے والے کے شکر گزار ہوا کرتے تھے۔

اندر رام کی انتہائی کامیابی یہ تھی کہ اُس نے ہوسٹل کے دو لڑکوں کو چھ چھ بید لگوا دیے تھے اور بہادر سنگھ پر یہ الزام لگا کر اُس کے کان پکڑوا دیے تھے کہ اُس نے اپنی الماری میں شراب کی بوتل چھپا رکھی تھی اور وہ ہر روز پیتا تھا۔ بہادر سنگھ نے کوئی صفائی پیش کیے بغیر کان پکڑ لیے اور جب پادری صاحب نے غصے میں آکر دو تین چھڑیاں مار دیں تو اُس نے احتجاج کیا۔

"جناب! مجھے یہ تو بتائیے کہ آپ کو غصہ کیوں آرہا ہے؟"

"اے اُلّو! تم شراب کی بوتلیں لے کر ہوسٹل میں آجاؤ اور مجھے غصہ نہ آئے تم پیو اور بڑھکیں مارو اور میں پھر بھی خاموش رہوں"۔

بہادر سنگھ نے عاجزی سے کہا۔ "مجھے بھگوان کی سوگند! میں نے بالکل نہیں پی،

میں نے کبھی بڑھکیں نہیں ماریں اور میرے پاس ایسی کوئی بوتل نہیں جس میں شراب ہو۔"

پادری صاحب نے جھنجھلا کر کہا کیا بکتے ہو؟ تمہاری الماری میں شراب کی بوتل نہیں ہے؟

"جناب! شراب کی بوتل تو ہے لیکن اُس میں اب سرسوں کا تیل ہے اور وہ اُس میں اُس وقت ڈالا گیا تھا۔ جب وہ خالی ہو گئی تھی۔"

پادری صاحب چکرا گئے انہوں نے الماری کھلوا کر خود تلاشی کر لی۔ بوتل نکالی گئی، تو معلوم ہوا کہ اُس میں خالص سرسوں کا تیل ہے، عین اُس موقع پر ہیڈ ماسٹر اور مینجر صاحب گشت پر آ گئے اور انہیں جب اِس واقعہ کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وُہ پادری صاحب کو ساتھ لے کر چلے گئے۔ چند دن بعد معلوم ہوا کہ پادری صاحب کسی اور جگہ تبدیل کر دیے گئے ہیں اور ایک اور اُستاد جن کا درجہ سیکنڈ ماسٹر کے برابر تھا بورڈنگ ہاؤس کے نئے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے انچارج بنا دیے گئے۔ اُن کی شہرت ان کے آنے سے پہلے پہنچ چکی تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ ایم اے ہیں اور اُن کا نام مسٹر جسٹن ہے وہ کچھ عرصہ اسکول میں کام کریں گے اِس کے بعد ملک سے باہر انہیں کوئی بڑی ملازمت مل جائے گی۔ مسٹر جسٹن کی ایک بات جس سے ہر طالب علم کو دلچسپی تھی۔ وہ یہ تھی کہ ڈسپلن کے معاملے میں بہت سخت تھے۔ اور اِس معاملے میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔ مسٹر جسٹن آئے اور انہوں نے بورڈنگ کے لڑکوں کو جمع کیا اور پہلی ملاقات میں یہ الفاظ کہہ دیے کہ میں اچھے لڑکوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرتا ہوں اور بُرے لڑکوں کو کبھی یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ سزا سے بچ سکیں گے۔

تیسرے دن مسٹر جسٹن نے پھر طلباء کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ اُن کے ہاتھ میں بید تھا، اور لڑکے اُن کے تیور دیکھ کر یہ سمجھ سکتے تھے کہ آج کسی کی شامت آئی ہوئی ہے۔

چند ثانیے بعد انہوں نے کہا۔ "جب سے مَیں یہاں آیا ہوں ایک لڑکا میرے پاس تین چار بار آیا ہے پہلے وہ صرف سلام کرتا تھا شاید اِس لیے کہ مجھے دو تین بار سلام کیا جاتے،

تو مَیں بے وقوف بن جاتا ہوں اور پھر اُس نے ایک اور لڑکے کی شکایات لگانا شروع کر دیں۔ شاید تم سمجھ گئے ہو گے۔ وہ لڑکا کون ہے؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ وُہ آگے آ کر کھڑا ہو جائے۔"

جب کوئی لڑکا نہ اُٹھا تو مسٹر جسٹن نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"انند رام آگے آ جاؤ!"

انند رام نے حکم کی تعمیل کی۔

مسٹر جسٹن نے کہا۔ "یوسف تم بھی آگے آ جاؤ۔"

مَیں اُٹھ کر چند قدم آگے بڑھا۔

مسٹر جسٹن نے انند رام کی طرف رُخ کر کے کہا۔

"دیکھو اِس بے وقوف لڑکے تمہارے لیے یہ صحیح جواب دینے کا آخری موقع ہے، ورنہ تمہیں وُہ سزا ملے گی جو تمہیں عمر بھر یاد رہے گی۔"

"اب بتاؤ کیا تم نے یوسف پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ اپنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے چھٹی ہوتے ہی بھاگ جاتا ہے اور اِس لیے بھاگ جاتا ہے کہ گاؤں کے آوارہ لڑکے اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں آتے ہوئے ڈرتے ہیں؟"

"جی! میں نے کہا تھا۔" انند رام نے کہا۔

"تم نے یہ الزام بھی لگایا تھا کہ یہ علی الصباح گاؤں کی طرف بھاگ جاتا ہے؟"

"جی! مَیں نے کہا تھا؟"

"یوسف! اب تم جواب دو۔ کہ چھٹی کتنے بجے ہوتی ہے؟"

"جی! چھٹی چار بجے ہوتی ہے" "اور تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟"

"جناب! دو میل سے کم ہے؟" "اور واپس کتنے بجے آ جاتے ہو؟"

"جناب! مَیں مطالعہ شروع ہو جانے سے پہلے آ جاتا ہوں۔"

"تم گھر جا کر کھانا کھاتے ہو۔"

"جی ہاں" ! "دو مرتبہ گھر جانے کی کوئی خاص وجہ بتا سکتے ہو؟"

"جی ! اُس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ امّی جان مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ اگر میں ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤں تو وہ بھوکی رہتی ہیں۔"

"تمہارے اور بہن بھائی بھی ہیں۔"

"جی ہاں ! میں اِس لیے بھی گاؤں جاتا ہوں کہ انہیں دیکھ کر مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

"تمہیں گھر میں کھانا کھانے اور باتیں کرنے کا اِتنا وقت مِل جاتا ہے کہ تم کھانا بھی کھا سکو، اور باتیں بھی کر سکو۔"

"جی ! واپس میں اپنی گھوڑی پہ آتا ہوں اور میرے ساتھ ایک آدمی ہوتا ہے۔ جو اُسے واپس گاؤں لے جاتا ہے۔"

ماسٹر جسٹن نے انندرام کی طرف دیکھا۔

"کیوں انندرام ! اب بتاؤ ! کیا یوسف نے کوئی بات غلط کہی ہے ؟"

"جی نہیں !"

"کوئی ایسی بات ہے جو یوسف نے نہیں بتائی ؟"

"جی نہیں ؟"

"کوئی ایسی بات ہے جس پر تمہیں کوئی اعتراض ہو؟

ہاں مجھے یاد آیا تم نے یہ کہا تھا کہ یوسف اپنے گاؤں سے گنّے اور گڑ منگواتا ہے اور لڑکوں میں تقسیم کرتا ہے۔ کیا تمہیں بھی اس نے کبھی گنّا اور گڑ دیا ؟"

"جی ! مجھے اِس نے گنّے بھی دیے تھے اور گُڑ بھی دیا تھا۔"

"مُفت دیا تھا یا تم سے پیسے لیے تھے ؟"

انندرام نے کہا "سَر میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ کسی سے پیسے لیتا ہے۔"

"تو پھر تمہیں کیا شکایت ہے ؟"

"سر اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے تو مجھے کوئی شکایت نہیں۔"

"یوسف تم اِس بے وقوف لڑکے کے مُنہ پر ایک تھپڑ مارنا پسند کرو گے یا زیادہ ؟"

یوسف نے جواب دیا "نہیں سر ! میں اس کے منہ پر تھپڑ مارنا پسند نہیں کرتا۔"

"اِس کے باوجود تم اس کے منہ پر تھپڑ مارنا پسند نہیں کرتے کہ اس نے تمہارے خلاف شکایتیں کی ہیں ؟"

سَر یہ بے وقوف ہے ۔ میرے تھپڑ کھا کر عقل مند نہیں ہو جائے گا۔"

مسٹر جسٹن نے کہا۔

"دیکھو انندرام ! میں اِس دفعہ تمہیں معاف کرتا ہوں لیکن آئندہ اگر تم نے کوئی حماقت کی تو اس بید سے تمہاری خوب تواضع کی جائے گی۔ اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

"ہم سٹڈی روم سے باہر نکلے تو انندرام کے خلاف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کئی لڑکے اس بات پر ناراض تھے کہ میں نے اسے تھپڑ کیوں نہیں مارا۔

باب ۔ ۱۹

ہمارے ایک رشتہ دار اپنے دَور کے ایک مشہور عالم دین تھے۔ انہیں طب کا شوق بھی تھا اور جڑی بوٹیوں کی تلاش میں دُور دراز کے مقامات کی سیاحت بھی کیا کرتے تھے۔ بڑے مشہور خطیب تھے اور جہاں جاتے تھے اپنا رنگ جما لیتے تھے۔

ایک مرتبہ وہ کشمیر کی سیاحت کے بعد واپس آئے تو وہاں سے کسی عقیدت مند نے انہیں ایک سواری کا جانور جسے وہ "یارقندی گھوڑا" کہہ کر اپنے مریدوں کو مرعوب کر دیا کرتے تھے۔ تحفے کے طور پر دیا۔ طویل مسافت میں بھُوکا رہنے کی وجہ سے اُس کی حالت قابلِ رحم ہو چکی تھی۔ قد اتنا چھوٹا تھا کہ مولانا جب چغہ پہن کر اُس پر سوار ہوتے تھے تو اُسے صرف قریب سے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ گھوڑے کی نسل سے ہے۔ گردن بہت چھوٹی تھی۔ اُس کے جبڑے قد کی نسبت زیادہ مضبوط اور بھاری معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں سے عیاری ٹپکتی تھی۔

مولوی صاحب کے زورِ خطابت کے باعث سُننے والوں کو اُن کے اَن گنت اوصاف نظر آ جاتے تھے، جب وہ یہ کہتے تھے کہ یہ تنگ اور پُر پیچ پہاڑی راستوں پر بے دھڑک چڑھ جاتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُسے کشمیر کے پہاڑوں میں بھاگتے اور کُودتے دیکھ

رہے ہیں۔ چوہدری غلام نبی کو مولوی صاحب سے کچھ زیادہ ہی اُنس تھا۔ اُس نے برادری کے دوسرے بزرگوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مولوی صاحب سے درخواست کی کہ اگر یہ نسل واقعی بہت قیمتی ہے تو اسے ہمارے پاس چھوڑ دیجئے۔ یہاں اسے ہمارے لہلہاتے کھیتوں میں کھلے بندوں پھرنے کی آزادی ہوگی اور دو تین مہینے جب یہ آزادی سے گندم کے کھیتوں میں گھومے پھرے گا، تو اس کی شکل تبدیل ہو جائے گی۔ قدوقامت اِس کا شاید زیادہ نہ بڑھ سکے لیکن جسامت میں دوگنا ضرور ہو جائے گا۔

مولانا نے خوش ہو کر کہا، "تو غلام نبی اب یہ گھوڑا پورا ایک سال تمہارے پاس رہے گا۔ اور اگر ایک سال یہ آزادی سے سرسبز کھیتوں میں پھرتا رہا تو پھر کوئی سوار اِس کے قریب نہیں جا سکے گا"۔

مولانا تو پھر کسی دُور دراز سفر پر چلے گئے۔ دیہاتی لوگوں نے یارقندی گھوڑے کو پہلے انگوٹھا ـــ پھر انگوٹھ ـــ اور بالآخر گوٹھ کہنا شروع کر دیا۔ اُس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ چند ماہ بعد گوٹھ کا لفظ کتنا مشہور ہو جائے گا۔

اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تمہارے دل میں کب سواری کا شوق پیدا ہوا تھا؟ اور تم نے کس سے سواری سیکھی تھی تو میں اس کا صحیح جواب نہ دے سکوں گا۔

گھر کا ہر بڑا ـــــ اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا تھا۔

جب مَیں پرائمری سکول میں پڑھتا تھا، مجھے کسی چھوٹے قد کے ٹٹو کی پُشت پر کُودتے ہوئے خوف نہیں محسوس ہوتا تھا۔ جب قبلہ مولوی صاحب کا "یارقندی گھوڑا" جو گاؤں میں گوٹھ کے نام سے مشہور رہا تھا۔ ہمارے گاؤں میں آیا تو میں ایک اچھا خاصا سوار بن چکا تھا۔ اور مَیں نے گوٹھ کی تعریف سُننے کے بعد اپنے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ جب یہ خوب مضبوط اور توانا ہو جائے گا تو سب سے پہلے میں اس پر سواری کروں گا۔

اور جب وہ گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں آزادی سے گھومتا پھرتا تو میں خوش ہوا کرتا۔
مَیں نے اُس کے ساتھ "دوستانہ مراسم" پیدا کرنے کے لیے اُسے گڑ کھلانے کی
کوشش بھی کی تھی لیکن وہ کسی کو قریب نہیں آنے دیتا تھا اور غلام نبی کہا کرتا تھا۔
"یار یہ تو بالکل جنگلی ہوتا جا رہا ہے"!

سردیوں کے دنوں میں گوٹھ رات کے وقت مویشیوں کے باڑے میں آجاتا تھا
جب موسم بہار آیا تو اُس کی جسامت میں ناقابلِ یقین اضافہ ہو چکا تھا۔ گردن موٹی ہو جانے
کے باعث اور چھوٹی نظر آتی تھی۔ گوٹھ چلتی ہوا میں دوڑتا تھا تو اُس کے لہراتے ہوئے بال
دُور سے نظر آتے تھے۔ اُس کے گلے میں رسّہ ڈال کر کسی جگہ باندھنا ایک مسئلہ تھا اس کے لیے
گاؤں کے مضبوط آدمیوں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں اور اسے باڑے کے ایک کونے
میں شہتوت کے ایک درخت کے نیچے باندھ دیا جاتا تھا۔

ایک دن جب نوکر نے اُسے لگام دینے کی کوشش کی تو اُس نے اگلے سُم اٹھا لیے
اور نوکر اُس کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ چوہدری غلام نبی نے مجھے آواز دی اور کہا "بھئی! یہ
تو لگام دیکھ کر حملہ کرتا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟"

مَیں نے نوکر سے کہا۔ تم رسّا کھونٹے سے کھول کر درخت کی شاخ کے اُوپر ڈال دو۔
اور پھر رسّے کو اِتنا کھینچو کہ گھوڑا ہل جُل نہ سکے۔ البتہ اس کی گردن اُوپر اٹھ جائے۔

اب چونکہ گھوڑے کی گردن اِتنی اُوپر ہو چکی تھی کہ اُس کے لیے اُچھلنے کودنے کی
گنجائش نہ تھی۔ اِس لیے مَیں نے اس کا جبڑا پکڑا اور غلام نبی نے اُس کے منہ میں لگام ٹھونس
دی۔

مَیں نے کہا "چچا! جلدی کرو زین منگواؤ پھر یہ قابو میں نہیں آئے گا"۔

نوکر بھاگ کر زین لایا۔ گھوڑا اُسے دیکھ کر تڑپا، اُچھلا، ایک دو بار ہولناک سی آواز
نکالی لیکن اُس کے بعد بے بس ہو گیا۔

غلام نبی نے اُسے کھولنے سے پہلے احتیاطاً دو آدمی اور بلوا لیئے تھے میں لپک کر
بید کی مضبوط چھڑی جسے میں سرکش گھوڑوں پر استعمال کیا کرتا تھا، لے آیا۔ تڑپتے،
اُچھلتے کودتے گھوڑے کو باڑے سے اِس طرح نکالا گیا کہ دو مضبوط آدمی اُس کی لگام تھامے
ہوئے تھے اور دو نے اُس کا رسّہ پکڑ رکھا تھا جب وہ گیٹ پر پہنچا تو رسّہ اس کی گردن سے
لپیٹ کر باندھ دیا گیا۔

ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ سواری کون کرے گا۔ مَیں نے آواز دی چچا غلام نبی!
میں آرہا ہوں اور اس کے ساتھ ہی مَیں نے دوڑ کر چھلانگ لگا دی اور زین پر بیٹھ کر نوکروں
کے ہاتھ سے لگام چھین لی۔

گوٹھ تڑپا، اُچھلا، کبھی وہ اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا تھا اور کبھی پچھلی ٹانگیں اُوپر کر کے
ہوا میں دولتیاں جھاڑتا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو چکے تھے اور غلام نبی کو
بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔

لیکن گھوڑے کو زیادہ دیر اپنے کرتب دکھانے کا موقعہ نہ ملا۔ مَیں نے رکابوں
کے اندر پاؤں جماتے ہی، اُس کی پیٹھ پر یکے بعد دیگرے دو چھڑیاں رسید کیں۔ وہ اُچھلا، رکا،
اور پھر ایک طرف بھاگ نکلا۔ اب وہ بھاگ رہا تھا اور میں اُسے خوب دوڑا رہا تھا۔ مجھے
پہلی بار اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ یارقندی نسل کے ناطے سے میں نے جو اُس کی خوبیاں
سنی تھیں وہ بے وجہ نہیں تھیں۔ اُس کا بار بار راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھٹکنے کو جی چاہتا تھا۔
لیکن میں اُس کی گردن پر چھڑی مار کر اُسے خبردار کر دیتا تھا۔ وہ راستہ بھی درست کر لیتا تھا اور
نسبتاً رفتار بھی تیز کر دیتا تھا۔

گاؤں کے کچھ لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے میرے پیچھے سوار ہو کر نکلے تھے لیکن وہ
بہت پیچھے رہ گئے۔ میں چند منٹ کے بعد بڑی نہر کے کنارے پہنچ کر یہ محسوس کر رہا
تھا کہ اب گوٹھ تھک چکا ہو گا۔ اُسے پٹڑی پر آرام سے چلنے دوں گا لیکن پٹڑی پر چڑھتے

ہی گوھٹ نے اچانک ایک جست لگائی اور مجھے نہر کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ کھانا پڑا۔ اگر میں تیراک نہ ہوتا تو یار قندی حضرت مجھ سے انتقام لے چکے تھے لیکن میں تیزی سے دو چار ہاتھ مارنے کے بعد باہر نکل آیا۔ اب گوھٹ کی باری تھی۔

پانی کافی گہرا تھا اور گوھٹ کے باہر نکلنے کی یہی صورت تھی کہ کنارے پر اُس کے پاؤں کسی جگہ جم جائیں لیکن ایسی جگہ وہاں نہیں تھی۔ مَیں اُسے چھڑی سے ڈرا کر پیچھے کر دیتا۔ سخت سرد پانی میں اُس کی تمام شوخیاں بہت جلد ختم ہو چکی تھیں۔ عام حالات میں مجھے یہ خونت ہونا چاہیے تھا کہ اگر میں ایک بار گر پڑا تو مجھے اس پر سوار کون کرائے گا لیکن وہ بُری طرح کانپ رہا تھا۔ دغاباز آنکھوں سے مسکینی اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔ میں نے ایک موزوں جگہ دیکھ کر اُس کی لگام پکڑ کر کھینچی اور وہ کنارے پر چڑھ آیا۔

میں نے اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ وہ نتھنوں سے ایک ایسی آواز نکال رہا تھا جس میں غصّے کی بجائے التجا تھی۔

میں اُس کی لگام پکڑ کر پیدل چل پڑا اور وہ میرے ساتھ آرام سے چلتا رہا۔ پھر میں اُس پر سوار ہونے لگا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ وہ گوھٹ نہیں، بلکہ جانوروں کی ایک انتہائی بے ضرر نسل سے تعلق رکھتا ہے۔

یہاں سے ہماری واقفیت شروع ہوئی گوھٹ مجھے پہچاننے لگ گیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی وہ آنکھیں پھیر لیا کرتا تھا اور شاید اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

مَیں نے میٹرک پاس کیا تو اَبّا جان میرے لیے ایک خوب صورت گھوڑی خرید لاتے تھے اور مَیں اس سے اِتنا مانوس ہو گیا تھا کہ مجھے سواری کے کسی اور جانور پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

سردیوں کے دنوں میں ہمارے ایک رشتہ دار ہمارے یہاں آئے وہ چند دن ٹھہرے،

اُن کے پاس بھی ایک گھوڑی تھی وہ میری گھوڑی کے ساتھ بہت مانوس ہو گئی۔ ایک دوپہر وہ رخصت ہوئے تو باہر کھیتوں میں میری گھوڑی چرچگ رہی تھی، وہ مہمان کی گھوڑی کے پیچھے چل پڑی۔ سہ پہر کا وقت تھا ——— مجھے گاؤں کے ایک آدمی نے بتایا کہ ایک آدمی گھوڑی پر سوار جا رہا تھا اور آپ کی گھوڑی اُس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی میری گھوڑی اپنی نئی دوست کے ساتھ اِتنی مانوس ہو چکی تھی کہ اس بات پر مجھے تعجب نہ ہوا۔

اب کئی مہینوں کے بعد گوھٹ کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ گوھٹ میرا اتنا لحاظ ضرور کرتا تھا کہ اُس پر سوار ہونے کے مراحل خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں۔ مَیں اُس گاؤں کی طرف چل پڑا جو کوئی سات آٹھ میل دور تھا۔ چونکہ رات سر پر آ رہی تھی اِس لیے میں کافی تیز دوڑا رہا تھا۔

میرا راستہ ایک نہر کی پٹڑی پر کوئی تین چار فرلانگ چلنے کے بعد اُس پل پر پہنچ جاتا تھا۔ جس کے پار جا کر مجھے اس گاؤں کا راستہ ملتا تھا۔

مغرب کے وقت میں کسی دِقّت کے بغیر اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں ہمارے رشتہ دار اور گاؤں کے دوسرے لوگ دیکھتے ہی جمع ہو گئے اور انہوں نے کہا "اُس بے وقوف نے نہر کے پُل پر آکر تمہاری گھوڑی دیکھی ہے۔ اور یہاں پہنچتے ہی گھوڑی کو دو آدمیوں کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا ہے۔ انہوں نے بڑی کوشش کی کہ میں وہاں ٹھہر جاؤں اور تسلی دی کہ گھوڑی پہنچ گئی ہو گی۔

لیکن مجھے گھوڑی سے اِتنا پیار تھا کہ مجھے اطمینان نہ ہوا۔ مَیں نے گوھٹ کی باگ موڑی اور السلام علیکم کہہ کر اُسے ایڑ لگا دی۔ اب رات ہو گئی تھی۔ پل عبور کرنے کے بعد نہر کی پٹڑی سے جو راستہ اُترتا تھا وہ میں اندھیرے کی وجہ سے نہ دیکھ سکا۔ شاید میں دو تین فرلانگ کی بجائے ایک یا دو میل آگے نکل آیا

دو دن قبل کافی بارش ہو چکی تھی اور راستے میں کافی کیچڑ تھا۔ میں رات کی تاریکی

میں واپس جاکر راستہ تلاش کرنے کی بجائے نیچے اُتر پڑا۔ میں کھیتوں میں کیچڑ سے لت پت ہو چکا تھا اور تاریکی میں صرف ستاروں سے اپنی سمت متعین کر سکتا تھا۔ مجھے ایک خدشہ ضرور تھا۔ کہ میں کہیں بے خبری کی حالت میں جرائم پیشہ قبیلے کی بستیوں میں نہ پہنچ جاؤں، یہ آٹھ دس گاؤں ایسے تھے جن کے آدمیوں کو علاقے کے تھانے میں حاضری دینی پڑتی تھی۔ اُن کی زمینیں اتنی اچھی نہیں تھیں۔ اِس لیے نقب زنی، رسّہ گیری اور چھوٹے چھوٹے ڈاکوں پر وُہ لوگ گذارہ کرتے تھے۔ کوئی بڑی واردات ان لوگوں سے منسوب نہ تھی۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ پولیس بلا وجہ انہیں تنگ کرتی ہے۔

اب مجھے اپنے "یار قندی" دوست کے متعلق جو ایک نیا تجربہ ہُوا، وہ یہ تھا کہ وُہ تاریکی میں بھاگتا ہُوا اچانک ایک جوہڑ میں کُود پڑا۔ میں نے یکے بعد دیگرے اُسے دو تین چھڑیاں ماریں، وہ کُودا اور چھلانگ لگا کر باہر نکلا۔ اور پھر میں نے دیکھا کہ ایک عورت چولہے پر روٹیاں پکا رہی ہے۔ یعنی میں ان جرائم پیشہ لوگوں کی بستی میں نہیں، بلکہ کسی کے گھر جا پہنچا تھا۔ بھائی کون ہے؟ بھائی کون ہے؟ عورت چلّائی۔

میں نے جواب دینے کی بجائے گھوڑے کو دو چھڑیاں رسید کیں اور چھوٹی سی گلی سے نکل کر پھر کسی کھیت میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد کئی طرف سے آوازیں آرہی تھیں "اے کون ہے؟ تم اِدھر سے جاؤ دیکھو کون ہے؟ ہم ادھر سے جاتے ہیں۔ اگلے گاؤں کو خبردار کرو۔ ہم سے پُوچھے بغیر یہاں کون آگیا ہے"۔

پھر کئی عورتیں بول رہی تھیں اور میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں

اب میری کوشش یہ تھی کہ ان آوازوں سے دُور چلا جاؤں۔ میں زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ دوسری طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

"یار اُدھر سے آوازیں آرہی ہیں کہ کوئی گروہ اِدھر سے آیا ہے"۔

میں نے گھوڑے کو روک لیا اور اُس کی گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دو آدمی بھاگتے ہوئے آئے۔

یار! اِدھر تو کوئی نہیں۔ اُن میں سے ایک کہہ رہا تھا۔

پھر پیچھے سے آوازیں آنے لگیں۔ "ارے! کوئی پتہ چلا؟"

یہ دو آدمی بالکل قریب آگئے تو میں نے کہا "ٹھہر جاؤ! وہ رُکے۔ تم اس وقت کہاں بھاگے پھرتے ہو؟" انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ذرا غصّے سے کہا "بیوقوف! بولتے کیوں نہیں؟ میں پوچھتا ہوں پولیس کہاں ٹھہری ہے"۔

ایک نے کہا "جی پولیس اِدھر نہیں آئی ہے؟"

"اگر نہیں آئی تو لوگ بھاگے کیوں پھرتے ہیں؟"

"جی ہمیں کچھ معلوم نہیں، ہم دوسروں کا شور سُن کر آئے ہیں"۔

"ہمارے آدمی پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر تم بتا دو کہ کارخانے کی بتیاں کس طرف ہیں تو میں ابھی راستہ تلاش کر کے انہیں ڈھونڈ لوں گا"۔

دیہاتی نے کہا "جناب کارخانے کی بتیاں اگلے گاؤں سے نکلتے ہی آپ کو نظر آجائیں گی"۔۔۔

"چلئے۔ مَیں آپ کے ساتھ چلتا ہوں"۔

اچھا چلو! اور اپنے ساتھیوں سے کہہ دو کہ اگر دوسری طرف سے کوئی آئے تو وُہ یہ کہہ دیں۔ کہ غلام قادر حوالدار، تھانے دار صاحب کا راستہ دیکھنے گیا ہے۔

دوسرے آدمی نے کہا "حوالدار صاحب آپ فکر نہ کریں، اگر اس علاقے میں پولیس کا کوئی آدمی آیا ہے تو اُسے بہت جلد یہ پیغام مل جائے گا"۔

"اب آپ بتیاں دیکھ کر خود راستہ تلاش کر لیں گے یا ہمارا آدمی آپ کے ساتھ کچھ دُور تک جائے"۔

"نہیں! مہربانی اس کی ضرورت نہیں"۔ مَیں نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

کوئی ایک میل چلنے کے بعد اگلے گاؤں کی دوسری طرف

مجھے کارخانے کی بتّیاں دکھائی دیں۔ اب مجھے معلوم تھا کہ ان بتیوں کی سیدھ میں چلتا رہوں تو کارخانے والے شہر سے ———— دو میل اُس طرف میرا گاؤں واقع ہے۔

باب ۔ ۲۰

گاؤں کے چھوٹے اور بڑے گھروں سے باہر نکل کر میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی، بیک وقت کئی آوازیں آئیں "گھوڑی پہنچ گئی ہے۔ گھوڑی پہنچ گئی ہے" پھر انہوں نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے گھوڑے سے کود کر انہیں جواب دیا۔

"مجھے گھوڑی کی تلاش میں بہت دُور جانا پڑا تھا۔ اور پھر واپسی پر میں راستہ بھول گیا"

پھر میں نے ایک نوکر سے کہا "تم بھاگ کر جاؤ اور ہمارے گھر سے بہت سا گُڑ لے کر آؤ"

نوکر گُڑ کی بھیلی لے آیا تو میں نے گھوڑے کی لگام اتاری اور گُڑ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر اُسے کھلانا شروع کر دیا۔ غالباً یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں بے تکلفی سے اپنا ہاتھ اُس کے منہ کے قریب لے گیا اور اُس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اُس کے منہ میں دانت ہیں۔ میں نے تین چوتھائی بھیلی اُسے کھلا کر باڑے میں بھجوا دیا اور باقی ماندہ گُڑ اپنی گھوڑی کو کھلا دیا۔

پھر میں نے نہا دھو کر کپڑے تبدیل کیے تو باورچی خانے سے امّی جان کی آواز آئی۔

"یوسف! تمہارا کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

میں نے کہا "امی جان! میرا خیال تھا کہ آپ سو گئی ہوں گی۔"

"جھوٹا کہیں کا!" ماں نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ جب تم آئے تھے تو میں تمہاری دادی اور تمہاری چچیاں سب گھر سے باہر نکل کر تمہارا راستہ دیکھ رہی تھیں اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہاری دادی اماں اس وقت شکرانے کے نوافل ادا کر رہی ہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "امی جان! مجھے ایک بات اور معلوم ہے کہ جب میں مکان کے اندر داخل ہوا تھا۔ تو آپ میرے لیے مرغی بھون رہی تھیں۔"

ماں نے پوچھا۔ "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"امی جان! بھوک لگی ہوئی ہو، تو بھونے جانے والے گوشت کی خوشبو بہت دور سے آجاتی ہے۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹا! جو ماں سمجھ سکتی ہے وہ کوئی اور نہیں سمجھ سکتا۔ میں نے عشاء کے وقت شور مچانا شروع کر دیا تھا کہ فوراً ایک مرغی ذبح کر لی جائے اگر میرا بیٹا دیر سے آیا تو اسے بہت بھوک لگ رہی ہو گی لیکن سب یہی کہتے تھے کہ وہ راستے میں کسی کے گھر سے کھانا کھا کر آئے گا۔ یوسف! یہ عجیب ہے کہ تمہارے متعلق جو کچھ میں سوچتی ہوں وہی درست ہوتا ہے۔"

"امی جان! آپ کے سوا اور کون ہے۔ جو میرے متعلق ایک ماں کی طرح سوچ سکتا ہے۔"

ماں نے چراغ کی روشنی میں میری طرف غور سے دیکھا اور پھر میرا سر اپنے سینے کے ساتھ بھینچتے ہوئے۔ اپنے ہونٹ میری پیشانی پر ثبت کر دیے۔ پھر وہ بولیں! "دیکھو یوسف! مجھے نہ ستایا کرو! جب مجھے پتہ چلا کہ تم اپنی گھوڑی کی تلاش میں

چلے گئے ہو تو میرے لیے یہ لمحہ قیامت سے کم نہ تھا۔ تمہیں میرے پیار کی حقیقت اس وقت سمجھ میں آئے گی۔ جب میں ــ جب میں، اُن کی آواز بھرا گئی۔ میں نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا تو اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"امی جان! مجھے معاف کر دیجئے! مجھ سے غلطی ہوئی ہے۔ مجھے آپ کو بتا کر جانا چاہیے تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا ــــــ آئندہ کبھی ایسا نہیں ہوگا!"

ایک منٹ بعد جب امی جان نے کھانا میرے سامنے رکھ دیا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی جان! ایک بات اور بتاؤں۔"

"بتاؤ! بیٹا!"

"امی جان! بات یہ ہے کہ آپ بھی بھوکی ہیں"

"تمہیں کیسے معلوم ہُوا؟"

"امی جان! جب مجھ سے کوئی ایسی حماقت ہوتی ہے تو آپ کھانا نہیں کھایا کرتیں!"

ماں جی میرے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئیں۔

ایک ہفتہ بعد قبلہ مولوی صاحب تشریف لائے اور چند دن قیام کرنے کے بعد گوٹھ کو اپنے ساتھ لے گئے اور قریباً تین مہینے بعد دُور دراز علاقوں میں مصروف رہے اور راستے میں گھوڑا کسی خوشحال زمیندار کے پاس چھوڑ گئے۔ جو اس کی بے حد تواضع کرتا تھا۔ جب وہ واپس تشریف لائے تو گوٹھ کو غلام نبی کے پاس چھوڑ گئے۔ لیکن اتنی طویل غیر حاضری کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی دیواریں پھر حائل ہو چکی تھیں۔ گوٹھ کافی فربہ نظر آتا تھا اور چوہدری غلام نبی کے دل میں یہ حسرت ایک مدت سے تھی کہ اس میں کچھ

شائستگی پیدا کی جائے۔ وُہ اِتنا مانوس ضرور ہوگیا تھا کہ اُن کے ہاتھ سے چنے اور گڑ کھا لیتا تھا اور اس بات کی بھی اجازت دیتا تھا کہ وہ لگام دے لیں اور زین بھی ڈال لیں۔ لیکن کسی سوار کے لیے اُچھل کُود سے باز رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔

ایک مرتبہ غلام نبی کو لے کر وہ کماد کے کھیت میں گھُس گیا تھا اور بیس منٹ اُسی کھیت میں بھاگتا دوڑتا رہا۔ غلام نبی نے کماد کے پتوں کی کاٹ سے اپنی آنکھیں بچالی تھیں لیکن اس کا چہرہ اور ہاتھ بُری طرح زخمی ہو گئے تھے۔

بہت کم خوش نصیب لوگ ایسے تھے جنہیں وہ اپنی روداد سنایا کرتا تھا۔

ایک دن اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"یوسف سچ بتاؤ ——— کہ تم اس پر سواری کرتے وقت کیا پڑھا کرتے ہو۔"

"چچا! میں تو کوئی خاص چیز نہیں پڑھا کرتا تھا۔ البتہ ہر کام شروع کرتے وقت میں اللہ کی اعانت کی دعا کیا کرتا ہوں اور یاحفیظُ یاحفیظُ ضرور کہا کرتا ہوں۔"

غلام نبی بولا "یار! اب اس پر ایسی دعاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

"بات یہ ہے کہ اِس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ گھوڑے کے لیے ایک اچھے سوار کا ہونا ضروری ہے۔ جو اس پر باقاعدہ سواری کرتا رہے۔ اب گوٹھ بیچارے کی بدقسمتی یہ ہے کہ چار چار مہینے اس پر سواری کوئی نہیں کرتا۔"

غلام نبی نے کہا "یار! اب اس کا رعب اتنا ہو گیا ہے کہ سب اس سے ڈرتے ہیں۔ مَیں نے سُنا ہے کہ تم بھی اُس سے ڈرتے ہو۔"

"چچا! آپ کو کس نے بتایا کہ میں اُس سے ڈرتا ہوں؟"

غلام نبی نے کہا۔ "وہ کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یوسف مجھ سے ڈرتا ہے۔ البتہ گاؤں کے لوگ ضرور یہ بات کہتے ہیں۔"

"چچا جان! آپ اُن سب کو بلالیں۔ میں ابھی اُس پر سواری کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

یہ کوئی تین بجے کا وقت تھا۔ میں گوٹھ پر سوار ہوگیا۔ اُس نے حسب معمول اپنے سارے کرتب دکھائے لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

پھر میں نے اُسے ایک دائرے میں دوڑانا شروع کیا اور وُہ آرام سے بھاگنے لگا۔

ایک کھیت کے کنارے پھلاہی کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا اور گوٹھ کو جس دائرے میں مَیں بھگا رہا تھا۔ اُسے ان خار دار جھاڑیوں کے قریب لے جانے کے لیے ذرا بڑھا دینے کی ضرورت تھی۔ دو چکر لگانے کے بعد وہ جھاڑیوں سے قریب ہوگیا۔ البتہ تیسرے چکر میں اُس نے اچانک اپنا رُخ بدل لیا اور سیدھا جھاڑیوں میں جا گھُسا اور وہ گھسا بھی کچھ اس طرح کہ اُس نے اپنا جسم سمیٹ لیا۔ اتنا سمیٹ لیا کہ اُسے نچلی شاخوں کے نیچے کافی جگہ مل گئی۔ لیکن مجھے اپنا چہرہ بچانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کام لینا پڑا۔ پھلاہی کے کانٹے سیدھے اور لمبے ہونے کی بجائے چھوٹے اور ٹیڑھے ہوتے ہیں اس لیے وہ جسم پر خراش تو لگا دیتے ہیں اِس سے زیادہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم یہ تھا کہ مَیں نے ہر وقت اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ کر اپنی آنکھیں بچالی تھیں۔ باقی زخم میرے لیے بے معنی تھے اور اِس مصیبت سے نجات حاصل کرتے ہی مَیں غلام نبی کے ساتھ دل لگا کر قہقہے لگا رہا تھا اور اس مصیبت سے دراصل میں نے نجات اس طرح حاصل کی تھی کہ گوٹھ کی لگام تو اپنے ہاتھ میں رکھی مگر کابوں سے اپنے پاؤں نکال لے اور پھر رینگتا ہُوا۔ جھاڑیوں سے باہر نکل آیا۔ رینگنا گوٹھ کے بس کی بات نہ تھی اور جگہ اتنی تنگ تھی کہ اس کے لیے کھڑا ہونا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ جب وہ چھڑیاں کھانے کے بعد مجبوراً باہر نکلا تو اُس کے جسم کی خراشیں

مجھ سے کہیں زیادہ تھیں اور اُس پر اُسی قسم کا خوف طاری تھا جو میں نے پہلے تعارف
میں ٹھنڈے پانی کی نہر سے بے بسی کی حالت میں نکلنے کے بعد دیکھا تھا

مَیں نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا تو اُسے اطمینان ہُوا۔ مَیں نے آواز دی "چچا غلام نبی
اب آپ اطمینان سے اِس پر سواری کر سکتے ہیں۔"

غلام نبی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"نہیں بھئی! اس پر سواری کرتے ہوئے آنکھوں کی حفاظت کے لیے لوہے کے خود
بنوانے پڑیں گے ...... یا سارے علاقے کے کانٹے دار درخت تلف کرنے پڑیں
گے۔"

"یار ایہ مجھے ویسے ہی چلتا پھرتا اچھا لگتا ہے۔ سواری کو گولی مارو!

"چچا! اِس کے ساتھ دوستی کرنا ہے تو اس پر روز سواری کیا کرو۔ اور
اِسے اپنے ہاتھ سے گڑ کھلایا کرو۔"

غلام نبی نے کہا۔" دیکھو! بیٹا! یہ نہیں ہو سکتا کہ دوستی تو میری رہے
لیکن سواری کی تکلیف تم کر لیا کرو؟"

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں اسلامیہ کالج لاہور پہنچ گیا۔ یہ عظیم شہر جس کی
پرانی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ پر مسلمانوں کے ماضی کی داستانیں نقش تھیں
مجھے ایک طلسم کدہ معلوم ہوتا تھا۔ قدیم عمارات کو دیکھ کر میں یہ محسوس کیا کرتا تھا کہ میں
مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار سے گزر رہا ہوں۔ لاہور میں مسلمانوں کی حالت
دیکھ کر مَیں زیادہ شدت سے اپنے مستقبل کے متعلق سوچا کرتا تھا اور اسلامیہ کالج کے
ماحول میں مَیں جو نئے افق دیکھا کرتا تھا وہاں مجھے منزلِ پاکستان آئے دن زیادہ حسین
اور زیادہ قریب دکھائی دیتی تھی۔ میرا اٹھنا بیٹھنا ان طلبا کے ساتھ تھا جو علامہ اقبال کا
کلام پڑھا کرتے تھے اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے لگایا کرتے تھے۔

پہلے سال کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ میں نے کالج کے ہوسٹل میں اپنے
لیے ایک ٹائم ٹیبل بنا لیا تھا اور اس پر بڑی سختی سے عمل کیا کرتا تھا۔ مَیں انگریزی
اور اردو اخبار باقاعدگی سے پڑھا کرتا تھا۔ ہوسٹل میں تین لڑکے ایسے تھے جو میرے
ساتھ علی الصباح سائیکلوں پر دریائے راوی تک جایا کرتے تھے اور وہاں ایک گھنٹہ
کشتی رانی کیا کرتے تھے واپس آکر ناشتہ کرتے اور کالج چلے جاتے تھے۔
جب ہمیں پی ٹی کے لیے اٹھنا پڑتا تھا اور ڈار صاحب لارنس گارڈن تک دوڑاتے
تھے تو یہ سارے کام منسوخ ہو جاتے تھے۔ کالج میں جب کوئی گھنٹہ خالی ہوتا
تھا تو میں سیدھا لائبریری پہنچتا تھا اور وہاں کوئی میگزین کتاب یا اخبار پڑھنا
شروع کر دیتا تھا۔ گروپ میٹنگ میں میری ملاقات فسٹ ایئر کے ایک طالب علم
منظور احمد سے ہوا کرتی تھی اور ہم بہت جلد بے تکلف دوست بن گئے تھے۔

کالج میں میرا دوسرا سال تھا۔ کرسمس کے دنوں میں گھر پہنچا تو ابا جی جو چھٹی پر
آئے ہوئے تھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا "تمہیں شکار
کا بہت شوق ہے تو پرسوں صبح میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

جب ہم شکار پر روانہ ہوتے تو ابا جان کے ایک نوکر کے علاوہ میرا ایک
چچا زاد بھائی اور گاؤں کا ایک اور آدمی ہمارے ساتھ چل پڑے۔ ہمارے
گاؤں سے کوئی آٹھ میل دُور وہ وسیع چھمب تھا۔ جسے ضلع کی سب سے بڑی
شکار گاہ سمجھا جاتا تھا...... ہمارا قیام علاقے کے ایک بہت بڑے زمیندار
کے گھر پر تھا۔

ابا جان جھیل کے کنارے کسی جگہ بیٹھ جاتے تھے اور وہاں مجھے شکار کھیلنے
کی آزادی تھی۔

مَیں نے پہلے دن جو شکار مارا وہ بیشتر ہماری دعوتوں میں ختم ہو گیا۔

اگلے دن ہم علی الصباح شکار کے لیے گئے اور میں دو گھنٹے کے اندر اندر پچیس مرغابیاں شکار کر چکا تھا اور میں نے فوراً واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے دن کی بچی ہوئی مرغابیوں میں سے آٹھ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیں اور باقی انھیں فوراً ہمارے گھر پہنچانے کی تاکید کر کے روانہ کر دیا اور گھر پر سستانے کے بعد ہم مزید شکار کی امید پہ دوسرے راستے گاؤں کی طرف چل پڑے۔

دوپہر کے وقت راستے میں ابا جان نے ایک اور دوست کے ہاں کھانا کھایا اور وہاں سے چل پڑے۔ عصر کی نماز ہم نے ایک نہر کے کنارے ادا کی اور آگے چل پڑے۔ اچانک مجھے بڑی مُرغابیوں کی ایک قطار اُڑتی ہوئی نظر آئی جب میں بندوق سیدھی کرنے لگا تو ابا جان نے کہا "نہیں بیٹا، وہ بہت دُور ہیں"

میں نے کہا "ابا جان! جب وہ بہت قریب آ جائیں گی تو میں فائر کروں گا۔ دیکھیے یہ نیچے آ رہی ہیں۔ شاید راستے میں ہم نے جو چھوٹی سی جھیل دیکھی ہے یہ وہاں اتر جائیں۔"

"بیٹا یہ مگ ہیں اگر تم ان میں سے ایک دو شکار کر لو تو تمھیں انعام ملے گا۔"

"میں مرغابیوں کے رُخ پر تیزی سے بھاگنے لگا۔ مرغابیوں کی آوازیں بتدریج قریب آ رہی تھیں۔ کماد کے کھیت کی اوٹ سے نکلنے کے بعد میں نے یکے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ دو مرغابیاں میرے سامنے گریں جنھیں میں نے ذبح کر لیا، لیکن تیسری مرغابی جو کچھ فاصلے پہ کماد کے کھیت کے قریب گری تھی۔ ہم تلاش نہ کر سکے۔

ابا جان بہت خوش ہوئے۔ میں نے پوچھا۔

"جی! وُہ انعام کیا تھا، جو آپ مجھے دینا چاہتے تھے؟

نوٹ: مگ بہت بڑی مرغابی کی ایک قسم

ابا جان نے کہا: "تمہارا انعام تمہارے ہاتھ میں ہے۔ مجھے سوچ کر یہ بتاؤ کہ تم یہ بندوق لینا پسند کرو گے یا تمہارے لیے نئی بندوق خرید لی جائے؟"

اُس وقت میرے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی، پھر کچھ دیر سوچ کر میں نے جواب دیا۔

"ابا جان! یہ بندوق بہت ہلکی ہے اور مجھے بہت بہت پسند ہے۔ آپ کوئی بڑھیا قسم کی نئی بندوق لے لیں۔"

"بہت اچھا بیٹا! میں واپس جانے سے پہلے یا جب دوبارہ آؤں گا تو یہ بندوق تمہارے نام کروا دوں گا" اور میں اتنا خوش تھا کہ مجھے باقی سفر محسوس تک نہ ہوا۔

شام کے قریب ہم عبدالکریم کی حویلی کے سامنے سے گزرے وہ پھاٹک کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بعد وہ اصرار کر کے چائے پلانے کے لیے اندر لے گیا۔ اُس کی حویلی میں بیٹھک کے علاوہ اُس کے رہائشی مکان کے چار نئے کمرے نیچے اور دو کمرے اُوپر تعمیر ہو چکے تھے۔ ابا جی نے مکان کو ایک نظر دیکھتے ہی کہا۔

"بھئی عبدالکریم یہ تو کمال کر دیا آپ نے! یہ گھر تو اچھی خاصی کوٹھی معلوم ہوتا ہے۔"

"جناب! ساری عمر یہی کام کرتا رہا ہوں۔ یہ علاقہ مجھے بہت پسند ہے پہلے تو میرا خیال یہی تھا کہ حویلی کے اندر دو تین کمرے کافی ہوں گے۔ اب میرے بال بچّوں کو یہاں کی آب و ہوا اس قدر پسند آئی ہے کہ وہ زیادہ وقت یہیں گزارنا چاہتے ہیں۔ امینہ پہلے ایسی اجاڑ جگہ میں قدم رکھنے سے بہت ڈرتی تھی۔ اب وہ کہتی ہے کہ میں گرمیوں کی چھٹیاں بھی یہیں گزارنا چاہتی ہوں۔ جب وُہ دو چار دن یہاں رہ کر جاتی ہے اُس کی صحت بہت اچھی ہو جاتی ہے۔"

نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ ابا جان نے مغرب کی نماز کے لیے جائے نماز مانگی تو عبدالکریم پریشان سا ہو کر اندر چلا گیا۔ اُس کی بیوی ایک سفید چادر نکال لائی اور سلام کرنے کے بعد بولی۔

"بھائی جی! آپ اسی پر نماز پڑھ لیں۔ ابھی ہمارا سامان نہیں آیا۔"

میں نے چادر اُس کے ہاتھ سے لیکر بیٹھک کے ایک کونے میں بچھا دی۔

نماز سے فارغ ہو کر جب ہم دوسرے کمرے میں چائے کے لیے بیٹھے تو امینہ جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سلام کرنے کے بعد تذبذب کے عالم میں اپنے باپ اور امّی کی طرف دیکھنے لگی۔ ابا جان نے پوچھا۔

"بیٹی آپ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں؟"

"اُس نے امی جان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ اگلے سال دسویں جماعت میں ہو جاؤں گی۔"

عبدالکریم بولا۔ میاں جی! میری بیٹی سات بیٹوں کے برابر ہے۔ اس کی اُستانیاں کہتی ہیں کہ میٹرک میں بہت اچھی پوزیشن لے گی۔"

رشیدہ نے کہا "میاں جی! اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ ماشاء اللہ! آپ کا یوسف بھی تو ہزاروں میں ایک ہے۔ اس علاقے کے کسان اور ان پڑھ لوگ بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ انشاء اللہ آپ کا نام روشن کرے گا۔"

"میں نے امینہ کی طرف پہلے کبھی توجہ نہ دی تھی۔ تاہم بہت دُبلی پتلی سی لڑکی اب کافی صحت مند اور پرکشش بن چکی تھی۔ ابا جان نے چائے پینے کے بعد کہا۔

"یوسف! باہر سے نوکر کو بلاؤ اور جس تازہ شکار سے تم نے اَنعام حاصل کیا ہے۔ وہ ان کو پیش کر دو۔ جب بڑی مرغابیاں عبدالکریم کو پیش کی گئیں تو انہوں نے کہا۔

"میاں جی! یہ بہت بڑی ہیں۔ ہمارے لیے ایک ہی کافی ہے۔" دوسری آپ اپنے پاس ہی رکھ لیں۔

ابا جان نے کہا۔ "میاں صاحب! ہمارے گھر میں کافی شکار پہنچ چکا ہے۔ آپ یہ مزے سے کھائیں!"

جب ہم رخصت ہو رہے تھے تو امینہ نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا اور وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی!

"بیٹا! یوسف! امینہ تمہاری امی، دادی اور تمہاری چچیوں اور بہنوں کو کسی دن آپ کے گھر جا کر دعوت دے گی۔"

ابا جان نے کہا "بیٹی! دعوت دینا ہمارا فرض ہے!

تمہارا جب جی چاہے ہمارے گھر آ جایا کرو۔ پھر کسی اچھے موقع پر انہیں تمہارے گھر آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

راستے میں مجھے ابا جان کہہ رہے تھے۔

"بیٹا! عبدالکریم ایک اچھا آدمی ہے۔ کبھی کبھی تھوڑی سی بے وقوفی کر لیتا ہے اور یہ بات ہر مالدار آدمی میں ہوتی ہے۔ وہ لڑکی بہت اچھی ہے لیکن اُس کی ماں ذرا چالاک ہے لیکن جب خاوند ذرا زیادہ سیدھا ہو تو عورتیں چالاک ہو ہی جایا کرتی ہیں۔"

اور میں ابا جان کی باتوں پر توجہ دینے کی بجائے بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ اگر امی جان وہ بڑی مرغابیاں دیکھتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔ جب وہ ایک اپنے لیے کافی سمجھتے تھے تو ابا جی نے دوسری دینے پر اصرار کیوں کیا تھا۔ مجھے جس قدر بندوق حاصل کرنے کی خوشی تھی اسی قدر عبدالکریم اور اس کی بیٹی پر غصہ آ رہا تھا۔"

منظور احمد کے چچا ڈلہوزی میں نائب تحصیلدار تھے میری طرح انہیں
کانگڑہ جانے کا بھی بڑا شوق تھا۔ ایف اے کے امتحان سے چند روز قبل منظور احمد کے
چچا کا خط آیا کہ جب چھٹیاں ہوں تو تم چند دن کے لیے یہاں آجاؤ۔ اس نے جواب
میں یہ لکھ دیا کہ میرا ایک دوست بھی کانگڑہ دیکھنا چاہتا ہے تو چچا نے لکھا بیٹا تمہارے
جتنے دوست آئیں ان کے لیے جگہ کا انتظام ہوسکتا ہے۔ چنانچہ منظور احمد نے کالج کے
ایک دوست محمود خان کو اپنی ٹیم میں بھرتی کر لیا۔ امتحان ختم ہوتے ہی ایک دن ہم بس
پر سوار ہوتے اور ڈلہوزی جا پہنچے۔ دو دن ڈلہوزی گھوم کر ہم کانگڑہ کی طرف چل پڑے۔
منظور احمد کے چچا نے دھرم سالہ میں ہمارے قیام کے لیے ایک دوست کے ہاں انتظام
کر دیا تھا اور ان کی ہدایت کے مطابق ہم نے اپنے کھانے اور چائے کا بندوبست ایک
دکان نما ہوٹل میں کر لیا تھا۔ کانگڑہ کے پہاڑوں کی سیاحت میرے ان خوابوں کی تعبیر تھی جو میں
بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ کئی کئی میل پیدل چلنے کے باوجود تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوتا
تھا۔ جب میرے ساتھی نڈھال ہو کر سو جایا کرتے تھے تو میں تنہا کسی طرف نکل جایا
کرتا تھا۔ پانچویں دن وہاں سے واپس آتے ہوئے میں اپنے ساتھیوں کو اپنے گاؤں
لے آیا وہاں وہ ایک رات ٹھہرے اور اگلے روز چلے گئے۔ گھر پہنچتے ہی چچا فتح محمد
نے سخت شکایت کے لہجے میں کہا تھا "دیکھو یوسف! اگر تمہیں فرصت ملی تھی تو لاہور
سے کانگڑہ جانے کی بجائے چند دن کے لیے سکھر سے ہو آتے۔ تم نے ان سے وعدہ
بھی کیا تھا"

امی جان نے بھی ان کی تائید کی تو میں نے جواب دیا "چا چا جی میں کانگڑہ سے
ایک لمبے سفر کی تیاری کر کے آیا ہوں۔ دیکھیے نا پچھلے دنوں میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ
سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ اب پہاڑوں میں ذرا سخت جان بن کر آیا ہوں۔ وہاں پہاڑ اتنے
اونچے تھے کہ میں بادلوں سے اونچا چلا جایا کرتا تھا۔ اب جس وقت امی جان اجازت

دیں گی میں سکھر چلا جاؤں گا۔ پھر یہ اتفاق تھا کہ جب میں سکھر پہنچا تو پتہ چلا کہ حسین احمد
چھٹی لے چکے ہیں اور گھر آنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ احمد خان
صاحب ان کے دوست تھے اور حسین احمد صاحب میری خاطر اپنی چھٹی منسوخ کروانا
چاہتے تھے تو انہوں نے یہ کہا آپ یوسف صاحب کو سیر کروانے کے لیے اپنی چھٹی
منسوخ نہ کروائیں۔ انھیں میں اپنے ساتھ کوئٹہ لے جاؤں گا۔ یہاں سے اتفاقات کا
ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ایک انتہائی معزز خاتون بیگم فریدہ احمد
اور ایک بہت ہی پیاری بچی نسرین اور ان کے عزیزوں سے متعارف ہوا ہوں اور
اس وقت میں ان لوگوں کا مہمان ہوں جو میرے لیے قطعاً اجنبی تھے۔ اور ان کے متعلق
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ان اتفاقات کے باعث ایسے لوگوں سے بھی متعارف
ہونے والا ہوں جو میری زندگی پر گہرا اثر ڈالیں گے۔

ننھی نسرین جس کے لیے میں نے دیکھتے ہی شہزادی نسرین کا نام پسند کیا تھا۔
جب گفتگو کرنے پر آتی ہے تو بہت کچھ بتا جاتی ہے۔ اُس نے جس معصومیت کے ساتھ
اپنے والدین، اپنے بھائی، اپنی بڑی بہن کا ذکر کیا ہے اس کا اثر یہ تھا کہ ان کی تصویریں
میرے دل پر نقش ہو گئی ہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ان مسکرانے، ہنسنے اور پیار
کرنے والے لوگوں کو مدت سے جانتا ہوں۔ نانی اپنی نواسی یا کسی اور رشتہ دار سے
جب نسرین کی بڑی بہن کے متعلق کوئی بات کرتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نسوانیت
کی جن خوبیوں کا تصور کیا جاتا ہے وہ تمام فہمیدہ میں موجود ہوں گی۔ نسرین جیسی خوب صورت
بچیاں خود پسند بھی ہو سکتی ہیں لیکن وہ فہمیدہ سے بے پناہ پیار کرتی ہے اور بات بات
پر اس کا ذکر لے بیٹھتی ہے۔

یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ وہ واپسی کا سفر میرے ساتھ کر رہی ہیں۔ نسرین نے
یہ فرض کر لیا ہے کہ میں گھر پہنچنے تک ان کے ساتھ رہوں گا۔ وہ بہت خوش ہے اور

کئی بار یہ کہہ چکی ہے۔

"بھائی جان میری آپا آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گی۔" اور جب وہ سب یہ کہیں گے کہ آپ چند دن کے لیے یہاں رُک جائیں تو آپ انکار نہیں کر سکیں گے اگر آپا مغموم ہو کر رو پڑی تو پھر آپ کے لیے ہمارے گھر سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا اور مجھے اس بات سے بہت خوشی ہو گی۔

اس وقت مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں جس قدر زیادہ ایسے نیک اور پاکباز لوگوں کے متعلق سوچتا ہوں اسی قدر حصولِ پاکستان کے لیے اپنی تڑپ میں اضافہ محسوس کرتا ہوں۔ رات کے سناٹے میں مَیں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی لاکھوں بستیوں اور ہزاروں شہروں میں بسنے والے ان مسلمانوں کے متعلق سوچتا ہوں جو اس وقت گہری نیند سو رہے ہوں گے اور میں برہمنی استبداد کے اس عفریت کو بھی کروٹیں لیتے دیکھ رہا ہوں جو برطانوی سامراج کا جانشین بننا چاہتا ہے اور میرے دل سے درد بھری چیخوں کے ساتھ یہ دعا نکلتی ہے کہ میرے اللہ مجھے یہ ہمت دے کہ مَیں اپنی قوم کو مستقبل کے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے بیدار کر سکوں۔ میرے قلم کو یہ طاقت دے کہ اس سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لوگوں کے دل میں اتر جائے اور مَیں اپنی آنکھوں سے منتشر افراد کو قافلوں کی صورت اختیار کرتے دیکھوں اور یہ قافلے ایک سیلِ ہمہ گیر کی طرح آگے بڑھیں اور برصغیر میں اپنے آخری دفاعی حصار پر پاکستان کا پرچم نصب کر دیں۔ میرے اللہ مجھے وہ عزم و یقین عطا کر کہ میں بے دھڑک ملت کی اجتماعی سلامتی کے راستے پر چلتا رہوں اور ہر قدم پر میرا یہ یقین پختہ ہوتا جائے کہ صراطِ مستقیم وہی ہے جو میں نے اختیار کیا ہے۔ میں تیری اعانت کے بھروسے پر تنہا گھر سے نکلوں اور جب مڑ کر دیکھوں تو یہ نظر آئے کہ ان گنت راستوں اور پگڈنڈیوں سے لوگ اسلام زندہ باد، پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے

نمودار ہو رہے ہیں۔"

آپ نے جس ملت کا پرچم اٹھایا ہے وہ احسان فراموش نہیں۔

آج مجھے بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس ہو رہا ہے کہ پاکستان کسی کی پسند یا ناپسند کا مسئلہ نہیں بلکہ موت و حیات کا مسئلہ ہے اور جب قوموں کو موت و حیات کے مسائل درپیش ہوں تو ایک فرد کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ یا اللہ مجھے ہمت دے کہ میں اپنی قوم کی عظمتِ رفتہ کے گیت گاتا ہوا میدان میں آؤں۔ جوانانِ ملت کے دلوں میں ناقابلِ شکست حوصلے بیدار کروں پھر اگر میں اس یقین کے ساتھ کہیں گر پڑوں کہ میں نے اپنی ساری توانائی جس مقصد کے لیے صرف کی تھی وہ پورا ہو رہا ہے تو میں اس موت کو بھی تیرا انعام سمجھوں گا۔ لیکن اس وقت میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں پاکستان کی جنگ میں بھرپور حصہ لوں گا اور کسی دن ان بہت اچھے، بہت نیک اور بہت پیار کرنے والے لوگوں کے پاس یہ پیغام لے کر آؤں گا کہ ہم نے وہ حصار بنا لیا ہے جس کے اندر ہم اپنی شہزادیوں کے مستقبل کے متعلق اطمینان کا سانس لے سکتے ہیں۔ میری ننھی بہن نسرین اس وقت میں تمہارے لیے یہ دعا کرتا ہوں کہ آج سے کئی برس بعد بھی جب تم بھائی جان یوسف کا ذکر کیا کرو تو تمہارا سر فخر سے اونچا ہو جایا کرے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں ایک ننھی بہن کے ساتھ سفر کر رہا ہوں اور ماں جی سے راستے میں بہت سی باتیں ہوں گی لیکن مجھے اس بات کا ملال ہے کہ میں جالندھر تک نہیں جا سکوں گا۔ کیوں کہ گھر میں میری اتی بڑی شدت سے انتظار کر رہی ہوں گی لیکن یہ ممکن ہے کہ ماں جی مجھے حکم دیں تو میں سرتابی نہیں کر سکوں گا۔

میں گھر پہنچ کر بڑی تفصیل سے بعض باتیں لکھوں گا۔ سرِدست صرف اس بات کا اعتراف کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں ان بھیڑیوں کا بہت ممنون ہوں جن کی وجہ سے میرا ان نیک لوگوں سے تعارف ہوا، اور جن کو دیکھ کر مجھے اس ملک میں نئی شدت

کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا ہے" میرے اللہ میں اپنے لیے اپنی قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے اور ہر ایسے انسان کے لیے جو اس دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کا حق دار ہے۔ ہندو کی غلامی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔"

تیسرا حصّہ

راستے اور فاصلے

باب - ۲۱

۱۹۴۴ء یوسف کی زندگی کا مصروف ترین سال تھا۔ اپنے خاندانی پس منظر کے باعث تحریکِ پاکستان کے ساتھ اس کی والہانہ شیفتگی قدرتی بات تھی جب وُہ کالج میں داخل ہوا تھا تو اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث اسے یہ یقین تھا کہ وہ کسی دن دنیا کے کامیاب ناول نگاروں کی صف میں کھڑا ہو گا اور اب مستقبل کے متعلق اُس کی تمام خواہشات حصولِ پاکستان تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں اور جو مضامین اور افسانے وہ لکھا کرتا تھا اُن کا اولین مقصد تحریکِ پاکستان کو تقویت دینا تھا۔ اُس کے بعض ساتھی جو دو تین سال قبل دیہاتی زندگی کے متعلق اس کے دلچسپ مضامین اور افسانے پڑھا کرتے تھے اِس بات پر حیران تھے کہ اب مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے سوا اس کے ذہن میں کوئی چیز آتی ہی نہیں۔ ایک دن اُس کے ایک شفیق اُستاد نے کہا۔ "میاں یوسف! میں تمہاری ابتدائی تحریریں پڑھ کر ہی کہا کرتا تھا کہ تم ادب کی دنیا میں نام پیدا کرو گے۔ تم بڑی خوب صورتی سے دیہاتی زندگی کی عکاسی کیا کرتے تھے۔ تمہارے طنز و مزاح میں بڑی جان تھی۔ اب تم کس مخمصے میں پھنس گئے ہو؟ دیکھو بھائی سیاست کو سیاست دانوں کے لیے چھوڑ دو اور تم صرف اُس کام سے سروکار رکھو جس کے لیے تم پیدا ہوتے ہو۔"

یوسف نے جواب دیا۔

"جناب! اگر آپ کا یہ مطلب ہے کہ مجھے صرف ادیب بننے پر ہی اکتفا کرنا چاہیے تو آپ کو یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ کوئی ادیب اپنے آزاد وطن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور پاکستان کے سوا میں اپنے لیے اور کسی آزاد وطن کا تصور نہیں کر سکتا یہ کروڑوں مسلمانوں کے ساتھ میری بقاء کا بھی اولین مسئلہ ہے"۔

پروفیسر صاحب نے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میاں یوسف! شاید تم سچ کہتے ہو لیکن اس سال تمہیں بہت محنت کرنی چاہیے تاکہ فائنل میں بہت اچھے نمبر لے سکو"۔

اُس کے تاریخی افسانے اور سیاسی مضامین سب پاکستان کے لیے ہوتے تھے۔ وہ اپنے کالج اور کالج سے باہر مسلم لیگ کے اجتماعات میں پرجوش تقریریں کیا کرتا تھا۔ ماں نے کئی بار اس کے سامنے سنہری بالوں والی کمسن لڑکی کے خاندان کا پتہ کرنے کا مسئلہ چھیڑا تھا لیکن وہ ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا تھا کہ امی جان ابھی ان باتوں کا وقت نہیں، آپ مطمئن رہیں میں بی اے کرتے ہی انھیں تلاش کر لوں گا۔ آپ کو اس وقت تک ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے"۔

ایک دن یوسف منظور احمد اور کالج کے تین لڑکوں کے ساتھ، امرتسر، جالندھر لدھیانہ اور انبالہ کے شہروں کا دورہ کرنے کے بعد واپس آیا اور ماں جو اردو اخبار میں اُس کی تقریریں پڑھا کرتی تھی، بڑے اشتیاق سے اس کی کارگزاری سُن رہی تھی۔ جب یوسف نے جالندھر کا ذکر چھیڑا تو قدسیہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن یوسف نے جالندھر کے جلسوں کا حال سنانے کے بعد فوراً ہی لدھیانہ کا ذکر شروع کر دیا اور اس نے لدھیانے میں پروگرام کی تفصیلات سناتے ہوئے کہا "امی جان ہمارا پروگرام یہ تھا کہ وہاں سے واپس آجائیں گے لیکن وہاں انبالہ کے چند معززین آئے ہوئے تھے اور وہ ہمیں اپنے ساتھ لے گئے۔ اس لیے ہمیں چار کی بجائے چھ دن لگ گئے"۔

"بیٹا وہ لوگ تمہیں ملے تھے؟"

"وہ کون امی جان؟"

"سچ کہو تمہیں لدھیانہ جا کر بھی وہ خاتون یاد نہیں آئی جسے تم نے ماں جی کہا تھا اور تم اُس کمسن شہزادی کو بھی بھول گئے"۔

"امی جان میں انھیں بھولا نہیں ہوں"۔

"لیکن تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ تم اس کا انتظام کر لوگے۔ دو سال تو ہونے والے ہیں اس بات کو، تم جلسوں میں جا سکتے ہو لیکن ماں کی خوشی کے لیے تم نے بی اے پاس کرنے کی شرط رکھ دی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے یہ خوشی میرے نصیب میں نہیں خیر تمہاری مرضی اب میں کچھ نہیں کہوں گی"۔

"امی جان مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ اِس قدر بے چین ہیں"۔

"بیٹا یہ سب تمہارا قصور ہے۔ تم نے سنہری بالوں والی ایک کمسن شہزادی اور اس کی نانی کا ذکر ہی اس طرح کیا تھا کہ مجھے اسی دن سے ان کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا لدھیانے والی بیگم احمد صاحبہ نے عطر کی جو شیشی بھیجی تھی وہ میں نے ایک متبرک سی چیز سمجھ کر اُسی طرح رکھی ہوئی ہے۔ صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی عید کے دن میں نے یہ شیشی کھولی تھی اور ایک قطرہ اپنے کُرتے پر مَل لیا تھا پھر کئی دن مجھے اپنے کپڑوں سے بھینی بھینی خوشبو آتی رہی اور میں نے اسے ایک قیمتی تحفہ سمجھ کر اپنے بکس میں چھپا رکھا ہے اگر وہ بہن مجھے مل جاتی تو میں ہر عید کے موقع پر کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور بھیجا کرتی"۔

یوسف نے کہا "امی جان اگر آپ مجھے دو سال پہلے بتا دیتیں کہ آپ انھیں اِتنا یاد کرتی ہیں تو میں کسی دقت کے بغیر یہاں بیٹھے ان کا پتہ معلوم کر لیتا"۔

"کیسے معلوم کر لیتے تم"؟

"امی جان وُہ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور میری تحریریں پڑھنے کے قابل سمجھی جاتی ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ جالندھر اور لدھیانہ میں میری کوئی تحریر پہنچ جائے۔ اُس کے لیے اخبارات و رسائل سے کام لیا جاسکتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات پہلے تمہارے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟"

"امی جان مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر ضرورت ہوتی بھی تو میں یہ سوچتا کہ جتنی آسانی سے مَیں ان کا پتہ کرسکتا ہوں اُسی قدر آسانی سے وُہ میرا پتہ کرسکتے ہیں۔ مثلاً اگر مجھے یہ معلوم تھا کہ کوئٹہ میں اُن کے رشتہ داروں سے پتہ کیا جاسکتا ہے تو انھیں بھی یہ معلوم تھا کہ مَیں اسلامیہ کالج میں پڑھتا ہوں اور وہ اسلامیہ کالج کے پرنسپل یا عملہ کے اور کسی آدمی سے میرا پتہ پوچھ سکتے ہیں۔ ہمارے درمیان ایک ایسی ہچکچاہٹ حائل ہوگئی تھی جس میں وقت کے ساتھ بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔"

"اب تمہیں یہ امید ہے کہ اگر انھیں تمہارے کسی مضمون سے تمہارا پتہ مل گیا تو وُہ فوراً تمہیں خط لکھیں گی؟"

"مجھے یقین ہے امی جان!"

ایک ہفتہ بعد لاہور کے ایک بااثر روزنامہ اخبار میں ملک کی سیاست پر یوسف کا ایک زوردار مضمون شائع ہوا۔ ایڈیٹر نے مضمون نگار کے تعارف کے لیے اُس کی تصویر کے ساتھ اپنے نام سے ایک مختصر تعریفی نوٹ بھی لکھا ہوا تھا۔ یہ مضمون اگلے روز دوسرے شہروں کے اخبارات میں بھی چھپ گیا اور چند دن اس کے خلاف کانگریسی اخبارات میں لے دے ہوتی رہی۔

گیارہ دن بعد ایک روز یوسف لائبریری میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایک چپڑاسی نے آکر پیغام دیا۔

"جناب پرنسپل صاحب اپنے کمرے میں بلاتے ہیں۔"

یوسف تھوڑی دیر بعد پرنسپل کے آفس میں داخل ہوا تو اُس نے اپنے قریب ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آیئے تشریف رکھیے۔"

یوسف بیٹھ گیا۔

پرنسپل چند ثانیے اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر اُس نے سوال کیا۔

"یوسف صاحب آپ ۱۹۴۲ء میں کوئٹہ گئے تھے؟"

"جی ہاں۔"

"وہاں آپ نے بھیڑیوں سے کسی کی جان بچائی تھی؟"

"جناب میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مَیں نے کسی کی جان بچائی تھی۔ بات یہ ہوئی تھی کہ میں ایک کھڈ کے کنارے کنارے ایک ویران پہاڑ کی چوٹی کی طرف جا رہا تھا کہ اچانک میں نے دیکھا کہ دو بھیڑیے کھڈ کے دوسرے کنارے میرے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ کھڈ اتنی گہری تھی کہ وہ میری طرف آ نہیں سکتے تھے اور میں نے مڑ کر نیچے اترنا شروع کردیا۔ پھر کچھ دُور جا کر مَیں نے یہ دیکھا کہ ایک آدمی کھڈ کے اُس کنارے جہاں میں نے بھیڑیے دیکھے تھے۔ تیزی سے اُوپر چڑھ رہا ہے۔ مَیں نے اُسے خبردار کرنے کے لیے پوری قوت سے آوازیں دیں۔ میرے ساتھیوں نے جو پیچھے ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ شور مچایا مگر اُس پر کوئی اثر نہ ہُوا۔ اب اس کو خبردار کرنے کی یہی ایک صورت رہ گئی تھی کہ میں پہاڑ کی بلندی کی طرف بھاگتا ہوا بالآخر اس جگہ پہنچ جاؤں جہاں چوٹی کے قریب کھڈ کے کنارے ملتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سخت جدوجہد کے بعد میں اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اسے اپنے ساتھ اُس جگہ لے آیا جہاں میرے ساتھی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے ورنہ اُس نے بھیڑیا نہیں دیکھا تھا اور نہ مجھے دوبارہ وہ بھیڑیے نظر آئے تھے۔"

پرنسپل نے کہا "اور تم نے اس شخص کے خاندان کی ایک معزز خاتون اور اُس کی کمسن نواسی کے ساتھ کوئٹہ سے امرتسر تک کا سفر بھی کیا تھا"

"جی ہاں"۔

"اور تمہاری کوئی چیز بھی گاڑی میں رہ گئی تھی"۔

"جی ہاں"۔

پرنسپل نے اپنے میز کی دراز کھول کر ایک بڑے سائز کا لفافہ نکالا اور اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"یہ لے جاؤ اور اسے اطمینان سے پڑھو۔ باہر کے لفافے پر میرا نام ہے اور دو صفحات اور اندر جو دوسرا خط ہے وہ تمہیں پہنچانے کی درخواست کی گئی ہے۔

بیٹا! یہ دونوں خط تمہاری خاطر لکھے گئے ہیں اور اس بڑے لفافے کے اندر موجود ہیں۔ اب یہ تمہارا فرض ہے کہ جن لوگوں نے اتنی مدت کے بعد تمہیں خط پہنچانے کا نیا طریقہ نکالا ہے انھیں فوراً جواب لکھو کہ تم وہی یوسف ہو جن کی انہیں تلاش ہے اور تمہارے کالج کے پرنسپل نے کسی تاخیر کے بغیر اُن کا خط تمہارے پاس پہنچا دیا ہے"۔

یوسف کے چہرے پر مسکراہٹیں اور دل میں دھڑکنیں تھیں۔

وہ پرنسپل کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

یوسف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس لائبریری میں پہنچا اور وہاں ایک کونے میں بیٹھ کر خطوط پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ پرنسپل کے نام جو خط تھا وہ نسرین کی طرف سے تھا۔ اُس نے کسی حد تک تفصیل کے ساتھ کوئٹہ سے سفر کے دوران اور اُس سے قبل یوسف کے بہادرانہ کارناموں کا ذکر کیا تھا اور آخر میں یہ لکھا تھا کہ آپ کے کالج کے یہ طالب علم جنہوں نے سفر کے دوران کئی نازک مرحلوں پر ہماری مدد کی تھی۔ امرتسر گاڑی سے اُترتے ہوئے اپنا کچھ نہایت قیمتی سامان ہمارے سامان کے ساتھ چھوڑ گئے

تھے۔ بدقسمتی سے اُن کا ایڈریس ہمارے پاس نہیں تھا اور ہمارے گھر کا ایڈریس جو انہیں لکھ کر دیا گیا وہ بھی سامان کے ساتھ ہی بھول گئے تھے۔ اب پچھلے دنوں پاکستان کے متعلق ان کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس سے مَیں یہ اندازہ لگا سکتی ہوں کہ اسلامیہ کالج میں وُہ کافی مشہور ہوں گے اور آپ بھی انہیں جانتے ہوں گے۔ اِس لیے مَیں آپ سے یہ درخواست کرتی ہوں کہ دوسرا لفافہ جو ان کے لیے بھیجا جا رہا ہے وُہ انہیں پہنچا دیجئے ورنہ مندرجہ ذیل ایڈریس پر واپس کر دیجئے۔

یوسف نے دوسرا لفافہ نکال کر کھولا اور پڑھنے میں منہمک ہوگیا۔ اُسے سیدھے سادھے الفاظ کے ساتھ ایک کمسن بچی کی دل کش آواز سنائی دے رہی تھی۔

نسرین نے لکھا تھا بھائی جان! السلام علیکم!

ہمارے گھر میں آپا فہمیدہ کے سوا سب ہی کہتے ہیں کہ آپ مجھے بھول چکے ہوں گے لیکن مجھے کبھی یقین نہیں آتا۔ مَیں ہر روز یہ دعا مانگ کرتی ہوں کہ آپ کسی دن اچانک آجائیں اور مجھے اس بات کی شکایت نہیں کہ میری یہ دعا قبول نہیں ہوئی۔ یہ خط میں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آپا فہمیدہ نے اخبار میں آپ کا مضمون پڑھا اور پھر مجھے یہ حکم دیا کہ مَیں آپ کو فوراً خط لکھوں۔ انگریزی میں پرنسپل کا نام اور ایڈریس انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ بھائی جان یہ بھی تو غضب کیا نا آپ نے کہ اُترتے وقت وہ تھیلا وہیں چھوڑ گئے جس میں آپ نے اپنی کتابیں اور قیمتی مسودہ رکھا ہُوا تھا۔ مَیں اُس وقت بہت سٹپٹائی تھی جب مجھے یہ یاد آیا کہ اپنا ایڈریس بھی میں نے آپ کی مسودے والی نوٹ بک پر لکھ دیا تھا۔ دوسری غلطی یہ ہوئی تھی کہ نانی جان نے آپ کا ایڈریس اس لیے نہیں لکھوایا تھا کہ خط و کتابت کی ابتدا آپ کریں گے۔ بھائی جان مَیں نے آپ کا تھیلا سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ گھر میں آپا فہمیدہ کے سوا کافی عرصہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ اس میں کیا ہے۔ پھر جب میں نے بار بار آپا فہمیدہ

کوسفر کے واقعات سنائے تو نانی جان کی طرح انھیں بھی آپ کی ہر بات پسند آنے لگی۔ بھائی جان اب آپ اس بات پر خفا نہ ہوں کہ ایک دن میں نے اور آپا جان نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ آپ کی غیر حاضری میں آپ کا سامان دیکھ لیں یا آپ کی کوئی کتاب پڑھ لیں تو یہ کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ آپا فہمیدہ تو یہاں تک کہتی تھیں کہ تمہارے بھائی جان نے اگر کوئی اچھی چیز لکھی ہے تو انھیں پڑھنے والوں پر خوش ہونا چاہیے۔ بھائی جان اگر آپا کی یہ بات درست ہے تو آپ کو اس بات پر بہت ہی خوش ہونا چاہیے کہ انہوں نے پہلے سال ہی آپ کی لکھی ہوئی کتاب کو تین بار پڑھا تھا اور اب بھی کبھی کبھی مجھے بلا کر یہ حکم دیا کرتی ہیں کہ مجھے فلاں واقعہ یا فلاں صفحہ سے آگے پڑھ کر سناؤ اور میرا خیال ہے کہ آپ کی کتاب کے ساتھ میری دلچسپی بھی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ آپ یہ سن کر بھی خوش ہوں گے کہ امی جان بھی آپ کی کتاب پڑھ چکی ہیں۔ وہ آپ کی امی جان کو سلام کہتی ہیں اور آپ کے لیے بہت دعائیں کرتی ہیں۔ آپا فہمیدہ نے انہیں بھی یقین دلا دیا ہے کہ آپ کسی دن بہت بڑے ناول نگار بنیں گے۔

بھائی جان! آپ جواب ضرور لکھیں ورنہ آپ کی ننھی شہزادی آپ سے روٹھ جائے گی۔ ایک دن، ایک مہینہ یا ایک برس کے لیے نہیں، ہمیشہ کے لیے روٹھ جائے گی۔ میں نے جالندھر میں اپنے گھر کا اور لدھیانے میں نانی جان کے گھر کا ایڈریس لکھ دیا ہے، یہ دونوں پتے کسی ایسی نوٹ بک پر لکھ لیں جس کے گم ہو جانے کا خطرہ نہ ہو، بلکہ میں تو یوں کہوں گی کہ جب آپ کے گھر کا ایڈریس ملے گا تو اُسے کئی دیواروں اور کئی کاپیوں پر نقل کرلوں گی۔ بھائی جان امی کہتی ہیں کہ اگر آپ کسی دن اچانک اپنی امی جان کے ساتھ جالندھر آ جائیں تو ہماری عید ہو جائے گی۔

چچا عبدالعزیز کا خط آیا ہے کہ شاید وہ عنقریب تبدیل ہو کر لاہور پہنچ جائیں گے اور ہم سب کو یہ خوشی ہے کہ ہمیں ان کی وجہ سے لاہور کی سیر کا موقع مل جایا کرے گا۔

ایک ضروری بات کرنا بھول گئی تھی:

آپا فہمیدہ نے آپ کی لکھی ہوئی کتاب اور تھیلے میں باقی سامان سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ پچھلی عید پر انہوں نے مجھے اور اپنی سہیلیوں کو کچھ تحفے دیے تھے اور بازار سے آپ کے سامان رکھنے کے لیے ایک نیا بکس بھی خرید لائی تھیں۔ یہ بکس انھوں نے اپنے جیب خرچ سے خریدا تھا۔ کیونکہ وہ کہتی تھیں کہ اچھی چیزیں اچھے بکس میں بند ہونی چاہئیں۔ انہیں یہ ڈر بھی تھا بھائی جان کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں لیکن میں نے انھیں مطمئن کر دیا تھا کہ میرے بھائی جان کسی اچھی بات پر ناراض نہیں ہوا کرتے اب میں یہ پوچھتی ہوں کہ آپ کا سامان آپا فہمیدہ کی حفاظت میں رہے یا کسی نوکر کے ہاتھ آپ کے گھر بھیج دیا جائے۔ جی تو چاہتا ہے کہ آپ کو اتنا لمبا خط لکھوں کہ آپ پڑھتے پڑھتے تھک جائیں لیکن صبح سکول بھی تو جانا ہے نا اور آپا جان کا حکم ہے کہ مجھے سیکنڈ نہیں ان کی طرح ہر کلاس میں فسٹ آنا چاہیے۔ اس لیے باقی باتیں دوسرے خط میں ہوں گی۔

زیادہ آداب

آپ کی نسرین

اس سے آگے خالی صفحہ کا کچھ حصہ چھوڑ کر یہ لکھا ہوا تھا۔

"بھائی جان! عجیب بے وقوف ہوں میں بھی، جب وقت آتا ہے تو ضروری باتیں بھول جاتی ہوں۔ مثلاً میں کئی دن سے یہ سوچ رہی تھی کہ جب میں آپ کو خط لکھوں گی تو میری پہلی درخواست یہ ہوگی کہ آپ اپنی ایک چھوٹی سی تصویر ضرور بھیج دیں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے آپ کی شکل یاد نہیں رہی بلکہ اس لیے کہ گھر میں بہت سے لوگوں نے آپ کو نہیں دیکھا اور آپا

فہمیدہ تو آپ کی تصویر دیکھ کر بہت ہی خوش ہوں گی۔ ویسے انھیں جب یہ پتہ لگے گا کہ میں نے اپنے خط میں ان کا ذکر کیا تھا میری پٹائی منزور ہوگی۔ آپ کی امی ابّو اور گھر کے سب بزرگوں کو ہم سب کی طرف سے سلام۔ آپا کہتی تھیں کہ آپ جیسے مصروف لوگوں کے پاس خط لکھنے کا وقت نہیں لیکن آپ کے متعلق میرا خیال ہے کہ جس قدر میں نے کئی گھنٹے سوچ سوچ کر لکھا ہے اُس سے زیادہ آپ چند منٹ میں لکھ سکتے ہیں۔

اُسی روز دوپہر کے وقت یوسف علیٰحدہ کمرے میں ماں کے ساتھ بیٹھا نسرین کا خط پڑھ کر سُنا رہا تھا اور عصر کی نماز کے بعد وُہ جواب لکھ رہا تھا۔ اُس نے پہلے نسرین کی نانی کو لکھتے ہوئے اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ جب میں نے اپنے گھر پہنچ کر امی جان کو نسرین اور آپ کے ساتھ سفر کے حالات بتلائے تو وُہ بھی اس بات پر بڑی پریشان ہوئیں تھیں کہ میں اپنا تھیلا جس کے اندر ایک نوٹ بک میں آپ کے ایڈریس لکھے ہوئے تھے گاڑی میں ہی بھول آیا تھا۔ وہ اکثر یہ دعا کیا کرتی تھیں کہ اگر کبھی جالندھر جانے کا موقع ملا تو میں نسرین کی والدہ کو تلاش کروں گی۔ ماں جی میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو جانے کی وجہ سے آپ کو تلاش نہ کر سکا۔ ورنہ یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ نسرین کے نام طویل خط میں اُس نے لکھا تھا۔ ننھی شہزادی تمہیں یقین نہیں آئے گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں تمھیں ایک دن کے لیے بھی نہیں بھولا۔ تم ہمارے گھر میں کافی مشہور ہو چکی ہو اور سب مجھے اس بات پر کوستے ہیں کہ تم نے شہزادی کا ایڈریس گنوا کیوں دیا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرا سامان گم نہیں ہونے دیا۔ ورنہ اگر وہ مسودہ گم ہو جاتا تو مجھے بہت افسوس ہوتا۔ تمہاری آپا فہمیدہ کا بھی میں ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کی حفاظت اپنے ذمّے لے لی ہے اور میری پہلی تحریر کو اس قدر دل چسپی کے ساتھ تین بار پڑھنے کے لیے بھی میں ان کا شکر گزار ہوں۔ میں یہ

دیکھتا رہا ہوں کہ ہمیں پاکستان کی منزل تک پہنچنے کے لیے کئی آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اور مجھے اس کتاب کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں ملے گا۔ آپ کی فہمیدہ آپا سے یہ درخواست ہے کہ وہ اس وقت تک یہ مسودہ اپنے پاس رکھیں جب تک کہ میں حصولِ پاکستان کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے فارغ نہیں ہو جاتا۔ اپنا آزاد وطن یہ انسان کی پہلی ضرورت ہے اور ایک ناول نگار عام انسانوں سے مختلف نہیں ہوتا۔ تصویر بھیج دی جائے گی اور اگر امی جان رضامند ہو گئیں تو ان کی تصویر بھی میرے ساتھ ہو گی۔

تمہارے والدین، فہمیدہ صاحبہ اور دوسرے بہن بھائیوں کو سلام۔ انشاءاللہ میں آپ کو اپنے حالات سے باخبر رکھوں گا لیکن اگر کبھی مجھ سے لکھنے میں کوتاہی ہو جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ شہزادی نسرین مجھ سے روٹھ جائے۔ امی جان آپ سب کے لیے دعائیں کرتی ہیں اور آپ کی والدہ کو سلام کہتی ہیں۔ میں گاؤں میں اپنا مستقل پتہ اور لاہور کا موجودہ ایڈریس لکھ رہا ہوں، لیکن خطوط فی الحال آپ کو لاہور کے ایڈریس پر لکھنے چاہئیں۔ امی جان کے حکم پر تعارف کے لیے ان کا نام لکھ رہا ہوں۔ ان کا نام قدسیہ بیگم ہے اور وہ آپ کی امی اور نانی جان کا نام پوچھتی ہیں۔
بہت سی دعاؤں کے ساتھ آپ کا بھائی

یوسف

یوسف نے خط ختم کرنے کے بعد پوچھا "امی جان آپ کچھ اور لکھوانا چاہتی ہیں"۔

"بیٹا! میں بہت کچھ لکھوانا چاہتی ہوں لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ یہ خط کسی تاخیر کے بغیر اُن کے پاس پہنچ جائے۔ تصویر بعد میں چلی جائے گی۔"

"امی جان میں ابھی جی پی او جاتا ہوں۔ انشاء اللہ یہ خط شام کی ڈاک میں نکل جائیں گے۔"

"اچھا بیٹا جاؤ۔ لیکن سائیکل ذرا احتیاط سے چلانا۔ خط اگر ایک دن بعد بھی پہنچ جائے تو کوئی حرج نہیں۔"

"امی جان میں اطمینان سے جاؤں گا۔ ڈاک میں کافی وقت ہے۔"
یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

○

دو ہفتے بعد یوسف کالج سے گھر آیا تو ماں نے کہا۔

"بیٹا! اُن کا خط آیا ہے۔ میں نے تمہاری الماری کے نچلے خانے میں رکھ دیا ہے۔"

"کس کا خط امی جان!"

"بھئی جالندھر والوں کا۔ تم پڑھ سکتے ہو لیکن کہیں گم نہ کر دینا۔ اُن لڑکیوں کی امی نے براہ راست مجھے لکھا ہے۔ کوئی پڑھی لکھی خاتون معلوم ہوتی ہیں۔ یوسف! جواب لکھتے ہوئے مجھے یہ الجھن ہوگی کہ میرا خط بہت خراب ہے۔"

"امی جان! یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ ہینڈ رائیٹنگ تو بعض بڑے بڑے مصنفوں کی بھی خراب ہوتی ہے اور آپ کا خط اتنا بُرا بھی نہیں کہ پڑھا نہ جا سکے۔"

ماں کے خط کے ساتھ نسرین اور فہمیدہ نے تمہیں چند سطریں لکھی ہیں۔ خط پڑھ کر انھیں جواب لکھ دو تاکہ میں ان کی والدہ کی معرفت بھیج دوں۔ صفیہ یعنی لڑکیوں کی والدہ نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ لدھیانے میں ان کی امی بھی ہمارے متعلق سُن کر بڑی خوش ہوں گی اور اُن کی طرف سے فوراً جواب آئے گا۔ بیٹا! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ یکایک ہم سے قریب آ گئے ہیں اور میں اُن لڑکیوں کو

لاہور میں اگر کسی جگہ دیکھوں تو فوراً پہچان لوں۔ بیٹا میں تصویر کھنچوانے سے ہچکچاتی تھی لیکن اب میں کل ہی تمہارے ساتھ فوٹوگرافر کے پاس جاؤں گی اور اس خط کے جواب کے ساتھ ہی انھیں تصویر بھیج دی جائے گی۔ میں جب ان کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فہمیدہ کو میں نے بارہا دیکھا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اپنے کمرے میں خط پڑھ رہا تھا۔ ایک علیحدہ صفحے پر نسرین کے خط کے ساتھ ایک صاف ستھری ہینڈ رائیٹنگ کی چند سطور پر نظر پڑتے ہی اُسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہ فہمیدہ کی تحریر ہے۔ اُس نے لکھا تھا محترم یوسف صاحب! اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

میں نسرین کے خط کے فوری جواب کے لیے آپ کی بے حد شکر گزار ہوں اور نانی جان کو آپ کا خط ملنے پر جو خوشی ہوگی وہ تو میں بیان ہی نہیں کر سکتی۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اس دنیا میں آکر دوسروں کو خوشیاں تقسیم کرتے ہیں۔ میں اپنی بہن کی شکر گزار ہوں کہ وہ آپ کا مسودہ جو آپ گاڑی میں بھول آئے تھے سنبھال کر گھر لے آئی۔ اُس شریر لڑکی نے یقیناً آپ کو یہ لکھا ہوگا کہ میں ہر وقت آپ کا مسودہ پڑھتی رہتی ہوں لیکن میں یقیناً اسے تین بار پڑھ چکی ہوں اور ہر بار مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ ایک نیک اور بہادر آدمی اس دنیا میں چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے مسکراہٹیں اور قہقہے تقسیم کر رہا ہے۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد اس کتاب کو مکمل کریں۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ بہت جلد ایک ناول نگار کی حیثیت سے مستقبل کے متعلق بلند ترین توقعات پوری ہوں گی۔ اور دیکھیے آپ کا مسودہ جو نامکمل حالت میں میرے پاس پڑا ہوا ہے اُسے بہر حال آپ نے مکمل کرنا ہے۔ میں اس کی بہت حفاظت کیا کرتی ہوں۔ ویسے بھی اُس کے گم ہو جانے کا کوئی امکان نہیں کیونکہ ایک دو بار اور پڑھنے کے بعد وہ مجھے پوری طرح زبانی یاد ہو جائے گا۔

تیسرے دن یوسف اور اس کی امی کی طرف سے اِس خط کے جواب کے ساتھ ایک گروپ فوٹو جس میں اُس کی ماں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یوسف اُس کے پیچھے اور چھوٹے بہن بھائی دائیں بائیں چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بھیجی جا چکی تھی۔ قدسیہ بیگم نے نسرین کی امی صفیہ کو اپنے ہاتھ سے ایک طویل خط لکھا تھا جس میں اُس نے اُسے اور اُس کے بچوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ میری بہن آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میری آنکھوں کے سامنے ہر وقت آپ کی شکلیں گھومتی رہتی ہیں۔ میں اللہ سے دُعا کرتی رہتی ہوں کہ مجھے گھر سے نکلنے کا موقع ملے اور میں سیدھی آپ کے پاس اور پھر آپ کی امّی کے پاس جاؤں۔ یوسف نے اپنی تحریر سے فہمیدہ کی دل چسپی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا۔ آپ کے خط سے یقیناً میری حوصلہ افزائی ہوئی ہے لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ جیسی ذہین طالبات کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اگر اُس مسودے کی وجہ سے آپ نے کسی مضمون میں اپنی توقعات سے کم نمبر لیے تو میں اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دوں گا اور دیکھیے وہ لوگ کم خوش نصیب نہیں ہوتے جو دوسروں کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور معمولی کامیابیوں پر خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ بات، ہمیشہ میرے ذہن میں رہے گی۔ آپ نے اس وقت میری حوصلہ افزائی کی ہے جب مجھے کوئی نہیں جانتا۔

دوسرا خط جالندھر بھیجنے کے پانچ دن بعد لدھیانہ سے نسرین کی نانی کا خط آیا اُس نے یوسف اُس کے والدین اور اُس کے بہن بھائیوں کو بہت دعائیں دی تھیں اور اس بات پر معذرت کی تھی کہ علالت کے باعث میں فوراً خط نہ لکھ سکی۔ بخار تو میرا اُسی دن ٹوٹ گیا تھا جس دن مجھے یہ اطلاع ملی تھی کہ یوسف بیٹا

اور اُس کے گھر کے تمام لوگ بخیریت ہیں لیکن میں یہ پروگرام بناتی رہی کہ ذرا کمزوری دور ہو جائے تو جالندھر جاؤں اور وہاں سے صفیہ بیٹی کو لے کر تمہاری امّی سے ملاقات کے لیے لاہور جاؤں۔ بیٹا تم کچھ اس طرح اپنی ماں کا ذکر کیا کرتے تھے کہ ہم سب کے دل میں انہیں دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ پھر پندرہ دن اور گذر گئے اور جالندھر سے کوئی خط نہ آیا۔ یوسف کے نزدیک یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن اُس کی ماں اکثر کہا کرتی تھی۔

"بیٹا ان کا خط آج بھی نہیں آیا۔"

اور ایک دن وہ یہ کہہ رہی تھی۔

"بیٹے! کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تم ایک اور خط لکھ کر اُن کی خیریت پوچھ لو۔"

"امی جان خط لوگ روز روز تو نہیں لکھا کرتے۔ اُن کا خط نہ آنے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہاں سب بخیریت ہیں۔"

"بیٹے یہ بھی ٹھیک ہے لیکن کبھی کبھی مجھے یہ خوف محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاید میں انھیں نہ دیکھ سکوں۔"

"امی جان ایسی باتیں نہ کریں۔ ذرا بارشیں شروع ہو جائیں تو میں خود آپ کو اُن کے پاس لے جاؤں گا۔"

ایک دن میاں عبدالرحیم نے دفتر سے گھر واپس آتے ہی کہا۔ "قدسیہ آج عبدالکریم مجھے دفتر آکر ملا تھا کہتا تھا لاہور میں جو کوٹھی اُس نے بنانی شروع کی تھی وہ مکمل ہو گئی ہے۔ اب عنقریب اُس کی بیوی اور بچے یہاں آئیں گے اور نئی کوٹھی میں ایک بڑی دعوت کا انتظام کیا جائے گا۔ اُس نے مجھ سے یہ وعدہ لیا تھا کہ ہم سب اس دعوت میں شریک ہوں گے۔ ویسے وہ اپنی کوٹھی دکھانے کے لیے اتنا بے تاب

تھا کہ مجھے دفتر سے اُٹھا کر سیدھا وہاں لے گیا۔ کوٹھی واقعی بہت اچھی ہے لیکن
اُس کا مقصد اپنی نئی کار دکھانا بھی تھا۔ بار بار یہ کہتا تھا کہ امینہ اور اس کی امی خُود
آکر آپ کو کار پر لے جائیں گی اور دعوت کے بعد آپ کو گھر پہنچا دیا جائے گا۔ مجھے
یہاں پہنچانے اور ہمارے گھر کا راستہ دکھانے کے لیے اُس نے ڈرائیور کو بھیج دیا
تھا اور دیکھو یوسف تمہارے متعلق اس نے خاص طور پر تاکید کی تھی کہ تمہیں اپنے
سب دوستوں کے ساتھ دعوت میں شریک ہونا چاہیے۔ مَیں اس موسم کی دعوتیں
پسند تو نہیں کرتا لیکن اگر میں دَورے پر چلا گیا تو تم اپنی ماں کے ساتھ چلے جانا۔ باقی
بچوں کو لے جانے کی ضرورت نہیں"۔

قدسیہ نے کہا۔ "اگر امینہ آئی تو وُہ ہم سب کو لے جانے پر ضد کرے گی۔
نمائشی دعوتوں کا اُس کی ماں کو بھی بڑا شوق ہے"۔

"قدسیہ اصل میں بات یہ ہے کہ بچّے اپنے والدین سے بُری عادتیں سیکھتے
ہیں۔ عبدالکریم اتنا مالدار ہے کہ اُسے ہر قسم کی نمائش سے بالاتر ہونا چاہیے لیکن
دولت اُس کا اوچھا پن دُور نہیں کر سکی"۔

قدسیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا "آپ ہاتھ دھولیں میں کھانا لگاتی ہوں"۔

کھانا کھانے کے بعد بچّے اپنے کمروں میں چلے گئے تو عبدالرحیم نے قدسیہ سے
مخاطب ہو کر کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم یہ سُن کر خوشی سے اچھل پڑو گی کہ امینہ خود تمہیں
لینے کے لیے آئے گی لیکن تم کچھ پریشان سی نظر آتی ہو"۔

قدسیہ نے جواب دیا۔ "میری پریشانی کی وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی جب آپ
اپنے دوستوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو آپ کو یہ خیال نہیں رہتا کہ بچّے آپ کی
باتیں سُن رہے ہیں اور ان پر ان باتوں کا اثر پڑے گا"۔

"دیکھو قدسیہ میں مانتا ہوں کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے لیکن یہاں یوسف

ہی تو ہے جسے ان لوگوں کے ذکر سے کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے لیکن اللہ کے فضل
سے وہ اتنا سمجھدار ہے کہ غلط باتوں میں کسی کی پیروی نہیں کر سکتا۔ نہ معلوم میرے
دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا تھا کہ امینہ کا ذکر سن کر تمہارا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ وہ
ایک ہوشیار لڑکی ہے۔ اس کی شکل وصورت بھی اچھی ہے اور اس کا باپ کہتا تھا
کہ وہ کار چلانا بھی جانتی ہے اور وہ نئی کار جو مجھے یہاں چھوڑ کر گئی ہے
اس کے لیے خریدی گئی ہے"۔

ایوب جو دوسرے کمرے کے دروازے پر کھڑا یہ گفتگو سن رہا تھا آگے بڑھ
کر بولا۔ "اباجی! وہ بس بھی چلا لیتی ہے نا"۔

میاں صاحب اور قدسیہ ہنس پڑے۔

تین دن بعد دورے پر روانہ ہوتے ہوتے عبدالرحیم نے قدسیہ بیگم سے کہا۔
"آپ کو یاد رہے گا کہ عبدالکریم نے آئندہ جمعہ کے روز دعوت کی ہے"۔

"جی ہاں مجھے یاد ہے"۔

"انشاءاللہ میں دعوت پر پہنچ جاؤں گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں ایک دن پہلے
آجاؤں لیکن آپ میرا انتظار نہ کریں۔ کیونکہ دورے کا پروگرام طویل بھی ہو سکتا ہے۔
ان کی یہ خواہش ہوگی کہ میری طرح آپ بھی دعوت کھانے سے قبل ان کی کوٹھی دیکھ آئیں
اس لیے وہ کسی وقت بھی آپ کو آکر لے جائیں گے۔ اگر امینہ اور اس کی ماں اچانک
آپ کو بلانے آجائیں تو ان کی دل شکنی نہیں ہونی چاہیے"۔

"جی آپ فکر نہ کریں"۔ قدسیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

جمعرات کے دن یوسف صبح کی نماز سے فارغ ہو کر کچھ دیر سیر کرنے کے بعد ناشتے پر بیٹھا تھا کہ
کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نوکر نے بھاگ کر اطلاع دی۔ "جناب عبدالعزیز
صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہیں تو سادہ سے آدمی لیکن کہتے ہیں کہ میں

پولیس انسپکٹر ہوں اور یوسف صاحب مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔" یوسف نے فوراً اٹھتے ہوئے کہا "تم ناشتہ بیٹھک میں لے آؤ۔"

"امی جان! اُن کے لیے کوئی اچھی چیز بھجوا دیں۔"

یوسف باہر نکلا تو عبدالعزیز اُس سے بغلگیر ہو کر ملا اور اُس کے ساتھ بیٹھک میں آ گیا۔

"چچا جان! تشریف رکھیے اور مجھے پہلے بتائیے کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور آپ کا سامان کہاں ہے"؟

عبدالعزیز مسکرایا "بھائی میرا سامان میرے گھر میں ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ وہ گھر کہاں ہے تو مختصر جواب یہ ہے کہ گھر بھی لاہور میں ہے۔ میری یہاں بدلی ہو گئی ہے اور بدلی اس لیے ہو گئی ہے کہ ہمارے ایس پی صاحب جس جگہ تبدیل ہوتے ہیں مجھے اُس جگہ تبدیل کروا لیتے ہیں۔ اب وہ ریلوے پولیس کے ڈی آئی جی بن گئے ہیں اور میرے حال پر اب بھی مہربان ہیں۔ خیال ہے کہ میری بھی ترقی ہو جائے گی۔ لاہور میں میرے خسر کی جائیداد سے ایک مکان میری بیوی کے حصے میں آیا تھا اس کا کچھ حصہ بن چکا تھا اور کچھ بننے والا ہے۔ دو سال سے وہ خالی پڑا تھا اب ہم اُس کو آباد کر رہے ہیں۔"

"چچا جان آپ کو یہ گھر تلاش کرنے میں دقت تو پیش نہیں آئی"؟

"بالکل نہیں، اور اس کی وجہ تمھیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہو جائے گی۔ اب تم فوراً تیاری کرو۔ ہمارے گھر میں آپ کا انتظار ہو رہا ہے اور آپ سے زیادہ آپ کی امی کا اور انھیں یہ کہہ دیجیے کہ تانگہ باہر کھڑا ہے۔"

نوکر نے ناشتہ لا کر تپائی پر رکھ دیا اور یوسف نے کہا۔

"جناب پہلے ناشتہ کر لیجیے میں امی جان سے کہہ آتا ہوں کہ وہ تیار ہو جائیں۔"

یوسف تھوڑی دیر کے لیے اندر گیا اور پھر واپس آ کر عبدالعزیز کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا، "جناب بسم اللہ کیجیے۔"

عبدالعزیز نے کہا "یوسف میاں! آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ مہمان کون ہیں"؟

"چچا جان! مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جن کے قاصد بن کر آئے ہیں وہ کوئی اچھے ہی لوگ ہوں گے۔"

"بھئی بعض باتیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ ہمارے خاندان میں تم بہت مشہور ہو چکے ہو اور مجھے یہ کبھی خیال تک نہیں آیا تھا کہ اپنے علاقے کے مشہور ڈاکو کو پکڑنے والا یوسف وہی نوجوان ہے جس نے میری ایک کم سن بھتیجی اور اس کی نانی کے ساتھ کوئٹہ سے امرتسر تک کا سفر کیا تھا۔ اصل میں ہم پولیس والے نیکیوں سے زیادہ برائیوں کا تعاقب کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ نسرین جسے تمھاری وجہ سے گھر میں سب اب شہزادی نسرین کہنے لگ گئے ہیں سے میں نے یہ واقعات اس وقت سُنے تھے جب تمھارے ضلع سے میری تبدیلی ہو چکی تھی لیکن تمھارا نام سنتے ہی مجھے یہ سمجھ جانا چاہیے تھا کہ اپنے گاؤں کے قریب ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے والا اور گاؤں سے دُور ہمارے خاندان کی ایک بزرگ عورت اور ایک کم سن بچی کی مدد کرنے والا یوسف ایک ہی آدمی ہو سکتا ہے۔ نسرین ایک ذہین بچی ہے اگر میں اس سے تمھارا حلیہ پوچھ لیتا تو بھی مجھے سب کچھ معلوم ہو جاتا، لیکن یہاں بھی مجھے اپنی بھتیجیوں کا ہی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انھیں اتنی سمجھ تھی کہ انھوں نے تمھارے پرنسپل کو خط لکھ کر تمھارے بارے میں معلوم کر لیا۔"

یوسف کے دل میں اگر ناشتے کی کوئی خواہش تھی تو وہ دور ہو چکی تھی۔ اُس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "چچا جان میں یہ بیان نہیں کر سکتا کہ جو مہمان آپ کے گھر میں ہمارا انتظار کر رہے ہیں امی جان اُن کو مل کر کتنا خوش ہوں گی۔ آپ

راستے میں ان کا ذکر نہ کریں کہ وہ کون ہیں اور پھر اگر آپ تعارف نہ بھی کروائیں تو وہ پہلی نظر میں ہی انھیں دیکھ کر پہچان لیں گی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ کشادہ گلی میں ایک تانگے پر سوار ہو رہے تھے۔

عبدالعزیز کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور جب یوسف اپنی والدہ کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر اُس کے ساتھ بیٹھنے لگا تو ایک نئی کار ہارن بجاتی ہوئی تانگے کے قریب آکر رُک گئی۔ چلانے والی امینہ تھی۔ اس کی والدہ ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اور ڈرائیور پچھلی سیٹ پر تھا۔

یوسف نے پریشان ہو کر دبی آواز میں کہا۔" انکل ایک مسئلہ پر مجھے آپ کی ضرورت پڑے گی۔"

"کیا مسئلہ ہے یوسف صاحب"

"یہ آپ کو ابھی پتہ چل جائے گا۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر رشیدہ کو سلام کیا اور پھر امینہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"آپ کو نئی کوٹھی مبارک ہو۔"

"جناب ہم آپ کو وہاں لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ آپ کی دعوت آج بھی ہے"

"نہیں جی دعوت کل ہے۔"

"جی کل بھی ہے اور آج بھی۔"

یوسف نے رشیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "جی صبح میرے انکل آگئے تھے اور ہم ان کے ساتھ ان کے بال بچوں کو دیکھنے جا رہے ہیں انشاء اللہ کل ہم آپ کی کوٹھی اچھی طرح دیکھ لیں گے اور شاید میرے ساتھ میرے کچھ دوست بھی آئیں۔"

امینہ بولی" اچھا تو جناب آپ ہمارے ساتھ کار میں بیٹھ جائیے پہلے ہم وہاں جائیں

گے۔ جہاں آپ کے انکل آپ کو لے جانا چاہتے ہیں اور پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"دیکھو امینہ! ان کے گھر بہت سے مہمان آئے ہوتے ہیں اور ہمیں کافی دیر وہاں رکنا پڑے گا اور جس علاقہ میں یہ تانگہ جا سکتا ہے وہاں آپ کی گاڑی نہیں جا سکے گی۔"

وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ یوسف جلدی سے تانگے میں بیٹھ گیا اور عبدالعزیز نے کوچوان سے کہا "بھئی ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

اور اُس کی آواز اتنی گرجدار تھی کہ امینہ سہم کر رہ گئی۔

قدسیہ نے بلند آواز میں کہا" بہن رشیدہ بُرا نہ ماننا بھائی جان کے ساتھ میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

اور تانگہ پوری رفتار کے ساتھ چل پڑا۔

امینہ نے حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" امی یہ کیسا انکل ہے یوسف صاحب کا۔"

"چلو بیٹی انکل ایسے ہی ہوتے ہیں جب موقع ملے گا تو پوچھ لیں گے۔"

تانگے پر عبدالعزیز نے یوسف سے کہا۔"یوسف وہ صاحبزادی کون تھیں جو میری طرف خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔"

"انکل یہ میاں عبدالکریم کی صاحبزادی ہے جسے ارجن سنگھ ڈاکو نے لوٹنے کی کوشش کی تھی اور ان کا مسئلہ یہ ہے کہ لاہور میں عبدالکریم صاحب نے نئی کوٹھی بنائی ہے جو وہ ہمیں دکھانا چاہتے ہیں اور یہاں ایک شاندار دعوت کا کئی دن سے ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ اطلاع بہت پہلے مل چکی تھی کہ صاحبزادی بذاتِ خود ہمیں لینے کے لیے آئیں گی۔"

عبدالعزیز نے کہا" بیٹا! میری وجہ سے تمہارا پروگرام خراب نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

"کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ہمارا اُن کے ساتھ۔ امّی جان سے پوچھ لیجیے۔"

عبدالعزیز نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا "بہن میرا نام عبدالعزیز ہے اور آپ کے ہونہار فرزند سے میری دوستی اُس وقت ہوئی تھی جب یہ ایک بہت بڑے ڈاکو کو پکڑ چکے تھے۔"

قدسیہ نے کہا "بھائی جان! مَیں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یوسف اکثر آپ کا ذکر کیا کرتا ہے۔ یوسف کے ابا جان دورے پر گئے ہوئے ہیں ورنہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوتے۔ بھائی جان یوسف آج بڑا خوش ہے۔ آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"آپا جی! آپ میرے گھر جا رہے ہیں جہاں بہت پیار کرنے والے لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

قدسیہ نے باقی راستہ میں کوئی بات نہ کی۔ اُس کے دل میں جو سوال اُٹھ رہے تھے ان کا جواب وہ یوسف کے چہرے پر تلاش کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد تانگہ ایک مکان کے دروازے پر رُکا، یوسف نے ماں کو سہارا دے کر اُتارا اور عبدالعزیز نے کہا "بھابی جی آپ بلا تکلف تشریف لے جائیں: وہاں میری بیوی، ایک نوکرانی اور اُن مہمانوں کے سوا کوئی نہ ہو گا جو بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"یوسف تم بھی جاؤ۔ مجھے ایک کام ہے مَیں جلدی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ بہرحال تم نے اور بھابی جان نے شام تک یہیں رہنا ہے۔ کیونکہ رات کی گاڑی پر وہ مہمان جو صرف بھابی جان کی خاطر آئے ہیں واپس چلے جائیں گے۔"

قدسیہ بیگم نے کہا۔ آپ یہ کیوں نہیں بتا دیتے کہ مہمان کون ہیں۔"

"بھابی جان اندر چلیے نا۔"

"آئیے امی جان" یوسف نے کہا۔

کشادہ صحن کے اندر جامن اور پیپل کے درختوں کی چھاؤں میں تین عورتیں کھڑی تھیں۔

قدسیہ نے پہلی نظر میں ہی معمر لیکن خوش وضع خاتون سے مخاطب ہو کر کہا "مجھے یقین ہے کہ آپ مسز احمد ہوں گی۔ اگرچہ یہاں دیکھ کر آپ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایک خواب دیکھ رہی ہوں۔" وہ بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی اور پھر وہ دوسری خاتون کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آپ نسرین اور فہمیدہ کی ماں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتیں۔"

اُس نے تیسری خاتون کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ بھائی عبدالعزیز صاحب کی زیادتی ہے کہ انہوں نے اندر بھیجتے ہوئے مجھے آپ کا نام نہیں بتایا۔ مَیں نے آپ کو شاید ٹھیک طرح السلام علیکم بھی نہیں کیا۔

بہن صفیہ مجھے اچھی طرح جھنجھوڑ کر بتاؤ کہ یہ سب کچھ ایک خواب نہیں۔ یہ چند دن کی بات ہے کہ مَیں نے یوسف سے کہا تھا کہ شاید میں آپ لوگوں کو نہیں دیکھ سکوں گی اور آج میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھتی ہوں۔"

قدسیہ مسکرا رہی تھی اور اُس کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

صفیہ نے پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "چلیے بہن۔ اندر چلیے۔"

وہ کشادہ کمرے میں بیٹھ گئیں۔

نوکرانی نے شربت سے بھرے ہوئے دو جگ لا کر میز پر رکھ دیے اور صفیہ نے دو گلاس بھر کے قدسیہ اور یوسف کو پیش کر دیئے۔

یوسف نے اُٹھ کر کہا "خالہ جان! آپ تشریف رکھیں" اور وہ گلاس جو اُس کے ہاتھ میں تھا۔ آگے بڑھ کر مسز احمد کو پیش کر دیا۔

اِس کے بعد اُس نے صفیہ کو ایک گلاس بھر کر پیش کیا۔ پھر وہ عبدالعزیز کی بیوی کی طرف متوجہ ہوا تو اُس نے کہا "بیٹا! اب تم اپنی امی جان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ جب تک تم پانی نہیں پیو گے اس وقت تک وہ اپنے منہ کو گلاس نہیں لگائیں گی"۔

یوسف جلدی سے ایک گلاس بھر کر ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

صفیہ اپنی امّی جان سے کہہ رہی تھی یہ شربت تو مَیں کئی بار پی چکی ہوں، لیکن آج کچھ زیادہ ہی میٹھا ہو گیا ہے کیوں بہن قدسیہ یوسف کے خالی پانی میں آپ کو مٹھاس محسوس نہیں ہوتی"۔

عبدالعزیز کی بیوی بلقیس نے ایک گلاس بھر کر دوسرے کمرے کا رُخ کرتے ہوئے مہمانوں کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا "آپا قدسیہ آپ کی ذہانت کا امتحان لینا ہے تو گستاخی لیکن ہمارے گھر میں ایک بچی ایسی ہے جسے یہ جان کر بڑی خوشی ہو گی کہ آپ نے اُسے بھی دیکھتے ہی پہچان لیا ہے"۔

جب وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی تو یوسف نے اٹھ کر کہا، "امی جان آپ اطمینان سے باتیں کریں مَیں یہاں پاس ہی ایک دوست سے مل کر آتا ہوں"۔

مسز احمد نے کہا "یوسف اِدھر آؤ"۔

یوسف اُس کے قریب کھڑا ہو گیا "فرمائیے ماں جی"۔

"مَیں اب بھی تمھیں کوئی حکم دینے کا حق رکھتی ہوں نا؟"

یوسف نے جواب دیا "ماں کا یہ حق ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے"۔

"اچھا میرے پاس بیٹھ جاؤ"۔

یوسف نے اُس کے دائیں ہاتھ بیٹھ کر سر جھکا لیا۔

وُہ بیگم عبدالعزیز کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوتی اور اس کے قریب سے گذر گئی۔

قدسیہ اُٹھی اور جلدی سے آگے بڑھ کر اُس سے لپٹ گئی۔ "فہمیدہ! میری پیاری بیٹی۔ بیٹی تم وہی ہو جسے میں سوتے جاگتے ہر وقت دیکھا کرتی تھی"۔ پھر وہ اُس کے سرخ وسفید گالوں، بڑی بڑی چمکدار آنکھوں اور پیشانی کو چوم رہی تھیں:

"بیٹی خدا کا شکر ہے کہ میں نے تمھیں دیکھ لیا ہے اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہو چکی ہے۔ مجھے اس بات سے خوف آتا تھا کہ میں تمھیں ملے بغیر رخصت نہ ہو جاؤں۔ بہت خوف آتا تھا مجھے اس بات سے۔ بیٹھ جاؤ میرے پاس"۔

قدسیہ بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی

یوسف اٹھا اور کمرے سے برآمدے میں چلا گیا۔ صفیہ نے اس کی طرف دیکھا تو وُہ منہ پھیر کر آنسو پونچھنے لگا۔ صفیہ جلدی سے باہر نکلی اور پیار سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی "بیٹا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جب یوسف سے ملاقات ہو گی تو میں اسے غمگین دیکھوں گی"۔

"خالہ جان!" یوسف نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "خدا معلوم امی جان ایسی باتیں کیوں کہہ رہی تھیں۔ انھیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ کسی دن ہمارا ساتھ چھوٹ جائے گا اور وہ دنیا جس کے متعلق فہمیدہ نے یہ لکھا تھا کہ میں یہاں خوشیاں تقسیم کرنے آیا ہوں ایک ویرانہ بن جائے گی۔ فہمیدہ کو دیکھ کر وہ یقیناً" بہت خوش ہوئیں ہیں لیکن ایسے موقعوں پر وہ خوشی اور غم کی سرحدوں کے درمیان فاصلے قائم نہیں رکھ سکتیں۔ وہ پورے خاندان میں سب سے زیادہ تندرست ہیں اور ان میں قوت برداشت بھی بہت ہے۔ مَیں جس کی ہر بات پر وُہ فخر کرنے

کی عادی ہیں اُن کے لیے ایک کمزوری بھی بن چکا ہوں۔ اِس لیے کہ وہ مجھ سے بہت
پیار کرتی ہیں یا شاید اس لیے کہ میں اُن سے بہت پیار کرتا ہوں۔ خالہ جان مجھے یقین
ہے کہ اگر فہمیدہ کوئی ہنسنے والی بات کر دے تو تھوڑی دیر بعد آپ کو اس کمرے میں
اُن کے قہقہے سنائی دیں گے۔

خالہ جان! نسرین کیوں نہیں آئی آپ کے ساتھ؟"

"بیٹا! بات یہ ہے کہ ہم پرسوں کانگڑہ جا رہے ہیں۔ وہاں ہم چند ہفتے
دھرم سالہ ٹھہریں گے۔ ہم صرف تمہاری امی سے ملنے کے لیے لاہور آئے تھے
کیونکہ فہمیدہ نے اب کالج میں داخل ہونا ہے۔ اس کے بعد خدا معلوم کب اسے
لاہور آنے کا موقع ملے۔ اس لیے ہم اسے ساتھ لے آئے۔ نسرین سے ہم نے وعدہ کیا
تھا کہ چھٹیاں ختم ہونے سے چند روز پہلے اُسے ہم اُس کو چچا کے ہاں بھیج دیں گے
اور پھر وہ روزانہ آپ کے ہاں آ جا سکے گی اور اگر وہ آپ کی امی کے پاس رہنا پسند
کرے تو ہمیں اس بات کی بھی خوشی ہو گی۔ اِن سب کو تمہارے "پردیسی درخت" دیکھنے
کا بہت شوق تھا اور ہمارے پہلے پروگرام میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اگر تمہارے
گاؤں کا پتہ چل گیا تو ہم آتے جاتے وہاں ایک دو دن ضرور ٹھہریں گے لیکن آپ کے
خط سے پتہ چلا کہ آپ کے والد لاہور تبدیل ہو چکے ہیں پھر امی جان اچانک جالندھر تشریف
لے آئیں۔ اصل مقصد تو ہمیں کانگڑہ کی طرف رخصت ہوتے وقت دیکھنا تھا لیکن
پھر اچانک ایک دن ان کا موڈ بدلا اور وُہ ہمیں اپنے ساتھ یہاں لے آئیں۔ اب
پروگرام یہ ہے کہ میں اور فہمیدہ جالندھر اُتر جائیں گے اور امی جان اسی گاڑی پر لُدھیانہ
پہنچ جائیں گی۔"

"خالہ جان! انہوں نے ہمارے لیے اتنی تکلیف کی ہے اگر انھیں گھر ہی
واپس جانا ہے تو چند دن ہمارے ہاں ٹھہر جائیں۔ میری امی جان خوش ہو جائیں گی۔"

"نہیں بیٹا اگر وہ ایک دفعہ فیصلہ کر لیں تو اسے تبدیل کرنا بہت مشکل ہوتا
ہے۔ تمہاری امی جان کو خوش کرنے کے لیے میں فہمیدہ کو کہوں گی کہ اُنھیں ہر ہفتہ
ایک خط ضرور لکھا کرے۔ ہاں تمہارے لیے مَیں کچھ تصویریں لائی ہوں۔ نسرین کہتی
تھی "امی جان یہ تصویریں بھائی یوسف کی امی کے ہاتھ میں دینا ورنہ وہ کہیں گم کر دیں گے"۔
کمرے سے ایک خوشگوار سا قہقہہ سنائی دیا اور یوسف صفیہ کے ساتھ اندر
آگیا۔

فہمیدہ جو لجاتی شرماتی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ابھی تک نصف چہرہ دوپٹے سے
چھپائے بیٹھی تھی۔

قدسیہ نے اُس کے ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھتے ہوئے کہا "بیٹی! کتنے خوب صورت
ہیں تمہارے ہاتھ، اگر میرے پاس الہ دین کے چراغ کا جن ہوتا تو اسے حکم دیتی کہ میرے
سامنے اشرفیوں کا انبار لگا دو جو میری بیٹی فہمیدہ کے قد کے برابر اونچا ہو اور پھر میں
بھائی عبدالعزیز سے درخواست کرتی کہ وہ اس علاقے کے تمام غریبوں کو جمع کر لیں
کیونکہ میں فہمیدہ کے خوب صورت ہاتھوں سے یہ اشرفیاں اُن میں تقسیم کروانا چاہتی
ہوں"۔

اِس پر سب ہنس پڑے اور ان کے ساتھ فہمیدہ کے دبے دبے خوشگوار
قہقہے بھی سنائی دینے لگے۔ مسز احمد نے کہا "بیٹا یوسف! ہم تو کوئی اور ہی
پروگرام لے کر آئے تھے لیکن تمہاری امی جان کو دیکھ کر مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہیں
ہوتی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ تمہارے ساتھ چلیں گے اور مَیں ان کے ساتھ اُس
لیے کانگڑہ جانے پر تیار ہو گئی تھی کہ مَیں وہاں اطمینان سے تمہاری زبان سے
وہ دلچسپ واقعات سننا چاہتی تھی جو مجھے عبدالعزیز سے معلوم ہوئے۔ یہ کتنی
عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں مَیں اور میری بیٹیاں یہ دعا کیا کرتی تھیں

کہ کہیں سے تمہاری اطلاع آجائے تو عبدالعزیز کو تمہارے اور تمہارے خاندان کے متعلق ایک ایک بات معلوم تھی۔ ڈاکوؤں کے ساتھ تصادم کے جو واقعات اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ فہمیدہ نے اپنے چچا سے اصرار کر کے اُن کے پرانے پرچے منگوا کر ایک اچھی خاصی فائل تیار کر لی تھی۔"

"ماں جی یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں تھا۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے ایک نیک کام میں میری مدد کی تھی۔"

"کیوں بیٹی صفیہ فہمیدہ نے یہی کہا تھا نا کہ جب میں یوسف کی تعریف کروں گی تو وہ بے پروائی سے یہ کہے گا: ماں جی یہ کون سی بڑی بات تھی۔"

تھوڑی دیر بعد حویلی کا پھاٹک کھلنے کی آہٹ سنائی دی اور بلقیس نے باہر جھانکتے ہوئے کہا، "شاید وہ آگئے ہیں"۔ پھر وہ اٹھ کر باہر جھانکتے ہوئے بولی: "وہ اس طرف آنے کی بجائے بیٹھک کی طرف چلے گئے ہیں۔"

یوسف نے اٹھتے ہوئے کہا "میں اُن کے پاس جاتا ہوں۔"

مسز احمد نے قدسیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "بہن اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کھانے کے لیے انھیں یہیں بلا لیا جائے۔"

آپا جی! "مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ فہمیدہ کا چچا ہی نہیں میرا بھائی بھی ہے۔ اور اگر وہ میری وجہ سے اتنی دیر گھر سے باہر رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہونا چاہیے۔"

صفیہ نے کہا "میں انھیں بلا لاتی ہوں"۔ وہ کمرے سے نکل کر بیٹھک کی طرف چلی گئی؛ دس منٹ بعد وہ واپس آئی اور اُس نے کہا۔ "وہ کہتے ہیں کہ جب کھانا لگ جائے گا تو ہم آجائیں گے۔" ——— پھر اُس نے آواز دی:

"فہمیدہ بیٹی وہ یہ کہتے ہیں کہ تمہاری چچی کی کار ورکشاپ سے مرمت ہو کر آجائے گی۔ اب کھانے کے بعد تمہیں دو تین گھنٹے لاہور میں گھومنے کے لیے مل جائیں گے۔"

"امی جان! دوپہر کے کھانے کے بعد سیر تو ایک سزا ہوگی۔"

بلقیس نے کہا۔ "بیٹی یہ ضروری تو نہیں کہ تم دھوپ میں ہی سیر کرو۔ ہم چار بجے کے قریب گھر سے نکلیں گے پھر اطمینان سے سیر کریں گے۔ لارنس گارڈن میں تو ہم رات کے دس بجے تک گھوم سکتے ہیں۔ پھر علی الصبح شاہی مسجد قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ دیکھ سکیں گے۔"

مسز احمد نے کہا "بیٹی رات ہمیں جالندھر پہنچنا ہے۔"

قدسیہ نے کہا۔ "دیکھیے آپا جان جالندھر سے آپ کو کانگڑہ جانا ہے اور وہاں اگر ہماری خاطر تاخیر سے چلی جائیں تو کیا نقصان ہوگا۔ خدا کے لیے مجھے یہ تو یقین آنے دیجیے کہ میں نے خواب نہیں دیکھا۔ اب پروگرام یہ ہے کہ شام کو سیر کرنے کے بعد آپ سب میرے ہاں کھانا کھائیں گے اور رات وہیں رہیں گے۔ علی الصبح پھر ہم سیر کے لیے نکلیں گے اور کسی جگہ ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ناشتہ ہم ساتھ لے جائیں گے۔ دوپہر کے کھانے کے وقت ہم گھر پہنچ جائیں گے۔ پھر ہم سب آپ کو اسٹیشن پر جا کر رخصت کریں گے۔ ویسے آپ یوسف کی طرح مجھے بھی حکم دے سکتی ہیں اور ڈانٹ کر یہ کہہ سکتی ہیں؛ لڑکی تم خاموش رہو اور میں خاموش ہو جاؤں گی۔"

مسز احمد نے گھبرا کر کہا۔ "قدسیہ بیٹی دیکھو کہیں پھر نہ رو پڑنا۔ میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کروں گی جو تمہیں پسند نہ ہو۔"

قدسیہ مسکرائی۔

مسز احمد نے کہا۔ "بیٹی! اسی طرح مسکراتی رہا کرو، تمہارے چہرے پر مسکراہٹ

بہت اچھی لگتی ہے۔"

قدسیہ نے فہمیدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، "کیوں فہمیدہ بیٹی تمہیں بھی میری مسکراہٹ اچھی لگتی ہے؟"

"جی خالہ جان"

"بیٹی تم اس بات پر ناراض تو نہیں ہوگئیں، میں نے تمہاری نانی جان کو پروگرام تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟"

فہمیدہ نے جواب دینے کی بجائے قدسیہ کی طرف دیکھا اور ایک دائمی مسکراہٹ جو اکثر اس کے ہونٹوں پر دیکھی جاتی تھی اس کے چہرے پر آنکھوں تک پھیل گئی اور اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

قدسیہ نے کہا "بیٹی کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ہزاروں دعاؤں کے بعد تمہاری نانی، تمہاری امی اور تم ملی ہو اور مجھے اس سے زیادہ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا کہ ایک دن اور ٹھہر جاؤ۔ مجھے ایک ہفتہ نہیں ایک مہینہ اور کہنا چاہیے تھا۔

وہ ہنس پڑیں۔

صفیہ بولی، "آخر تم ایک ادیب کی ماں ہو نا۔"

فہمیدہ نے کہا "خالہ جان جالندھر یا لدھیانہ یہاں سے بہت دور تو نہیں ہے۔"

"بیٹی اب دور نہیں ہیں کل تک تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں نہ ختم ہونے والے فاصلوں میں گم ہو کر رہ جاؤں گی۔"

○

بیٹھک میں عبدالعزیز یوسف سے کہہ رہا تھا "دیکھو بھائی مجھ سے یہ وعدہ کرو کہ جب تمہیں فرصت ملا کرے گی تو تم سیدھے یہاں آجایا کرو گے ہم میں سے کوئی گھر میں ہو یا نہ ہو تمہارے ٹھہرنے کا انتظام یہاں ضرور ہوا کرے گا۔ میرا چھوٹا بھائی کمال الدین

کالج میں داخل ہوا تھا تو اس وقت اس مکان میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی۔ بھابی صفیہ اور ان کی بچیاں بھی یہاں آجایا کرتی تھیں۔ فہمیدہ اور نسرین کے ساتھ تو ہم میاں بیوی اتنے مانوس تھے کہ کسی نہ کسی بہانے جالندھر چلے جایا کرتے تھے۔ کمال الدین میڈیکل کالج سے فارغ ہو کر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلا گیا ہے تو ہمیں اس گھر میں پاؤں رکھتے ہوئے گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔

یوسف نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ "چچا جان! آپ کے بچے کہاں ہیں؟"

"بھائی!" اس نے جواب دیا، "اللہ نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا ہے اور میں تمام اچھے بچوں پر ایک باپ کا پیار تقسیم کرتا رہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اس میں سے تم بھی ایک بڑا حصہ لے چکے ہو۔ میں کسی بچے کی جن اچھائیوں کا تصور کیا کرتا تھا وہ سب مجھے تم میں نظر آتی ہیں اور وہ بھی نظر آتی ہیں جن کا تصور میں نہیں کیا کرتا تھا۔ مثلاً میں تمہیں گاؤں کے ایک بہادر آدمی، ایک بہترین شہسوار اور ایک نڈر اور ذہین نوجوان کی حیثیت سے جانتا تھا۔ پھر نسرین اور اس کی نانی سے معلوم ہوا کہ تم تیراک بھی ہو اور کشتی کھینا بھی جانتے ہو اور فہمیدہ کا یہ دعویٰ ہے کہ تم اپنے قلم سے اپنے لیے بڑی سے بڑی کامیابی کے راستے کھول سکتے ہو، اچھا یہ بتاؤ تمہیں کار چلانا بھی آتی ہے؟"

"نہیں چچا جان کار چلانا گاؤں والوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

"لاہور گاؤں نہیں ہے یوسف تمہارے جیسا آدمی جسے کشتی تک چلانی آتی ہو وہ تین چار دن میں اچھا خاصا موٹر ڈرائیور بن جائے گا۔"

"چچا جان جب میں موٹر لینے کے قابل ہو جاؤں گا تو چلانا بھی سیکھ لوں گا۔"

"بھئی چلانا سیکھ لوگے تو موٹر بھی آجائے گی۔ آج تھوڑی دیر تک بلقیس کی کار یہاں آئے گی اور ڈرائیور کو یہ کہوں گا کہ وہ ایک ہفتہ کے لیے دو تین گھنٹے روزانہ تمہیں دیا کرے۔ بڑا تجربہ کار ہے وہ۔ اور جب اسے یہ بتایا جائے گا کہ اسے ایسے نوجوان کا استاد بنایا جا رہا ہے جس نے ایک انتہائی خوفناک ڈاکو کو پکڑا تھا۔ جس کے نام سے

بڑے بڑے بدمعاش کانپتے تھے تو وہ بہت خوش ہوگا۔"
یوسف نے کہا "نہیں چچا جان آپ کو اِس سے تکلیف ہو گی۔"
"بیٹا مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی تم جانتے ہو کہ میں اپنے لیے سائیکل پسند کرتا ہوں" یہ کار بلقیس کو تین سال قبل اس کے والد نے دی تھی۔ پھر وہ بھی اسے کم ہی استعمال کرتی ہے، بلکہ اُس نے تو یہ کہہ دیا تھا کہ: "ہم تو ڈرائیور کے اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے" اس پر اُس کے ابا جان نے ڈرائیور کی تنخواہ اپنے ذمہ لے لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بات پر خوش ہوں گی کہ آپ نے اُن کے ڈرائیور سے کار چلانا سیکھی ہے۔ بلکہ وہ اُسے انعام بھی دیں گی۔"

یوسف نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نماز کے لیے مسجد تک جا رہا ہوں۔"

عبدالعزیز نے اُٹھتے ہوئے کہا "چلو میں بھی چلتا ہوں۔"
جب وہ باہر نکلے تو برآمدے سے صفیہ کی آواز سنائی دی۔ "بھائی جان کھانا تیار ہے۔"

عبدالعزیز نے جواب دیا۔ "ہم نماز پڑھ کر آتے ہیں۔"
قدسیہ نے ایک کمرے میں ظہر کی نماز ادا کی اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ فہمیدہ اُس کے بائیں ہاتھ کھڑی ہے۔ وہ دُعا ختم کر کے اُٹھی، چند ثانیے اُس کے پیچھے کھڑی رہی اور پھر ذرا ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اسے قیام اور رکوع و سجود تک فہمیدہ کی ہر بات انوکھی معلوم ہوتی تھی اور اُس کے دل سے بے اختیار یہ دعائیں نکل رہی تھیں:
"یا اللہ اس بچی کا حُسن اور اِس کی پاکیزگی اسی طرح قائم رہے۔

اِسے اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دے۔ یا اللہ اِس کے والدین اِس کی اَن گنت خوشیاں دیکھیں۔ یا اللہ مجھے اتنی زندگی دے کہ میں یوسف اور اِس بچی کے لیے جی بھر کر دعائیں کر سکوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ سب دسترخوان پر بیٹھے ہوتے تھے اور صفیہ کہہ رہی تھی:
"آپا قدسیہ آپ کے آنے کی خوشی میں میں باورچی خانے کی طرف توجہ نہیں دے سکی ویسے ہماری باورچن مہمانوں کی شکل دیکھ کر ہی سمجھ جاتی ہے کہ وہ کس قسم کا نمک مرچ پسند کریں گے۔"

اور قدسیہ کہہ رہی تھی۔ "پھر تو ہمیں اس کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ہمیں اچھے مہمانوں میں شامل کر لیا ہے۔"
خادمہ نے کہا۔ "جی بی بی جی آپ سے اچھا کون ہو سکتا ہے۔"
"واہ بھئی تمہاری بریانی کا تو کوئی جواب نہیں۔ کیا نام ہے تمہارا؟"
خادمہ نے شرماتے ہوئے کہا۔ "جی میرا نام فضلاں ہے۔"
قدسیہ نے کہا "اگر ہمیں کسی دن خاص لوگوں کو دعوت پر بلانا پڑا تو میں بہن بلقیس سے درخواست کروں گی کہ تمہیں ایک دن ہمارے گھر آنے کی چھٹی مل جائے۔"

بلقیس بولی۔ "خدا کا شکر ہے کہ تمہیں فضلاں کا کھانا پسند آیا ہے۔ اب پ کو جب بھی ضرورت پڑے گی یہ آپ کے پاس پہنچ جایا کرے گی۔"
کھانے سے فارغ ہو کر قدسیہ نے عبدالعزیز سے مخاطب ہو کر کہا "بھائی جان! پ ڈرائیور سے کہیں کہ مجھے گھر چھوڑ آئے۔ میں نے نوکر کو شام کے کھانے کے لیے ہ ہدایات دینی ہیں۔"
بلقیس بولی۔ "بہن کچھ دیر آرام کر لو، بہت گرمی ہے۔ کھانا پکانے کے لیے

میں فضلاں بی بی کو آپ کے ساتھ بھیج دوں گی۔"

"بہن یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ شاید فضلاں کی وجہ سے ہمارے نوکر کو کچھ عقل آجائے۔ وہ خواہ کوئی چیز پکائے ذائقہ بالکل ایک ہوتا ہے۔ میں تین بجے یہاں سے چلی جاؤں گی۔

یوسف یہیں رہے گا اور چار بجے آپ کے ساتھ وہاں آجائے گا۔ وہاں چائے پی کر ہم چڑیا گھر اور لارنس گارڈن جائیں گے۔ باقی لاہور دیکھنے کے لیے ہم صبح نماز پڑھتے ہی نکل جائیں گے۔"

مسز احمد نے کہا۔ "بیٹی میں نے چڑیا گھر، لارنس گارڈن اور باقی لاہور دیکھا ہُوا ہے۔"

"جی وُہ مَیں نے بھی دیکھا ہُوا ہے۔ یوسف نے لاہور پہنچتے ہی مجھے خوب سیر کرا دی تھی۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "بھئی اصل بات یہ ہے کہ لاہور کے پروگرام کا تعلق فہمیدہ سے ہے۔ بچپن میں جب یہ یہاں آیا کرتی تھی تو اِس کا پہلا مطالبہ یہ ہوا کرتا تھا کہ مجھے چڑیا گھر لے چلو۔ پروگرام آج بھی یہی تھا کہ صبح ہوتے ہی میں اِسے چڑیا گھر دکھلاؤں لیکن مجھے یوسف صاحب کی تلاش میں جانا پڑا۔"

قدسیہ نے کہا "بھائی جان ہمیں یقین ہے کہ آج ہمیں دیکھ کر فہمیدہ کو چڑیا گھر جانے سے زیادہ خوشی ہوئی ہوگی۔"

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے سر نیچے کر لیا۔

تھوڑی دیر بعد قدسیہ نے اُٹھ کر اپنے سر پر چادر لیتے ہوئے یوسف سے کہا۔ "تھوڑی دیر آرام کرلیں تو اطمینان سے انھیں لے کر آجانا۔ مجھے ابھی خیال آیا ہے کہ وہ کوٹھی والے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اور اگر تمہارے ابا جان ہمارے

گھر سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ڈیرے سے واپس آگئے ہونگے تو انھوں نے انھیں بہت پریشان کیا ہوگا۔

"یہ کوٹھی والے کون ہیں بہن؟"

"انھیں بھائی عبدالعزیز جانتے ہیں۔ آؤ فضلاں بی بی۔"

وُہ سب قدسیہ کو رخصت کرنے کے لیے باہر نکلے۔

"دیکھئے جی باہر بہت گرمی ہے۔ آپ آرام سے بیٹھی رہیں۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "آپا جی یہ آپ کو روانہ کرنے سے پہلے آرام نہیں کریں گی اگر ایک دوسرے کے آرام کا اتنا خیال ہے تو وہ باتیں جو عورتیں رخصت ہوتے وقت دروازے سے باہر کیا کرتی ہیں وہ یہاں برآمدے میں ہی کرلیں۔ مَیں نے ڈرائیور کو سمجھا دیا ہے وہ سیدھا آپ کو آپ کے گھر لے جائے گا۔"

"اچھا جی جاتی ہوں خدا حافظ۔"

قدسیہ یہ کہہ کر تیزی سے پھاٹک کی طرف بڑھی اور بلا توقف کار میں سوار ہو گئی۔

فضلاں بھی بھاگ کر اُس کے ساتھ جا بیٹھی اور ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کر دی۔

وہ سب چند قدم دُور کھڑی ہنستی ہوئی ہاتھ ہلا رہی تھیں اور قدسیہ اپنا ہاتھ باہر نکال کر اُن کے اشاروں کا جواب دے رہی تھی۔



کار عین مکان کے سامنے رُکی اور نوکر علی بخش نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "بی بی جی آپ کہاں چلی گئیں تھیں۔ میاں جی آپ کے جاتے ہی آگئے تھے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے تو عبدالکریم صاحب کا نوکر آگیا اور کہنے لگا کہ بی بی جی سے

کہو کہ میں ان کے لیے کار لے آیا ہوں ۔ میاں جی نے پہلے بھی میری بہت مرمت کی
تھی ۔ اب دوبارہ میری شامت آگئی اور وہ بار بار پُوچھتے تھے ۔ بے وقوف تم نے اُن
سے یہ پوچھا کیوں نہیں تھا کہ وہ کہاں جارہی ہیں اور اس بدتمیز نوکر نے میرے لیے
ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی ۔ جناب امینہ بی بی کہتی تھیں کہ جب صبح ہم انھیں
لینے آئی تھیں تو بیگم صاحبہ اور یوسف صاحب کسی آدمی کے ساتھ تانگے پہ جارہے
تھے ۔ مجھ سے دوبارہ پوچھا جارہا تھا کہ اے گدھے مجھے بتاؤ کہ وہ آدمی کون تھا ۔ مَیں نے
جواب دیا ۔ جناب کوئی یوسف صاحب سے ملنے آیا تھا اور اس نے ناشتہ بھی
ان کے ساتھ کیا تھا اور وہ بدتمیز نوکر پھر بول اُٹھا ۔ ”میاں جی چھوٹی اور بڑی بی بی دونوں
یہ کہتی تھیں کہ وہ یوسف صاحب کا انکل تھا اور وہ اُس کے گھر جارہے تھے ۔
میری پھر شامت آگئی اور مجھ سے پوچھا جارہا تھا وہ کون تھا جو یوسف کا انکل بن کر
آیا تھا ۔ تم اتنے بے وقوف ہو کہ یہاں کوئی ہمارا ملنے والا آتے اور تم اسے پہچان بھی
نہ سکو ۔ مجھے الّو اور گدھا بھی کہا انھوں نے ۔ یہ شکر ہے کہ میاں جی تھکے ہوئے تھے
انھیں کھانا کھاتے ہی نیند آگئی اور یہ بھی شکر ہے کہ آپ واپس آگئی ہیں ورنہ میری
جان پر بنی ہوئی تھی ۔ ابھی میں اس بات سے ڈر رہا تھا کہ وہ عبدالکریم والے اگر ایک
بار پھر یہاں پہنچ گئے تو میرا کیا بنے گا ۔“

”اچھا علی بخش تم فوراً قصائی کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ ہمارے خاص
مہمان آرہے ہیں ہمیں بہت اچھا چار سیر گوشت چاہیے ۔ کھانا پکانے کے لیے
فضلاں بی بی آگئی ہے ۔ تم نے آج اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرنا ۔ جو چیزیں یہ مانگے اسے
بازار سے لا دینا اور تمہیں جلد واپس آکر چائے کے لیے کچھ چیزیں بھی لانی ہیں کیونکہ
مہمان چائے یہاں پئیں گے ۔ چائے تم بہت اچھی بناتے ہو، اِس لیے میں فضلاں
کو تکلیف نہیں دوں گی ۔“

قدسیہ اندر آگئی تو یہی شکایت یوسف کے بہن بھائی کر رہے تھے کہ آپ
ہمیں بتا کر کیوں نہیں گئیں ۔ ابّا جان بہت غصّے میں تھے ۔
لیکن وہ قطعاً پریشان نہ تھی ۔ اُس نے بڑے کمرے میں جا کر دیکھا ۔ میاں عبدالرحیم
بڑے آرام کی نیند سو رہے تھے ۔ عصر کی نماز کے بعد وُہ کام میں مصروف ہو چکی تھی ۔
کچھ دیر بعد کار کا ہارن سنائی دیا اُس نے دروازہ کھولا اور کار سے یوسف کے ساتھ
صفیہ، فہمیدہ اور بلقیس اُتریں ۔

قدسیہ نے پُوچھا ۔ ”بیٹا یوسف ۔ بھائی عبدالعزیز اور مسز احمد نہیں آئے ۔“

”جی عبدالعزیز صاحب کو اپنے دفتر میں کوئی کام تھا اور ماں جی کو تھکاوٹ اور
نیند محسوس ہو رہی تھی ۔“

بلقیس بولی ۔ ”آپا جی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فہمیدہ کی موجودگی میں وہ میری
غیر حاضری محسوس نہیں کریں گی ۔“

فہمیدہ بولی ۔ ”انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم سیر سے فارغ ہو جائیں تو
یوسف صاحب کو میرے پاس چھوڑ جائیں مجھے ان سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا ۔“

قدسیہ انھیں بیٹھک میں لے گئی اور نوکر کو شربت لانے کا حکم دے کر
یوسف کی طرف متوجہ ہوئی ۔ ”بیٹا ! میرا خدشہ درست ثابت ہوا ۔ ہمارے بعد تمہارے
ابّا جان پہنچ گئے تھے اور عبدالکریم والوں نے نوکر کو موٹر دے کر بھیج دیا تھا ۔ اب
وہ گہری نیند سو رہے ہیں ۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ چائے سے فارغ ہوتے ہی باہر
نکل جاؤں ۔“

بلقیس بولی ۔ ”بہن آپ فکرمند نہ ہوں ۔ اگر آپ کو ایک اور حملے کا خدشہ ہے
تو ہم آپ کی پوری مدد کریں گے ۔“

قدسیہ نے کہا ۔ ”بہن مجھے صرف ایک پریشانی ہے اگر وُہ اچانک

آگئیں تو کل دعوت میں ہماری شرکت سے معذرت قبول کرنے کی بجائے یہ اصرار کریں گی کہ آپ بھی دعوت میں شریک ہوں۔"

صفیہ نے کہا۔" تو بہن اِس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ ہم بڑی خوشی سے جائیں گی آپ کے ساتھ۔ یوسف صاحب کہتے ہیں کہ صاحبزادی کو اپنی نئی موٹر کار دکھا کر چلانے کا شوق ہے۔ ہم جی بھر کر ان کا یہ شوق پورا کریں گے۔"

" نہیں بہن"۔ قدسیہ نے پریشان سی ہو کر کہا۔" مَیں فہمیدہ کو اُس بے وقوف کے ساتھ کبھی بیٹھنے نہ دوں گی۔"

وہ چائے پی رہے تھے کہ دوسرے کمرے سے عبدالرحیم نے نوکر کو آواز دی۔

قدسیہ شربت کا گلاس بھر کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ میاں صاحب کا موڈ کچھ اچھا نہیں تھا، لیکن ٹھنڈے شربت کا گلاس پینے کے بعد انھوں نے کہا۔" قدسیہ تم سے اتنی غیر ذمہ داری کی توقع نہیں تھی۔ مَیں ساری زندگی اِتنا پریشان نہیں ہوا۔ تم نے گھر میں کسی کو تو یہ بتا دیا ہوتا کہ کہاں جا رہی ہو۔"

قدسیہ چند ثانیے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر وہ مسکرائی اور میاں صاحب کے سارے شکوے جاتے رہے۔

اچھا یہی بتا دو کہ وہ یوسف کے انکل صاحب کون تھے جن کے ساتھ تم تانگے پر سوار ہو کر نکل گئی تھیں اور وہ جو تمھیں کار پر لینے آئی تھی ایک دوسری کا منہ دیکھتے رہ گئیں۔"

"صغریٰ" قدسیہ نے آواز دی۔ اپنے ابا کے لیے چائے لاؤ۔ آپ اطمینان سے چائے پیئیں۔ اُس انکل صاحب کو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ بیٹھک میں

چند خاص قسم کی مہمان بیٹھی ہوئی ہیں۔ مَیں ابھی آتی ہوں۔"

صغریٰ نے چائے لا کر میاں صاحب کے سامنے رکھ دی اور انھوں نے پُوچھا۔" بیٹے! تم جانتی ہو مہمان کون ہیں۔"

" نہیں ابا جان! لیکن وہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ ان کی ایک بیٹی تو بالکل شہزادی معلوم ہوتی ہے۔"

" اچھا بیٹی! اب یوسف کو بھیج دو۔"

صغریٰ چلی گئی اور ایک منٹ بعد یوسف کمرے میں داخل ہُوا اور السلام علیکم کہہ کر ادب سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

میاں صاحب نے کہا۔" بیٹا! مجھے تم پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ تم گھر میں کسی کو بتا کر نہیں گئے اور وہ تمھارا انکل کون تھا جس نے مجھے اور مجھ سے زیادہ عبدالکریم کے خاندان کو پریشان کیا ہے۔"

یوسف مسکرایا۔" ابا جان! وہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب تھے اور عبدالکریم صاحب بھی انہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جن کی ایک بزرگ خاتون اور ایک بچی کے ساتھ ۱۹۴۲ء کے سیلاب کے دنوں مَیں نے کوئٹہ سے امرتسر تک سفر کیا تھا۔ وُہ صبح سویرے مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے اور انھوں نے یہ بتایا کہ وُہ معزز خاتون ان کے ہاں میرا انتظار کر رہی ہے۔ ہمیں فوراً اُن کے ساتھ جانا پڑا۔ تانگے پر نکلے تو عبدالکریم کی بیٹی اور بیگم سے سامنا ہو گیا۔ وُہ ہمیں کوٹھی دکھانے کے لیے لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ اُن سے معذرت کر لی جائے۔"

" بیٹا! یہ تم نے اچھا کیا۔ جس معزز خاتون کو تم نے ماں کہا تھا اُس کے لیے ہر پروگرام منسوخ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن کسی کو بتا کر گئے ہوتے نا۔"

"اباجان ہم گھر سے کچھ دُور آ چکے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ ان کے خاندان کے لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔"

"عبدالعزیز صاحب تمہارے ساتھ نہیں آئے۔"

"اباجان! وُہ کچھ مصروف تھے۔ انشاء اللہ آپ سے ملا کریں گے۔"

"بیٹا اپنی ماں سے پوچھو اُن کی خاطر تواضع کا بھی کوئی انتظام ہو رہا ہے کہ نہیں۔"

"اباجان! کل تک وہ امّی کے مہمان ہیں اور امّی جان ان کا کھانا تیار کرنے کے لیے انسپکٹر صاحب کی باورچن کو بھی یہاں لے آئی ہیں۔"

عبدالرحیم نے اُٹھ کر اُسی کمرے میں عصر کی نماز ادا کی اور نوکر نے حقہ لا کر سامنے رکھ دیا۔

قدسیہ جس نے فہمیدہ کا بازو پکڑ رکھا تھا صحن کی طرف سے نمودار ہوئی اور اُس نے دروازے کے سامنے کھڑی ہو کر کہا "یوسف کے ابا۔ دیکھئے یہ کون ہے؟"

"انہوں نے جواب دیا "کیا یہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب کی بیٹی ہے؟"

بیٹی نہیں۔ یہ بھتیجی ہے۔ بہت ہی لاڈلی۔ بہت ہی پیاری بھتیجی۔ اب آپ یہ بتلائیے کہ مجھے ایسے مہمانوں سے نظر ہٹا کر کسی اور طرف ایک منٹ کے لیے بھی توجہ دینی چاہیے تھی۔"

بالکل نہیں، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے گھر میں ایسے مہمان دیکھنے کے بعد انہیں کھانے کی دعوت پر اصرار کرنے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"بیٹی اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہیں دیکھ کر میں نے اپنی آنکھوں میں ٹھنڈک محسوس کی ہے" قدسیہ نے کہا۔ "مجھے اپنے مہمانوں کے ساتھ سیر کے لیے جانے کی اجازت ہے؟"

"میں نے کب کہا تھا کہ آپ کو اجازت لینے کی ضرورت ہے۔"

"یوسف بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔"

"ہاں ہاں ضرور جائیے۔"

"شاید ہمیں دیر بھی ہو جائے۔"

"لیکن مہمانوں کے آرام کا خیال تو رکھو گی نا۔ مجھے کچھ میٹھے خربوزے مِل گئے تھے اور مَیں سوچ رہا تھا کہ آج کوئی مہمان آجائے تو بہت اچھا ہوگا۔"

قدسیہ بولی۔ "اب آپ کو یہ پریشانی تو نہیں ہوگی کہ کوٹھی والے آکر آپ کو تنگ کریں گے۔"

"بھئی پریشانی کس بات کی۔ مَیں انھیں کہہ دوں گا کہ بیگم صاحبہ اپنے مہمانوں کو چھوڑ کر گھر سے نہیں نکل سکتیں لیکن مہمان اتنے اچھے ہیں کہ وہ بھی ان کی دل شکنی پسند نہیں کریں گے۔"

"وہ آکر یقیناً اصرار کریں گے کہ ہمارے مہمانوں کو بھی شریک ہونا چاہیے اور آپ مہمانوں کی طرف سے بھی دعوت قبول کر لیجیے۔

عبدالعزیز صاحب سے ڈاکے کے واقعات سن کر مہمانوں کو ہم سے بہت دلچسپی ہوگئی ہے۔"

"اچھا آؤ بیٹی"

فہمیدہ قدسیہ کے ساتھ بیٹھک میں چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد وُہ کار میں بیٹھ کر جڑیا گھر کا رُخ کر رہے تھے۔

باب ۔ ۲۲

چڑیا گھر پہنچتے ہی یوسف نے سب سے پہلے باہر کی دو کانوں سے بھنے ہوئے چنے خریدے پھر ٹکٹیں لیں اور اپنی والدہ اور مہمانوں کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ابھی تک فہمیدہ سے براہِ راست اُس کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ اُس نے صفیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "خالہ جان! چڑیا گھر کا پروگرام فہمیدہ کے لیے بنایا گیا ہے اِس لیے یہاں سے آگے ہماری رہنمائی وہ کریں گی۔ اور ہمیں اُن کی پسند کی چیزیں دیکھنے پر اکتفا کرنا پڑے گا۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "نہیں جی میں بہت دیر کے بعد یہاں آئی ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہاں کون سے نئے جانور لائے گئے ہیں۔ اِس لیے رہنمائی آپ کو کرنی چاہیے۔"

کوئی بیس منٹ گھومنے کے بعد بلقیس نے کہا۔ "بھئی ہماری عمر کی عورتیں تو اس گرمی میں چڑیا گھر میں پھرتی ہوئی عجیب لگتی ہوں گی۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کہیں چھاؤں میں بیٹھ جائیں اور یوسف صاحب فہمیدہ کو ان کی پسند کے جانور دکھا لائیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "ٹھیک ہے بہن میں بھی کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہی ہوں یوسف تم جلدی سے چکر لگا آؤ ہم اُس طرف چھاؤں میں بیٹھ کر تمہارا انتظار

کریں گی لیکن گرمی بہت ہے فہمیدہ بیٹی کو زیادہ تھکا نہ دینا۔"

وہ چل پڑے تو بلقیس نے کہا۔ "آپا جی فہمیدہ اس لحاظ سے بڑی خوش نصیب ہے کہ اِسے جو بھی دیکھتا ہے بڑا پیار کرتا ہے لیکن میں ایک بات بتا دوں اس کے متعلق کہ وُہ اتنی نازک نہیں ہے۔"

چند جانوروں کے جنگلے دیکھنے کے بعد وہ اپنے ساتھیوں کی نگاہوں سے اُوجھل ہو چکے تھے اور یوسف پہلی بار بے تکلفی سے اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"فہمیدہ صاحبہ اب آپ بتائیے کہ ہم کہاں سے شروع کریں دراصل میرا مقصد جانور دیکھنے سے زیادہ آپ سے باتیں کرنا تھا جو بظاہر مجھے ناممکن نظر آتا تھا۔ صرف یہی نہیں مَیں آپ کو اس قدر قریب سے دیکھنا بھی ناممکن سمجھتا تھا۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "جی مجھے سب سے پہلے بھیڑیئے کے جنگلے کے پاس لے چلیے۔"

"چلئے، وہیں چلتے ہیں۔ لیکن بھیڑیئے میں آپ کو کوئی خاص دلچسپ بات نظر نہیں آئے گی۔ بس سمجھ لیجئے کہ وہ ایک طرح کا السیشن کتا ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کی درندگی ذرا زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ ایک خصوصیت اس کی یہ ہے کہ وہ جنگلے کے اندر عام طور پر اپنی بھوک کی وجہ سے بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ آپ یہ بھوکا اور بے رحم جانور دیکھ کر کیا کریں گی؟"

فہمیدہ بولی۔ "میں نے یہ جانور دیکھا ضرور ہوگا مگر مجھے یاد نہیں کہ وہ مردار پر آپ کی سرگزشت پڑھنے کے بعد میں اس جانور کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی کہ یوسف صاحب کی داستان میں اگر ان بھیڑیوں کا قصہ نہ آتا تو نانی جان اور نسرین سے اُن کی واقفیت نہ ہوتی۔ اور وہ اُن کے ساتھ سفر کرتے نہ وہ اپنا مسودہ بھیجتے اور نہ میں اسے بار بار پڑھتی۔"

باتیں کرتے کرتے وہ بھیڑیئے کے جنگلے کے قریب پہنچ گئے۔ فہمیدہ کہہ رہی

تھی۔ "یوسف صاحب! یہ جانور یقیناً خوفناک ہوگا لیکن میں اس سے نفرت نہیں کرسکتی۔"

یوسف نے پوچھا۔ "فہمیدہ میری تحریر آپ کو واقعی پسند آئی تھی یا آپ میرا دل رکھنے کے لیے باتیں کر رہی ہیں۔"

"یوسف صاحب کاش ان دنوں جب میں رات کی تنہائی میں آپ کی دلچسپ تحریر پڑھا کرتی تھی میرے دبے دبے قہقہے آپ کے کانوں تک پہنچ سکتے۔ آپ کے گاؤں کے مناظر ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہوتے تھے۔ میں گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں گھوما کرتی تھی اور آپ کے ساتھ سرپٹ گھوڑے پر سواری کیا کرتی تھی۔ میں آپ کے "پردیسی درختوں" کے درمیان بھی گھوما کرتی تھی۔ ایک دن نسرین نے مجھ سے کہا تھا۔ "کاش آپا! تم نے بھائی یوسف کو دیکھ لیا ہوتا" اور میں نے اُسے جواب دیا تھا۔ "میری بہن میں انہیں تم سے زیادہ دیکھ چکی ہوں وہ حیران ہو کر پوچھتی تھی، "کہاں"؟ میں نے جواب دیا تھا "اس کتاب کے اندر، اور جب تم بڑی ہو جاؤ گی اور اس کتاب کو سمجھ سکو گی تو تمہیں یہ محسوس ہوگا کہ یوسف جو اس کتاب کے اندر ہے وُہ تمہارے اُس بھائی سے زیادہ خوب صورت ہے جس کے ساتھ تم نے سفر کیا تھا۔"

وہ ٹہلتے ہوئے کئی جنگلوں کے قریب گئے لیکن اس ماحول میں انہیں اپنے سوا ہر چیز غیر اہم معلوم ہوتی تھی۔ چنوں کا ایک لفافہ انھوں نے بندروں، ہرنوں، پہاڑی بکروں بارہ سنگھوں اور نیل گایوں کو کھلا دیا تھا۔ جب یوسف نے شتر مرغ کے جنگلے کے قریب جا کر دانوں کی ایک مٹھی بھر کر اس کے سامنے کر دی تو فہمیدہ نے گھبرا کر اُسے پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے! انھیں کاٹ لے گا۔ آپ اتنے بڑے قد آور بے تحاشا لمبی گردن اور اس قدر چھوٹے سر والے جانور کا اعتبار کیسے کر سکتے ہیں۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ان تمام باتوں کے باوجود یہ جانور میرے دوست ہیں۔

آپ نیل گایوں اور بارہ سنگھوں کو بھی میرا ہاتھ چاٹتے دیکھیں گی۔ ہاتھی کے ساتھ تو میری اچھی خاصی بے تکلفی ہے۔ سواری کریں گی آپ ہاتھی پر؟"

فہمیدہ مسکرائی اور یوسف کو ایسا محسوس ہوا کہ نسوانی حسن و وقار اطراف عالم سے سمٹ کر اُس کے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔ اگلے جنگلے پر اُس کی دیکھا دیکھی فہمیدہ بھی اپنے ہاتھ سے ہرنوں کو چنے کھلانے کی کوشش کرنے لگی لیکن جب کوئی ہرن دانوں کی طرف لپکتا تو وہ گھبرا کر ہاتھ باہر نکال لیتی۔ نیل گائیں یوسف کو دیکھتے ہی اس کے پاس جمع ہو گئیں اُس نے لفافے سے چنوں کی مٹھی نکالی اور پورا ہاتھ جنگلے کے اندر کر دیا۔ ایک نیل گائے نے چند دانے منہ میں ڈالے تو یوسف نے مٹھی بند کر کے دوسری نیل گائے کے آگے کر دیے اور پھر اس نے خالی ہاتھ کھول دیا اور دونوں اُسے چاٹنے لگیں۔

فہمیدہ نے پوچھا "آپ کو بالکل خوف نہیں آتا کسی جانور سے؟"

"ان جانوروں سے تو آپ کو بھی خوف نہیں آنا چاہیے۔ آپ کے ہاتھ اللہ نے ایسے بنائے ہیں کہ ان جانوروں میں سے کسی کا دماغ اگر بالکل جواب دے جاتے تو بھی وُہ ان ہاتھوں کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے گردن جھکا لی اور اپنے ہاتھ چادر کے اندر کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں جناب! میں ان کی دماغی حالتوں کا معائنہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ خطرے میں نہیں ڈالوں گی۔ لیکن چلیے! وہ ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی! آپ کو دیکھنے سے قبل میرے دل میں ہزاروں سوال تھے۔ لاتعداد شکایات تھیں اور دل میں دعا کر رہی تھی کہ آپ سے باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔ اب باتیں کرنے کا موقع ملا ہے تو صرف ایک شکایت ذہن میں رہ گئی ہے کہ آپ لاپتہ کیوں ہو گئے تھے؟ ہمارا پتہ اپنے سامان کے ساتھ بھول جانا کوئی معقول بہانہ نہیں ہوگا کیونکہ اگر آپ کو یہ احساس ہوتا کہ میری ننھی بہن اتنی پریشان ہوگی تو آپ فوراً ہمارا پتہ معلوم کر سکتے تھے۔ آپ کوئٹہ میں ہمارے

رشتہ داروں سے رابطہ پیدا کر سکتے تھے ۔ آپ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ میرے چھوٹے
چچا میڈیکل کالج سے فارغ ہو کر انگلستان گئے ہیں ۔ آپ میڈیکل کالج جا کر ساری
معلومات حاصل کر سکتے ہیں وہاں آپ کو کئی ایسے استاد اور طالب مل جاتے
جو ہمارے متعلق بتا سکتے تھے ۔"

یوسف مسکرایا: "اللہ کے بعض انعامات ان راستوں سے آتے ہیں جن کے
متعلق ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے ۔ دیکھئے میں گاڑی میں اپنا ایک تھیلا بھول گیا تھا
اور قدرت نے نسرین کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ اِس تھیلے سے میرا مسودہ اُس ذہین لڑکی
کے پاس پہنچا دے جو اس وقت میرے سامنے کھڑی ہے ۔ میں نسرین کو بھولا نہیں تھا،
لیکن اسے دوبارہ دیکھنے کا معاملہ میں نے اللہ کو سونپ دیا تھا ۔ مجھے یہ بھی اطمینان تھا کہ
اپنے دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر مجھے نسرین کی نانی اور باقی عزیزوں کو تلاش کرنے میں
مشکل پیش نہیں آئے گی ۔ لیکن میرے طالب علمی کے دور سے اس کا کوئی تعلق نہیں
تھا ۔ اب دیکھئے تھوڑی سی پریشانی کے بعد مجھے کتنے انعام ملے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ
کے ذہن میں ڈالا اور آپ نے خط لکھ دیا اور مجھے یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں ایسے لوگ
بھی ہیں جو مستقبل کے ایک ایسے ناول نگار سے دل چسپی رکھتے ہیں جس کی چاروں اطراف
سے حوصلہ شکنی ہوئی ۔"

فہمیدہ نے کہا: "یوسف صاحب میں صرف دلچسپی ہی نہیں رکھتی بلکہ مجھے یقین
ہے کہ ادب کے جس میدان میں آپ قدم رکھنا چاہتے ہیں وہاں آپ کا کوئی حریف نہیں
ہو گا ۔"

"فہمیدہ تم خوش قسمت ہو کہ تمہاری چھوٹی سی بہن تمہارے متعلق اتنا کچھ جانتی
تھی اور تم پر اتنا فخر کرتی تھی کہ میں سراسر ایک اجنبی ہونے کے باوجود اس کی باتوں سے
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا لیکن میری حالت یہ ہے کہ اب تک اس دنیا میں صرف

تین انسان مجھے جانتے ہیں ایک میری امی جان جن کی بدولت چاروں اطراف سے
حوصلہ شکنی کے باوجود میری خود اعتمادی قائم رہی ہے اور دوسری آپ اور آپ کی
چھوٹی بہن نسرین جن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہیں ملتے ۔"

یوسف صاحب! "امی جان بھی آپ کا مسودہ پڑھ چکی ہیں اس لیے انھیں بھی اپنے
مداحوں میں شامل کر سکتے ہیں آپ کے گاؤں کا ماحول اور اس کے قدرتی مناظر میرے دل پر نقش ہو چکے ہیں ۔
میں آپ کے "پردیسی درختوں" کے متعلق اکثر سوچا کرتی ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دن وہاں
جا کر انھیں دیکھ سکوں ؟"

"فہمیدہ آج مجھے کوئی بات ناممکن محسوس نہیں ہوتی ۔ مجھے تو یہ بھی بعید از امکان محسوس
نہیں ہوتا کہ واپسی پر آپ ہمارے گاؤں کے ریلوے اسٹیشن پر اتر پڑیں اور پھر چند دن
ہمارے ہاں مہمان رہیں ۔ امی جان آپ کی آمد کی اطلاع ملنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ
جائیں گی ۔ پچھلے دنوں میں نے ابا جان سے کہا تھا کہ لاہور کی آب و ہوا کا امی جان پر
اچھا اثر نہیں پڑ رہا اور یہ فیصلہ ہوا تھا کہ سال میں دو تین بار وہ چند ہفتے گاؤں چلی جایا
کریں گی ۔"

فہمیدہ نے کہا: "مجھے بہت سی باتیں گاڑی پر سوار ہونے کے بعد یاد آئیں گی اور
آپ بھی شاید ہمیں رخصت کرنے کے بعد یہ محسوس کریں کہ کچھ ضروری باتیں رہ گئی ہیں
لیکن ایک بات جس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہی یہ ہے کہ آج سے ہمیں
ایک دوسرے کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے اور جس طرح میں اچانک اپنے راستے
سے بھٹک کر آپ کے پاس آ گئی ہوں اسی طرح اگر کسی دن آپ ہمارے پاس پہنچ
جائیں تو ہمارے گھر میں آپ کو دیکھ کر اس قدر خوشی ہو گی جس طرح مجھے دیکھ کر آپ کی
امی کو ہوئی تھی ۔"

بلقیس نے اُن کی طرف دیکھتے ہی قدسیہ کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ "دیکھو بہن!
وُہ کتنے اطمینان سے آرہے ہیں۔ آپ کو بلا وجہ فہمیدہ کے کھو جانے کا خوف تھا۔ اَب
اُٹھیئے یہاں سے نکلیں۔ نماز ہم لارنس گارڈن میں پڑھیں گے۔"

○

تھوڑی دیر کے بعد وہ چڑیا گھر سے نکل رہے تھے کہ انھیں گیٹ سے باہر امینہ
کے ساتھ ایک عورت دکھائی دی۔

یوسف نے کہا۔ "امی جان امینہ یہاں بھی پہنچ گئی۔"

قدسیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بیٹا! وہ ہمارے گھر گئے ہوں گے اور
تمہارے اباجان نے کہہ دیا ہو گا کہ ہم چڑیا گھر کی طرف گئے ہیں اِس لیے وہ اس طرف
آگئے ہیں۔ آخر امینہ ہمارے مہمانوں کو کار دکھائے بغیر کیسے رہ سکتی ہے؟"

بلقیس نے کہا۔ "جی وہ دعوت پر زور دینے کے لیے آئی ہوں گی، مجھے اُن سے
بات کرنے دیجئے اور وہ جو ساتھ ہے وہ اُس کی کون ہے؟"

یوسف نے جواب دیا وہ امینہ کے سوتیلے ماموں قائم دین کی لڑکی ہے جو امرتسر
میں عبدالکریم صاحب کے اینٹوں کے تین بھٹوں کی نگرانی کرتا تھا اور کوئی تین سال سے
ہمارے گاؤں کے پاس عبدالکریم کی زمین کا انتظام سنبھالے ہوئے ہے۔ اس نے چند
ایکڑ زمین اپنے لیے بھی خرید لی ہے۔

قدسیہ بولی۔ بھئی اس کا نام قائم دین ہے؟

یوسف نے ہنس کر کہا۔ "جی نہیں اس کا نام چراغ بی بی ہے، قائم دین اُس کا
باپ ہے۔"

قدسیہ بولی "ارے میں چراغ بی بی کو پہچان ہی نہیں سکی گاؤں میں تو یہ کئی
بار ہمارے گھر آچکی ہے۔ پھر اس کی شادی ہوگئی تو میں نے نہیں دیکھا۔ ایک خبر سُنی

تھی کہ لڑکا منگنی کے دو ماہ بعد فوج میں بھرتی ہوگیا تھا۔ اور اس کے بعد مدت سے لاپتہ
ہے؟"

امینہ اور دوسری عورت جھجکتی ہوئی آگے بڑھیں۔ قدسیہ نے رسمی علیک سلیک
کے بعد کہا "بھئی اب نماز کا وقت ہوچکا ہے۔ ہم پہلے لارنس گارڈن کے کسی گوشے
میں نماز پڑھ لیتی ہیں اس کے بعد کسی جگہ آرام سے باتیں کریں گی۔ بیٹی! آپ ہمارے
گھر سے ہوکر آئی ہیں؟"

"جی ہاں! جب ہمارے نوکر نے گھر جاکر یہ بتایا کہ آپ کے مہمان اُس انسپکٹر
صاحب کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے ڈاکوؤں کے خلاف ہماری مدد
کی تھی تو اباجی نے اُسی وقت ڈرائیور کو حکم دیا تم ابھی میاں صاحب کے گھر جاکر پتہ کرو
کہ انسپکٹر صاحب کس جگہ رہتے ہیں پھر میں خود جاکر اُن کے تمام عزیزوں کو دعوت
دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "مَیں ڈرائیور کے ساتھ جاتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب میں
امی جان اور آپ کی طرف سے دعوت دوں گی تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ وُہ یوں
بھی بہت تھکے ہوئے تھے اور امی جان بہت مصروف تھیں۔ اِس لیے انھوں نے
چراغ بی بی کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ یہ اب چند ماہ سے یہاں رہتی ہے اسے آپ کے مہمانوں
سے ملنے کا بہت شوق تھا۔"

چراغ بی بی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کی طرف دیکھ رہی تھی اور فہمیدہ کو اُس کی
نگاہوں سے اتنی الجھن محسوس ہوتی تھی کہ وہ کبھی کسی طرف دیکھنے لگ جاتی اور کبھی اپنی چادر کھینچ کر ذرا اور
نیچے کرلیتی۔ فہمیدہ اس کی ماں، چچی اور قدسیہ نے ایک جگہ گھاس پر نماز ادا کی۔ یوسف ان سے
کچھ دُور نماز پڑھنے میں مصروف ہوگیا۔ امینہ اور چراغ بی بی اِدھر اُدھر ٹہلنے لگیں اور

پھر ان کی پریشانی میں اضافہ کرنے کے لیے دونوں موٹروں کے ڈرائیور نیچے اتر کر ایک جگہ نماز میں مصروف ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر عورتوں نے ٹہلنا شروع کر دیا۔ امینہ سخت پریشانی کی حالت میں ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

بلقیس نے ایک لمبا چکر لگانے کے بعد ان کے قریب سے گذرتے ہوئے کہا۔

"بھئی تم سیر نہیں کرو گی۔؟"

"جی اس وقت"؟

"بیٹی ابھی تو ہوا کچھ خوشگوار ہوئی ہے! اس عمر میں آپ لوگوں کو سورج نکلنے سے پہلے یہاں پہنچنا چاہیے اور دوڑ کر پہاڑی کی چوٹی پر جا کر لمبے لمبے سانس لینے چاہئیں کہتے ہیں کہ آکسیجن سے تازہ خون پیدا ہوتا ہے اور بیمار چہرے سُرخ نظر آنے لگتے ہیں"

قدسیہ نے کہا " بہن آپ نے دن کی روشنی میں نہیں دیکھا۔ امینہ کا چہرہ ماشاءاللہ بہت سرخ ہے"

"اری بہن۔ دو منٹ دھوپ میں کھڑی رہنے کے بعد سب کے چہرے سُرخ ہو جاتے ہیں"

"نہیں بہن میرا مطلب یہ ہے کہ امینہ کافی صحت مند لڑکی ہے"

چراغ بی بی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔ بہرحال وہ بولی "آپا جی! امینہ کا رنگ بھی ٹھیک ہے اور اس کی صحت بھی بہت اچھی ہے۔ اللہ نے ہر نعمت دی ہے۔ پانی مانگے تو پھلوں کا رس اور دُودھ ملتا ہے"

"دیکھو بہن" صفیہ نے کہا" دودھ اور پھلوں کی طرح خالی پانی بھی ایک نعمت ہے اگر کوئی پانی چھوڑ دے تو بھی وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ امینہ ایک سمجھ دار بچی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ پانی کی جگہ کوئی قیمتی چیز تلاش نہیں کرے گی"

"دیکھو چراغ بی بی تم میری وکالت نہ کیا کرو"۔ امینہ نے غصّے سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خاص کر ان لوگوں کے سامنے جو تمہیں پڑھے لکھے نظر آئیں۔ جنہیں دیکھنے سے تمہیں احساس ہو جائے کہ یہ ہر بات تم سے زیادہ جانتے ہیں"

چراغ بی بی اگرچہ عمر میں امینہ سے چار سال بڑی تھی تاہم وہ یہ سمجھ کر خاموش رہی کہ عبدالکریم کے سامنے اُس کی حیثیت ایک رشتے دار کی بجائے ایک ملازم کی سی ہے۔

بلقیس نے کہا "بیٹی جہاں تک تمہاری دعوت کا تعلق ہے اُس کے متعلق تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انشاءاللہ ہم سب آئیں گے"

"شکریہ چچی جان کل تین موٹریں یوسف صاحب کے مکان پر پہنچ جائیں گی۔ ایک آپ انسپکٹر صاحب کے مکان پر پہنچا دیں باقی دو موٹروں پر آپ سب آجائیں"

بلقیس نے کہا "بیٹی ہمارا پروگرام تو یہ تھا کہ ہم علی الصبح اٹھیں اور آپ کی دعوت پر جانے سے پہلے آپ کی نئی کار پر شاہی مسجد، قلعہ اور جہانگیر کا مقبرہ دیکھ آئیں، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ تھک جائیں گی"

"نہیں جی! مجھے قطعاً تھکاوٹ محسوس نہیں ہو گی۔ بلکہ اس بات کی خوشی ہو گی کہ میں فہمیدہ بہن سے کچھ دیر باتیں کر سکوں گی"

"لیکن بھئی۔ آپ نماز کے وقت اُٹھیں گی تو سورج نکلنے سے پہلے ہمارے گھر پہنچ سکیں گی"

"خالہ جان"! اُس نے جواب دیا" انشاءاللہ میں سورج نکلنے سے پہلے آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ اَب مجھے اجازت دیجئے۔ چلو آپا چراغ بی بی"

وہ السلام علیکم کہہ کر تیزی سے کار کی طرف مڑی۔

اُن کے روانہ ہوتے ہی یوسف نے کہا "چچی جان یہ دکھاوے کی عادت گھر

کے ماحول کا نتیجہ ہے ورنہ امینہ طبعاً ایک اچھی لڑکی ہے۔"

"چلئے پہاڑی پر جاکر چاند نکلتا دیکھتے ہیں۔ اب ہوا بہت خوشگوار ہوگئی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ آہستہ آہستہ پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ یوسف اور فہمیدہ کی رفتار ذرا تیز تھی اور وہ کچھ دُور آگے نکل گئے تھے۔

بلقیس نے ایک جگہ رُکتے ہوئے کہا۔ "بھئی میں تھک گئی ہوں۔ تھوڑی دیر سانس لے لو۔"

وہ ایک جگہ لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گئیں۔ یوسف فہمیدہ کے ساتھ چوٹی پر پہنچا اور کچھ دیر چھوٹے سے میدان میں ٹہلنے کے بعد فہمیدہ کو ایک بنچ پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ "فہمیدہ تھوڑی دیر خاموشی سے اِسی سمت دیکھتی رہو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تمہارا چہرہ چاند سے زیادہ تابناک ہے۔"

فہمیدہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال یہ تھا کہ آپ عام شاعروں جیسی بات نہیں کریں گے۔"

"فہمیدہ میں انتہائی ندامت کے ساتھ اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آئندہ میں آپ کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ آپ کیسی ہیں۔ دیکھو ایک بچہ چاند کی طرف دیکھ کر خوش بھی ہوتا ہے اور اُچھل اُچھل کر اُسے پکڑنے کی کوشش بھی کرتا ہے پھر کوئی چوٹ لگ جانے کی وجہ سے وہ روتا بھی ہے لیکن تم مجھے ایسے بچے کے کھیل کھیلتے نہیں دیکھو گی۔ آج تمہاری پہلی جھلک دیکھنے کے بعد میں زندگی کے سفر کی وہ منازل اور راستے دیکھ رہا تھا جو میرے تصور میں نہیں تھے۔ کیا تم نے بھی پہلی ملاقات میں میری امّی جان کے طرزِ عمل سے یہ محسوس نہیں کیا کہ تم ان کی زندگی کے حسین ترین خوابوں کی تعبیر ہو۔ اگر کبھی فرصت ملی تو تمہیں یہ سمجھا سکوں گا کہ وہ اس قدر جذبات میں کیوں آگئیں

تھیں۔ لیکن اپنے دل میں یہ عہد کرچکا ہوں کہ میں اُن کی ہر خواہش پوری کروں گا۔ اگر انھوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ہر وہ لڑکی جو میری زندگی کے کٹھن راستوں میں میرا ساتھ دے سکتی ہے اور میں اسے زندگی کی خوشیاں دے سکتا ہوں تو میں رُوئے زمین کی تمام نعمتیں اِس کے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ اگر تم اجازت دو تو میں اس وقت بھی تمہاری امی کے کان میں ہر بات کہہ سکتا ہوں کہ مَیں ایک سیدھا سادھا دیہاتی لڑکا ہوں جس نے کوئی قابلِ فخر کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی۔ لیکن اگر میں نصف دنیا کا مالک ہوتا تو اسی وقت اپنے اور تمہارے تمام عزیزوں کو یہاں جمع کرتا اور تمہارے والدین کے سامنے دوزانو ہوکر یہ اعلان کرتا کہ میں فہمیدہ کے لیے سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ چلئے وہ سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

فہمیدہ خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑی۔ چند قدم چل کر وہ رُک گئی:

"ٹھہریئے! مَیں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"پوچھیئے۔" یوسف نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

فہمیدہ بولی۔ "کبھی آپ ان باتوں پر ہنسا تو نہیں کریں گے؟"

"کون سی باتوں پر۔"

"یہی جو آج آپ ابھی کہہ رہے تھے۔"

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن عورتوں مردوں اور بچوں کی ایک ٹولی باتیں کرتی ہوئی نمودار ہوئی تو وہ خاموش ہوگئے۔ تھوڑی دیر بعد فہمیدہ نے کہا۔

"چلئے ہم اس طرف سے چکر لگا کر چلتے ہیں۔"

وہ ایک دوسرے راستے سے نیچے اُترنے لگے تھوڑی دیر بعد یوسف کہنے لگا:

"فہمیدہ بظاہر یہ بات ایک مذاق معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ میں نے تمہیں آج ہی پہلی بار دیکھا اور چند گھنٹے بعد آج ہی میں نے وہ بات کہہ دی ہے جس کے لیے

مدتوں سوچا جاتا ہے لیکن میں نے تمہاری پہلی جھلک دیکھنے اور پہلی بار تمہاری آواز سننے کے بعد یہ محسوس کیا تھا کہ میں برسوں سے تمہیں جانتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی میری باتیں سُن کر یہ محسوس نہیں کیا ہوگا کہ ایک اجنبی تمہارے سامنے گستاخی کر رہا ہے۔"

"آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔"

"شکریہ اب چلیئے۔"

چند منٹ کے بعد وہ اُس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں صفیہ، بلقیس اور قدسیہ بیٹھی ہوئی تھیں وہ اُنھیں دیکھتے ہی اُٹھ کر ساتھ چل پڑیں اور تھوڑی دیر بعد وہ موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو چکے تھے۔ جب وہ گھر پہنچے تو عبدالعزیز اور مسز احمد وہاں موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ مسز احمد نے مغرب کی نماز کے بعد اچانک گھر میں آرام کرنے کا ارادہ بدل دیا تھا اور وہ عبدالعزیز کے ساتھ تانگے پر یوسف کے گھر کو روانہ ہوگئی تھیں جو کوئی آدھ گھنٹے پہلے یہاں پہنچے تھے۔ میاں عبدالرحیم نے جس گرم جوشی سے عبدالعزیز کا خیر مقدم کیا اور پھر جس طرح انھیں باتوں میں مصروف رکھا اُس سے انھیں یہ نصف گھنٹہ محسوس نہ ہوا۔ لیکن مسز احمد جنھیں بچوں کے ساتھ یہ وقت گذارنا پڑا سخت پریشان تھیں۔

"کیسے بے وقوف ہیں یہ لوگ یہ سیر کا کون سا وقت ہے۔" وُہ بار بار کہہ رہی تھی لیکن جب یوسف نے آکر ماں جی السلام علیکم کیا تو ان کے سارے گلے جاتے رہے اور اُس نے کہا۔" بیٹا میں نے سخت غلطی کی جو تمہارے ساتھ نہیں آئی تھی۔ عبدالعزیز کام کیلئے چلے گئے تھے اور شام تک غائب رہے فضلاں بی بی اور باقی سب یہاں آگئے تھے اور نوکر ایسا تھا کہ اُس کی بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اور اُن کے والد میاں عبدالعزیز کے ساتھ خواتین اد

بچے علیٰحدہ علیٰحدہ کمروں میں کھانا کھا رہے تھے۔

کھانا ختم کرنے کے بعد عبدالعزیز اگلی دوپہر عبدالاکرم کی دعوت میں شرکت کا وعدہ کرنے کے بعد بلقیس کے ساتھ واپس چلا گیا اور صفیہ، فہمیدہ اور اس کی نانی وہیں ٹھہر گئیں۔

عشاء کی نماز کے بعد وہ بالا خانے کی چھت پر لیٹ گئیں اور مسز احمد نے چند منٹ قدسیہ کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد کہا۔" بیٹی یوسف کہاں غائب ہو گیا ہے؟"

"جی وہ مسجد سے نماز پڑھ کر آ ہی رہے ہوں گے۔"

"اچھا تو بیٹی! نوکر سے کہو یہاں اُس کے لیے کرسی رکھ دے اور اُسے آتے ہی میرے پاس لے آئے۔ مَیں اُس سے بہت کچھ سننا چاہتی ہوں۔"

فہمیدہ بولی! "نانی جان۔ میں بھی آپ کی باتیں سُن سکتی ہوں۔"

قدسیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔" بیٹی ہم سب ان کی باتیں سُنیں گے۔ مَیں سب کے لیے کرسیاں بھیجتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد یوسف اوپر آیا اور مسز احمد کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ماں جی آپ کا سر دبا دوں۔"

"نہیں بیٹا۔ یہ تمہیں کس نے بتایا کہ میرے سر میں درد ہوتا ہے۔"

"ماں جی۔ سر درد کے لیے تو نہیں دبایا جاتا۔ میں نے ایک دن نسرین کو آپ کا سر دباتے دیکھا تھا۔"

"ارے بیٹا! تم نسرین نہیں ہو، یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے ڈاکوؤں کا سارا قصّہ سناؤ۔"

صفیہ نے کہا۔" ماں جی ہم نے وہ لڑکی بھی دیکھی ہے جس کا گھر لوٹنے وُہ ڈاکو آئے تھے۔"

"کہاں دیکھا تم نے اُس کو؟"

"وہیں چڑیا گھر میں۔ امی جان۔"

"ارے! چڑیا گھر میں وُہ کیا کرتی تھی؟"

اُمی جان! وہ یہاں کل کے لیے دعوت دینے آئی تھی۔ جب یہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ ہم چڑیا گھر کی طرف گئے ہیں تو اپنی کار بھگا کر وہاں پہنچ گئی اور یہ وعدہ لے کر گئی تھی کہ ہم سب ان کی دعوت میں شریک ہوں گی اور صبح وہ ہمیں اپنی کار پر لاہور کی سیر کرانے کے لیے بھی آئے گی۔"

مسز احمد نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ مجھے کل اُس کی دعوت میں شریک ہونا پڑے گا۔ اور صبح سیر کے لیے بھی اُس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ کیوں بیٹا یوسف! وہ کار اچھی طرح چلانا جانتی ہے۔"

"ماں جی! خطرے کی کوئی بات نہیں۔ میں اسے کہہ دوں گا کہ اگر چچا عبدالعزیز صاحب کے عزیزوں میں سے کسی کو خراش بھی آگئی تو تمہاری کم از کم سزا یہ ہوگی کہ ڈرائیونگ لائسنس سے محروم ہوجاؤ گی۔"

"اچھا بیٹا۔ اب شروع کرو وہ ڈاکوؤں کا قصہ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہ واقعہ کب ہوا تھا؟"

"ماں جی۔ گھر پہنچنے سے چند دن بعد۔ میں اس قسم کے کاموں میں مصروف ہوگیا تھا۔ عبدالعزیز صاحب اس سے کچھ عرصہ پہلے کہیں سے تبدیل ہو کر ہمارے ضلع میں آچکے تھے، لیکن مجھے قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نسرین کے چچا ہیں یا آپ سے ان کا کوئی رشتہ ہے۔"

"اچھا بیٹا۔ اب وہ قصہ شروع کرو۔"

یوسف نے پوری تفصیل کے ساتھ ڈاکوؤں کے متعلق قبل از وقت اطلاع ملنے

اور ان کی گرفتاری کے واقعات بیان کرنا شروع کر دیئے جب وہ سیٹھ دینا ناتھ کا ذکر کر رہا تھا تو وہ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھیں۔

مسز احمد کہہ رہی تھی۔ "بیٹا میں بلاوجہ تمہاری زبان سے یہ باتیں سننے کے لیے بے چین نہ تھی اور کوئی اس قدر اطمینان سے باتیں کرتا بھی تو نہیں۔ لیکن ایک بات پر مجھے بار بار افسوس آتا ہے۔"

"ماں جی! وہ بات کیا ہے؟"

"بیٹا وہ بات یہ ہے کہ اس وقت نسرین یہاں نہیں ہے ورنہ وہ خوشی سے دیوانی ہوجاتی۔"

صفیہ نے کہا۔ "اپنی زندگی کے ایسے تمام دلچسپ واقعات آپ کو لکھ چھوڑنے چاہئیں جو مسودہ آپ وہاں چھوڑ آئے تھے اُسے پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ جو باتیں لکھیں گے انھیں ہر عمر کے لوگ پسند کریں گے۔"

"خالہ جان آپ میرے لیے دعا کیا کریں کہ میں اپنے تمام فرائض پورے کرسکوں بس اپنے دل کی گہرائیوں میں دبی ہوئی ان گنت آوازیں لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکوں۔"

"ماں جی آپ بھی میرے لیے دعا کریں کہ میں اپنے بزرگوں کی بلند توقعات پوری کرسکوں اور ماں جی وہ کون سی دعا ہے جو آپ نے میرے لیے نہیں کی ہوگی۔ اُن بے شمار دعاؤں میں سے جو آپ صبح و شام دہرایا کرتی ہیں اس چھوٹی سی ایک اور دعا کا اضافہ کرلیجئے کہ میں ان پاکباز لوگوں کو ٹھیس نہ پہنچاؤں جو میرے خلوص پر اعتماد کرتے ہیں اور میری اُن باتوں پر بھی یقین کرلیتے ہیں جو آج دوسروں کو مضحکہ خیز نظر آتی ہیں۔"

وُہ اُٹھا اور فہمیدہ نے جو اُس کی ماں کے ساتھ دائیں ہاتھ سمٹ کر بیٹھی ہوئی تھی ایسا محسوس کیا کہ اس کے قدوقامت میں اچانک اضافہ ہوگیا ہے۔ تھوڑی دیر

بعد وہ اپنے بستر پر لیٹی ہوئی دل میں کہہ رہی تھی۔

"یوسف تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تمہیں دیکھنے سے پہلے بھی یقین تھا کہ تم کسی کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتے۔"

○

قدسیہ اپنے مہمانوں کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی کہ باہر موٹر کار کا ہارن سنائی دیا۔ اُس نے اپنی کمسن بیٹی سے کہا۔ بیٹی جا کر دیکھو اگر امینہ ہے تو اسے یہیں لے آؤ۔ صغریٰ اُٹھ کر سلیپر پہن رہی تھی کہ یوسف کی آواز سنائی دی۔

"آپ سیدھی اندر چلی جائیں۔"

اس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی اور چند ثانیے بعد امینہ اُن کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے بنفشئی رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔

"دیکھیے میں اپنے وعدے کے مطابق پہنچ گئی ہوں اور آپ نے ابھی تک ناشتہ بھی نہیں کیا۔"

صفیہ مسز احمد سے مخاطب ہو کر بولی۔ "امی جان یہ امینہ ہے۔"

امینہ نے السلام علیکم کہہ کر فہمیدہ پر جو اپنی نانی کے ساتھ بیٹھی تھی نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ عام گھریلو لباس میں بھی ایک شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ قدسیہ نے کہا۔

"بیٹی بیٹھ جاؤ اور کچھ کھا لو ہم ابھی تیار ہو جائیں گی۔"

"شکریہ خالہ۔ میں پورا ناشتہ کر کے آئی ہوں۔"

"اچھا تو تم بیٹھ کر بہن صفیہ کی امی سے باتیں کرو۔ انھیں تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ فہمیدہ بیٹی تم اُٹھ کر جلدی سے کپڑے بدل لو۔"

فہمیدہ بولی: "خالہ جان میرے کپڑے ٹھیک ہیں کھانے پر جاتے وقت میں دوسرا جوڑا پہن لوں گی۔"

"اچھا پھر آپ سب امینہ کے ساتھ موٹر میں بیٹھ جائیں میں ایک منٹ میں آتی ہوں۔ لیکن بیٹی امینہ میری ایک بات اچھی طرح سُن لو تم نے موٹر بہت احتیاط سے چلانی ہے۔"

قدسیہ یہ کہہ کر بیٹھک میں چلی گئی جہاں میاں عبدالرحیم اور یوسف ناشتے سے فارغ ہو کر باتیں کر رہے تھے اُس نے کہا۔ "یوسف! تم نے مہمانوں کے ساتھ جانا ہے۔"

"امی جان!" یوسف نے احتجاج کیا۔ "امینہ اپنے ڈرائیور کو ساتھ نہیں لائی اس لیے میں اس کے ساتھ نہیں بیٹھوں گا۔"

"بیٹا وہ ڈرائیور کو اس لیے ساتھ نہیں لائی کہ ہم میں سے زیادہ لوگوں کو ساتھ لے جا سکے۔ اب میں اس بات کا ذمہ لیتی ہوں کہ تمہیں اُس کے ساتھ نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ اُٹھو تیاری کرو۔ صغریٰ ہمارے ساتھ جائے گی۔"

یوسف اُٹھ کر چلا گیا تو قدسیہ نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ایسے مہمان بار بار نہیں آتے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ عام مہمان نہیں ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی کام ہے تو آپ کو کسی تمہید کی ضرورت نہیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "ایسے موقعوں کے لیے میں نے کپڑوں کے چند جوڑے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک آج مسز احمد اور دوسرا صفیہ کو پیش کیا جائے گا لیکن گھر میں کوئی تحفہ ایسا نہیں جو فہمیدہ کو پیش کیا جا سکے۔ فہمیدہ کی ایک چھوٹی سی بہن ہے جسے میں کچھ بھیجنا چاہتی ہوں۔ اِس لیے آپ انارکلی کے کسی بہترین دکاندار کے پاس جائیں اور اُس کے پاس جو سب سے اچھا کپڑا ہو اُس کے دو سوٹ خرید لائیں۔ مجھے یقین ہے کہ فہمیدہ کو دیکھنے کے بعد آپ اُس کے لباس کے انتخاب میں غلطی

نہیں کریں گے اور کہتے ہیں کہ اُس کی چھوٹی بہن بھی قریباً اسی جیسی ہے۔ عمر تین چار سال کم ہوگی۔ تحائف انہیں روانہ ہوتے وقت دیے جائیں گے۔ یوسف نے آپ کو بتایا ہے کہ ہمارے تعلقات کس طرح شروع ہوتے تھے۔"

"ہاں بھتی۔ ابھی ہم یہی باتیں کر رہے تھے۔"

قدسیہ کمرے سے نکلی تو خواتین موٹر کے گرد کھڑی تھیں اور یوسف گلی کے موڑ کے قریب اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ امینہ ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھی بے چینی سے باہر جھانک رہی تھی۔

قدسیہ بولی۔ "بیٹا تم نے ابھی تک بٹھایا نہیں اُن کو؟"

"امی جان! آپ نے یہ کہا تھا کہ مجھے اُن کے ساتھ نہیں بیٹھنا پڑے گا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ بیٹھنے کی ترتیب کیا ہوگی۔"

"بیٹا تم پچھلی سیٹ پر مسز احمد اور صفیہ کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرو گے۔ صغریٰ بھی آپ لوگوں کے ساتھ سمٹ کر بیٹھ جائے گی، اگلی سیٹ پر امینہ کے ساتھ میں اور فہمیدہ بیٹھ جائیں گی۔"

یوسف نے بدحواس ہو کر کہا۔ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ اپنی سائیکل اُٹھالوں اور ایک تانگہ روک کر آپ کو فہمیدہ کے ساتھ بٹھا دوں لیکن یہ میرے لیے ناقابل برداشت ہوگا کہ آپ اور فہمیدہ کی جانوں کی حفاظت دو منٹ کے لیے بھی امینہ کے سپرد کر دی جائے۔"

فہمیدہ مسکرائی۔ "میں نانی جان سے کہہ دوں گی کہ امینہ پر کنٹرول رکھنے کے لیے یوسف صاحب کا آگے ہونا ضروری ہے۔ اِس لیے آپ اور میری امی آگے بیٹھیں گے اور پیچھے نانی جان، آپ کی امی اور صغریٰ کو جگہ مل جاتی ہے لیکن آپ جلدی سے بیٹھ جائیے۔ وہ اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے اس کے متعلق کوئی

سازش کر رہے ہوں۔"

"اُسے تیز رفتاری سے روکنے کا گُر مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اسے راستے میں ایک دوبارہ یہ یاد دلانا پڑے گا کہ عبدالعزیز صاحب آپ کے چچا ہیں اور اُس کی ڈرائیونگ کی کسی غلطی سے اگر ان کی لاڈلی بھتیجی کو ہلکی سی خراش آگئی تو یہ خوب صورت موٹر دوبارہ سڑک پر نہیں آسکے گی۔"

"چلیے۔"

یوسف نے صفیہ کو ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ بٹھا دیا اور اس کے ساتھ خود بیٹھ گیا اور باقی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ جب کار اسٹارٹ ہوئی تو مسز احمد نے کہا۔

"ارے بھئی! یہ سب تم سے خوفزدہ تھے۔ ذرا احتیاط سے چلانا۔"

"جی آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"بیٹی۔ مجھے سچ سچ بتا دو۔ آج تک تم نے کتنے ایکسیڈنٹ کیے ہیں۔"

امینہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے بے خیالی میں کار کی رفتار تیز کر دی۔

مسز احمد چلائیں۔ "ارے بیٹا روکو اسے۔"

امینہ نے کار کی رفتار کم کر دی اور یوسف نے اُس کی دل جوئی کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "ماں جی! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ امینہ نے آج تک کوئی ایکسیڈنٹ نہیں کیا ان کا پاؤں ایسے وقت میں ایکسیلیٹر پر آگیا تھا جب ان کا خیال کہیں اور تھا۔"

صفیہ نے کہا۔ "ہاں ماں جی۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی۔ اب دیکھیے نا کس صفائی سے چلا رہی ہیں یہ موٹر۔"

"ہاں بیٹی۔ یہ ٹھیک چلاتی ہے لیکن ہمیں یہ دعا ضرور مانگتے رہنا چاہیے کہ جب

تک ہم بخیریت واپس نہیں آجاتے ان کے خیال کسی اور طرف نہ نکل جائیں۔"
انہوں نے دریا دیکھا۔ جہانگیر کا مقبرہ دیکھا۔ واپسی پر بادشاہی مسجد دیکھی لیکن
جب قلعہ دیکھنے کا مسئلہ آیا تو فہمیدہ نے کہا "اب نانی جان کو گرمی محسوس ہو رہی ہے۔
قلعہ ہم کبھی آئندہ لاہور آکر دیکھیں گے۔ بھئی امینہ موٹر چلانے میں واقعی بہت ماہر
ہیں۔"

صفیہ نے کہا۔" یوسف صاحب کے منہ سے تعریف سننے کے بعد شاید کسی اور
سے شاباش لینے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔"

امینہ نے کہا۔" اگر آج بادل ہوتے تو میں آپ کو بہت سیر کرواتی۔"

"تم فکر نہ کرو بیٹی۔ لاہور میں ہم بھی آتے رہیں گے بادل بھی آتے رہیں گے اور خُدا
تمہارے باپ کے کاروبار میں برکت دے وہ کاروں کے نئے نئے ماڈل خریدتے
رہیں گے۔ میں تو یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ میں جب کبھی بہت ہی اچھے موسم میں یہاں آؤں
گی تو تمہاری کار پر یہاں سے جالندھر، لدھیانہ، دہلی اور آگرہ تک سفر کروں۔"

"جی میں آپ کو راولپنڈی اور پشاور کی سیر بھی کروا لاؤں گی۔"

واپسی پر کار قدسیہ کے گھر رُکی، مہمانوں کی لیمن کی ٹھنڈی بوتلوں سے تواضع
کی گئی۔ جب وہ دوبارہ روانہ ہونے لگے تو فہمیدہ سفید لباس پہن کر ایک کمرے سے
نکلی اس کے حسن میں بے پناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ یوسف نے ایک نظر اس کی طرف
دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ قدسیہ بار بار اپنے دل میں یہ الفاظ
دہرا رہی تھی "یا اللہ اس بچی کو نظر سے بچائیں۔ اس کی معصومیت اِسی طرح قائم رکھیں۔"
تھوڑی دیر بعد وہ کار پر سوار ہو کر امینہ کی کوٹھی کا رُخ کر رہے تھے۔

صفیہ یوسف سے باتوں میں مصروف ہو گئی تو اچانک امینہ نے کہا "خالہ
میری امی کی بڑی خواہش ہے کہ آپ دو چار دن ہمارے ہاں مہمان رہیں۔"

صفیہ نے مڑ کر مسز احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی جان سُنا آپ نے امینہ آپ کو تین چار دن اپنی کوٹھی میں مہمان
رکھنا چاہتی ہے۔ چونکہ اس کے ابا جان کی بھائی جان سے پرانی واقفیت ہے
اِس لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

مسز احمد بولی۔"اری بیٹی یہ دعوت کسی اچھے وقت پر ملتوی کر دو اور اس
بیٹی کو بتا دو کہ تم کانگڑہ جا رہی ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ جا رہی ہوں۔ رات میں
نے لدھیانہ واپس جانے کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"سچی نانی جان۔" فہمیدہ نے خوشی سے اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے کہا۔

"اری اتنی انجان نہ بنو تمہیں معلوم تھا کہ مَیں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی اور
نسرین کو تو یقین تھا کہ جب گھر جانے کا موقع آئے گا تو میں اچانک تمہارے ساتھ
کانگڑہ کی طرف چل پڑوں گی اور اب وہ چڑیل قہقہہ مار کر یہ کہے گی کہ میں نے
ارادہ تبدیل نہیں کیا بلکہ میرا پروگرام پہلے سے یہی تھا۔"

گاڑی ایک کشادہ کوٹھی کے پورچ میں رُکی اور امینہ کی والدہ اور چند خواتین
نے باہر نکل کر بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں بالائی منزل کے ایک
بڑے کمرے میں لے گئیں۔ یہاں پندرہ بیس لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ امینہ نے
باہر نکل کر ڈرائیور کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا۔" تم نے ٹھیک گیارہ بجے یہاں
سے میاں عبدالرحیم کے گھر روانہ ہو جانا ہے۔ انھیں، بچوں اور نوکر کو یہاں پہنچانے
کے بعد اگر تم دیکھو کہ انسپکٹر عبدالعزیز صاحب اور ان کی بیگم یہاں نہیں آئے
تو جا کر اُنھیں بھی لے آنا۔ راستہ دکھانے کے لیے یوسف صاحب کے نوکر کو ساتھ
لے جانا لیکن اچھی طرح دیکھ لینا یہ بات نہ ہو کہ وہ یہاں بیٹھے ہوئے ہوں اور تم
شہر میں بھاگتے پھرو۔ جانے سے پہلے یوسف صاحب سے پوچھ لینا۔ انھیں

جانتے ہونا۔"

"جانتا ہوں جی۔ یہ وہی ہیں ناجو اُس دن آپ کی کار پر بیٹھنے کی بجائے تانگے پر
کہیں چلے گئے تھے اور بی بی جی اُن کے متعلق تو میں بہت کچھ سن چکا تھا۔"

"کیا سُنا تھا تم نے؟"

"یہی کہ بڑے بڑے ڈاکو ان کے نام سے ڈرتے ہیں۔"

"ڈاکوؤں کا قصہ تمہیں فضل دین نے بتایا ہوگا۔؟"

"ایک قصہ بی بی جی؟ وہ تو جب بھی گاؤں سے آیا کرتا تھا کوئی نئی کہانی سنایا کرتا
تھا۔"

تھوڑی دیر بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔ اور بالائی منزل کے دو کمرے خواتین سے
اور نچلی منزل کے تین کمرے مردوں سے بھر گئے۔ خواتین کے لیے کھانے کا اہتمام بالائی منزل
کے ایک کشادہ کمرے میں تھا اور مردوں کے لیے نیچے دو کمروں میں شہر کے کاروباری اور
خوشحال لوگوں کی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔ بڑے بڑے سرکاری افسر بھی وہاں موجود تھے
اور ان کی بیگمات بھی وہاں آئی ہوئی تھیں۔ کھانا شہر کے مشہور باورچیوں نے تیار کیا تھا
اور ہر طرف اس کی تعریف ہو رہی تھی۔ خواتین کی محفل میں سب کی نگاہیں فہمیدہ پر مرکوز
تھیں اور رشیدہ سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا جا رہا تھا۔" وہ کون ہے رشیدہ؟"

"وہ ایک پولیس افسر کی بھتیجی ہے۔"

"پولیس افسر اسی ملک کا ہے؟"

"ہاں۔ اسی ملک کا ہے۔"

"اری بہن اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کوئی انگریز ہوگا۔"

"نہیں جی۔ انگریز نہیں ہے وہ۔"

"بہن میں بھی یہی سمجھاتی تھی کہ انگریز لڑکی ایسی خوب صورت نہیں ہوتی! یہ

اُس کا رنگ دیکھتی ہیں چہرے کا نور نہیں دیکھتیں۔"

ایک لڑکی نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔" امینہ! تم نے اس لڑکی کی ماں
دیکھی ہے؟"

"جی اُس کے دائیں طرف اُس کی ماں ہی تو کھڑی ہے۔"

"باپ بھی آیا ہوا ہے اُس کا؟"

"نہیں۔ اُس کا باپ دیکھنے کے لیے تمہیں جالندھر جانا پڑے گا۔"

عورتیں ہنس پڑیں اور لڑکی پریشان ہو کر بولی۔" میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کا
باپ کیسا ہے۔ اگر اُس کا رنگ بھی اس کی ماں جیسا ہے تو پھر کسی کو تعجب نہیں کرنا
چاہیے۔"

قدسیہ جو اس بحث کو دلچسپی سے سُن رہی تھی بولی" بیٹی اگر تم ان کی نانی کو
دیکھ لو تو پھر تمہیں کوئی حیرت نہیں رہے گی۔"

نوجوان لڑکی نے کہا۔" کہاں ہیں اس کی نانی صاحبہ؟"

"ذرا دائیں طرف دیکھیے۔"

لڑکی نے دائیں طرف دیکھا اور اچانک اُس کی نگاہیں مسز احمد پر مرکوز
ہو کر رہ گئیں۔ پھر وہ قدسیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔

"جی میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ اس لڑکی نے اپنی نانی سے بہت کچھ لیا
ہے۔ لیکن آپ سے ان کا کیا رشتہ ہے؟"

"بیٹی اگر میں یہ کہوں کہ اس بچی اس کی نانی اور والدہ سے میری ملاقات کل ہی
ہوئی تھی تو آپ کو یقین آجائے گا؟"

دراز قامت لڑکی مسکرائی۔" جناب! آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔
آپ سے اُس بزرگ عورت کی بڑی مشابہت ہے۔"

قدسیہ نے کہا " بہن صفیہ ایک بات اور سُن لو۔ یہ صاحبزادی بھی یہی کہتی
ہیں کہ آپ کی امّی مجھ سے بہت ملتی ہیں "۔

" بہن ہم سب ہی کہتے ہیں کہ امی جان کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے اور
کوئٹہ میں بھی پہلی بار یوسف نے امی کو دیکھ کر یہی کہا تھا "۔

" مجھے اُس نے بتایا تھا "۔

کھانے کے اختتام پر تھوڑی دیر باتیں کر کے مہمان یکے بعد دیگرے رخصت
ہونے لگے تو رشیدہ نے چراغ بی بی سے کہا " چراغ بی بی صفیہ کی امی کو میرے کمرے
میں لے جاؤ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔ بہن قدسیہ آپ بھی وہیں جا کر آرام کریں۔
میں باقی مہمانوں کو رخصت کر کے آپ کے ساتھ آرام سے باتیں کروں گی "۔

چراغ بی بی نے مسز احمد کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور وہاں سے چل پڑی۔

قدسیہ نے دبی زبان میں صفیہ سے کہا " بہن بظاہر چراغ بی بی میں کوئی بُرائی
نہیں مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے اچھی کیوں نہیں لگتی۔ ابھی آپ کی امی کے پاس بیٹھے
ہوئے بھی وہ مجھے اچھی نہیں لگتی تھی۔ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُن کی طرف
دیکھ رہی تھی۔ یہ شکر ہے کہ اُسے معزز عورتوں کے ساتھ بیٹھنے کا شوق ہے اور ہماری
فہمیدہ سے دُور رہی۔ ورنہ جب وہ بے وقوفوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی
ہے تو فہمیدہ بڑی پریشان ہوتی ہے۔ مَیں تو یہ بھی دُعا کرتی ہوں کہ آپ کی امّی جان
اس کی نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔ چلیئے اُن کے پاس چلتے ہیں۔ فہمیدہ بیٹی سے باتیں
کرنے کا بھی اسے بڑا شوق ہے۔ ذرا حوصلہ افزائی ہوئی تو بہت پریشان کرے گی "۔

بلقیس بولی " آپا جی آپ چلیں تو سہی اگر دو منٹ کے بعد وہ خاموشی سے باہر
نہ نکل آئے تو میرا نام بلقیس نہیں "۔

" صفیہ نے کہا " آپا قدسیہ تھوڑی بہت تعلیم یافتہ ضرور ہو گی وُہ آج لباس میں

تو نئے فیشن کا بہت خیال رکھا ہے اُس نے "۔

" بہن تعلیم تو شاید اس نے دسویں جماعت میں چھوڑ دی تھی لیکن ہوشیار
بہت ہے "۔

چراغ بی بی کمرے میں داخل ہوئی تو مسز احمد اُونگھ رہی تھیں۔

" ماں جی! آپ کی ٹانگیں دبا دوں "۔

" بھئی میں ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ میرا نیند سے بُرا حال ہو رہا ہے "۔

" ماں جی اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے سر پہ کدو کے تیل کی مالش کر دیتی
ہوں۔ ہمارے حکیم طارق علی صاحب کہتے تھے کہ کدو کے خالص تیل کی مالش سے دماغ
کھل جاتا ہے "۔

" بھئی بھاڑ میں جائیں تمہارے حکیم طارق علی۔ انہوں نے کیوں لگا دیا تمھیں
میرے پیچھے "۔ وہ سب کمرے میں داخل ہوئیں اور قدسیہ نے آگے بڑھ کر کہا " خالہ جی۔
یہ طارق کون ہے؟ "

" ہو گا اس کا کوئی۔ سر کھا لیا ہے اس نے میرا "۔

" خالہ جی۔ اگر طارق علی اِس کا کوئی ہے تو اسے طارق کا سر کھانا چاہیے۔ جاؤ بی بی
انھیں آرام کی ضرورت ہے "۔

چراغ بی بی اُٹھی اور اپنا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔

صفیہ نے کہا " بہن میں نے ایک عجیب بات دیکھی ہے۔ لوگوں کا رنگ غصّے میں سرخ
ہو جاتا ہے لیکن اس کا رنگ بھی زرد تھا اور آنکھیں بھی خوف زدہ گائے کی طرح سفید
نظر آتی تھیں "۔

مسز احمد اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔ قدسیہ نے کہا " خالہ جان مجھے افسوس ہے کہ اُس
نے آپ کی نیند خراب کی "۔

"اری بیٹی! نیند کہاں آرہی تھی مجھے میں تو اس کی باتوں سے بچنے کے لیے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔"

صفیہ بولی "امی جان! آپ بھی اس سے نفرت کرتی ہیں"۔

بیٹی۔ "میری نفرت کے لیے یہ کافی نہیں کہ قدسیہ اُسے اچھا نہیں سمجھتی۔"

کچھ دیر وہ باتیں کرتی رہیں پھر یوسف نے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

"امی جان میرا خیال ہے ابا جان کچھ دیر اپنے دوستوں کے ساتھ باتوں میں مصروف رہیں گے۔ آپ بھی کچھ دیر آرام کر لیں۔"

"نہیں بیٹا۔ تم ان سے کہو میں گھر جاتی ہوں اور وہ بھی انھیں رخصت کرنے کے بعد جلد پہنچ جائیں۔"

یوسف مڑنے لگا تو مسز احمد نے آواز دی۔ "بیٹا! جاؤ نہیں میں نے ایک بات کرنی ہے۔"

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "فرمائیے ماں جی۔"

"بیٹا میں تمہیں نصیحت کرنے کا حق رکھتی ہوں نا۔"

"ماں جی مجھے ہمیشہ آپ کی نصیحتوں کی ضرورت رہے گی۔"

"بیٹا میری یہ بات یاد رکھنا کہ زندگی میں تمہارے لیے وہی بات اچھی ہوگی جسے تمہاری ماں اچھا سمجھتی ہو۔ یہ اتنی معصوم ہے کہ اسے دوسروں کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں پر بھی پیار آتا ہے اگر کسی کو یہ اچھا نہیں سمجھتی تو تمہارے دل میں کبھی یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ وہ تمہارا خیر خواہ ہو سکتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے ماں جی اور امی جان کو یہ معلوم ہے کہ کسی کو پسند یا ناپسند کرنے سے پہلے میں ان کے چہرے کی طرف دیکھا کرتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس گھر کے بعض لوگوں کو دیکھ کر آپ خوش نہیں ہوں گی لیکن اباجی کی وجہ سے امی جان کو اور

اور امی جان کی وجہ سے مجھے کچھ لحاظ آگیا تھا اور شاید میری وجہ سے آپ کو کچھ زحمت اٹھانی پڑی۔"

"ارے بیٹا کیا بات کرتے ہو۔ میں تو بہت خوش ہوئی ہوں یہاں آکر۔ مجھے یوں ہی خیال آیا تھا کہ تمہارے جیسے نیک نیت لوگوں کو بہت سوچ بچار کے بعد کسی پر اعتماد کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو لوگ دل کے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ انہیں ذرا مشکل سے بُرے لوگوں کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے۔"

"ماں جی۔ میری امی کا چہرہ ایک آئینہ ہے جس میں میں ہر اچھے اور بُرے کی اصلی صورت دیکھ لیتا ہوں۔"

رشیدہ امینہ کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے کہا۔ "خالہ جی! اُس بے وقوف نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا۔ اصل میں غلطی میری تھی کہ میں نے اُسے آپ کا خاص خیال رکھنے کی ہدایت کی تھی۔"

مسز احمد بولی "نہیں بیٹی پریشان تو وہ میرے روکھے پن کی وجہ سے ہوئی ہوگی۔ وہ باتیں کر کے مجھے خوش کرنا چاہتی تھی لیکن مجھ پر آپ کے لذیذ کھانوں کا یہ اثر تھا کہ میں فوراً سو جانا چاہتی تھی۔ اُس نے میرے سر پہ مالش کے لیے کسی حکیم صاحب کے کدو کے تیل کی تعریف کی تھی اور میں نے شاید حکیم صاحب کو کچھ کہہ دیا تھا۔ پھر یہ سب آگئیں اور شاید بلقیس کی کسی بات نے اسے ذرا ناراض کر دیا۔ بہرصورت وُہ اچھی لڑکی ہے اور میں جانے سے پہلے اس کا شکریہ ادا کروں گی۔"

امینہ بولی۔ "ماں جی اس بے وقوف کو آپ سے معافی مانگنی پڑے گی۔ اس نے یقیناً آپ کو بہت پریشان کیا ہوگا۔"

"نہیں بیٹی۔ ہماری خاطر تمہیں اس کے ساتھ بہت شفقت سے پیش آنا چاہیے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آپ لوگ باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتے۔ اسے باقاعدگی سے نماز

پڑھایا کرو۔ وہ خود بھی خوش رہے گی اور تمہیں بھی خوش رکھا کرے گی۔"

رشیدہ نے کہا خالہ جان۔" میں امینہ کے ابا کی طرف سے یہ درخواست لے کر آئی ہوں کہ کانگڑہ سے واپسی پر آپ کم از کم پورا ہفتہ ہمارے پاس ٹھہریں۔ امینہ آپ کو خوب سیر کرائے گی۔"

"بیٹی میں یہ وعدہ نہیں کرتی کہ اتنے دن ٹھہروں گی لیکن آؤں گی ضرور۔"

"میرا مطلب ہے کہ آپ سب آئیں گے۔ صفیہ بھی اور اس کے بچے بھی۔"

"بھئی صفیہ سے تو شاید تم پہلے ہی وعدہ لے چکی ہو لیکن اس کے لیے شاید ایک ہفتہ والی بات ذرا مشکل ہو گی۔"

شام کے وقت قدسیہ۔ یوسف عبدالعزیز اور اس کی بیوی بلقیس مہمانوں کو ریلوے اسٹیشن پر رخصت کرنے آئے تھے۔ جب وہ سیکنڈ کلاس کے زنانہ ڈبے میں بیٹھ گئیں تو قدسیہ نے اپنے نوکر کے ہاتھ سے ایک گٹھڑی لے کر مسز احمد کو پیش کرتے ہوئے کہا۔

"یہ چھوٹا سا تحفہ قبول فرمایئے۔ سبز رنگ کے ریشمی رومال میں جو دو سوٹ ہیں ان میں سے ایک آپ کے لیے اور ایک بہن صفیہ کے لیے ہے۔ دوسرے سفید رومال میں فہمیدہ اور نسرین کے کپڑے ہیں۔ میں نے آپ کے لیے عطر کی دو شیشیاں بھی منگوائی تھیں لیکن جیسا عطر آپ نے کوئٹہ سے مجھے یوسف کے ہاتھ بھیجا تھا ویسا یہاں سے نہیں مِلا۔ بہرحال میرے یہ تحائف قبول فرمایئے۔ میں اپنے گھر پر ہی انہیں آپ کے سامان میں رکھوانے کی کوشش کرتی لیکن میں ڈرتی تھی کہ کہیں خالہ جان انکار نہ کر دیں۔ اس امید پر یہاں پہنچ کر آپ کو پیش کر رہی ہوں کہ آپ خلقِ خدا کے سامنے مجھے شرمندہ نہیں کریں گی۔"

"ارے بیٹی۔ آخر تم نے مجھے ہوا کیوں سمجھ لیا ہے۔ فہمیدہ یہ تحائف سنبھال کر اپنے سوٹ کیس میں رکھ لو۔ میں اطمینان سے دیکھوں گی اور صفیہ تم کیوں خاموش ہو۔ شکریہ ادا کرو اپنی بہن کا۔"

"خالہ جان"۔ قدسیہ نے کہا۔ "صفیہ کو شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے قدرت کا اس سے بڑا انعام اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے دیکھے بغیر میرا تحفہ قبول کر لیا ہے۔"

یوسف چند قدم پیچھے کھڑا ہو کر عبدالعزیز سے باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی نے سیٹی دی اور وہ قریب آ گئے۔ قدسیہ اور صفیہ دروازے میں آ کر کھڑی ہو گئیں گاڑی چل پڑی اور وہ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے لگے۔

یوسف ڈبے کے سامنے سب سے پیچھے کھڑا تھا بلقیس، عبدالعزیز اور قدسیہ ہاتھ ہلا کر رخصت ہونے والوں کے الوداعی اشاروں کا جواب دے رہی تھیں۔ فہمیدہ کھلے دروازے میں کھڑی تھی اور یوسف اطمینان سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب گاڑی ذرا آگے نکل گئی تو اُس نے دل میں خدا حافظ خدا حافظ کہتے ہوئے ایک ہاتھ بلند کر دیا۔

عبدالعزیز، بلقیس، یوسف اور اس کی امّی کو کار پر اُن کے گھر تک پہنچا کر گئے اور رخصت ہوتے وقت عبدالعزیز نے کہا۔ "مَیں نے ڈرائیور کو کہہ دیا ہے کہ کل سے آپ کو باقاعدہ ڈرائیونگ سکھانا شروع کر دے گا۔ آپ اس کے لیے صبح یا شام کا کوئی وقت مقرر کر لیں۔ یہ آپ کو باقاعدہ ہر روز دو گھنٹے کے لیے ساتھ لے جایا کرے گا۔ میں صبح نماز کے لیے تیار ہو جایا کروں گا اور ڈرائیور کے ساتھ ناشتہ کر کے اس کے ساتھ چل پڑا کروں گا اور اگر یہ کوئی دقت محسوس کرے تو ہم عصر کی نماز کے بعد پروگرام بنا لیا کریں گے۔"

ڈرائیور نے کہا "جناب صبح کے وقت ٹھیک رہے گا۔"

"اچھا تو ہم کل نہیں پرسوں سے شروع کریں گے۔"

اگلے دن دس بجے کے قریب یوسف اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا کہ ماں اُس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے ایک پیکیٹ یوسف کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا: "یہ پیکیٹ میں نے کھول کر دیکھے بغیر گھر پہنچتے ہی اپنے ٹرنک میں رکھ لیا تھا۔ پھر اُن کے یہاں ہوتے ہوتے مجھے ان کی تصویریں دیکھنے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی۔ اب جب تم سیر کے لیے نکلے تھے تو میں نے یہ پیکیٹ کھولا تھا۔ نسرین اور فہمیدہ کی شکلیں بہت ملتی ہیں لیکن فہمیدہ اتنی حسین ہے کہ اُس کی کوئی تصویر اُس جیسی نہیں ہو سکتی۔"

یوسف نے بظاہر بے پروائی سے یکے بعد دیگرے تمام تصویریں دیکھیں اور انہیں پیکیٹ میں ڈالنے کے بعد مسکرا کر کہا: "امی جان بات دراصل یہ ہے کہ کیمرے کی بے جان آنکھ میں مامتا نہیں آسکتی اور آپ تو فہمیدہ اور اس کی نانی کو بھی یہ شاید احساس دلا چکی ہیں کہ اُس کے لیے آپ کی مامتا کسی سے کم نہیں۔ لیکن امی جان آپ اُسے دیکھتے ہی کیوں رو پڑی تھیں؟"

"بیٹا وہ خوشی کے آنسو تھے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں مدتوں سے اُسے تلاش کر رہی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اُس کی ماں اور نانی ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے اجنبی محسوس نہیں ہوئیں۔ میں اس کی وجہ بیان نہیں کر سکتی لیکن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ میری ہیں شاید اُس کی یہ وجہ ہو کہ میں نے اُن سب کی نگاہوں میں تمہارے لیے پیار دیکھا تھا اور میں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ تمہیں اُن لوگوں سے پیار ملے گا۔ بیٹا پہلے شاید میں یہ بات تم سے نہ کہتی لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ میں انہیں دیکھنے سے پہلے ایک بات سے خوفزدہ تھی۔"

"کس بات سے امی جان؟"

"بیٹا! میں اس بات سے خوف زدہ تھی کہ میں اتنی بے بس نہ ہو جاؤں کہ

تمہارے ابا جان کسی دن تمہارے مستقبل کے متعلق کوئی ایسا فیصلہ کر دیں کہ میری روح کی چیخیں آسمان تک جا پہنچیں لیکن میں زبان بھی نہ ہلا سکوں۔"

"امی جان آپ کبھی بھی بے بس نہیں ہوں گی اور میں آپ کا کوئی بھی فیصلہ رد نہیں ہونے دوں گا۔ اگر آپ کو ساری دنیا سے بے اطمینانی ہو جائے تو بھی مجھ پر آپ کو اعتماد کرنا چاہیے۔"

"بیٹا مجھے تم پر اعتماد ہے لیکن میں اس بات سے ڈرتی ہوں کہ تمہارے ابا جان کہیں دنیا داری کے چکر میں نہ پڑ جائیں لیکن نہیں مجھے ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔"

یوسف مسکرایا۔ "امی جان جو باتیں آپ کہنا چاہتی ہیں وہ آپ کے چہرے پر لکھی ہوئی ہیں۔ آپ یہی کہنا چاہتی ہیں نا کہ دنیا داری کا چکر ابا جان کو عبدالکریم کی طرف کھینچ لے گا۔ لیکن مجھے اپنی ہمت سے زیادہ آپ کی دعاؤں پر یقین ہے اور آپ کی دعائیں مجھے اس راستے پر کبھی نہیں جانے دیں گی جو آپ کو پسند نہیں، امی جان میں ہوش سنبھالتے ہی اپنے متعلق آپ کی جو دعائیں سُنا کرتا تھا، ان میں سے ایک بار بار دہرائی جانے والی دعا معصوم پاکیزہ اور خوب صورت لڑکی کے نقوش میرے ذہن میں اُبھارا کرتے تھے۔ اُس سے آپ مل چکی ہیں اور میں بھی اُسے دیکھ چکا ہوں۔ آپ کی دُعاؤں کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ وہ بھولی بھالی لڑکی بھی یہ جانتی ہے کہ میں جو کچھ ہوں اُس کے لیے ہوں۔ مجھے کسی دن صرف اس کے والدین کو یہ کہنا پڑے گا کہ اگر زمانے کے حوادث کے باعث کامیابی کی منزل کی طرف میرا راستہ طویل ہو جائے تو میرا سب سے بڑا سہارا یہ ہوگا کہ وہ میرا انتظار کرے گی۔ دوسری لڑکی امینہ کے بارے میں اگر آپ کو کوئی پریشانی ہے یا ابا جان کو میرے متعلق کوئی غلط فہمی ہے تو وہ بہت جلد دُور ہو جائے گی۔ میں کسی دن اس سے براہ راست بات کروں گا آپ اور اُس کی ماں سُن سکیں گی اور اگر ضرورت پڑی تو میں عبدالکریم صاحب سے

بات کروں گا۔ میرے لیے یہ مسئلہ قطعاً پیچیدہ نہیں۔"

ماں نے کہا۔" بیٹا! جب میں تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو میری تمام پریشانیاں ختم ہو جاتی ہیں۔"

"امی جان پھر میری طرف دیکھتی رہا کریں نا۔"

"ارے بیٹا میں زندہ ہی اِس لیے ہوں کہ تمہیں دیکھا کرتی ہوں لیکن ابھی وہ تصویریں تمہیں چھپا کر رکھنی چاہئیں۔ جب وہ گاڑی پر روانہ ہوتے تھے تو مجھے خیال آیا تھا کہ اُن سے یہ کہوں کہ شاید میں یوسف کو بھی کسی دن کانگڑہ سیر کے لیے بھیج دوں۔"

"نہیں امی جان۔ ابھی نہیں، ابھی میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔"

"بیٹا کسی دن تم اُداس نہیں ہو جاؤ گے؟"

"آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ وہ بیٹا کیسے اداس ہو سکتا ہے جس کے لیے آپ جیسی ماں دعائیں کرتی ہو۔"

ماں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔" اللہ تمہیں ہر میدان میں کامیابی دے اور پھر میں تمہارے ساتھ بہت سیر کیا کروں گی۔ پھر وہ مبارک دن بھی آئے گا جب فہمیدہ ہمارے ساتھ ہوا کرے گی۔"

" امی جان۔" یوسف نے کچھ سوچ کر کہا۔" فہمیدہ کو دیکھے بغیر آپ کے دل میں اس کا خیال کیسے پیدا ہوا تھا۔"

"بیٹا۔ جب تم نسرین کا ذکر کر رہے تھے تو میں دل میں کہہ رہی تھی کاش اُس کی کوئی بڑی بہن ہو، پھر جب تمہاری گفتگو سے یہ پتہ چلا کہ ایک بڑی بہن بھی ہے جس کی نسرین اور اس کی نانی دونوں تعریف کرتی تھیں۔ تو میرے دل میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ یہی وہ لڑکی ہو سکتی ہے جسے میں تصور میں دیکھا کرتی تھی اور نسرین کے پہلے خط میں اُس کے ہاتھ کی چند سطریں پڑھنے کے بعد تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اللہ نے میری دعائیں سن لی ہیں لیکن بیٹا مجھے

تم سے ایک شکایت ہے کہ تم پڑھائی میں اپنے ابا جان کی توقعات پوری نہیں کر رہے۔ کیا تم اپنے ابا جان اور ہم سب کی خوشی کے لیے اس سال ذرا زیادہ محنت نہیں کر سکتے۔"

"امی جان بی اے کے امتحان کا نتیجہ دیکھنے کے بعد آپا جی کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔"

"بیٹا اگر تم نے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی تو میں اور تمہارے ابا جان بلا تاخیر فہمیدہ کے گھر جائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ بلقیس اور اس کے میاں یہ سفارش کریں گے کہ ہماری درخواست قبول کر لی جائے۔"

"لیکن امی جان بی اے کے بعد میرے جو ارادے ہیں انھیں پورا کرنے کے لیے مجھے دو چار سال بہت کام کرنا پڑے گا۔"

"بیٹا میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں لیکن میرا مقصد ان کے والدین کی رضامندی حاصل کرنا ہے۔ پھر ایسی بہو کے انتظار میں دو چار سال ایک دل کش خواب کی طرح گذر جائیں گے اور تم بھی پوری یکسوئی سے اپنا کام کر سکو گے۔ پھر میں اُسے خط لکھا کروں گی۔ عیدوں پر اسے تحائف بھیجا کروں گی اور سوتے جاگتے تم دونوں کے لیے دعائیں کیا کروں گی۔ میرے لیے کتنے خوشی کے دن ہوں گے وُہ۔"

○

دس دن بعد قدسیہ کو ایک لفافہ موصول ہوا جس کے اندر ایک خط صفیہ کی طرف سے تھا اور دوسرا یوسف کے لیے نسرین کی طرف سے۔ صفیہ نے اپنے خط میں اپنی ماں اور فہمیدہ کی طرف سے اُن کی مہمان نوازی اور تحائف کا شکریہ ادا کرنے کے بعد یہ لکھا تھا۔

"بہن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گی کہ جب گاڑی بٹالہ سے آگے ایک اسٹیشن

پر رُکی تو فہمیدہ نے ایک کارخانے کی بلند چمنی دیکھتے ہی کہنا شروع کر دیا کہ اس اسٹیشن
سے مشرق کی طرف یوسف صاحب کا گاؤں ہے۔ ہم دائیں ہاتھ گاڑی کی کھڑکیوں
سے مشرق کی طرف دیکھنے لگے۔ تین سکھ عورتیں جو اس اسٹیشن سے سوار ہوئیں
تھیں ہماری باتوں میں دل چسپی لینے لگیں۔ جب میں نے آپ کے گاؤں کا نام لیا تو
"بہن"! ایک عورت نے کہا" اگر آپ نے اِس گاؤں جانا ہے تو یہیں اتر جائیں
اگلا اسٹیشن تو بہت دُور ہو جائے گا"۔

میں نے کہا" نہیں جی ہم نے وہاں نہیں جانا صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ
وُہ گاؤں کس طرف ہے"۔ ایک نوجوان لڑکی جلدی سے ہمارے قریب آ گئی اور اُس
نے بازو نکال کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" جی وہ سامنے ہمارے گاؤں کے
درخت ہیں اور دوسرا گاؤں جس کا آپ پوچھ رہی ہیں اُس کے پیچھے ذرا دائیں طرف
ہے۔ وہاں آپ کسی کو جانتی ہیں"۔

میں نے کہا" ہاں بیٹی۔ ہم میاں عبدالرحیم ان کے بیٹے یوسف اور اُن کی بیگم صاحبہ
کو اچھی طرح جانتے ہیں"۔ یہ سُن کر باقی دو عورتیں بھی ہمارے پاس آ گئیں اور اُنھوں
نے میاں صاحب کے خاندان کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ فہمیدہ نے اچانک
نوجوان لڑکی سے پُوچھا" ہم یہاں سے پردیسی درخت دیکھ سکتی ہیں"۔

"جی وہ ایک بڑے گاؤں کے پیچھے ہیں"۔

فہمیدہ نے پوچھا" پردیسی درختوں کی خاص بات کیا ہے"۔

لڑکی نے کہا" جی وہ بہت پرانے ہیں۔ کہیں دُور سے چل کر آئے تھے،
تھک کر وہاں رُک گئے تھے"۔

فہمیدہ بولی" جی تھک کر نہیں۔ بات یہ تھی کہ بہت سویرے ایک عورت
نے آٹا پیسنے والی چکی چلاتے ہوئے باہر دیکھا تو درخت بھاگتے جا رہے تھے۔ وہ

دہائی دینے لگی تو درخت جہاں تھے وہیں رُک گئے"۔

فہمیدہ نے پوچھا" کیا یہ درست ہے کہ بعض درختوں میں کھوڑ ہے جن میں
سانپ رہتے ہیں"۔

لڑکی نے جواب دیا" جی سانپ ہی نہیں وہاں خوفناک جنگلی بلے بھی ڈیرہ
جما لیتے ہیں۔ ایک بلا اِتنا بڑا تھا کہ اس نے دو کتے جان سے مار ڈالے اور ہمارا
ایک قیمتی کتا بری طرح زخمی کر دیا تھا"۔

فہمیدہ نے پوچھا" آپ کا گاؤں یوسف صاحب کے گاؤں سے مغرب کی
طرف ہے؟ اور پردیسی درخت وہاں سے جنوب کی طرف ہیں"۔

"جی ہاں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمارا علاقہ دیکھ چکی ہیں"۔

"اچھا یہ بتایئے بہن کہ سردار بیلا سنگھ آپ کے کیا لگتے ہیں"۔

لڑکی۔" جی وہ میرے تایا ہیں اور میرا نام جیت کور ہے"۔

بڑی عمر کی عورت نے کہا" بیٹی اگر آپ اتنا کچھ جانتی ہیں تو میاں عبدالرحیم
کے خاندان سے آپ کا کوئی رشتہ ہو گا۔ جب آپ ان کے پاس آئیں تو ہمیں
ضرور اطلاع دیں"۔

"میں نے یونہی سوال کر دیا۔ آپ ان کے بیٹے یوسف کو اچھی طرح جانتی
ہیں"۔

"جی اُسے کون نہیں جانتا۔ اچھے لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں اور جو بُرے
ہیں وہ اُن کے سائے سے بھاگتے ہیں"۔

اِن لوگوں سے گفتگو بہت دل چسپ رہی لیکن جلد ہی وہ دوسرے اسٹیشن
پر اُتر گئیں۔

بہن پردیسی درختوں کے ذکر سے امّی جان کو آپ کے گاؤں سے اتنی دلچسپی
پیدا ہوگئی ہے کہ اگر اگست کے آخری دنوں میں آپ لوگ اپنے گاؤں میں ہوں تو
ہم واپسی پر آپ کا گاؤں ضرور دیکھیں گے۔ اگر کوئی پروگرام ہے تو ہمیں اطلاع دیجئے۔
اور کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کسی دن چپکے سے دھرم سالہ پہنچ جائیں اور ہماری سب
کی عید ہو جائے۔

آپ کی بہن صفیہ

نسرین نے لکھا تھا۔

میری پیاری خالہ جان

جب آپا فہمیدہ نے آپ کا قیمتی تحفہ مجھے دیا تو رنگ وہی تھا جو میرے ابّو
اور امّی پسند کیا کرتے ہیں اور وہ کہتی تھیں کہ آپ اُن بزرگوں میں سے ہیں جو
دیکھے بغیر بچّوں سے پیار کرنے لگ جاتے ہیں۔ خالہ جان! یہ بھی عجیب بات ہے
کہ جب یوسف بھائی نے نانی جان سے کہا تھا کہ آپ کی صورت بالکل میری امّی
سے ملتی ہے تو میں نے بھی آپ سے پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ یوسف بھائی جان
سے مَیں سخت ناراض ہوں۔ آپ انہیں اس بات پر تھوڑا سا ضرور ڈانٹیں کہ انہوں
نے اپنی ننھی بہن کا پتہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ یہ تو آپا فہمیدہ کا کمال تھا کہ انہوں
نے کسی اخبار میں اُن کا مضمون پڑھا اور مجھ سے پرنسپل صاحب کے نام خط لکھوا دیا۔
جب مجھے یہ خیال آتا تھا کہ بھائی یوسف مجھے بھول گئے ہوں گے تو مَیں بیان نہیں کر سکتی
کہ مجھے کتنا دُکھ ہوتا تھا۔ خالہ جی زیادہ دکھ مجھے اِس بات کا ہے کہ میرے شیر دل بھائی جان
نے اتنے بڑے کارنامے سرانجام دیئے اور مجھے خبر بھی نہ تھی اور جب مجھے یہ پتہ چلا کہ چچا جان
انہیں اچھی طرح جانتے تھے تو کتنا غصّہ آیا تھا مجھے اُن پر۔ خالہ جان آپ کو دیکھنے کو بہت

جی چاہتا ہے اور اس وقت تو میرا دل پھٹنے لگتا ہے جب آپا، امی اور نانی جان آپ کے
متعلق باتیں کرتی ہیں اور اس طرح ذکر کرتی ہیں۔ جیسے میں یوسف بھائی جان کو بالکل نہیں
جانتی۔ خالہ جان میں نے ایسے ہی لکھ دیا ہے کہ آپ میرا دل دکھانے پر ان کی ڈانٹ ڈپٹ
کریں ورنہ میں اُن سے بالکل ناراض نہیں ہوں اور کبھی بھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ خالہ جان بھائی
جان کو بھی تو چھٹیاں ہیں اور کانگڑہ کا موسم بہت اچھا ہے یا تو آپ اس طرح کریں کہ بھائی
جان کے ساتھ یہاں آجائیں یا بھائی جان کو بھیج دیں تاکہ مجھے آکر آپ کے پاس لے جائیں۔
میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کو دیکھنے کی خوشی مجھے لاہور کی گرمی محسوس نہیں ہونے
دے گی۔ بھائی جان سے کہہ دیجئے کہ مَیں اس یقین کے ساتھ ہر نماز کے بعد دعا کرتی
ہوں کہ گاڑی پر سفر کے دوران میرے لیے دعا کرنے کا جو وعدہ انہوں نے کیا تھا
وہ انہیں نہیں بھولا ہوگا۔

اور پیاری خالہ جان اب مَیں بھائی جان کے ساتھ آپ کی صحت اور سلامتی
کے لیے بھی دعا کیا کروں گی۔ آپا فہمیدہ آپ سب کو سلام کہتی ہیں۔

آپ کی بیٹی

نسرین

نسرین کا خط آنے کے بعد کوئی ایک ہفتہ قدسیہ فرصت کے اوقات
میں الگ بیٹھ کر انہیں خطوط لکھا کرتی تھی۔ پہلے تین دن وُہ صفیہ اُس کی امّی اور
نسرین کے نام لکھتی رہی۔ چوتھے روز اُس نے فہمیدہ کو لکھا لیکن اُسے اپنی تحریر
پسند نہ آئی اُس دن گرمی بہت زیادہ تھی لیکن شام کے وقت اچانک شدید آندھی
آئی اور اُس کے بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ صبح کے وقت موسم بہت خوشگوار

تھا۔ قدسیہ یہ کہہ کر اُوپر کمرے میں چلی گئی " مَیں آرام کرنا چاہتی ہوں اِس لیے جب تک میں خود نہ اُٹھوں مجھے جگانے کے لیے کوئی نہ آئے "۔

یوسف جو کسی دوست کے گھر گیا ہوا تھا اپنے بھائی سے یہ سُن کر پریشان ہوا کہ امّی جان آپ کے گھر سے نکلتے ہی آرام کے لیے اوپر چلی گئیں تھیں اور یہ حکم دے گئیں تھیں کہ جب تک میں خود نہ نیچے آؤں مجھے بلانے کے لیے کوئی نہ آئے۔

پھر اُس نے بہن سے کہا " صغریٰ دبے پاؤں جاؤ دیکھو امّی جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا "

اُس نے واپس آکر جواب دیا " بھائی جان! انھوں نے اندر سے دروازے کی کنڈی لگا رکھی ہے "

" تم نے آہستہ سے آواز نہیں دی؟ "

" جی نہیں "۔

یوسف بھاگتا ہُوا اُوپر چڑھا اور اُس نے بالائی منزل کے دو کشادہ کمروں میں سے ایک کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا " امی جان۔ امّی جان "۔

ماں نے اندر سے کہا " بیٹا میں ٹھیک ہوں۔ نوکر سے کہو وہ کھانا تیار کرے میں ابھی آجاؤں گی "۔

" امی جان آپ آج بھی کچھ لکھ رہی ہیں "۔

" ہاں بیٹا، سب سے اہم خط تو مَیں آج لکھ رہی ہوں۔ بس تھوڑا سا رہ گیا ہے اِس کے بعد وہ چاروں خط جو مَیں نے لکھے ہیں آکر پڑھ لینا اور لفافوں پر ان کے پتے لکھ کر آج ہی پوسٹ کر آنا "۔

" چوتھا خط کس کے نام ہے امّی جان "

" تمہیں معلوم ہے کہ وہ کس کے نام ہے۔ اب جاؤ ورنہ بہت سی باتیں لکھنا بھول

جاؤں گی "۔

" اچھا امی جان، مَیں جاتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کوئی بات نہیں بھولیں گی "۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد یوسف ایک کتاب اُٹھا کر بیٹھک میں لیٹ گیا ماں کمرے میں داخل ہوئی اور اُس نے چار خالی لفافوں کے ساتھ اپنے لکھے ہوئے خطوط میز کی ایک دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔ " بیٹا! آرام کرنے کے بعد یہ چاروں خط اچھی طرح پڑھ لینا اور پھر اُوپر والا خط جو مَیں نے ابھی ختم کیا ہے بڑی احتیاط سے پڑھنا کوئی غلطی ہو تو ٹھیک کر دینا۔ مَیں نہیں چاہتی کہ کوئی فہمیدہ کے سامنے میرا مذاق اڑائے "۔

" امی جان۔ آپ یہاں بیٹھ جائیں۔ وہ خط میں آرام کرنے سے پہلے آپ کے سامنے پڑھوں گا۔ کیونکہ جس فہمیدہ کو میں جانتا ہوں اس کے سامنے کوئی آپ کا مذاق نہیں اُڑا سکتا "۔

ماں نے دراز کھول کر خط نکالا اور یوسف کو دیتے ہوئے اُس کے پاس بیٹھ گئی۔ یوسف اُٹھ کر خاموشی سے خط پڑھنے لگا۔ قدسیہ نے لکھا تھا کہ

میری بیٹی، آنکھوں کی روشنی سلامت رہو

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جن کی آواز سننے کے لیے کان ترستے ہیں، وہ یکایک خاموش ہو جاتے ہیں۔ خدا معلوم کہ اِس میں کیا مصلحت تھی کہ تم مجھے چند سطریں بھی نہ لکھ سکیں لیکن اس کے باوجود ہر خط تمہاری طرف سے ایک خوشی کا پیغام محسوس ہوتا تھا۔ کل بہت گرمی تھی۔ میں نے سوچا کہ فہمیدہ نے نہیں لکھا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ میں بھی نہ لکھوں لیکن جو خط میں نے لکھا تھا وُہ

مجھے پسند نہ آیا اور شاید اس لیے پسند نہ آیا کہ سخت گرمی میں مَیں کانگڑہ کی خوشگوار ہواؤں اور دل کش مناظر کا تصوّر کر رہی تھی اور ہر تصور کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے تم آجاتی تھیں۔ مَیں نے اپنی تحریر پڑھی تو اُن فقروں کے سوا جو میں نے تمہارے متعلق لکھے تھے مجھے ہر بات بے ربط نظر آتی تھی، اور میں سوچتی تھی کہ تم ایسا خط پڑھ کر کیا کہو گی۔ چنانچہ مَیں نے پہلا خط ضائع کر دیا پھر شام کو آندھی آئی اور کھل کر بارش ہوئی۔ اب مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میری بیٹی کی دعاؤں نے کانگڑہ کی ہواؤں کا رُخ میری طرف پھیر دیا ہے تاکہ میں اطمینان سے اُسے لکھ سکوں چنانچہ میں اُوپر تنہا بیٹھی ہوں اور نیچے یہ کہہ آئی ہوں کہ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ اِس لیے کوئی اُوپر نہ آئے۔ مَیں نے تنہائی کے لیے کمرے کا دروازہ بھی بند کر دیا تھا لیکن بیٹی مَیں تنہا نہیں ہوں کیونکہ مجھے خط لکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم کسی کونے میں چھُپ کر مجھے دیکھ رہی ہو۔ نسرین کو مَیں نے لکھ دیا ہے کہ بہن صفیہ نے اجازت دی تو میں اُس کو یہاں لانے کا کوئی انتظام کروں گی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَیں خود یوسف کے ساتھ چل پڑوں میرے لیے اِس سے زیادہ خوشی کی کوئی اور بات نہیں ہو سکتی کہ کانگڑہ سے واپسی پر آپ ہمارے گاؤں میں رکیں اور میں آپ کی آمد سے چند دن پہلے گھر پہنچ جاؤں۔ آپ کے ساتھ ملاقات سے پہلے میرے دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ میں اس سال اچانک کسی دن اپنے گاؤں جا سکوں گی۔ لاہور کے ساتھ آتے دن میری دلچسپیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ لیکن اب یکایک بڑی شدت سے قدرت کی اُن نعمتوں کا احساس ہونے لگا ہے جو مَیں وہاں چھوڑ کر آئی ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ جو آسمان جو چاند اور جو ستارے مَیں اپنے گاؤں میں دیکھا کرتی تھی وہ اِس شہر سے بہت مختلف ہیں۔ جس فضا میں مَیں سانس لیا کرتی تھی وُہ

یکسر بدل چکی ہے۔ یوسف کو اس بات کا احساس ہے کہ شہر کی ہوا کا مجھ پر اچھا اثر نہیں پڑ رہا۔ وہ اپنے ابا جان کو بھی قائل کر چکا ہے کہ مجھے وقتاً فوقتاً دو چار دن کے لیے گاؤں جا کر ضرور رہنا چاہیے۔

ہمارا پروگرام یہ ہے کہ اگست کے آخری دو ہفتے اپنے گاؤں میں گذار آئیں۔ اس لیے پندرہ اگست کے بعد جس دن بھی تشریف لائیں یوسف آپ کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود ہو گا۔ بیٹی زیادہ مناسب بات یہی ہو گی کہ آپ کی امّی بہن بلقیس یا اُن کے میاں کو لکھے کہ آپ کون سی تاریخ کو کانگڑہ سے روانہ ہوں گی۔ ہماری کوشش تو یہی ہو گی کہ بلقیس اور بھائی عبدالعزیز بھی ہمارے ساتھ چل پڑیں لیکن اگر انھیں کوئی مصروفیت ہوئی تو بھی مجھے یقین ہے کہ پردیسی درختوں کے متعلق سننے کے بعد وہ یقیناً ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہو جائیں گے۔

بیٹی اِس وقت عجیب وغریب باتیں آ رہی ہیں میرے ذہن میں ایک فرضی سی کہانی تو یہ ہے کہ 'پردیسی درخت' پہاڑوں کی طرف سے بھاگ کر اُس طرف آ نکلے تھے اور رات کے پچھلے پہر چکی پیسنے والی عورت کی دُہائی سُن کر وہ اچانک وہیں رُک گئے تھے۔ لیکن کسی دن جب ہمارے علاقے کے لوگ اپنے بڑوں کی زبانی یہ سُنا کریں گے کہ دو شہزادیاں جن کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھے ان درختوں کو دیکھنے آئی تھیں تو ان کی ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتّے سے نغمے پھوٹ نکلے تھے تو کئی لوگ اس بات پر بھی یقین کر لیں گے۔

یوسف آخری الفاظ رُک رُک کر پڑھ رہا تھا اور ہر فقرے کے بعد اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قدسیہ نے کہا۔ "بیٹا اِس خط کو لفافے میں ڈالنے سے پہلے اچھی طرح پڑھ لو۔ میں نے یقیناً کوئی غلطی کی ہو گی۔"

"نہیں امی جان۔ اِس خط کو کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ یہ خط پڑھنے سے پہلے

شاید میں کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ آپ اِتنا اچھا لکھ سکتی ہیں۔"

" اچھا بیٹا! اس پر تو میں نے خاص توجہ دی ہے مگر باقی خط ضرور دیکھ لو اور انھیں آج ہی روانہ کر دو۔"

باب - ۲۳

جولائی کے دن قدسیہ، یوسف اور اُس کے بھائی اور بہنوں کے لیے بڑی خوشی کے دن تھے۔

یوسف کی چچازاد زہرہ بہاول پور میں اپنے سسرال کے گھر سے ایک سالہ بچّے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔

کانگڑہ سے باقاعدہ خطوط آیا کرتے تھے اور ہر خط ان کی خوشیوں میں اضافہ کیا کرتا تھا۔ فہمیدہ نے جو طویل خط قدسیہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا اُسے وہ کئی بار پڑھ چکی تھی اور یوسف کو بھی دکھا چکی تھی۔ اس خط میں براہِ راست اُس نے یوسف کے ذکر سے اجتناب کیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لکھتے وقت بظاہر اُس کی ماں سے مخاطب ہے لیکن اُس کے خیالات یوسف پر مرکوز ہیں اور قدسیہ جب جواب لکھتی تھی تو اُس کے مبہم سوالات کے جواب میں اُسے یوسف کا تذکرہ کرنا پڑتا تھا۔ اگست کی پہلی تاریخ کو ہی گھر میں گاؤں جانے کا پروگرام بننا شروع ہو گیا تھا۔ میاں عبدالرحیم نے ان کو اجازت دے دی تھی اور عبدالعزیز صاحب نے یوسف کے والد کی طرح عام مصروفیات کی وجہ سے معذوری ظاہر کر دی تھی اور بلقیس کو اجازت دے دی تھی کہ وہ یوسف اور اُس کی امی کے ساتھ جا سکتی ہے۔ یوسف بہت اچھی طرح کار چلانا سیکھ چکا تھا اور عبدالعزیز نے یوسف سے یہ بھی کہا تھا کہ

"اب تم ڈرائیور کے بغیر بھی کار اپنے گاؤں تک لے جاسکتے ہو" اور یوسف نے جواب دیا تھا۔ "چچا جان' کار اس موسم میں ہمارے گاؤں تک نہیں جاسکتی اِس لیے ہم گاڑی یا بس پر جائیں گے۔ اسٹیشن یا لاریوں کے اڈے سے اُتر کر ہمیں دو میل تانگوں پر جانا پڑے گا۔"

تیرہ اگست کو وہ گاؤں جانے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے۔ اور پندرہ اگست صبح کو انہوں نے بس پر روانہ ہونے کا پروگرام بنایا تھا لیکن چودہ اگست کو انہیں یہ خط آیا کہ ہم انشاء اللہ یہاں سے بائیس اگست کو روانہ ہوں گے اور جی بھر کر آپ کے علاقے کی سیر کریں گے، ہم اس گاڑی پر آئیں گے جو دن کے وقت آپ کے اسٹیشن پر پہنچتی ہے اور روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم آپ کو تار بھی دے دیں گے۔

قدسیہ نے اُسی وقت جواب لکھا۔ "پیاری بہن۔ ہم تو آپ کی خاطر چودہ کو وہاں جا رہے تھے۔ اب ہم پانچ چھ دن اور یہاں ٹھہر جائیں گے۔ بائیس اگست کو آپ کا انتظار کیا جائے گا۔ اُس دن اور اُس کے بعد بھی پٹھانکوٹ کی طرف آنے والی دونوں گاڑیاں باقاعدہ دیکھی جائیں گی۔"

اٹھارہ اگست کی صبح امینہ، اُس کی ماں اور چراغ بی بی اُن کے گھر آئیں اور امینہ کی ماں نے قدسیہ سے شکایت کی۔ "آپا جان۔ آپ نے ہمیں زہرہ کے آنے کی اطلاع ہی نہیں دی۔ پرسوں شام اگر بھائی صاحب ہمارے گھر نہ آتے تو ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہوتا کہ زہرہ یہاں ہے۔ بہرحال آج دوپہر کا کھانا آپ کو ہمارے ہاں کھانا ہوگا اور ہم انتظام کر کے آئے ہیں۔"

قدسیہ نے کہا۔ "بہن اگر یوسف کے ابا تمہارے گھر پرسوں گئے تھے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کل دورے پر چلے گئے ہیں۔"

"جی، مجھے معلوم ہے۔ لیکن آج امینہ کے ابا بھی تو گھر پر نہیں ہیں۔ ہم نے

زہرہ کی دعوت کی ہے اِس لیے آپ کو آنا پڑے گا۔"

قدسیہ نے کہا۔ "دیکھو رشیدہ، رات مجھے نیند نہیں آئی اور اِس وقت بھی میری طبیعت خراب ہے۔ تم زہرہ اور باقی تمام بچوں کو ساتھ لے جاؤ اور مجھے گھر میں لیٹنے دو۔"

رشیدہ بولی۔ "نہیں وہاں جاکر آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"دیکھو رشیدہ ضد نہ کرو۔"

یوسف نے بہت کم اپنی ماں کو یہ کہتے سُنا تھا کہ اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وُہ گھبرا کر بولا۔ "امی جان، مَیں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

"بیٹا! ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر سونے کے بعد مَیں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ جاؤ تم بھی ان کے ساتھ دعوت میں چلے جاؤ لیکن جلدی واپس آجانا۔"

"نہیں امی جان۔ مَیں آپ کے پاس ٹھہروں گا اور جب آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ ابھی کھانے میں کافی دیر ہے۔"

"نہیں بیٹا! نوکر یہاں موجود ہے اور تم ریشم بی بی کو کہو کہ میرے پاس آجائے۔"

رشیدہ بولی۔ "چلو بیٹا۔ ہم تمہیں واپس بھیج دیں گے اور باقی اطمینان سے آئیں گے۔ میں چراغ بی بی کو بھی تمہاری امی کی خدمت کے لیے بھیج دوں گی۔"

قدسیہ نے کہا۔ "رشیدہ میری فکر نہ کرو۔ ریشم بی بی ہماری پڑوسن ہے۔ چراغ بی بی سے کہو بائیں ہاتھ دیوار کے قریب جاکر آواز دے۔ وہ فوراً یہاں پہنچ جائے گی۔"

"میں بلاتا ہوں امی جان۔" یوسف یہ کہہ کر اُٹھا اور بائیں طرف دوسرے مکان کی چھت کے پردے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے آواز دی۔ "خالہ جی، خالہ جی۔"

ایک چوبیس پچیس سال کی عورت پردے کے اُوپر سے اِس طرف آگئی اور یوسف نے کہا "خالہ جان! آپ امی جان کا خیال رکھیں مَیں ابھی آتا ہوں۔"

"خدا خیر کرے کیا ہوا آپا جی کو؟" ریشم بی بی نے جلدی سے نچلی چھت عبور کر کے بالائی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

قدسیہ نے کہا۔ "ریشم بی بی تمہیں یوسف کی تسلّی کے لیے کچھ دیر میرے پاس بیٹھنا پڑے گا۔ ورنہ ہمارے یہ مہمان ناراض ہو جائیں گے۔"

رشیدہ نے کہا۔ "ہاں بہن یہ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ہم ان کی دعوت کر بیٹھی تھیں اور آپا جی کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔"

یوسف بادلِ ناخواستہ اُن کے ساتھ مکان سے نکل گیا اور قدسیہ بستر پر لیٹ گئی اور ریشم بی بی نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپا میں آپ کے ہاتھ پاؤں دبا دوں۔"

"نہیں بہن! مجھے پانی پلا دو اور نوکر سے کہو کہ وہ نیچے ہی کھانا تیار کر دے۔"

قدسیہ کچھ دیر لیٹے لیٹے باتیں کرتی رہی اور پھر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

بالائی منزل کے دو کشادہ کمروں اور باورچی خانے کے سامنے خالی چھت کے دو حصے تھے۔ وہ حصہ جو ڈیوڑھی اور بیٹھک کے اُوپر تھا کوئی پانچ فٹ اُونچی دیوار نے باقی چھت سے علیحدہ کر رکھا تھا۔ اِس چھوٹے حصے پر بیت الخلاء اور غسلخانہ تھا۔ بڑے حصے میں کُھلا کشادہ جنگلا تھا۔ جس سے روشنی نچلے حصے میں جاتی تھی۔

ریشم بی بی ایک خوش طبع عورت تھی اسے ہر وقت ہنستے ہنساتے دیکھا جاتا تھا۔ اگر مسئلہ قدسیہ کے پاؤں دبانے یا کسی اور کام کا ہوتا یا اگر وہ اُس کے ساتھ باتیں کر سکتی تو اُسے وقت کٹتا محسوس نہ ہوتا لیکن قدسیہ آنکھیں بند کیے

خاموش پڑی تھی اور اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُسے کوئی تکلیف ہے اِس لیے اُسے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔

یوسف کمرے میں داخل ہوا اور اُس نے ایک ہاتھ ماں کی پیشانی پر رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی نبض دیکھنے لگا۔ ماں نے آنکھیں کھولیں۔

"بیٹا، تم انہیں راستے میں چھوڑ کر واپس آگئے ہو؟"

"نہیں امّی جان۔ میں بے چین ضرور تھا لیکن انہوں نے مجھے روکنے کی بجائے ہمارا ابھی اور خالہ کا بھی کھانا موٹر میں رکھوا دیا تھا۔ نوکر اُوپر لا رہا ہے۔ آپ ہاتھ دھو کر تیار ہو جائیں۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹا کھانا دوسرے کمرے میں رکھواؤ اور تم وہیں بیٹھ کر کھا لو۔ ریشم بی بی تم بھی اپنے میاں اور بچّوں کو بلا کر انہیں کھلا دو۔ میرے لیے ایک بالٹی یہاں رکھ دو اور غسل خانے سے باہر بھی پانی کا ایک لوٹا رکھوا دو۔"

یوسف نے پریشان ہو کر پُوچھا۔ "امی جان کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بیٹا۔ تم جا کر کھانا کھاؤ اور ریشم بی بی کے بچوں کو بھی بلا لو، وُہ بھوکے ہوں گے۔ بھائی حسین علی جب گھر آئے تو نوکر سے کہنا کہ اُن کا کھانا وہیں پہنچا دے۔"

"انہیں مَیں بلا لیتا ہوں امی جان! لیکن آپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے میں پہلے ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔"

"بیٹا! میری بات مانو تم کھانا شروع کرو گے تو شاید میں بھی تمہارے ساتھ آ کر دو لُقمے کھا لوں۔ اِس وقت مجھے تلخی سی محسوس ہو رہی ہے اور جی بھی کچھ متلا رہا ہے۔ ریشم بی بی کہہ رہی تھی کہ ابھی لیموں کے شربت کے دو ٹھنڈے گلاس پینے سے میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"لیکن مجھے ڈر ہے کہ پانی پیتے ہی مجھے قے آجائے گی۔"

"امّی جان کچھ نہیں ہوگا۔ مَیں ابھی حکیم صاحب کے پاس جاتا ہوں۔ اُن سے پُوچھ کر صندل یا اُس سے کوئی اور اچھا شربت اور تازہ لیموں لے آتا ہوں۔"

"ہاں بیٹا، جلدی کرو اور برف بھی لے آنا۔"

یوسف بھاگتا ہوا نیچے کی طرف گیا تھوڑی دیر بعد اُس نے واپس آکر حکیم صاحب کے تجویز کردہ شربت میں لیموں کا رس اور پانی ملا کر ایک بڑا جگ تیار کیا اور ایک گلاس بھر کر اپنی ماں کو پیش کر دیا۔ قدسیہ نے جلدی سے پینے کے بعد کہا۔ "بیٹا ایک گلاس اور بھر دو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر آگ سلگ رہی ہے۔ دوسرا گلاس پینے کے بعد اُس نے تکیہ پر سر رکھتے ہوئے کہا۔" بیٹا اب تم کھانا کھالو اور شربت کی بجائے خالی پانی کا ایک جگ برف ڈال کر تپائی پر رکھ دو۔ اگر میں سو جاؤں تو سمجھنا کہ میری تکلیف دُور ہوگئی ہے۔ لیکن اگر تم نے کھانا نہ کھایا تو مجھے چین نہیں آئے گا۔"

یوسف نے کہا۔ "آپ کچھ تو کھالیں۔"

"بیٹا، اگر مَیں نے کچھ کھایا تو مجھے قے آجائے گی۔ جاؤ نا۔"

یوسف نے دوسرے کمرے میں جا کر ریشم بی بی اس کے چودہ سالہ سوتیلے بیٹے نظیر احمد اور اس کی چار سالہ بیٹی خدیجہ کے ساتھ بیٹھ کر تھوڑا سا پلاؤ کھایا اور جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "خالہ آپ اطمینان سے کھاتیے مَیں امّی کے پاس جاتا ہوں۔"

ریشم بی بی نے کہا۔ "بیٹا، اگر وہ سو جائیں تو اُنھیں جگانے کی کوشش نہ کرنا۔"

باب - ۲۴

یوسف اُٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تو قدسیہ اپنے بستر پر نہیں تھی۔ بستر کے ساتھ اُس کے سلیپر غائب پا کر اُسے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ دبے پاؤں چھت کے دوسرے حصّے کی طرف نکل گئی ہے۔ اُس نے باہر نکل کر جھانکا تو پانی سے بھرا ہُوا لوٹا بھی اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ وہ بستر کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر ماں کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ گذر گئے اور وُہ اپنے دل میں اضطراب محسوس کرنے لگا۔ ریشم بی بی کمرے میں داخل ہوئی تو اُس نے مضطرب ہو کر کہا "خالہ جان مجھے معلوم نہیں امی جان کس وقت دوسری چھت پر گئی تھیں لیکن جب میں کھانا کھا کر آیا تھا تو وہ یہاں نہیں تھیں۔ اب انھیں کافی دیر ہوگئی ہے۔ آپ اُس طرف جائیں اور پانی کا ایک اور لوٹا وہاں رکھوا دیں۔ شاید انہیں ضرورت ہو۔"

ریشم بی بی پانی کا ایک اور لوٹا بھر کر دوسری چھت کی طرف چلی گئی چند منٹ اور گذر گئے اور یوسف کے اضطراب کی شدّت میں اضافہ ہونے لگا۔

دیہاتی عورتیں طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے یا شام دھندلکے کے بعد اپنے گھروں سے باہر نکلتی تھیں اور جلد ہی واپس آجایا کرتی تھیں۔ قدسیہ ایک انتہائی صحت مند دیہاتی عورت تھی اور شہر میں آکر بھی اُس کی یہی حالت تھی کہ کسی نے اُس کو دن کے وقت بیت الخلاء کی طرف آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ ملیریا کے

موسم کے سوا اُسے کبھی بخار بھی نہیں ہوا تھا۔ جب یوسف کو اُس کا انتظار ناقابلِ برداشت محسوس ہونے لگا تو اُس نے چھت کے دوسرے حصّے کی دیوار کے قریب جا کر آواز دی

"خالہ! خالہ"

رشیم بی بی نے جواب دیا۔" بیٹا گھبراؤ نہیں۔ میں ابھی تمہاری امی جان کو لے کر آتی ہوں۔"

یوسف چند قدم پیچھے ہٹ کر چوبارے کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔

رشیم بی بی قدسیہ کو سہارا دیتے چھت کے دوسرے حصّے سے نمودار ہوئی۔ قدسیہ کا چہرہ زرد تھا اور رشیم بی بی کے ساتھ چلتے ہوئے اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ یوسف نے بھاگ کر قدسیہ کو دوسری طرف سے سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"خالہ جان۔ آپ چھوڑ دیں۔ میں انھیں اندر لے جاتا ہوں۔"

"اچھا بیٹا۔ تم انہیں آرام سے لاؤ۔ یہ باہر سائے میں لیٹنا چاہتی ہیں۔ میں جلدی سے وہاں چارپائی ڈال دیتی ہوں۔"

اور پھر یوسف اُسے ایک کشادہ چارپائی پر لٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔" امی جان! کیا ہوا آپ کو؟ آپ نے مجھے ڈاکٹر بلانے سے کیوں منع کیا تھا۔؟"

"بیٹا" ماں نے تکیہ پر سر رکھتے ہوئے کہا۔" بس ٹھیک ہوں۔ بس بالکل ٹھیک ہوں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ رشیم بی بی یہ بالٹی اِدھر رکھ دو اور مجھے ٹھنڈا پانی پلاتی رہو۔"

یوسف بولا" خالہ وہ جگ برف والے پانی سے بھرا ہے۔"

"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔" یوسف جلدی سے اُٹھا اور بھاگتا ہُوا نیچے چلا گیا۔ کوئی بیس منٹ بعد یوسف محلّے کے مشہور ڈاکٹر کو لے کر پہنچ گیا۔ اُس نے دو دوائیاں اپنے تھیلے سے نکال کر دیں اور دو کاغذ پر لکھ کر بازار سے منگوانے کے لئے کہا۔

یوسف نے اُس کے ہاتھ سے کاغذ لیتے ہوئے کہا۔" میں ابھی لے آتا ہوں لیکن امی جان

کی پیاس کا فوراً کوئی علاج کیجئے۔ یہ سخت پیاس کے باوجود پانی اِس لیے نہیں پیتیں کہ اُسی وقت قے نہ آجائے۔"

"بیٹا، تم نوکر سے کہو کہ پانی اُبال کر ٹھنڈا کرے۔ برف پانی میں نہ ڈالے۔ بلکہ پانی والا برتن برف کے اُوپر رکھ دے۔ جو دوائی میں منگوا رہا ہوں وہ پانی میں ڈال کر پلائی جائے گی اور پھر قے نہیں آئے گی۔ ان کے جسم سے بہت سا پانی ضائع ہو چکا ہے اِن کا علاج فوراً شروع ہو جانا چاہیے۔"

یوسف بولا۔" ڈاکٹر صاحب! جو اچھی سے اچھی دوائی ہے وہ مجھے لکھ دیں اور اس بات کی پروا نہ کریں کہ اُس کی قیمت کیا ہے؟"

"بیٹا جو اچھی دوائیاں تھیں وہ میں نے لکھ دی ہیں اور میں تمہاری گفتگو سے ان کی بیماری کے متعلق سمجھ گیا تھا۔ اِس لیے دوائیاں اپنے ساتھ بھی لے آیا تھا۔"

"آپ میرے آنے تک یہاں ٹھہریں گے نا؟"

"ہاں بیٹا۔ تم جاؤ۔"

یوسف نے نیچے اترتے ہوئے نوکر سے کہا۔" تم کسی بڑے دیگچے میں پانی اچھی طرح اُبالو اور پھر چھوٹے برتنوں میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دو۔ ایک دیگچی جلدی ٹھنڈی کرنے کے لیے نیچے سے بہت ساری برف بھی لے آؤ تاکہ ٹھنڈے پانی میں فوراً دوائی ڈال کر امی جان کو پلائی جا سکے۔"

چند منٹ بعد یوسف واپس آگیا۔ دیگچی کے پانی کو اُبال آیا تو رشیم بی بی نے اپنے خاوند حسین علی کو بھیج کر کوئی بیس سیر برف کی ایک سِل منگوا لی اور دیگچی کی بجائے تین کٹورے بھر کر اُس پر رکھ دیئے۔ ڈاکٹر نے پانی میں ایک دوائی ملا دی اور جب وہ ذرا ٹھنڈا ہُوا تو رشیم بی بی نے ایک کٹورا اُٹھا کر اُس کے منہ کو لگاتے ہوئے کہا۔" بہن پی لیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ اُنہوں نے اس میں جو دوائی ڈالی ہے اُس کی وجہ

سے آپ کو اب قے نہیں آئے گی۔"

قدسیہ نے جلد ہی کٹورا خالی کر دیا اور اس کے چہرے پر معمولی سی تازگی آ گئی۔ ڈاکٹر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔"یوسف بیٹا! اب میں جاتا ہوں۔ آپ کو جب بھی ضرورت پڑے نوکر کو بھیج دیں۔ اپنی ماں کو تھوڑا تھوڑا پانی پلاتے رہیں۔ اگر انہیں نیند آجائے تو یہاں کوئی شور نہیں ہونا چاہیے۔"

ڈاکٹر چلا گیا تو قدسیہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ یوسف ریشم بی بی کو خاموشی سے بیٹھنے کا اشارہ کر کے نیچے چلا گیا اور وضو کرنے کے بعد بیٹھک میں نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ زہرہ، امینہ اور چراغ بی بی جن کے پیچھے دوسرے بچے آرہے تھے کار سے اُتر کر باتیں کرتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئیں اور نچلے کمروں میں جھانکنے کے بعد اُوپر چلی گئیں۔ زہرہ اُن کے پُرتکلف اور امیرانہ ٹھاٹھ کا ذکر کرنے کے لیے بے چین تھی لیکن قدسیہ کی حالت دیکھ کر اُس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ قدسیہ نے آنکھیں کھولے بغیر "ریشم بی بی مجھے پانی دو۔" کہا۔

ریشم بی بی نے اُسے سہارا دے کر اُٹھایا اور دوائی والے پانی کا ایک کٹورا پلا دیا۔

قدسیہ نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔"میری بہن بہت سے پانی میں دوائی ڈال دو۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی مجھے آرام آجائے گا۔ پانی کا ایک دیگچہ اور ابال لو۔ اس گھر میں سب کو اُبلا ہوا پانی پینا چاہیے۔"

یوسف دعائیں کرتا ہوا اُوپر آیا اور ماں کو باتیں کرتا دیکھ کر اسے اطمینان محسوس ہوا لیکن قدسیہ اچانک اس طرف جھک گئی جدھر بالٹی رکھی ہوئی تھی اور پھر اسے قے شروع ہو گئی۔ زہرہ نے اُس کے سر کو سہارا دے رکھا تھا جب اُسے لٹا دیا گیا تو اُس نے کہا۔"ریشم بی بی مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اب میں مانگوں تو بھی مجھے پانی نہ دینا۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر کہا۔"امی جان! ڈاکٹر کہتا تھا کہ آپ کے جسم میں سے پانی کا ختم ہو جانا بہت خطرناک ہے۔ پتہ نہیں ابا جان ابھی تک کیوں نہیں آئے ورنہ میں انکل عبدالعزیز کو ساتھ لے کر جاتا اور کسی بڑے ڈاکٹر کو یہاں لے آتا۔"

زہرہ نے کہا۔"ابا جان تو سیدھے ان کے گھر پہنچے تھے اور کھانا کھا کر وہیں سو گئے تھے۔"

امینہ نے کہا۔"میں جاتی ہوں اور میاں صاحب اور اپنے ابا کو خبر دیتی ہوں۔ ابا جی یہاں کے ہر بڑے ڈاکٹر کو جانتے ہیں۔ چراغ بی بی جب تک خالہ جی ٹھیک نہیں ہوتیں تم یہیں رہو گی۔ یوسف صاحب! مجھے اجازت ہے نا؟"

"جی میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن جلدی جائیے۔"

وہ تیزی سے زینے سے اُترنے لگی اور یوسف نے پہلی بار دیکھا کہ وُہ بہت نفیس کپڑے پہنے ہوئے تھی۔

یوسف نے جنگلے کے قریب جا کر نوکر کو آواز دے کر کہا۔"تم بھاگ کر حکیم صاحب کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ امی جان کو پانی پیتے ہی قے آجاتی ہے۔ ڈاکٹر جو دوائیاں دے کر گیا وُہ بھی ان کے اندر نہیں ٹھہریں۔ کوئی ایسا عرق بھی دے دیجیے جس سے انہیں قے نہ آئے۔ میں دس روپے کا نوٹ نیچے پھینک رہا ہوں۔ یہ اُٹھاؤ اور بھاگ کر جاؤ۔"

قدسیہ نے لیٹے لیٹے ہاتھ اُٹھا کر اشارہ کیا اور صغریٰ جو سہمی ہوئی ایوب کے ساتھ بستر کے قریب کھڑی تھی بولی۔

"بھائی جان! امی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

یوسف جلدی سے ماں کے سرہانے کے بائیں طرف بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے اپنا ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال کر اُسے اپنی طرف کھینچا اور پھر اُس کا سر دونوں ہاتھوں

ہیں تھام کر اُس کی پیشانی چُومنے لگی۔

"میرے بیٹے" وہ نحیف آواز میں کہہ رہی تھی "میں تمہیں مغموم نہیں دیکھ سکتی۔"

"امی جان" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں مغموم نہیں ہوں۔ جب آپ ٹھیک ہوجائیں گی تو لوگوں کو دُور دُور تک میرے قہقہے سنائی دیں گے۔"

نوکر آیا اور اُس نے ایک تھیلا ریشم بی بی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"حکیم صاحب نے عرق کی چار بوتلیں دی ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ ان میں سے ایک چائے کی پیالی کے برابر نکال کر باری باری پلاتے جائیں اگر اس کے باوجود متلی آئے تو پیاز کا پانی نچوڑ کر ایک پیالی پلا دیں اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ انشاء اللہ بی بی جی کو پیاز کا پانی پینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آپ یہ عرق دیتے جائیں جب ختم ہوجائے تو اور منگوالیں۔"

یوسف نے کہا۔ "اچھا تم جاؤ۔"

زہرہ پیالی لے آئی اور اُس نے ایک بوتل سے عرق نکال کر ماں کو پلا دیا۔ چند منٹ بعد قدسیہ نے کہا۔ "مجھے اور دو۔" زہرہ نے دوسری بوتل سے عرق نکال کر پلا دیا اور قدسیہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ چند منٹ بعد میاں عبدالرحیم اور عبدالکریم ایک ڈاکٹر کے ساتھ وہاں پہنچ گئے اور عورتیں ایک طرف ہٹ گئیں۔ ڈاکٹر کے سوالات کے جواب میں یوسف نے اپنی ماں کی بیماری کی ساری تفصیل بیان کر دی۔ ڈاکٹر نے مریضہ کا سرسری معائنہ کرنے کے بعد ہی میاں عبدالرحیم سے یہ کہہ دیا کہ "یہ ہیضے کا کیس ہے۔ آپ کو پانی پلاتے رہنا چاہیے۔ یہ جو عرق ہیں اس کے متعلق میں اطمینان سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر انہیں باقاعدہ کشید کر کے بنایا گیا ہے تو ٹھیک ہیں ورنہ ان سے بھی پرہیز کرنا ہی بہتر ہوگا۔ میں ابھی باقی سب کو ٹیکے لگوانے کا انتظام کرتا ہوں۔ جو دوائیاں پہلے ڈاکٹر صاحب دے گئے

وہ ٹھیک ہیں۔ میں دو اور دوائیاں بھیج دوں گا۔ اگر انہیں نیند آجائے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ان کی بیماری دور ہو جائے گی۔ گھر میں سب اُبلا ہوا پانی پئیں اور مریضہ کے پانی میں دوائی کے ساتھ کچھ نمک بھی ڈال دیا کریں۔ جو دوائیاں میں بھیجوں گا وہ تین تین گھنٹے کے بعد دینی ہیں اور یہ جو آپ کے پاس پڑی ہوئی ہیں یہ بھی اسی طرح دینی ہیں جیسے ڈاکٹر صاحب آپ کو سمجھا گئے ہیں لیکن اگر یہ سو جائیں تو انہیں دوائی دینے کے لیے جگانے کی ضرورت نہیں۔ جب ٹیکہ لگانے والے آئیں تو آپ اپنے لیے ان لوگوں کو بھی ٹیکہ لگوا دیں جو یہاں آئے ہوتے ہیں۔ اِس موسم میں ہیضہ کے پھیل جانے کا بہت خطرہ ہوتا ہے۔"

یوسف نے ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! حکیم صاحب نے پیغام بھیجا ہے کہ پیاز کا پانی نکال کر پلا دیا جائے۔"

بوڑھے ڈاکٹر نے کہا۔ "بیٹا! اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوسکتا ہے یہ مفید ہو مگر مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔"

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر وہاں سے رخصت ہونے لگا تو عبدالکریم نے کہا۔

"میاں صاحب! ہم ڈاکٹر صاحب کو پہنچانے کے بعد آپ کی دوائی لے آئیں گے، آپ یہیں بیٹھے رہیں۔"

یوسف انہیں نیچے چھوڑنے آیا تو اس نے عبدالکریم سے کہا۔ "میاں صاحب! میں امینہ کا بہت شکر گزار ہوں۔ انھوں نے ہمارے لیے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔"

امینہ بولی۔ "یوسف صاحب، یہ میرا فرض تھا۔"

عبدالکریم نے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم ہسپتال سے ٹیکے لگوا کر ہی گھر جائیں؟"

"ہاں، جی ہاں! احتیاط کا مطلب تو یہی ہے۔"

عبدالکریم نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یوسف صاحب آپ ایسا کریں کہ اپنے نوکر کو ہمارے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ دوائی لے کر فوراً واپس آجائے کیونکہ اسکے بعد ہسپتال جاکر ہمیں شاید کچھ دیر لگ جائے۔"

یوسف بھاگتا ہوا اُوپر گیا۔ اُس نے نوکر سے کہا۔ "دیکھو میاں عبدالکریم صاحب، ڈاکٹر صاحب کو گھر پہنچا کر ٹیکے لگوانے کے لیے ہسپتال جائیں گے تم ان کے ساتھ جاؤ اور فوراً دوائی لے کر تانگے پر واپس آجاؤ۔"

نوکر نیچے پہنچ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا تھا کہ چراغ بی بی نے بھاگتے ہوئے کار کا دروازہ کھولا اور امینہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ عبدالکریم نے کھسیانا ہو کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چراغ بی بی! اچھا ہوا تم آگئیں ورنہ ہمیں ٹیکہ لگانے والوں کو گھر بلانا پڑتا۔"

کار اسٹارٹ ہوئی تو ایوب بھاگتا ہوا نیچے آیا۔ "ٹھہرئیے۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ شاید صبح ہوتے ہی انکل عبدالعزیز اور چچی جان ہمارے گھر آجائیں۔ اِس لیے انھیں یہ اطلاع دینا ضروری ہے کہ ہمارے محلے میں ہیضہ پھیل رہا ہے اور امی جان بیمار ہیں۔"

"اچھا بیٹا!" عبدالکریم نے جواب دیا۔ "ہم ضرور ان کو اطلاع دے دیں گے۔"

انہوں نے تھوڑی دیر بعد ادویات کی ایک دوکان سے نوکر کو ادویات دے کر واپس بھیج دیا اور کار ڈاکٹر کے مکان کی طرف چل پڑی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "بہت سمجھ دار لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ ہر انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

عبدالکریم بولا۔ "جناب امینہ کا خیال تھا کہ اگر ہم فوراً اٹھ کر چل پڑے تو

یوسف ناراض ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک پڑھے لکھے آدمی کو ایسی بات پر ناراض نہیں ہونا چاہیے اور میری یہ بیٹی امینہ کسی کو ٹیکہ لگتے ہوئے دیکھ کر آنکھیں بند کرلیتی ہے۔ اب آپ اگر اسے یہ مشورہ دیں کہ ہیضے سے بچنے کے لیے ایک ہی وقت میں تمہیں دس ٹیکے لگوانے پڑیں گے تو اس کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔"

امینہ بولی۔ "اباجی! میں آپ کے ساتھ اِس لیے جا رہی ہوں کہ ٹیکہ لگانے والے کو یوسف صاحب کے گھر لے آؤں کیونکہ ان سب کو ٹیکہ لگوانا زیادہ ضروری ہے۔"

عبدالکریم نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے بیٹی! یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم ہسپتال سے کسی کمپونڈر یا ڈاکٹر کو اپنے گھر لے آئیں اور وہاں سے اپنے ڈرائیور کے ساتھ یوسف کے گھر بھیج دیں۔"

چراغ بی بی بولی "ہاں جی! بلاوجہ خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ میری نانی کہتی تھی کہ ایک دفعہ ہمارے گاؤں میں ہیضہ ـــ"

امینہ نے تلملا کر کہا۔ "خدا کے لیے چپ رہو، ورنہ موٹر کہیں ٹکرا جائے گی۔"

چراغ بی بی اپنا فقرہ پورا نہ کرسکی۔

ڈاکٹر بولا "دیکھو بی بی کار چلانے والے کو کبھی پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ بیٹی امینہ تمہارا جذبہ قابلِ داد ہے لیکن تمہیں اپنا ٹیکہ لگوانے میں بھی ذرا تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں اپنے گھر پہنچتے ہی ہسپتال کے کسی ذمہ دار آدمی کو ٹیلی فون کردوں گا اور انشاءاللہ وہ تمہیں ہسپتال پہنچتے ہی فارغ کر دے گا اور کوئی کمپونڈر تمہارے ساتھ جانے کے لیے بھی تیار ہوگا۔ اس کے بعد پہلے تم اپنے گھر پہنچو اور ٹیکہ لگانے والے کو اپنے ڈرائیور کے ساتھ یوسف کے گھر بھیج دو۔"

امینہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اگر اباجی کی طرح آپ کا بھی یہی حکم ہے کہ میں یوسف صاحب

کی امّی کی خدمت نہ کروں تو میں آپ کے گھر سے ڈرائیور کو فون کروں گی کہ وہ تیار رہ کر کوٹھی کے گیٹ پر کھڑا رہے تو پھر عبدالعزیز صاحب کو اطلاع دوں گی۔ ڈاکٹر صاحب آپ ہسپتال والوں کو یہ ضرور کہہ دیں کہ یوسف صاحب کے گھر اور پڑوس میں بہت سے لوگوں کو ٹیکے کی ضرورت پڑے گی۔"

"بیٹی تم فکر نہ کرو۔"

ایک گھنٹہ بعد کار عبدالکریم کی کوٹھی کے پھاٹک پر رُکی اور وہ اُتر پڑے۔ میاں عبدالکریم نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہسپتال کے ملازم کو دیتے ہوئے کہا "بھائی یہ لیجئے اور یوسف صاحب کے گھر جتنے آدمی ہوں انہیں ٹیکہ لگا دیجئے۔ ان کے پڑوسیوں کو بھی ٹیکہ لگانا ضروری ہے۔ شاید وہاں پولیس کے ایک بڑے افسر بھی آئیں۔"

"میاں صاحب یہ سب کام ان پیسوں کے بغیر بھی ہو جائے گا۔"

"نہیں بھائی یہ پیسے لینے ہی پڑیں گے اور میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے۔"

"اچھا میاں جی آپ کا شکریہ۔"

ڈرائیور نے کار سٹارٹ کر دی اور میاں عبدالکریم جسے تھکاوٹ کے ساتھ ہیضے کے ٹیکے کی تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ اچانک امینہ پر برس پڑا۔ "رشیدہ کو تم نے گھر آ کر یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ یوسف کی امی کو ہیضہ ہو گیا ہے۔ کتنے آرام سے یہ خبر سنائی تھی کہ یوسف کی امّی کی طبیعت خراب ہے اور جب میں اُس کی تیمار داری کے لیے تیار ہو گیا تھا تو بھی تمہیں یہ خیال نہ آیا۔ ہیضہ ایک ایسا مرض ہے جو تیمار داروں کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔"

"ابا جی آپ کیوں پریشان ہیں اَب تو آپ نے ٹیکہ بھی لگوا لیا ہے۔"

عبدالکریم نے ذرا نرم ہو کر کہا "مجھے اس بات پر غصّہ آ رہا ہے کہ تم اپنی ماں کو بھی ہمارے ساتھ گھسیٹ رہی تھی لیکن میں اس بات پر خوش ہوں کہ آج تم نے ٹیکہ لگواتے وقت چیخ نہیں ماری۔"

چراغ بی بی بولی! "میاں جی مَیں نے بھی چیخ نہیں ماری۔"

امینہ نے کہا "لیکن پسینہ تو آ گیا تھا تم کو اور آنکھیں بھی بند کر رکھی تھیں تم نے۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ موت کے خوف نے تمہارے اندر چیخیں مارنے کی طاقت نہیں چھوڑی تھی؟"

"مرنے سے کون نہیں ڈرتا۔ آپ کو تو وہاں سے بھاگنے کی اتنی جلدی تھی کہ مجھے بھول ہی گئی تھیں اور اب بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ٹیکے جو اُس بھینگے سے کمپونڈر نے ہم کو لگا دیتے ہیں۔ ہیضے کو روک لیں گے۔ ایک دن پہلے قدسیہ بیگم کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ کبھی بیمار بھی ہو سکتی ہیں اور چند گھنٹوں کے اندر اندر وہ اتنی کمزور ہو سکتی ہیں کہ کوئی پہچان بھی نہ سکے۔ خدا کی قسم مجھے تو اُن کی طرف دیکھ کر خوف آتا تھا۔"

امینہ نے کہا "دیکھو چراغ بی بی۔ کچھ پڑھنا شروع کر دو ورنہ تمہیں ہیضہ ہو گیا تو تمہیں دیکھنے والے ڈر کر چیخیں ماریں گے۔ ابا جی دیکھئے اس کا رنگ بدل نہیں رہا؟"

رشیدہ نے باہر آ کر کہا "آپ اندر کیوں نہیں آتے، کیا حال ہے آپا قدسیہ کا؟"

"جی وہ ..." چراغ بی بی کوئی موزوں الفاظ سوچ رہی تھی لیکن امینہ نے غضب ناک ہو کر کہا۔ "خدا کے لیے تم چپ رہو۔" اور چراغ بی بی غصّے سے بل کھاتی ہوئی مکان کے ایک کونے میں غائب ہو گئی اور امینہ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "امّی جان اُن کی حالت اچھی نہیں آپ دُعا کریں۔"

عبدالکریم بولا۔ "اُس بیچاری کو ہیضہ ہو گیا ہے۔"

رشیدہ بولی۔ "اللہ اُس پر فضل کرے، جاؤ بیٹی تم بھی نماز پڑھ کر دعا کرو۔"

اور امینہ زندگی میں پہلی بار انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ دعا مانگ رہی تھی ـــــ

"یا اللہ یوسف کی امّی کو شفا دے۔ یا اللہ یوسف کو اس قدر پیار کرنے والی ماں کے سائے سے محروم نہ کیجیو۔"

یوسف نے مغرب کی نماز مسجد میں جا کر پڑھی، دیر تک انتہائی سوز و گداز کے ساتھ ماں کی صحت کے لیے دعا کرتا رہا۔ واپس گھر آتے ہوئے وہ قدم قدم پر رُک کر دعا مانگ رہا تھا۔ یا اللہ جب میں گھر پہنچوں تو مجھے زینے پر چڑھتے ہوئے امی جان کے قہقہے سنائی دیں اور انہیں دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہو کہ اُن کی بیماری کے متعلق جو میں سارا دن دیکھتا رہا وُہ سب ایک خواب تھا لیکن جب وہ ماں کے قریب پہنچا تو اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اُس کا دل بیٹھ گیا۔ اُس نے زہرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "انہیں پھر قے آئی ہے؟"

"ہاں بھائی۔ جو دوائی نوکر لے کر آیا ہے وہ بھی اِن کے اندر نہیں ٹھہری۔"

یوسف نے کہا۔ "دوائی اندر نہ ٹھہرنے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بند کر دی جائیں، کم از کم اُبلا ہوا پانی انہیں تھوڑا تھوڑا ضرور پلاتے رہیں۔"

یوسف کے باپ نے کہا۔ "بیٹا! حکیم صاحب ابھی دیکھ کر گئے ہیں اور انہوں نے یہ کہا تھا کہ پیاز کا پانی نکال کر پلانے سے قے بند ہو جاتی ہے۔ مَیں نے حسین علی کو کہہ دیا تھا اور وہ نیچے کونڈے میں پیاز کوٹ کر پانی نکال رہا ہے۔ تم دعا کرو یہ فائدہ مند ثابت ہو۔"

پھر انہوں نے آگے جھک کر قدسیہ سے پوچھا۔ "قدسیہ یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تمہارا بستر اب اندر کر دیا جائے۔ رات کو شبنم کی نمی سے تمہاری طبیعت اور خراب

ہو جائے گی۔"

قدسیہ نے نحیف سی آواز میں کہا۔ "ہاں۔ میرا بستر اندر ہی کر دو اور میرے اُوپر کمبل یا رضائی بھی ڈال دو مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے۔"

زہرہ نے جلدی سے ایک چارپائی پر صاف بستر بچھایا اور پھر یوسف کی مدد سے اسے سہارا دے کر اندر لٹا دیا اور اُس کے اُوپر کمبل ڈال دیا۔ ایوب اور صغریٰ نے گھر میں پڑے کھانے سے کچھ کھا لیا۔ حسین علی شیشے کے ایک جگ میں پیاز کا رس نکال کر لے آیا۔ جب زہرہ نے اُس میں سے ایک پیالی بھر کر قدسیہ کو پیش کی تو وُہ ہچکچائی اور پھر یکایک آنکھیں بند کر کے دو گھونٹ پی لیے۔ اُس کا جی بُری طرح متلا رہا تھا۔

حسین علی نے کہا۔ "میاں جی! حکیم صاحب یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بیگم صاحبہ کو پیاز کے رس سے متلی آنے لگے تو انہیں الائچی کا عرق چمچے کے ساتھ آہستہ آہستہ شروع کر دیں۔ پھر ذرا طبیعت بحال ہو جائے تو یہ چند گھونٹ پیاز کا رس اور پی لیں اگر پانچ منٹ بھی وہ اندر ٹھہر گیا تو انہیں قے نہیں آئے گی۔"

جلدی سے الائچی کے عرق کی بوتل سے ایک چمچہ بھر کر سامنے کیا تو ماں نے لیٹے لیٹے منہ کھول دیا اور عرق حلق کے اندر اتارنے کے بعد آنکھیں بند کر لیں پانچ منٹ اور گزر گئے تو یوسف نے قریب جا کر کہا۔ "امی جان ایک اور پلا دوں؟"

ماں نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا۔ عشاء کی اذان کی آواز سنائی دی تو ماں نے کہا۔ "بیٹا جاؤ نماز پڑھ لو۔"

"نماز میں کافی وقت ہے امّی جان۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ذرا ٹھیک ہو جائیں الائچی کا عرق اور دوں امی جان۔" اُس نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"بیٹا! میرا خیال ہے کہ اب میں پیاز کا رس پی سکتی ہوں۔"

یوسف نے پیالی سے پیاز کے رس کا چمچ بھر کر آگے کیا اور قدسیہ نے

آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ پیاز کا رس حلق سے اتارتے ہوئے وہ بُری طرح منہ بنا رہی تھی اور دیکھنے والے سب یہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں وہ قے نہ کر دے۔ پانچ منٹ گذر گئے تو یوسف نے کہا۔ "اباجی اللہ نے ہم میں سے کسی کی دُعا قبول کر لی ہے۔ میں نماز پڑھ آؤں اب چند منٹ تک آپ انھیں صرف الائچی کا عرق پلا دیں۔ اس کے بعد ہم پیاز کے رس کی مقدار آہستہ آہستہ بڑھاتے جائیں گے اور ڈاکٹر کی دوائی ملا کر اُبلا ہوا پانی پلانا بھی شروع کر دیں گے۔"

مسجد میں نماز ختم کرنے کے بعد یوسف دیر تک سربسجود ہو کر دعا کرتا رہا۔ جب وہ اُٹھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ گھر کے قریب پہنچا تو سڑک پر عبدالعزیز کی موٹر کھڑی تھی۔ اُس نے ڈرائیور سے پُوچھا۔ "چچا جان تشریف لائے ہیں۔"

"جی ہاں بیگم صاحبہ بھی آئی ہوئی ہیں۔"

یوسف جلدی سے مکان میں داخل ہوا تو اُوپر سے عبدالعزیز کسی سے باتیں کرتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ یوسف ڈیوڑھی میں رُک کر انتظار کرنے لگا۔ عبدالعزیز نے یوسف پر نظر پڑتے ہی پیچھے مُڑ کر اُس کے باپ سے کہا۔ "میاں صاحب آپ جا کر آرام کریں۔ یوسف صاحب آ گئے ہیں۔"

یوسف کے والد نے کہا۔ "اچھا جی۔ آپ کی تکلیف کا بہت شکریہ، یوسف جاؤ انھیں کار تک چھوڑ آؤ۔"

یوسف نے پوچھا "اباجی! امی جان کو دوبارہ قے تو نہیں آئی۔"

"نہیں لیکن اُن کی طبیعت بہت متلا رہی ہے اور ان پر پھر یہ خوف سوار ہے کہ پانی پیتے ہی پہلا نہیں قے دوبارہ شروع ہو جائے گی۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "میاں جی! ڈرائیور مجھے پہنچا کر یہاں آ جائے گا اور بلقیس یہیں

رہے گی۔ میں راستے میں آپ کے ڈاکٹر سے مِل کر جاؤں گا اور اگر انھوں نے مشورہ دیا تو میں کسی اور ڈاکٹر صاحب کو بھی اُن کے ساتھ بھیج دوں گا۔ یوسف بیٹا تمہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں تم اپنی امّی کے پاس رہو۔ میں موٹر واپس بھیج دوں گا اور وہ یہیں رہے گی۔ میری ضرورت پڑے تو ڈرائیور بھیج دینا میں فوراً آ جاؤں گا۔

باب - ۲۵

عبدالعزیز خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ اُوپر سے زہرہ کی آواز آئی۔ "یوسف بھائی!"

وُہ تیزی سے زینے پر چڑھا اور بھاگتا ہوا ماں کے بستر کے قریب پہنچا تو بلقیس نے کہا: "یوسف انھیں غش آگیا ہے۔ تم ان کا منہ کھولنے میں میری مدد کرو۔"

یوسف نے دیکھا تو اُس کے دانت مضبوطی سے ملے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھی۔ اُس نے پہلے بھی اس حالت میں لوگوں کو دیکھا ہوا تھا۔ اُس نے باچھوں کے اندر دونوں ہاتھ ڈال کر منہ کھول دیا۔ بلقیس کی ہدایت کے مطابق زہرہ نے عرقِ گاؤزبان کا ایک چمچہ بھر کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔ قدسیہ نے ہوش میں آکر آنکھیں کھولیں اور اُس نے کہا: "میرا جسم سردی سے سُن ہو رہا ہے۔ میرے اوپر رضائی ڈال دو۔" پھر اس نے اچانک ایک طرف جُھک کر بالٹی میں قے کر دی۔

ریشم بی بی نے اُس پر رضائی ڈال دی اور وہ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ پھر اُس نے کہا: "یوسف کے ابا آپ آرام کریں۔ بلقیس بہن آپ کچھ دیر میرے پاس بیٹھیں۔ باقی سب یہاں سے چلے جائیں۔ یوسف بیٹا! تم بھی جا کر لیٹ جاؤ۔ تمہیں پریشان دیکھ کر مجھے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔"

عبدالرحیم باہر نکل کر ایک چارپائی پر بیٹھ گیا اور یوسف بھی اُس کے پاس

آبیٹھا۔ بلقیس کے سوا سب کمرے سے نکل گئے۔

"بلقیس"۔ اُس نے کہا۔ "اپنی کرسی ذرا آگے کر لو۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئیں ورنہ میں ایک حسرت اپنے ساتھ لے جاتی۔ میری بہن مجھے معلوم ہے کہ میرا وقت آچکا ہے۔ میں کبھی اس طرح بیمار نہیں ہوئی لیکن میں محسوس کیا کرتی تھی کہ ایک دن میرا یوسف اچانک میرے پیار سے محروم ہو جائے گا۔ ماں کو سب بچے پیارے ہوتے ہیں لیکن یوسف میرے لیے ہر بچے سے مختلف ہے۔ بہن جس دن آپ لوگوں سے پہلی ملاقات ہوئی تھی مجھے اطمینان محسوس ہوا تھا کہ اگر میں اچانک دنیا سے چلی جاؤں تو یہ وہ لوگ ہیں جو میرے بیٹے کو میری کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے اور فہمیدہ کو دیکھ کر تو میں نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں ضبط کی تھیں۔ بہن میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ اپنے بیٹے کی دائمی رفاقت کے لیے جس بچی کا میں تصور کیا کرتی تھی وہ اچانک کہیں سے نکل کر میرے سامنے آگئی ہے۔ بہن کاش میں اتنی با اختیار ہوتی کہ میں اُسی وقت اپنے اور آپ کے خاندان کے تمام لوگوں کو جمع کر سکتی اور ان کے سامنے یہ اعلان کر سکتی کہ یہ میری بہو ہے۔ بہن مجھے یہ اطمینان تھا کہ یوسف کی پسند وہی ہو گی جو میری پسند ہو اور مجھے یہ یقین ہے کہ یوسف عمر بھر کسی لڑکی کا نام نہیں لے گا۔ لیکن یہ صرف خدا جانتا ہے کہ اپنے فیصلوں پر عمل کرنے میں وہ کس قدر با اختیار ہو گا۔ میری بہن! جب میں بھائی عبدالعزیز اور تمہاری طرف دیکھتی ہوں تو میرے دل کو یہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی آزمائش کا وقت آئے گا تو میرا بیٹا یہ محسوس نہیں کرے گا کہ وُہ تنہا ہے۔"

بلقیس نے کہا: "آپا آپ کس بات سے خائف ہیں۔ یہ اطمینان میں آپ کو دلا سکتی ہوں کہ فہمیدہ کے والدین کی طرف سے یوسف کو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اُس کی ماں اور اُس کی نانی اگر اس وقت یہاں موجود ہوتیں تو میں اُن سے اعلان

کروا دیتی کہ وہ آپ کے بیٹے کو بہت پہلے پسند کر چکی ہیں۔ بہن اللہ تمہیں صحت دے
میں صفیہ کے گھر تمہارے ساتھ جاؤں اور پھر تم دیکھو گی کہ وہ کتنی خوشیاں مناتے ہیں۔"
قدسیہ نے کہا۔" بہن میں صرف آپ سے یہ اطمینان چاہتی ہوں کہ اگر یوسف
کو کوئی مشکل پیش آجائے یا وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو کیا وہ لوگ چند برس
اُس کا انتظار کر سکیں گے؟"

"ہاں۔ اور فہمیدہ کے بارے میں تو میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ وہ ساری عمر یوسف
کا انتظار کر سکے گی۔"

"بہن خدا تمہارا بھلا کرے۔ فہمیدہ کو صرف اتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا جب
تک کہ یوسف خود مختار نہیں ہو جاتا۔" قدسیہ نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔

○

بلقیس کچھ دیر کرب کی حالت میں اُس کی طرف دیکھتی رہی پھر وہ بولی
"بہن! یوسف جیسے بیٹے کی ماں کو کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ آپ
کو کس بات سے بے اطمینانی ہے؟"

"اب مجھے کوئی بے اطمینانی نہیں۔" قدسیہ نے نحیف آواز میں جواب دیا۔

"آپ کو عبدالکریم کی لڑکی سے کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟"

"بہن اُس سے نہیں لیکن اُس کی وجہ سے ایک پریشانی ضرور ہے اور وہ یہ
ہے کہ یوسف کے ابا کسی دن اُن لوگوں کی دولت سے اِتنے مرعوب نہ ہو جائیں کہ میرے
بیٹے کے گلے میں رَسّا ڈال کر اُن کے حوالے کرنے کی کوشش کریں۔ بہن میں یوسف کی
ماں ہوں اور مجھ سے زیادہ اُسے کوئی نہیں جانتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب اُس کی عزتِ نفس
پر حملہ کیا جائے گا تو وہ ساری دنیا کے ساتھ لڑنے پر تیار ہو جائے گا۔ بلقیس میں اس
بات پر بے حد خوش تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو تلاش کر لیا ہے لیکن مجھے اس بات

سے خوف آتا ہے کہ اگر میرے بدقسمت نے اُس کا ساتھ نہ دیا تو اُس کی زندگی کتنی
تلخ ہو جائے گی لیکن میری بات کا بُرا نہ ماننا فہمیدہ کا نام سُن کر اُس کا چہرہ خوشی سے
چمک اُٹھتا ہے اور فہمیدہ کے بغیر۔۔۔" قدسیہ کی آواز بھرا گئی اور اُس کی آنکھوں
سے آنسو اُمڈ آئے۔

بلقیس نے کہا۔" بہن اگر تمہیں اِس بات سے اطمینان ہو سکتا ہے تو میں
اللہ کو حاضر ناظر سمجھ کر یہ وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ صورتِ حال خواہ کچھ ہو میری تمام
ہمدردیاں یوسف اور فہمیدہ کے ساتھ ہوں گی۔"

"اچھا بہن مجھے پانی پلاؤ۔ اب جو پلاتی جاؤ گی میں پیتی جاؤں گی۔ اب
مجھے تکے کا خوف نہیں رہا۔ مجھے اِس بات کا بھی خوف نہیں رہا کہ میں اچانک
اِس دنیا سے چلی جاؤں گی۔"

بلقیس نے آواز دی۔" یوسف اندر آؤ۔ انہیں وہ دوائیاں اور پھر چاروں
عرق باری باری پلاتے جاؤ۔"

یوسف نے جلدی سے ایک پیالی بھر کر اُسے دیتے ہوئے کہا۔" چچی جان
میں باہر ان کی آواز سُن کر یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ ٹھیک ہو رہی ہیں۔"

بلقیس نے عرق کی پیالی پلانے کے بعد کہا۔" بیٹا! یہ سب کچھ تمہاری وجہ
سے تھا۔ تمہارے متعلق باتیں کرتے ہوئے ان میں جان آجاتی ہے۔"

قدسیہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے پڑی رہی پھر اُس نے نحیف آواز میں
کہا۔" یوسف۔"

"جی امّی جان۔"

ماں نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔ قدسیہ نے
آہستہ آہستہ ہاتھ بلند کیا اور یوسف نے گردن نیچی کر کے اُس کا ہاتھ اپنے سر پر

رکھ لیا۔ قدسیہ کچھ دیر کمزور ہاتھ اُس کے سر پر پھیرتی رہی۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا سر پکڑ کر اپنے سینے سے بھینچ دیا۔

"یوسف!" وُہ ڈوبتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "اللہ تمہاری حفاظت کرے۔ تم اپنے خاندان میں خوشیاں تقسیم کرنے کے لیے زندہ رہو اور وہ لوگ بھی تمہاری خوشیوں میں شریک ہوں جو تم سے پیار کرتے ہیں۔ بیٹا! تم تھک گئے ہو گے۔ جاؤ سو جاؤ۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔"

یوسف کے سر پر ماں کی انگلیوں کی گردش اچانک تھم گئی اور وہ گھبراہٹ کے عالم میں سر اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ قدسیہ کی آنکھیں بند تھیں۔ یوسف نے ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر اور دوسرا نبض پر رکھتے ہوئے بلقیس سے مخاطب ہو کر کہا۔ "چچی جان امی جان کا جسم ٹھنڈا ہو رہا ہے نبض بھی بہت کمزور ہے۔"

بلقیس نے جلدی سے اپنی انگلی قدسیہ کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بیٹا انہیں غش آگیا ہے۔ تم آرام سے اِن کا منہ کھولو میں پانی اور دوائی ڈالتی ہوں۔ اِس مرتبہ ہمیں دوائی والا پانی زیادہ مقدار میں دینا پڑے گا۔"

یوسف نے اپنے دونوں انگوٹھوں سے زور دے کر منہ کھولا اور قدسیہ نے معمولی جدوجہد کے بعد دوائی اُس کے بعد دو چمچ عرق اور ایک پیالی پانی حلق سے اُتار لیا لیکن فوراً قے آگئی۔

بلقیس نے آواز دی۔ "زہرہ تولیہ لاؤ۔ جلدی کرو۔"

ریشم بی بی بھی اندر آگئی اور یوسف نے کہا۔ "خالہ! آپ فوراً یہ بستر اور امی کے کپڑے بدل دیں۔ میں باہر جاتا ہوں۔"

دس منٹ بعد وہ اُس کا باپ اور باقی تیماردار بستر کے گرد کھڑے تھے۔ قدسیہ کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ اُکھڑے اُکھڑے سانس لے رہی تھی پھر اُس نے

ایک لمبا سانس لیا اور کھلی آنکھوں کے اندر زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ زہرہ رونے لگی۔ یوسف نے کہا۔ "زہرہ! اِس وقت کسی کی آواز گھر سے باہر نہیں جانی چاہیے۔"

بلقیس نے سسکیاں لیتے ہوئے آگے بڑھ کر قدسیہ کی آنکھیں بند کر دیں۔ عبدالرحیم خاموشی سے آنسو بہا رہا تھا۔ ایوب دوسرے کمرے سے اُٹھ کر آیا اور یوسف کے ساتھ لپٹ گیا۔ ریشم بی بی کھل کر رونا چاہتی تھی لیکن جب یوسف نے زہرہ کو بھی اِس بات کی اجازت نہ دی تو وہ سسکیاں لیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔ یوسف غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رضائی اور کمبل اُتار کر اُس پر ایک سفید چادر ڈال دی گئی تھی۔ اُس کے سُرخ و سفید چہرے پر جو زردی چھا گئی تھی وہ نیلاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ جو ہاتھ چادر سے باہر تھا اُس کی انگلیاں آہستہ آہستہ سکڑنے کی وجہ سے متحرک معلوم ہوتی تھیں اور یوسف دیوانہ وار اُس کی نبض ٹٹولتے ہوئے اپنے آپ کو یہ تسلی دے رہا تھا کہ وُہ زندہ ہے۔ "چچی جان"۔

اُس نے کہا۔ "دیکھئے! ان کی انگلیاں ہل رہی ہیں۔"

بلقیس نے کہا۔ "یوسف بیٹا! ہمت سے کام لو۔ اب جا کر نہا لو اور صبح کی نماز کی تیاری کرو۔"

اچانک یوسف کو ایسا محسوس ہُوا کہ وہ اِس دنیا میں اپنی سب سے بڑی جائے پناہ کو بھول گیا ہے۔ اُس نے نیچے جا کر غسل کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور جاء نماز لے کر اُوپر ماں کی میت کو ایک نظر دیکھنے کے بعد دوسری چھت پر چڑھ گیا۔ اذان ہوئی تو وُہ نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ نماز کے اختتام پر وہ دیر تک سربسجود پڑا رہا۔ "میرے اللہ! مجھے صبر اور حوصلہ دے۔ میرے اللہ! میری ماں کی وہ دعائیں قبول فرما جو اُس نے آخری وقت تک میرے لیے کی ہیں۔ یا اللہ! قیامت کے دن

مجھے اِن کی روح کے سامنے شرمسار نہ کرنا۔ یا اللہ مجھے اپنی دنیا میں زندہ رہنے کے وہ سلیقے عطا کر کہ میری ماں کی روح مجھ سے خوش ہو۔ یا اللہ! میری امی، میرے دادا اور میرے چچا کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ یا اللہ! میرے والد اور میرے بہن اور بھائی کو صبر، ہمت اور حوصلہ دے۔ آمین۔"

اور پھر جب اُس نے سر اٹھایا تو اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ مشرق کے افق پر طلوعِ آفتاب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ وہ چھت پر کھڑا تھا۔ مشرق کی طرف پھیلی ہوئی بدلیاں آہستہ آہستہ سرخ ہو رہی تھیں۔ آسمان پر وہی پرندے اُڑ رہے تھے جنھیں وہ ہر روز دیکھا کرتا تھا۔ درختوں کا رنگ وہی تھا لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ دنیا میں کوئی خلا پیدا ہو چکا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زینے پر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے مُڑ کر دیکھا۔ عبدالعزیز اُوپر آ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر یوسف سے لپٹ گیا۔ یوسف نے چند سسکیاں لینے کے بعد کہا۔ "چچا جان آپ نے اور چچی جان نے بہت تکلیف اٹھائی ہے۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "بیٹا اگر ہم دس گنا یا سو گنا زیادہ تکلیف اُٹھا کر تمھاری امی کی جان بچا سکتے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہوتی۔ بہرحال اب تم نے حوصلے سے کام لینا ہے۔ قبر کے لیے آدمی بھیج دیئے گئے ہیں۔ مکان اور گلی کی صفائی کے لیے محکمہ صفائی کی ٹیم اور ہیضے کے ٹیکے لگانے کے لیے ڈاکٹر تھوڑی دیر تک یہاں پہنچ جائے گا۔ آپ سب کو ٹیکے لگوا دیں اور میں نے سُنا ہے کہ آپ کی مہمان کے بچّے کو بھی کوئی تکلیف ہے اس کے متعلق بھی ڈاکٹر سے پوچھ لیں اور یوسف صاحب خود بھی ٹیکہ لگوانا ہے آپ کو۔"

"چچا جان ہم سب ٹیکہ لگوا چکے ہیں۔ میاں عبدالکریم نے ہسپتال سے آدمی بھیج دیا تھا۔"

"اچھا میں تھوڑی دیر کے لیے جاتا ہوں۔ ڈیڑھ گھنٹے تک آ جاؤں گا اور بلقیس بھی میرے ساتھ ہی جائے گی۔"

"لیکن چچا جان! ٹیکے کی آپ کو بھی ضرورت ہے۔"

"بیٹا تمھیں ہمارے متعلق اس قدر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ ہم ہیضے اور ٹائیفائیڈ کا ہر سال باقاعدہ ٹیکہ لگوایا کرتے ہیں اب احتیاطاً ایک اور لگوالیں گے۔ میں تمھیں ایک بات بتانا بھول گیا تھا۔ میاں عبدالکریم کا نوکر صبح سویرے آپ کے گھر کا حال پوچھنے آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر تمھاری امی کی وفات کا سنتے ہی وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ آپ کا پُرانا واقف ہے۔"

"جی یہ وہی ہوگا جو گاؤں میں عبدالکریم کے ساتھ تھا اور جس نے ٹھاکر ارجن سنگھ کو باندھنے کے لیے رسّوں کے علاوہ ایک پلنگ کی آدھی نواڑ خرچ کر دی تھی۔"

"ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے اور بیٹا تمھارے دل پر یہ بوجھ نہیں رہنا چاہیے کہ اب گاؤں جانے کے پروگرام کا کیا بنے گا۔ میں انہیں تار دے رہا ہوں کہ بعض ناگزیر وجوہات کی بنا پر آپ گاؤں نہیں جا سکیں گے میں مقامی پولیس کو بھی فون کر دوں گا کہ انہیں اطلاع کر دی جائے اور مزید احتیاط کے لیے میں ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دوں گا کہ وہ آپ کے ریلوے اسٹیشن پر پہرہ دیتا رہے۔"

یوسف نے کہا۔ "جس آدمی کو آپ بھیجنا چاہتے ہیں اُس کے ساتھ میں عبدالکریم کا نوکر بھیج دیتا ہوں۔ وہ بہت قابلِ اعتماد ہے اور وہ یہ سُن کر بہت خوش ہوگا کہ مجھے انسپکٹر صاحب نے کسی ڈیوٹی کے قابل سمجھا ہے۔"

"یہ تو اور زیادہ اچھی بات ہوگی۔"

بیگم قدسیہ کے جنازے میں شریک ہونے والے لوگ گیارہ بجے کے قریب قبرستان سے واپس آ چکے تھے۔ یوسف قبر کے قریب کھڑا تھا۔ جنازہ گھر سے نکلتے وقت اُس نے جنوب مغرب کی طرف جو بادل دیکھے تھے وُہ اب پورے آسمان پر چھا رہے تھے۔ جنوب سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ پھر بادل گرجا اور بارش ہونے لگی۔ یوسف وہاں سے آہستہ آہستہ چل دیا۔ وہ گھر جا رہا تھا لیکن اُسے پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ تیز بارش میں اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد اُس کے عین سامنے آکر ایک کار نے ہارن دیا۔ اُس نے چونک کر دیکھا تو عبدالعزیز کار چلا رہا تھا اور ڈرائیور پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ عبدالعزیز نے کچھ کہے بغیر دروازہ کھول دیا اور یوسف اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کار سے اُتر کر وہ مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو عبدالعزیز نے کہا۔ "بیٹا تمہیں اتنی دیر بارش میں پیدل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ہیضے کے ٹیکے کے بعد تو ویسے بھی بخار ہو جاتا ہے تم جلدی سے کپڑے پہن لو اور نوکر سے کہو کہ میرا اور تمہارا کھانا بیٹھک میں لے آئے۔"

یوسف کپڑے بدل کر آیا اور کھانے کی میز پر عبدالعزیز کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "چچا جی! میری ماموں زاد کے بچے کی طبیعت کافی خراب تھی لیکن چند بار پیاز کا رس پلانے سے کافی فرق پڑا ہے۔"

نوکر نے کھانا سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "میاں صاحب کھانا آپ بہت زیادہ لے آئے ہیں۔ ہم نے پڑوسیوں میں کافی بانٹا ہے اِس کے باوجود نصف سے زیادہ بچا ہوا ہے۔"

عبدالعزیز نے بے پروائی سے کہا۔ "بھئی جو بچ گیا ہے وہ بھی فوراً بانٹ دو۔"

یوسف نے پُوچھا۔ "چچا جی! آپ نے دھرم سالہ اطلاع بھیج دی ہے؟"

"ہاں بیٹا اور مجھے امید ہے کہ آج شام بھائی ناصرالدین پولیس اسٹیشن سے مجھے ٹیلی فون کریں گے۔ ایس۔ آئی کو میں نے بہت تاکید کی ہے شاید صفیہ اور بچے بھی بات کرنے کے لیے اُس کے ساتھ آ جائیں۔"

"چچا جی۔ میری طرف سے آپ اُن سب کو یہی کہیں کہ مجھے اُن کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

عبدالکریم کا نوکر فضل دین جھجکتا ہوا کمرے میں داخل ہُوا اور کچھ فاصلے پر رُک گیا۔

یوسف نے اُٹھ کر کہا "آؤ فضل دین۔"

فضل دین آگے بڑھ کر سسکیاں لیتا ہُوا اُس سے لپٹ گیا۔ "یوسف صاحب! مَیں یہیں تھا لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ ماں جی کی حالت اتنی خراب ہے وہ سب یہی کہتے تھے کہ صبح سب کو ٹیکہ لگوانا ضروری ہے۔"

یوسف نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بھئی کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وُہ اتنی جلدی دُنیا سے رُخصت ہو جائیں گی اور پھر ایسے حالات میں ٹیکہ لگوانا تو بہت ضروری تھا۔ انھوں نے اچھا کیا تمہیں گلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

"جی ایسی زندگی کا کیا فائدہ کہ ماں جی کے جنازے میں بھی شریک نہ ہو سکا۔"

"بیٹھ جاؤ فضل دین کھانا کھاؤ۔ زندگی کا یہ فائدہ ہے کہ تم مرنے والوں کے لیے دعائیں کر سکتے ہو۔"

عبدالعزیز نے کہا۔ "بھئی کھاؤ۔ تم خاموش کیوں بیٹھ گئے۔"

"جی مجھے بھوک نہیں۔"

یوسف نے کہا۔ "فضل دین بھوک ہم میں سے کسی کو بھی نہیں تم اگر اپنی بھوک کے لیے نہیں تو ہماری خوشی کے لیے تھوڑا سا کھا لو۔"

یوسف نے ایک پلیٹ میں سالن اور چاول ڈال کر اُس کے سامنے کر دیا، لیکن اُس نے کھانا شروع کرنے کی بجائے کہا "جی انہوں نے مجھے یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ رات کا کھانا اُن کے گھر سے آئے گا۔ وُہ خود اِس لیے نہیں آسکے کہ ٹیکے کی وجہ سے انہیں بخار ہو گیا تھا۔"

یوسف نے کہا "بھئی فضل دین تم جلدی اُن کو واپس جاکر کہو کہ کھانا تو گھر میں اتنا وافر پڑا ہے کہ آج ضرورت نہیں پڑے گی۔ اِس لیے کل دیکھا جائے گا۔ یہ بھی اچھا ہُوا کہ انہوں نے ٹیکے لگوا لیے ورنہ بخار کی شدت یہ ظاہر کرتی ہے کہ انہیں بیماری کا خطرہ تھا۔"

فضل دین نے کہا۔ "یوسف صاحب اگر آپ اجازت دیں تو میاں صاحب سے کل کے کھانے کا پوچھ لوں۔"

"ہاں وہ اندر کمرے میں لیٹے ہوتے ہیں۔ زیادہ باتیں نہ کرنا اُن کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

باقی دن تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ گلی کے پاس پڑوسی نے اُن کی سہولت کے لیے اپنے کشادہ مکان کی نچلی منزل خالی کروا دی تھی اور مہمانوں کو بٹھانے کے لیے آس پاس سے کرسیاں بھی جمع کرکے وہاں رکھوا دی تھیں۔ عبدالعزیز نے اُٹھ کر کہا۔ "یوسف تم اُوپر جاکر سو جاؤ، تمہارے لیے چند گھنٹے آرام کرنا بہت ضروری ہے۔ میں تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے موجود رہوں گا۔ خواتین کا مسئلہ آپ کی پڑوسن ریشم بی بی اور بلقیس سنبھال لیں گی۔"

"چچا جان آپ کو بھی تو آرام کی ضرورت ہے۔ میری مدد کے لیے حسین علی موجود ہو گا۔"

حسین علی نے کہا۔ "جناب مہمانوں کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اِس محلّے کے

لوگ ایک برادری کی طرح رہتے ہیں۔ یوسف صاحب اگر شور میں آپ کو نیند نہ آئے تو آپ میرے گھر جاکر لیٹ جائیں۔"

یوسف نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "نہیں جی میرا خیال ہے کہ مجھے بستر پر لیٹتے ہی نیند آ جائے گی۔"

یوسف اُوپر جاکر ایک چارپائی پر گر پڑا اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو باہر آفتاب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اُس نے جلدی سے وضو کیا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ نماز کے بعد عبدالعزیز اُس کے ساتھ مسجد سے باہر نکلا اور اُس نے کہا "بیٹا یہ تمہاری زندگی کا ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ لیکن جب میں تمہیں نماز پڑھتا دیکھتا ہوں تو مجھے یہ اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ تم صبر اور حوصلہ عطا کرنے والے کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلانا جانتے ہو۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا تھا کہ دعا مانگتے وقت تمہارے چہرے پر عزم و یقین کی روشنی آجاتی ہے۔"

یوسف نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "اِس دُنیا میں خدا کے عاجز بندوں کا سرمایہ یہی تو ہے چچا جان۔"

"اچھا تم اپنی چچی کو اندر سے بھیج دو اُس کے پاس جب بھی وقت ہوا کرے گا وہ یہاں آجایا کرے گی۔"

"بہت اچھا چچا جان جب کانگڑہ میں آپ کی ٹیلی فون پر بات ہو تو انہیں کہیے کہ ہم سب ٹھیک ہیں۔"

"ہاں بیٹا۔ وہاں تو ابھی تھوڑی دیر بعد شاید بات ہو جائے ورنہ صبح ہو جائے گی۔ ویسے ایک دو دن تک ہمارے ہاں بھی ٹیلی فون لگ جائے گا۔"

○

رات کے وقت یوسف اپنے باپ کے قریب چوبارے کی چھت پر

لیٹا ہوا تھا۔

"اباجی! آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہے نا؟" اُس نے کہا۔

"ہاں بیٹا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اب تو بخار وغیرہ معلوم نہیں ہوتا۔"

"اباجی! وہ ٹیکے کا اثر تھا۔ صبح تک آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ دو چار روز تک آپ سب کو ٹائیفائڈ کے ٹیکے بھی لگوا دیئے جائیں۔"

باپ نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔" اچھا بیٹا۔ اب سو جاؤ۔"

یوسف دیر تک آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ تارے اُسی طرح چمک رہے تھے۔ کہکشاں میں اَن گنت جھرمٹ اُسی طرح نظر آتے تھے جنہیں وہ اپنی ماں کے پاس لیٹ کر دیکھا کرتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کتنی ماؤں نے کتنے بچوں کو ان تاروں کی چھاؤں میں لوریاں دی ہوں گی۔ کتنے بچوں نے ماں کی گود سے اچھل کر چاند اور تاروں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہوگی۔ موت ہماری زندگی کی کتنی اٹل حقیقت ہے اور ہم ہیں کہ اس حقیقت کو آخر وقت تک جھٹلاتے رہتے ہیں۔ یا اللہ مجھے اپنی قدرت کی حقیقتوں کو سمجھنے کا شعور اور انہیں تسلیم کرنے کی عقل عطا کر۔ یا اللہ مجھے سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کے سیدھے راستے پر چلا۔ یا اللہ مجھے اپنا فرماں بردار بندہ بننے کی توفیق عطا فرما۔ یا اللہ وہ نیک دعائیں قبول فرما، جو میری ماں ہمیشہ میرے لیے کیا کرتی تھی۔ یا اللہ میرا دامن اتنی نیکیوں سے بھر دے کہ قیامت کے دن امی جان مجھے دیکھیں تو انہیں تسکین محسوس ہو۔ وہ دُعا کرتے کرتے سو گیا اور پھر وہ خواب کی حالت میں اپنی ماں کی اُنگلی تھامے سرسبز کھیتوں میں دَوڑ رہا تھا۔

○

عبدالعزیز مقامی تھانے دار کی وساطت سے یوسف کے گاؤں قدسیہ کی وفات کی اطلاع بھجوا چکا تھا۔ اس لیے دوسرے روز صبح ہوتے ہی اس کے چچا، بچیاں اور دوسرے

رشتے دار پہنچنے شروع ہو گئے تھے۔ نو بجے کے قریب عبدالکریم کے نوکر ریڑھے پر کھانے کی دیگیں لے کر پہنچ گئے اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی بال بچوں سمیت پہنچ گیا۔ عبدالکریم نے فاتحہ خوانی کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔" میاں جی! مجھ سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر کے مشورے سے میں نے گھر جانے سے پہلے ہیضے کا ٹیکہ لگوا لیا تھا۔ مجھے اتنا شدید بخار ہوا کہ میں اگلے روز شام تک بستر سے نہ اٹھ سکا اور یہ پچھتاوا مجھے عمر بھر رہے گا کہ میں جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔"

میاں عبدالرحیم نے بے پروائی سے کہا۔" بھائی صاحب جب کسی بیماری کا خطرہ ہو تو ہر آدمی کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ اُسے پھیلنے سے روکا جائے۔"

"امینہ کا بھی بُرا حال تھا۔ اُس کی ماں صبح آنے کے لیے تیار ہوئی تھی لیکن اچانک ٹیکہ لگانے والا ہمارے گھر پہنچ گیا اور اُس نے رشیدہ کے علاوہ میرے سب نوکروں اور پڑوسیوں کو بھی ٹیکے لگا دیئے۔

میاں جی آپ کے گھر سے کچھ فاصلے پر ہی مجھے یہ محلہ سنسان محسوس ہونے لگا تھا۔"

"ہاں بھئی مجھے بھی اس گھر میں اب وحشت محسوس ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ چھٹی لے کر گاؤں چلا جاؤں۔"

"میاں صاحب! اگر آپ کہیں تو ہم بھی گاؤں جائیں گے۔"

باب - ۲۶

کھانا کھانے کے بعد چند مہمانوں کے سوا باقی رخصت ہو چکے تھے۔ امینہ اور اُس کی ماں یوسف کی چچی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ امینہ کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت رو چکی ہے۔ چراغ بی بی بھی حُزن و ملال کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ دوسرے کمرے میں عبدالکریم، عبدالرحیم سے کہہ رہا تھا۔ "میاں جی! اب ہمیں اجازت دیجئے آپ کے ہاں مہمان بہت آئیں گے اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بھی آپ کو تکلیف ہوگی۔ اِس لیے ہم چراغ بی بی کو یہیں چھوڑ جائیں گے۔"

"لیکن میں تو اب گاؤں جانے کی سوچ رہا تھا۔"

"میاں صاحب چراغ بی بی کی وہاں بھی آپ کو ضرورت ہوگی۔ جو کام ایک ماں کرتی ہے وہ سنبھالنا آسان نہیں اور میری تو یہ کوشش ہوگی کہ امینہ اور اُس کی ماں بھی زیادہ وقت آپ کے ہاں گذارہ کریں یا آپ کے بال بچوں کو اپنے گھر لے جایا کریں۔ گاؤں جا کر ان کی کوشش ہی یہی ہوگی کہ وہ زیادہ وقت آپ کے ہاں گذارا کریں۔"

"اچھا آپ کی بڑی بڑی مہربانی۔ لیکن یہاں کام بہت زیادہ ہوگا۔ چراغ بی بی تنگ تو نہیں آجائے گی۔"

"بھائی جی! میری بیوی کہا کرتی ہے کہ چراغ بی بی لوہے کی بنی ہوئی ہے۔

اُس کے سامنے جتنا زیادہ کام ہو اُتنا زیادہ وُہ خوش رہتی ہے۔"

یوسف نے کہا۔ "ابا جی! چچی جان کے ہوتے ہوئے ہمیں چراغ بی بی کو تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ کل اسے بخار تھا اور شاید اب بھی اس کی طبیعت اچھی نہیں۔"

عبدالکریم نے بلند آواز میں کہا۔ "امینہ! امینہ چراغ بی بی کو اِدھر بھیج دو۔"

چراغ بی بی جھجکتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی۔

"کیوں چراغ بی بی تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

"جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"چند دن میاں عبدالرحیم صاحب کے گھر کا انتظام سنبھالنے میں تمہیں تکلیف تو نہیں ہوگی؟"

"کیسی تکلیف جی۔"

"تم یہ تو نہیں سمجھو گی کہ تم سے نوکروں جیسے کام لیے جا رہے ہیں۔"

"جناب میں نے ان کا گاؤں بھی دیکھا ہے اور ان کا گھر بھی دیکھا ہے اور یہ وُہ لوگ ہیں جن کے کمروں میں جھاڑو دینے پر بھی میں فخر کروں گی۔"

عبدالکریم نے میاں عبدالرحیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ہم نے اِسے یہاں رہنے اور کام کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ اِس کی اپنی خواہش تھی۔ اچھا ہم چلتے ہیں۔ دیکھو چراغ بی بی میاں صاحب تمہیں یہ نہیں بتائیں گے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ تمہیں اپنی عقل سے کام لینا ہوگا۔"

جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو امینہ نے پہلی بار ذرا جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا یوسف صاحب! میں بڑی دیر سے کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن میرے پاس الفاظ نہیں ہیں صرف آنسو ہیں اور میں اِس بات سے بھی ڈرتی ہوں کہ آپ رونے والوں کو

پسند نہیں کرتے۔"

یوسف نے جواب دیا: "امینہ مَیں ان لوگوں کو بہت قابلِ قدر سمجھتا ہوں جو مشکل یا آزمائش کے وقت صرف اللہ کی بارگاہ میں سر جھکا کر آنسو بہاتے ہیں۔ مَیں ہر اس انسان کو پسند کرتا ہوں جو دوسروں کے لیے نیک جذبات رکھتا ہے۔ مَیں آپ کا بہت شکرگزار ہوں۔"

—O—

امینہ آنسو پونچھتی ہوئی اپنے والدین کے ساتھ موٹر میں سوار ہو گئی۔ تھوڑی دُور جا کر اُس نے کہا۔ "اباجی میں حیران ہوں کہ آپ کو ایک نئی مصیبت ان کے گلے میں ڈالنے کا کیسے خیال آیا؟"

"بیٹی کون سی مصیبت؟" عبدالکریم نے حیران ہو کر پوچھا۔ "اباجی! آپ چراغ بی بی کو مصیبت نہیں سمجھتے؟"

عبدالکریم بولا! "بیٹی تم بلاوجہ اس غریب سے نفرت کرتی ہو۔ ان دنوں وہ غریب بہت پریشان ہے جب سے اس کا خاوند فوج میں بھرتی ہو کر گیا ہے اُس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ مَیں نے سوچا تھا کہ اس بیچاری کا دل بہل جائے گا۔"

امینہ نے ذرا بلند آواز میں کہا۔ "اباجی وہ بیچاری نہیں ہے۔ اگر اس کا خاوند بے وقوف ہے اور اس نے جان بوجھ کر کوئی اطلاع نہیں بھیجی یا لاپتہ ہو گیا ہے تو اس کی سزا یوسف صاحب کو نہیں ملنی چاہیے۔"

عبدالکریم نے کہا۔ "بیٹی تم بلاوجہ پریشان ہو رہی ہو۔ میں نے یوسف کے سامنے بات کی تھی اور وہ ناراض نہیں تھا۔"

"اباجی اُس نے کہا تو تھا کہ چراغ بی بی کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں اور اگر وُہ پوری طرح ناراض نہیں تھا تو ہو جائے گا۔ بہت جلد ہو جائے گا۔"

"بیٹی اگر وہ ہو جائے تو وہ واپس آجائے گی تم کیوں فکر کرتی ہو۔ میں اُسے کہہ دوں گا کہ تم اگر کسی وقت یوسف کو غصے میں آتا دیکھو تو فوراً واپس آجاؤ۔"

"اباجی وہ بیوقوف کبھی یہ نہیں سمجھے گی کہ یوسف صاحب کو کسی بات پر غصہ آرہا ہے یا نہیں۔ آپ کو اُسے واپس بلانے کی کوئی اور ترکیب سوچنی پڑے گی۔"

رشیدہ بولی "میاں جی! بیٹی امینہ ٹھیک کہتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یوسف ایک بہادر آدمی ہے اور ایک بہادر آدمی کو ایک بے بس عورت پر غصہ نہیں آئے گا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے یوسف ہم سب سے نفرت کرنے لگے۔"

عبدالکریم بولا "لیکن تم تو ہمیشہ اُس کی تعریف کیا کرتی ہو۔"

"جی میں تو اس کی دلجوئی کے لیے تعریف کیا کرتی تھی۔"

امینہ بولی! "اباجی یہ غلطی مجھ سے کبھی نہیں ہوئی مَیں اُسے ایک مصیبت سمجھتی ہوں لیکن اس بات پر خوش نہیں ہوں کہ آپ نے اُسے دوسروں کے گلے میں ڈال دیا ہے۔"

"کیسی مصیبت بیٹی؟ میں اس کے باپ کو کہوں گا کہ وہ کسی دن جا کر اس کو لے آئے۔"

"اباجی کسی دن کیوں، اس کے باپ کو ابھی بلا کر کیوں نہیں کہتے کہ وہ اسے یوسف کے گاؤں جانے سے روک دے۔"

"بیٹی اگر میں نے اب کچھ کہا تو بڑی بدمزگی ہو گی۔ ہمیں کچھ دن صبر کرنا پڑے گا۔"

—O—

منظور احمد چھٹیوں میں سرگودھا کے قریب اپنے گاؤں گیا ہوا تھا۔ یوسف نے ماں کے کفن دفن سے فارغ ہو کر سرگودھا کے ایک ہم جماعت کو تار دیا تھا کہ وہ منظور کو اس کے گاؤں میں اطلاع بھیج دے۔ چنانچہ منظور اگلی صبح لاہور پہنچ چکا تھا اور اس نے خط و کتابت کا کام سنبھال لیا تھا۔ چار دن بعد وہ گاؤں جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ سندھ سے یوسف کو احمد خان کا تار آ گیا کہ وہ کل صبح لاہور پہنچیں گے۔ چنانچہ یہ پروگرام دو دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ اگلی صبح گاڑی پہنچی تو احمد خان کے استقبال کے لیے یوسف اور منظور کھڑے تھے۔ احمد خان نے گاڑی سے اُترتے ہی یوسف کو پیار سے گلے لگایا اور کہا بھائی میں نے بڑی دیر سے تمہارے گاؤں کا پروگرام بنایا تھا۔

پچھلے سال میں اپنے بیٹے کو ڈیرہ دون پبلک سکول داخل کروانے جا رہا تھا اور میں نے تمہیں کالج اور گاؤں دونوں جگہ خط لکھے تھے کہ اگر تم لاہور سے میرے ساتھ سفر میں شامل ہو جاؤ تو ہم دونوں جان محمد کو داخل کروانے کے بعد مسوری کی سیر کریں گے لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ پھر جب میں واپس گھر پہنچا تو گاؤں سے تمہارے چچا کا خط ملا کہ یوسف کے والد کی تبدیلی لاہور ہو گئی ہے اور وہ سب لاہور چلے گئے ہیں۔ میں کسی دن اچانک تمہیں یہاں تلاش کرنے کا پروگرام بنایا کرتا تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ ہماری ملاقات ان حالات میں ہو گی۔ اللہ تمہیں صبر و ہمت دے۔ اب میں پہلے تمہارے گھر جا کر فاتحہ پڑھوں گا۔ پھر ماں جی کی قبر پر جاؤں گا۔ اس کے بعد تمہیں اگر کوئی مصروفیت نہ ہوئی تو ہم نیڈوز ہوٹل آ جائیں گے اور شام تک باتیں کریں گے۔ رات کی گاڑی میں میں واپس چلا جاؤں گا اور یہ وعدہ لے کر جاؤں گا کہ آئندہ جب تمہیں چھٹیاں ملیں گی تم میرے پاس آیا کرو گے۔"

"تمہارے ابا جی کیسے ہیں؟"

"جی وہ بالکل ٹھیک ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

آپ کو اپنے پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑے گی۔ آپ کا سامان ہوٹل میں رکھوا کر ہم آپ کو گھر لے جائیں گے۔ وہاں فاتحہ خوانی کے بعد آپ کو قبرستان بھی لے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کا کھانا ہمارے گھر ہو گا۔"

"احمد خان نے جواب دیا بھائی مجھے منظور ہے۔"

اتوار کے دن عبدالعزیز اور بلقیس سے مشورہ کرنے کے بعد میاں عبدالرحیم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم کل یہاں سے بس پر روانہ ہو جائیں گے۔ عبدالعزیز اور بلقیس مصر تھے کہ آپ ہماری کار لے جائیں لیکن یوسف نے کہا "چچا جان آپ جانتے ہیں کہ آپ کی کار ہمیں شہر میں کسی جگہ چھوڑنی پڑے گی اور اس کی حفاظت ایک مسئلہ بن جائے گی۔ پکی سڑک پر سے اُتر کر ہم تانگوں پر جائیں تو بھی ہمیں کچھ راستہ پیدل چلنا پڑے گا۔ جب آپ ہمارے گاؤں آئیں تو میں آپ کے لیے گھر تک راستہ درست کرا دوں گا۔"

عبدالعزیز نے رخصت کرتے ہوئے کہا "اچھا بیٹا انشاء اللہ کل ہم تمہیں بسوں کے اڈے پر رخصت کریں گے۔"

یوسف نے کہا "چچا جان آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں۔"

"بیٹا اگر تکلیف ہوتی تو ہم کبھی نہ آتے۔"

"انشاء اللہ ہم عین وقت پر پہنچ جائیں گے"

اگر مجھے کوئی کام پڑ گیا تو بلقیس ضرور آئے گی۔

یوسف نے علی بخش کو تاکید کی کہ تم ہماری غیر حاضری میں ہماری ڈاک منظور احمد کے سپرد کر دیا کرنا۔ ان کے پڑوسی حسین علی اور ریشم بی بی نے یہ ذمہ لیا تھا کہ اگر کوئی مہمان آپ کی غیر حاضری کے دوران آیا تو اُس کی خاطر تواضع کی جائے گی اور یہ سمجھا دیا جائے گا کہ آپ

کا گاؤں جانا ایک مجبوری تھی۔

اگلے دن وہ آٹھ بجے کے قریب بس پر بیٹھے ہوئے تھے اور ڈرائیور ہارن دے رہا تھا۔ اچانک بلقیس کی کار نمودار ہوئی اور عین بس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر بس ڈرائیور سے کچھ کہا اور پھر یوسف سے مخاطب ہو کر کہا! یوسف صاحب انسپکٹر صاحب نہیں آسکے انھیں کوئی کام تھا لیکن بیگم صاحبہ آئی ہیں۔

آپ ان سے بات کریں یوسف بس سے اترا اور آگے بڑھ کر بلقیس کو سلام کرنے کے بعد بولا کہ چچی جان خدا کا شکر ہے کہ آپ بخیریت ہیں۔ میں بہت پریشان تھا چچا جان بالکل ٹھیک ہیں نا! بیٹا وہ ٹھیک ہیں کوئی ضروری کام انھیں پڑ گیا تھا میں اسی لیے بھاگی آئی ہوں کہ ٹیلی فون پر رات کو پیغام آگیا تھا اور وہ یہ ہے کہ وہ لوگ منگل کے روز دھرم سالہ سے روانہ ہوں گے اور اسی روز گاڑی تمہارے گاؤں کے اسٹیشن سے گزرے گی۔ تمہیں صبح مجھے یہ بتانے کا اچانک اِس لیے خیال آیا کہ شاید ایک مختصر سی ملاقات میں تم ان سے دعائیں لینا غنیمت سمجھو۔ یوسف نے آبدیدہ ہو کر کہا شکریہ چچی جان مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے۔

بلقیس نے کہا بیٹا افسوس اس بات کا ہے کہ ان کے پاس ٹیلی فون نہیں ہے ورنہ میں صفیہ، فہمیدہ اور نسرین سے بہت باتیں کرتی۔

بہت اچھا چچی جان میں منگل اور اس کے بعد ہر روز اُدھر سے آنے والی گاڑی دیکھا کروں گا۔ بلقیس مسکرائی۔ "بیٹا اگر وہ منگل کو نہ آئے تو جمعرات کو آجائیں گے۔ لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تم اسٹیشن پر ان کا انتظار کر رہے ہو"۔



چوتھے روز سہ پہر کے وقت یوسف ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ کارخانے کا گھڑیال جو دور دور سے دکھائی دیتا تھا۔ سوا تین بجا رہا تھا۔ ساڑھے

تین کے قریب شمال کی طرف سگنل ڈاؤن ہوا تو چند منٹ بعد دور سے گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔ پھر انجن دھواں اڑاتا ہوا بل کھاتی ہوئی ریلوے لائن کے کناروں پر گھنے درختوں کی اوٹ سے نمودار ہوا اور تھوڑی دیر میں گاڑی اسٹیشن پر آرکی۔ یوسف نے اس اسٹیشن پر سینکڑوں بار گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ لیکن آج وہ پہلی بار اپنے دل میں ایک دھڑکن سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ انٹر کلاس کے ڈبے کی طرف بڑھا۔ نسرین جو کھڑکی کے باہر جھانک رہی تھی چلانے لگی۔ بھائی جان! بھائی جان! ہم ادھر ہیں۔ امی جان، آپا فہمیدہ" نسرین فقرہ پورا کرنے کی بجائے سواریوں کو راستے سے ہٹاتی ہوئی گاڑی سے اتری اور یوسف کا ہاتھ پکڑ کر چلّانے لگی"!

"امی جان، فہمیدہ، نانی جان، ابا جی باہر دیکھئے یہ بھائی جان یوسف ہیں۔ میں نے آپ کو دور سے پہچان لیا تھا۔ بھائی جان۔ وہ سب اندر ہیں۔ اندر دیکھئے امی اور فہمیدہ آپ کو دیکھ رہی ہیں اور ابا جان اور نانی جان بھی اندر ہیں۔ بھائی جان آپ کو معلوم تھا کہ ہم اس گاڑی پر آرہے ہیں۔ شاید آپ کو خواب آیا یا میری دعا قبول ہو گئی ہے" یوسف کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہو رہے تھے۔

صفیہ نے نسرین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا بیٹا یوسف یہ اتفاق ہے یا کہیں سے تمہیں اطلاع مل گئی تھی۔ جب ہم لاہور سے روانہ ہو رہے تھے تو چچی بلقیس اچانک پہنچ گئی تھیں اور انھوں نے آپ کا پروگرام بتا دیا تھا۔

نسرین بولی "دیکھا آپا جان چچی بلقیس کتنی اچھی ہیں"۔

"صفیہ نے پوچھا بیٹا گاڑی یہاں کتنی دیر ٹھہرے گی"۔

"خالہ جان گاڑی دس منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرے گی لیکن میں ماں جی کی دعائیں لینے کے لیے میرے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا"۔

صفیہ نے کہا "بیٹا یہ تو ہم سب کے دل کی بات کہہ رہے ہو۔ یہاں سے گزرتے

ہوئے میرا دل بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ ہمارا ارادہ صبح کی گاڑی پر آنے کا تھا لیکن ہمیں گھر سے نکلنے دیر ہو گئی۔ مجھے گاڑی نہ ملنے کا افسوس تھا لیکن اب اللہ کا شکر کرتی ہوں کہ تم مل گئے۔

نسرین بولی "امی جان آپ بلاوجہ ناراض ہو رہی تھیں کہ میں نے اٹھنے میں دیر کر دی۔ اگر میں وقت پر تیار ہو جاتی تو بھائی جان کیسے ملتے؟"

یوسف مسکرایا "شہزادی صاحبہ میں نے صبح کی گاڑی بھی دیکھی تھی اور اگر آپ کل آتیں تو بھی میں دونوں گاڑیاں دیکھتا۔"

صفیہ نے پوچھا۔ "بیٹا کل کیوں دیکھتے دونوں گاڑیاں؟"

"خالہ جان میں سوچ سکتا تھا کہ کوئی وجہ ہو گئی ہو گی اور آپ رُک گئے ہوں گے۔"

فہمیدہ نے شرماتے ہوئے پوچھا "اور اگر ہم کل بھی نہ آتے تو"

"جی اس صورت میں میرے لیے غیر معمولی بات ہو جاتی اور میں یہاں تیسرے دن گاڑیاں دیکھنے کی بجائے سیدھا کانگڑہ پہنچتا" اور وہاں سے پولیس اسٹیشن جا کر آپ کا پتہ کرتا۔"

"بھائی جان آپ واقعی کانگڑہ پہنچتے"۔ نسرین نے پوچھا۔

"میں ضرور پہنچتا۔"

نسرین ماں کی طرف متوجہ ہوئی۔ "امی جان کیا ہم دو دن کانگڑہ میں نہیں رُک سکتے تھے۔"

ایک وجیہہ آدمی جس کی عمر چالیس برس سے اُوپر معلوم ہوتی تھی۔ گاڑی سے اُترا اور اس نے بے تکلفی سے یوسف کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یوسف صاحب، میرا نام نصیر الدین ہے۔"

فہمیدہ بولی "یہ میرے ابا جی ہیں۔"

نصیر الدین کا رنگ سرخ و سپید تھا اس کے سر اور چھوٹی چھوٹی داڑھی کے بالوں کی رنگت بھوری تھی اور بڑی بڑی چمکدار آنکھوں میں جوانی کی سی دل کشی تھی۔ یوسف اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے فہمیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"اگر آپ نہ بتاتیں تو بھی میں غلطی نہ کرتا کہ یہ آپ کے ابا جان ہیں۔"

نصیر الدین بولا "بھئی یوسف صاحب اب تو میں آپ کی تصویر بھی دیکھ چکا لیکن اس سے پہلے نسرین تمہارے متعلق اتنی باتیں کر چکی تھی کہ کسی جگہ تمہارے ملنے کی توقع ہوتی تو شاید میں بھی تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیتا۔"

فہمیدہ نے کہا "امی جان گاڑی پر چلیں نانی جان اس طرف آ کر کھڑکی سے دیکھ رہی ہیں سخت غصے کے عالم میں ہیں۔"

یوسف جلدی سے گاڑی پر چڑھا اور اس نے بیگم فریدہ احمد کے قریب جا کر "ہاں جی، السلام علیکم کہتے ہوئے سر جھکا دیا۔ فریدہ نے جلدی سے اُٹھ کر دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے اور بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا میں دوسری طرف بیٹھی تمہارے گاؤں کی سمت دیکھ رہی تھی اور یہ معلوم نہیں تھا کہ تم پلیٹ فارم پر کھڑے ان سے باتیں کر رہے ہو۔"

نسرین نے آگے بڑھ کر کہا "نانی جان! بھائی جان نے سب سے پہلے آپ کو سلام کرنا تھا، اب میں آپ کو ایک اچھی خبر سناتی ہوں کہ بھائی آپ سے باتیں کرنے اور آپ کی دعائیں لینے کے لیے کچھ دیر اور ہمارے ساتھ سفر کریں گے اور کسی اگلے اسٹیشن سے واپس آ جائیں گے۔"

صفیہ نے کہا "امی جان اگلے اسٹیشن کا مطلب یہ نہیں کہ یہ یہاں سے دوسرے یا تیسرے اسٹیشن پر اتر جائیں گے بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ کم از کم امرتسر تک تو ہمارا ساتھ دیں گے اور وہاں بھی ہمیں باتیں کرنے کا کافی وقت مل جائے گا۔"

فریدہ احمد نے کہا "بیٹی یہ فیصلہ مَیں کروں گی کہ یوسف کہاں اُترے گا اگر یہ امرتسر تک ہمارا ساتھ دے سکتا ہے تو جالندھر تک ہمارا ساتھ کیوں نہیں دے سکتا؟ بیٹا یوسف تم مجھے یہ بتاؤ کہ اگر تھوڑی باتوں سے میری تسلی نہ ہو اور تمہیں ایک دن گھر سے غیر حاضر رہنا پڑے تو وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی؟"

"نہیں ماں جی مَیں گھر میں یہ کہہ آیا تھا کہ مَیں ایک بزرگ سے دعا کروانے جا رہا ہوں اور ممکن ہے کہ وہ مجھے فوراً واپس آنے کی اجازت نہ دیں۔ ماں جی جب آپ ہمارے گاؤں کی طرف دیکھ رہی تھیں تو آپ نے چند قدم دُور شیشم کے پاس ایک آدمی کو گھوڑے کی باگ تھامے نہیں دیکھا تھا؟"

"دیکھا تو تھا مَیں نے۔"

"نسرین، فہمیدہ خالہ جان اب آپ سب دیکھ لیں وہ میرا خاص آدمی ہے جس کے متعلق آپ پڑھ چکی ہیں۔"

نسرین، فہمیدہ اور ان کی ماں دوسری طرف کی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگیں۔

نسرین نے پوچھا "بھائی جان وہ کون ہے؟"

یوسف نے کہا "میرا خیال ہے کہ فہمیدہ نے اسے پہچان لیا ہو گا۔"

فہمیدہ نے مڑ کر دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد منہ پھیر کر بولی "اگر آپ کی تحریر میں اس آدمی کا ذکر ہے تو اسے بلّو ہونا چاہیے صرف اتنا فرق ہے کہ لباس سے یہ بھیل معلوم نہیں ہوتا۔"

یوسف نے کہا "اب ہر بات میں ہماری پسند اس کی پسند بنتی جا رہی ہے۔"

نسرین نے پوچھا "بھائی جان، اب جنگلی پتّے کھانے چھوڑ دیے ہیں اس نے؟"

"ہاں لیکن کچھوے اسے اب بھی بہت پسند ہیں۔"

بھیل کے ذکر سے نصیر الدین کو بھی کچھ دل چسپی پیدا ہوئی اور وہ دوسری طرف

جا کر دیکھنے لگا۔

فریدہ احمد نے اٹھتے ہوئے کہا "ارے مَیں بھی دیکھ لوں وُہ کیا بلا ہے؟"

"ماں جی آپ آرام سے بیٹھی رہیں اب گاڑی چلنے والی ہے۔" یہ کہتے ہوئے یوسف نے دوسری طرف پہنچ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور پائیدان پر پاؤں رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ بلند کر کے اشارہ کیا۔ بلّو نے اپنے ہاتھ سے اس کے اشارے کا جواب دیا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اس کے پہیے حرکت میں آئے وُہ کچھ دیر اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتا رہا اور پھر اس نے گھوڑے کی باگ پھیر لی اور اسے سرپٹ چھوڑ دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ مکئی کے کھیتوں میں غائب ہو چکا تھا۔

بیگم فریدہ احمد نے آواز دی "بیٹا اب میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ اور جب تک میں تمام باتیں نہ پوچھ لوں تمہیں کسی طرف متوجہ ہونے کی اجازت نہیں۔"

نسرین نے کہا "نانی جان اگر اجازت ہو تو ہم سب آپ کے پاس آجائیں۔" تھوڑی دیر میں وہ سب آمنے سامنے دو سیٹوں پر بیٹھ گئے باقی ڈبہ خالی تھا۔

صفیہ نے کہا "امی جان، اگر اجازت ہو تو میں پہلے ایک ضروری بات پوچھ لوں؟"

"ہاں بیٹی پوچھ لو تمہیں اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بیٹا یوسف، مَیں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ گھر میں تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں تھی؟"

"خالہ جی! امی جان نے مجھے یہ معلوم نہیں ہونے دیا تھا کہ پریشانی کیا ہوتی ہے۔ ایسی تمام باتیں انہوں نے اپنے سر لے رکھی تھیں اور اب مجھے معمولی بات بھی پریشان کر دیتی ہے۔"

یوسف کی آنکھیں نم ناک ہو رہی تھیں اور ان سب کے چہروں پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

فہمیدہ نے مغموم آواز میں کہا "آج آپ نے دونوں گاڑیاں دیکھیں فرض کیجئے اگر ہم اس گاڑی پر بھی نہ آتے تو پھر آپ کیا سوچتے؟"

"پھر میں بار بار یہ دعائیں کرتا کہ آپ سب بخیریت ہوں کیونکہ امی جان کی وفات سے
میں نے یہ سبق لیا ہے کہ پریشانیاں جس قدر زیادہ ہوں اسی قدر زیادہ دعاؤں کی ضرورت
ہوتی ہے۔"

نسرین نے پوچھا "بھائی جان" بلو گھر جاکر کیا بتائے گا؟"

"وہ میرے چچا کو یہ بتائے گا کہ میں نے شہر میں گھومنے اور اپنے دوستوں سے
ملنے کے بعد اچانک کسی بزرگ کے پاس جانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے علاوہ جو
کہنے والی باتیں ہیں وہ میں بڑی چچی کو سمجھا آیا ہوں۔"

صفیہ نے کہا "بیٹا گھر میں اگر کوئی پریشانی تھی تو تم کھل کر بات کر سکتے ہو۔"

"کوئی خاص پریشانی نہیں تھی لیکن اب تک پوری طرح سمجھ نہیں سکا اور بعض
باتوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کل عبدالکریم والے بھی وہاں پہنچ گئے
تھے۔ وہ ٹھہرے تو اپنے گھر میں ہیں لیکن تیور یہ بتا رہے ہیں کہ ان کا زیادہ وقت ہمارے ہی
گھر میں گذرا کرے گا اور وہاں وہ مہمانداری کے فرائض بھی سنبھال لیں گے اور تو اور وہ
چراغ بی بی بھی ان کے ساتھ آئی ہے۔"

بیگم فریدہ احمد نے کہا "خدا اسے غارت کرے، وہ کیا لینے آئی ہے؟"

"ماں جی، اصل میں بات یہ ہے کہ ہمارے گھر میں سب عورتیں اس سے
ہمدردی کرتی ہیں۔ پہلے تو اس پر اس وجہ سے ترس آتا تھا کہ اس کا خاوند جو شادی سے
تھوڑی دیر بعد فوج میں بھرتی ہو کر کہیں چلا گیا تھا، لاپتہ ہو چکا ہے۔ اب اس افواہ کی
تصدیق ہو چکی ہے وہ جنگ میں کام آ چکا ہے اور ان حالات میں میں بھی اسے قابلِ رحم سمجھتا
ہوں لیکن جب ان میں سے کوئی میرے ساتھ بات کرے تو مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ امی جان کی وفات کے بعد بعض لوگوں کے متعلق میرے دل
میں اچانک سختی آگئی ہے۔ ماں جی، میرے لیے یہ بھی دعا کریں کہ میرے دل میں کوئی غلط قسم

کی سختی پیدا نہ ہو جائے۔"

بیگم فریدہ احمد نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹا، میں ہر سانس
کے ساتھ تمہارے لیے دعا کرتی ہوں اور مجھے یہ یقین ہے کہ جو بات بھی تمہارے دل
میں پیدا ہوگی وہ غلط نہیں ہوگی۔"

نصیر الدین نے کہا "یوسف صاحب، آپ اطمینان کے ساتھ ہمارے ساتھ
سفر کریں کہ جس جگہ ہم رہتے ہیں وہ آپ کا دوسرا گھر ہے۔" یہ عجیب بات ہے کہ جس دن
میں نے نسرین اور ماں جی سے کوئٹہ سے واپس آکر آپ کا ذکر سنا تھا تو میں نے محسوس کیا تھا
کہ جب میں آپ کو دیکھوں گا تو آپ اجنبی نظر نہیں آئیں گے۔"

نصیر الدین نے کہا "یہ عجیب بات ہے کہ بعض لوگوں کے ساتھ ہم زندگیاں گذار
دیتے ہیں اور مانوس نہیں ہوتے اور بعضوں کے ساتھ ایک مختصر سی ملاقات میں ہمیں
یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم انھیں برسوں سے جانتے ہیں۔"

"ارے بھائی مجھے بھی اپنے بیٹے سے بات کرنے دو گے یا نہیں"۔ فریدہ احمد
نے بیزار سی ہو کر کہا۔

"امی جان؟ بیٹا اس وقت تک آپ کی باتیں سنتا رہے گا جب تک آپ
تھک نہیں جائیں گی۔"

یوسف نے بٹالہ اسٹیشن پر اتر کر وضو کیا تو نسرین نے گاڑی سے اتر کر اسے جانماز
پیش کر دیا۔ یوسف ایک طرف ہٹ کر جانماز بچھا رہا تھا کہ نصیر الدین گاڑی سے اتر
کر وضو کرنے میں مصروف ہو گئے۔ یوسف نے نماز ختم کی تو وہ جانماز پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔
نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ کچھ دیر یوسف کے ساتھ پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا، گاڑی نے
سیٹی بجائی تو وہ گاڑی پر سوار ہو گئے۔

جالندھر تک سفر کا وقت ایک خواب کی طرح گذر گیا۔ جالندھر اسٹیشن سے

اُتر کر انہوں نے دو تانگے لیے۔ ایک پر خواتین سوار ہوگئیں اور دوسرے پر یوسف اور نصیرالدین بیٹھنے لگے تو نسرین صفیہ سے یہ کہہ کر اُتر گئی "امی جان مجھے بھائی جان سے ایک ضروری بات کہنی یاد آئی ہے" پھر وہ بھاگ کر دوسرے تانگے کے قریب پہنچی اور یوسف سے مخاطب ہو کر بولی "بھائی جان، آپ آگے بیٹھ جائیں تاکہ آپ یہاں سے ہمارے گھر تک کا سارا راستہ اچھی طرح دیکھ سکیں"۔

نصیرالدین نے کہا "میری بیٹی ٹھیک کہتی ہے"۔

یوسف آگے چلا گیا اور نسرین اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ تمام راستہ وہ شور مچاتی رہی۔ "بھائی جان، اب ہم فلاں موڑ پر ہیں...... یہ وہ جگہ ہے...... یہ سڑک ہمارے سکول کی طرف جاتی ہے، آگے سے ہم اپنے گھر کی طرف مڑیں گے"۔ لیکن یوسف کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اُس کی حالت ایک ایسے مسافر کی سی تھی جسے منزل پر پہنچ کر نیند نے آلیا ہو۔ مکان میں داخل ہوتے وقت بھی اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ دروازہ کس سمت کھلتا ہے۔ نوکروں کو مہمانوں کے آنے کی اطلاع تھی اور انھوں نے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ صفیہ نے مکان میں داخل ہوتے ہی نوکر سے پوچھا "دہرہ دون سے کوئی اطلاع آئی ہے؟"

"جی ہاں، مینیجر صاحب کا فون آیا تھا کہ —— حمیرا بی بی اور ذکیہ بی بی کل پہنچیں گے"

یوسف نے عشاء کی نماز ادا کی، اور کھانا کھاتے ہی بالائی منزل کے ایک کمرے میں جاکر سو گیا۔

ایک مدت کے بعد وہ خواب میں دلکش پہاڑ اور حسین وادیاں دیکھ رہا تھا، جب اس کی آنکھ کھلی تو روشندان سے دھوپ اندر آرہی تھی، اُس نے کروٹ بدلی تو اُسے نسرین دروازے سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دی: "نسرین" اُس نے آواز دی۔

"بھائی جان" اس نے شکایت کے لہجے میں کہا "آپ بہت سوئے ہیں۔ نانی جان نماز کے وقت آپ کو دیکھ گئی تھیں اور پھر انہوں نے سختی سے یہ حکم دے دیا تھا کہ کوئی آپ کو جگانے کے لیے اُوپر نہ جائے۔ ناشتہ کرنے سے پہلے اور ناشتہ ختم کرنے کے بعد وہ خود دو دفعہ اُوپر آئی تھیں اور پھر انہوں نے بڑی سختی سے امی جان کو یہ حکم دیا تھا کہ جب تک آپ خود نہ اُٹھیں آپ کو کوئی نہ جگائے۔ اِس کے بعد وہ سو گئی تھیں اور ہم باری باری آپ کو دیکھتے رہے۔ دو دفعہ امی جان، تین بار آپا فہمیدہ اور چوتھی مرتبہ میں واپس جا رہی تھی"۔

فہمیدہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی "السلام علیکم" کہا۔ یوسف نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا "میں نے آپ کو یقیناً پریشان کیا ہوگا لیکن مجھے مدت کے بعد نیند آئی ہے۔ میں کئی وادیاں، کئی پہاڑ، کئی دریا دیکھ چکا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طویل سفر میں امی جان میرے ساتھ تھیں"۔

فہمیدہ نے کہا "بھوک کا نیند کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ نسرین اپنے بھائی کو غسل خانہ دکھادو۔ میں امی جان کو یہ خوشخبری دیتی ہوں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں"۔

تھوڑی دیر بعد یوسف نیچے ایک کمرے میں صفیہ، نسرین اور فہمیدہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فہمیدہ نے ناشتہ لاکر ایک میز پر رکھ دیا۔

فریدہ احمد نے کہا "بیٹا.. جلدی سے ناشتہ کرلو"۔

یوسف میز کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نسرین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "نانی جان، آپ بھی بیٹھ جائیں نا بھائی جان کے ساتھ"۔

"چڑیل، مجھے دوبارہ ناشتہ کراؤ گی"۔

"نانی جان آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ مہمان کو تنہا نہیں بٹھاتے"۔

"بے وقوف میرا مہمان نہیں ہے، بیٹا ہے، اگر تم اسے مہمان سمجھتی ہو تو تھوڑی

دیر فہمیدہ کی طرح صبر کر لیا ہوتا۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ فاقہ کرے گی"۔

نانی جان میں نے آپا کو کہا ہے لیکن اُسے امی کے اشارے اور آپ کی اجازت کی ضرورت ہے"۔

"کیوں فہمیدہ... کسی نے تمہیں منع کیا تھا؟"

"نہیں نانی جان"۔

فہمیدہ جھجکتی ہوئی یوسف کے سامنے بیٹھ گئی اور پھر ناشتے کے دوران وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے تھے۔

یوسف نے صفیہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "خالہ جان، آج مجھ سے اپنے دادا جان اور امی جان کی حکم عدولی ہوئی ہے۔ میں نے کسی حالت میں بھی نماز قضا نہیں ہونے دی تھی، لیکن آج میں بہت سویا، آپ مجھے جگا دیتیں تو اچھا ہوتا"۔

"بیٹا... یہ نیند بلا وجہ نہیں تھی۔ ایسی حالت میں قضا بھی تو پڑھی جا سکتی ہے بیٹا اب تم کچھ دیر آرام کر لو۔

اتنی دیر میں نسرین کے ابّو دہرہ دون سے آنے والے بچّوں کو اسٹیشن سے لیکر پہنچ جائیں گے پھر کھانے کے دوران اور کھانے کے بعد بھی بہت سی باتیں کرنی پڑیں گی"

فریدہ احمد نے کہا "ہاں بیٹا، وہ تو پہروں تمہارے ساتھ باتیں کرنا چاہیں گے۔ وہ اسٹیشن پر تمہارے آنے کی اطلاع سن کر بے چین ہو جائیں گے"۔

صفیہ نے کہا "امّی جان، صبح جب نسرین کو یہ پتہ چلا کہ اس کے ابا جان شہر میں اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی سیدھے اسٹیشن پر چلے جائیں گے تو وہ بڑی پریشان تھی کہ اُسے پہلے کیوں نہیں بتایا اور وُہ ان کے ساتھ کیوں نہ جا سکی"۔

"بیٹی نسرین تو گھر آتے ہی پڑوسیوں کو اپنے بہادر بھائی کی خبر دینا چاہتی تھی۔ اگر میں اسے منع نہ کرتی تو آج ہمارے گھر میلہ لگا ہوتا"۔

"نانی جان، میلہ تو اب بھی لگے گا جو لوگ ہمیں جانتے ہیں وہ ہمارے بھائی کو دیکھے بغیر یہاں سے کیسے جانے دیں گے"۔

صفیہ نے کہا "بیٹی، تمہارے بھائی جان کو آرام کی ضرورت ہے"۔

"امی جان! میں نے کب انہیں بے آرام کیا ہے میں تو صرف نانی جان سے چند جھڑکیاں سننا چاہتی تھی۔ دیکھا نہیں آپ نے کہ آپا فہمیدہ بھی تو یہی کہتی ہیں کہ نانی جان کو جب غصّہ آتا ہے تو بڑی پیاری لگتی ہیں"۔

فہمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا "بے وقوف لڑکی، نانی جان ہنستی ہوئی زیادہ اچھی لگتی ہیں"۔

فریدہ نے کہا "تم دونوں بہت شریر ہو"۔

یوسف نے کہا "ماں جی، پیار نہیں آتا آپ کو ان کی شرارتوں پر"۔

"بہت پیار آتا ہے بیٹا، اسی لیے تو انھیں دیکھ کر اپنے گھر کی تمام ذمہ داریاں بھول جاتی ہوں"۔



دوپہر کے وقت یوسف افراد خانہ کے علاوہ نسرین کی چچی ذکیہ اور ان کی بیٹی حمیرا کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ ذکیہ کے خاوند میجر محمد بشیر فوج میں ڈاکٹر تھے اور کُنبے میں عمر کے لحاظ سے وہ تیسرے نمبر پر تھے، نصیر الدین سب سے بڑے تھے، اُن سے چھوٹے عبدالعزیز تھے اور سب سے چھوٹے ڈاکٹر کمال الدین تھے۔

میجر محمد بشیر کا بیٹا رفیق احمد تھا جس کی شکل و صورت بہت حد تک اپنی بہنوں سے ملتی تھی ذکیہ بیگم کافی صحت مند اور خوش شکل عورت تھیں لیکن رنگ قدرے سانولا تھا۔ حمیرا کے نقوش اپنی ماں کی طرح تیکھے تھے لیکن رنگ قدرے کھلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ عمر میں نسرین سے بڑی اور فہمیدہ سے چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں کسی کو ذکیہ اور اس کی بیٹی سے یوسف کا لمبا چوڑا

خوب صورت ہیں کہ یوسف آپ کی دعوت کو رد نہیں کرے گا۔ اور آپ نے اسے یہ
بھی تو نہیں بتایا کہ وہاں دہرہ دون میں اس کی ملاقات سجاد کے ساتھ بھی ہوگی، یوسف
بیٹا، سجاد حمیرا کا بھائی ہے اور ملٹری کالج میں پڑھتا ہے اور شکار کا اسے بھی کچھ شوق
ہے تم اسے بہت کچھ سکھا سکو گے۔"

ذکیہ نے کہا "باجی میں آپ کو بتا ہی نہیں سکتی کہ سجاد کو انھیں دیکھنے کا کتنا اشتیاق
ہے۔ رفیق کی باتیں سن کر وہ یہ محسوس کرتا تھا کہ یوسف صاحب کوئی طلسماتی انسان ہیں۔
بڑی خوشی ہوگی بیٹا یوسف تمہارے آنے سے، کیا اچھا ہو کہ تم بی اے کے امتحان سے فارغ
ہوتے ہی وہاں آجاؤ۔"

"چچی جان، مجھے اپنے پروگرام کا کوئی علم نہیں، اگر وقت ملا تو میں ضرور آؤں گا۔"

نسرین نے کہا "چچی جان، ہمیں آپ نے دعوت نہیں دی، کم از کم نانی جان
کو ہی دعوت دی ہوتی پھر میں تو ان کے ساتھ آجاتی نا۔"

"چڑیل، اپنے گھر آنے کے لیے بھی کوئی کسی کو دعوت دیا کرتا ہے، وہ تو میں باجی
صفیہ کو فون کروں گی اور آپ سب گاڑی پر سوار ہو جایئے پھر وہاں ہمیں پوری چھٹیاں
سیر کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوگا۔"

شام کے وقت یوسف سیر کے لیے جانے لگا تو نسرین نے حمیرا کو آواز دی "حمیرا
باجی میں بھائی جان کے ساتھ سیر کے لیے جا رہی ہوں تم بھی چلو گی نا، حمیرا جواب دیئے بغیر
اپنی چادر سنبھالتے ہوئے ان کے ساتھ ہو گئی۔

مکان سے باہر نکلتے ہی نسرین نے کہا "بھائی جان ہم اسٹیشن کی طرف جائیں گے
یہ اس لیے ضروری ہے کہ آپ راستہ اچھی طرح دیکھ لیں، رات کو تو تانگے پر آپ کو راستے
کا پتہ ہی نہیں چلا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے" یوسف نے کہا "لیکن اگر اسٹیشن کی طرف ہی جانا ہے تو تم نہیں

تعارف کروانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ نسرین ان کے متعلق جو باتیں سنایا کرتی تھی وہ
دور دور پہنچ چکی تھیں۔

نصیر الدین نے ریلوے اسٹیشن پر ہی انھیں یوسف کی والدہ کی وفات کی خبر سنا
دی تھی۔ اور گھر میں اس کی تعزیت کے بعد وہ جلد ہی بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

کھانے کے دوران حمیرا نے کہا "بھائی جان، آپ کو جنگلی جانوروں کے شکار کا شوق
ہے تو دہرہ دون ضرور آیئے۔ ابا جی کو بھی شکار کا بہت شوق ہے وہ اکثر اپنے دوست
ناصر علی صاحب کے ساتھ شکار پر جایا کرتے ہیں، وہ کوئی بڑے زمیندار ہیں۔ ان کی
ایک کوٹھی دہرہ دون میں ہے اور دوسری مسوری میں، پچھلے سال ہم نے گرمیوں کی چھٹیاں
مسوری میں گزاری تھیں اور انہوں نے وہاں اب بھی اسی کوٹھی کا ایک حصہ ہمیں
دے دیا تھا۔ اب ان کی طرف سے ہمیں اس سال کی دعوت ہے کہ ہم جب بھی
مسوری ٹھہرنا چاہیں تو ان کی کوٹھی کے ایک حصے پر قبضہ جما سکتے ہیں۔ ابا جان نے
ان کے ساتھ ایک شیر اور ایک چیتے کے علاوہ کئی جانور مارے ہیں۔"

رفیق احمد نے کہا، "ہاں بھائی جان میں نے ناصر علی کے گھر میں کئی بارہ سنگھوں
اور ہرنوں کی کھالیں دیکھی ہیں۔ اگر میں آپ کی طرح بندوق چلا سکتا تو ان کے ساتھ شکار
پر جاتا اور شیر مار کر اس کی کھال یہاں لاتا، ہاں بھائی جان اور میں نے وہاں بہت بڑے
اژدہے کی کھال بھی دیکھی ہے۔"

یوسف نے کہا "بھئی اگر موقع ملا تو وہاں ضرور جاؤں گا۔ مجھے بڑے جانوروں کے
شکار کا بے حد شوق ہے لیکن میں مردہ جانوروں کی کھالیں گھر میں لٹکانا پسند نہیں کرتا۔"

ذکیہ نے کہا "باجی صفیہ مجھے یوسف کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے اور میں آپ
کی موجودگی میں ان سے وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ یہ ہمارے ہاں ضرور آئیں گے۔"

صفیہ نے کہا "ہاں دہرہ دون کا علاقہ اور اس کے آگے مسوری کے پہاڑ اتنے

اور رفیق کو بھی لے آتیں۔"

"ہاں بھائی جان، مَیں انھیں ابھی لاتی ہوں، دیکھیے نا مَیں شور تو نہیں مچاؤں گی صرف ان کے کان میں کہوں گی کہ سیر کے لیے آپ کا انتظار ہو رہا ہے وہ اس وقت سیر کے لیے نہیں جایا کرتیں، لیکن آپ کی خاطر وہ فوراً چل پڑیں گی۔"

یوسف نے کہا "نسرین تم بہت اچھی لڑکی ہو، اگر انھیں کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے تو ضرور لے آؤ۔"

نسرین بھاگتی ہوئی گئی اور تھوڑی دیر بعد فہمیدہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اس کے ساتھ آ رہی تھی۔

یوسف نے کہا "نسرین میرا مطلب ہے، شہزادی نسرین یہ تو آپ کو وہم نہیں ہونا چاہیے کہ مَیں آپ کے گھر کا راستہ بھول جاؤں گا۔ رات کو آتے وقت تو مَیں نے غور سے نہیں دیکھا تھا مگر جاتے ہوئے غور سے دیکھ کر جاؤں گا۔ اس لیے بھول جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم ان سنسان سڑکوں پر لمبی سیر کریں، جہاں بھیڑ نہ ہو اور جو تمھاری آپا کو خاص طور پر پسند ہوں۔"

نسرین نے کہا "پہلے آپا جان، آپ ہماری رہنمائی کریں، بھائی جان مَیں نے وہ فلم دیکھی تھی، وہ کیا ہوتا ہے جو افریقہ میں سیاحوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

یوسف ہنسا، "شہزادی صاحبہ، اسے سفاری کہتے ہیں اور سڑکوں پر سیر کرنے والوں کی رہنمائی نہیں کرتا بلکہ خطرناک جنگلوں میں شیروں، ہاتھیوں، گینڈوں اور مگرمچھوں کا شکار کرنے والوں کی رہنمائی کرتا ہے۔"

یوسف فہمیدہ کی طرف متوجہ ہوا، "مَیں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جب موقع ملتا ہے تو کوئی بات یاد نہیں رہتی۔"

"ایسی باتیں آپ لکھ چھوڑا کریں شاید کسی دن آپ کے کام آئیں۔ عجیب بات ہے

کہ میری بھی یہی حالت ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں گھر جاتے ہی آپ کے مسودے کا ذکر چھیڑوں گی لیکن کل سے مجھے خیال ہی نہیں آیا۔ آپ کی تحریر کے بارے میں اَن گنت باتیں مجھے آپ کے جانے کے بعد یاد آئیں گی۔"

حمیرا نے نسرین سے مخاطب ہو کر کہا "نسرین سیر کرنے والی سڑکیں تو دہرہ دون کی ہیں ہم جب بھی وہاں جاتے ہیں تم بہت یاد آیا کرتی ہو۔"

نسرین نے اپنی رفتار ذرا تیز کرتے ہوئے کہا "مسوری یقیناً بہت خوب صورت ہو گا لیکن کانگڑہ کے مناظر دنیا میں کہیں اور نہیں ہو سکتے۔"

انھیں آگے جاتا دیکھ کر فہمیدہ اور یوسف نے اپنی رفتار کم کر دی۔

یوسف نے کہا "فہمیدہ مجھے معلوم نہیں کہ ایک بات میں کتنی بار کہنا چاہوں گا اور کتنی بار مجھے بھول جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے مجھے موزوں الفاظ نہ مل سکیں۔ بات بڑی مختصر ہے اور وہ یہ ہے کہ جب آپ میری آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہیں تو مَیں آپ کا تصور نہیں کر سکتا۔ میرا مطلب ہے کہ دنیا میں اَن گنت صورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے نقوش ایک دفعہ دیکھنے سے ہمارے ذہن میں ثبت ہو جاتے ہیں لیکن تصور میں تمھاری جو صورتیں میرے سامنے آتی ہیں وہ ہر آن بدلتی رہتی ہیں مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ تمھیں دیکھنے پہچاننے اور تمھارے نقوش اپنے دل میں بٹھانے کے لیے مجھے صبح کی روشنی میں چند لمحات، چند دن اور چند مہینے کافی نہیں بلکہ مدتوں دیکھنے کی ضرورت ہے اس قدر انہماک کے ساتھ کہ مَیں آنکھ بھی نہ جھپک سکوں لیکن شاید تم نہیں سمجھ سکو گی۔"

فہمیدہ نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا "مَیں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ مَیں کیا سمجھ سکتی ہوں اور کیا نہیں سمجھ سکتی۔ آج میرے متعلق ایک مسئلہ آپ کے سامنے لایا جائے گا اور ہمارے گھر میں آپ کی رائے آخری سمجھی جائے گی۔ اِس لیے

آخری سمجھی جائے گی کہ گھر میں امی اور ابا جان وہی پسند کیا کرتے ہیں جو میں پسند کیا کرتی ہوں۔
اور یوسف صاحب! میں بھی ایک بات کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ میں نے بھی آپ کو دن کی روشنی میں اتنا نہیں دیکھا جتنا میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کل نہ جائیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو جب تک چچی جان یہاں ہیں آپ بھی یہیں ٹھہریں، شاید مجھے آپ کی کتاب کے متعلق کچھ کہنے کا موقع مل جائے۔"

یوسف نے کہا "میرا واپس جانا بہت ضروری ہے مگر تمہاری تھوڑی سی خوشی کے لیے میں رُک جاؤں گا۔"

"تھوڑی نہیں بہت زیادہ"۔

"نسرین" اس نے آواز دی "آؤ تمہیں ایک خوشخبری سناؤں۔"

نسرین حمیرا کا ہاتھ پکڑ کر بھاگتی ہوئی ان سے آملی اور فہمیدہ نے کہا "خوشخبری یہ ہے کہ تمہارے بھائی جان کل نہیں جائیں گے۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ جب تک چچی جان اور حمیرا یہاں ہیں آپ یہیں رہیں لیکن فی الحال یہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کے بعد یہ وعدہ تم لے لینا کہ جب بھی انہیں موقع ملے گا یہ جالندھر کا راستہ نہیں بھولیں گے۔"

حمیرا نے کہا بھائی جان، میں بھی آپ سے دہرہ دون آنے کا وعدہ لینا چاہتی ہوں۔ عثمان بھائی جان آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

یوسف نے کہا "اس وقت میں یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ کبھی اس طرف جانا ہوا تو میں سیدھا آپ کے گھر آؤں گا لیکن ملک کے حالات اتنے غیر یقینی ہیں کہ یقین کے ساتھ کوئی پروگرام نہیں بنایا جا سکتا۔"

نسرین "آپا حمیرا آپ مطمئن رہیں آئندہ جب کبھی ہم نے دہرہ دون جانے کا پروگرام بنایا تو انشاء اللہ بھائی جان ہمارے ساتھ ہوں گے"۔

یوسف نے فہمیدہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا "آپ نے کہا تھا کہ گھر جا کر ایک اہم

مسئلے پر میرا مشورہ لیا جائے گا اگر یہ ابھی بتا دیں مسئلہ کیا ہے تو میں شاید کچھ سوچ سکوں اور مجھے یقین ہے کہ نسرین اور حمیرا بھی کوئی اچھی رائے دے سکیں گی۔"

فہمیدہ نے کہا "مسئلہ یہ ہے کہ مجھے نانا جان اور نانی جان کی خواہش کے مطابق میڈیکل اسکول میں داخلہ لینا چاہیے یا آرٹس کے لیے جالندھر یا لاہور میں پڑھنا چاہیے۔ چچا عبدالعزیز اور چچی بلقیس کا اصرار ہے کہ میں لاہور میں داخلہ لے لوں اور ان کے پاس رہوں وہ شاید اچانک کسی دن مجھے لینے بھی آجائیں۔"

یوسف نے کہا "میں اس مسئلہ میں کوئی رائے دینے سے پہلے شہزادی نسرین تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔"

"بھائی جان، افسوس تو یہی ہے کہ شہزادی کا حکم نہیں چلتا ورنہ میں یہ فرمان جاری کرتی کہ میری آپا جان کو ڈاکٹر بننے کی بجائے اپنے وقت کی سب سے بڑی ادیبہ بننا چاہیے اور آرٹس کے لیے ان کا لاہور جانا بہتر ہوگا۔ اگرچہ میں بہت تنہائی محسوس کیا کروں گی ان کی تو یہ عادت ہے کہ یہ آپریشن کرنا تو درکنار یہ تو کسی کو ٹیکہ لگتے دیکھ کر بھی آنکھیں بند کر لیتی ہیں"۔

"ایسی بات تو میں ان کے متعلق نہیں مانتا، ضرورت کے وقت یہ مسکراتے ہوئے بڑے سے بڑا اپریشن کر دیا کریں گی لیکن مسئلہ یہ ہے ان کے طبعی رجحان کا اور وہ تم نے کہہ ہی دیا ہے کہ یہ ایک ادیب کا ذہن لے کر پیدا ہوئی ہیں۔ پھر اگر یہ لاہور جائیں تو تمہاری یہ مشکل بھی تو بہت جلد حل ہو جائے گی کہ تم ان کے ساتھ آن ملو گی۔"

نسرین بولی "بھائی جان، اگر آپ نے یہ کہہ دیا امی جان انھیں بھی روک لیں گی۔"

یوسف فہمیدہ کی طرف متوجہ ہوا "فہمیدہ آپ ان لڑکیوں میں سے ہیں جو اپنے متعلق بہترین فیصلے کرنے اور اسے منوانے کا حق لے کر پیدا ہوئی ہیں۔ اگر ڈاکٹری کی طرف رجحان ہو تو یہ ایک مقدس پیشہ ہے لیکن اس صورت میں جبکہ آپ طبعاً ادب کی طرف راغب ہیں تو آپ کے لیے لاہور جانا بہتر ہوگا۔"

فہمیدہ نے کہا "اب گھر پہنچتے ہی اس مسئلے پر بات ہوگی اور چچا عبدالعزیز یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ آپ نے مجھے لاہور بھیجنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مَیں ماں جی کو خفا کرنا چاہتا ہوں۔"

فہمیدہ نے کہا "آپ کے مشورے کا سب سے بڑا فائدہ تو مجھے ہی ہوگا کہ نانی جان فوراً مان جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں فوراً واپس چلنا چاہیے۔"

یوسف نے کہا "لیکن حمیرا نے کوئی رائے نہیں دی۔"

حمیرا بولی "بھائی جان، میرا ووٹ بھی آپ کے ساتھ ہے۔ میرے ابا جان کی تو یہی خواہش ہے کہ فہمیدہ آپا ڈاکٹر بنیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اگر یہ کامیاب ادیب بن سکتی ہیں تو انہیں زبردستی ڈاکٹر بنا دیا جائے۔"

"میری تو حالت یہ ہے کہ مجھے آپا فہمیدہ ہر حالت میں اچھی لگیں گی خواہ یہ ڈاکٹر ہوں یا پروفیسر یا کچھ اور۔"

یوسف نے پوچھا "آپ یہ چاہیں گی کہ آپ کی کتابیں آپا لکھا کریں؟"

"کیوں نہیں، دُنیا میں ہر اچھی چیز میری آپا کے لیے ہونی چاہیے" "لیکن لوگ کہتے ہیں کہ کتابیں لکھنے والوں کو کبھی کبھی بھوکا بھی رہنا پڑتا ہے۔"

"دیکھیں بھائی جان، آپ منحوس باتیں نہ کریں" اُس نے برہم ہو کر کہا۔

فہمیدہ نے کہا "آپ کو کبھی اپنے مسودے کا خیال نہیں آیا۔"

"خیال بہت آتا ہے اور کسی دن اچانک اس کو مکمل کرنے کے لیے بیٹھ جاؤں گا۔"

فہمیدہ نے کہا: "کبھی آپ کو یہ خیال آیا ہے کہ یہاں آ کر مسودہ نامکمل ہے! میرا مطلب ہے کہ اس سے آگے بھی لکھا جائے اور یوسف کی سرگزشت کے باقی واقعات بھی اس میں شامل کیے جائیں۔"

یوسف نے کہا: "دیکھیے، یہ سرگزشت دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی، دُوسرا

حصہ جو میرے نزدیک بہت اہم ہے اور جسے پڑھنے والے بھی بہت اہمیت دیں گے وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جب امرتسر کے اسٹیشن سے ماں جی اور نسرین سے میرا راستہ جُدا ہو گیا تھا اور مَیں اپنا ہینڈ بیگ جس میں مسودہ بند تھا، جالندھر جانیوالی گاڑی پر چھوڑ آیا تھا مجھے اپنے مسودے سے زیادہ اس بات کا ملال تھا کہ اس پر نسرین نے اپنا ایڈریس بھی لکھا ہوا تھا۔ اب اس حصے کو مکمل کرنے کے لیے مَیں آپ سے کئی سوالات پوچھوں گا اور یہی وجہ ہے کہ مَیں کل رُک گیا ہوں۔ اصل مسودہ آپ کے پاس رہے گا اور مَیں جو کچھ لکھا کروں گا، اس کی ایک نقل بالاقساط آپ کو ملتی رہے گی۔"

فہمیدہ نے کہا "دیکھیے جو آپ کا اصل مسودہ تھا وہ میرے پاس محفوظ ہے اور مَیں نے جو اُس کی ایک نقل رکھی ہے وُہ آپ کے سُپرد کر دی جائے گی تاکہ آپ کو تسلسل قائم رکھنے میں آسانی رہے۔ اس سرگزشت کا جو حصہ جالندھر سے تعلق رکھتا ہے اُس کے متعلق آپ کو زیادہ سوال پُوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آپ جانتے ہیں کہ نسرین کو کوئی بات نہیں بُھولتی اور میرا خیال ہے کہ اگر یہ ابھی سے وہ واقعات سُنانا شروع کر دے جو امرتسر سے جُدا ہونے کے بعد پیش آئے تھے تو آپ کو کئی سوالات کا جواب مل جائے گا، اور آپ کی تحریر نے جو مجھ پر اثر کیا تھا اُس کے متعلق بھی نسرین سے زیادہ آپ کو کوئی نہیں بتا سکتا۔"

نسرین نے کہا "بھائی جان! آپ کو اپنی پریشانی کا سارا حال سُناؤں گی، لیکن یہ غلط ہے کہ میں کوئی بات آپا جان سے بہتر کر سکتی ہوں۔"

یوسف نے کہا "بھئی یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے کتنا پیار کرتی ہو۔ یہ بات تو میں فہمیدہ کو دیکھے بغیر سمجھ گیا تھا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کب معلوم ہوا تھا کہ مَیں اپنا ہینڈ بیگ بھول گیا ہوں۔"

"اُسی وقت بھائی جان جب گاڑی چل پڑی تھی۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا احساس

تھا کہ مجھ سے کوئی حماقت ضرور ہوگئی ہے اور مَیں نے نانی جان سے بھی کہہ دیا تھا۔"
اور پھر نسرین بولتی چلی جارہی تھی۔ دس منٹ بعد وہ گھر پہنچنے تک کے واقعات سُنا
چکی تھی۔

یوسف نے آہستہ سے کہا "فہمیدہ یہ سیر ذرا لمبی نہ کریں، اس وقت شہزادی
نسرین بولنے کے موڈ میں ہے۔"

فہمیدہ نے کہا۔ "ہم آگے سے دائیں ہاتھ مڑ جائیں تو شہزادی صاحبہ کو نصف
گھنٹہ اور بولنے کا موقع مل جائے گا۔"

نسرین بدستور بولتی رہی اور گھر کے قریب پہنچ کر وہ اُن دنوں کا ذکر کر رہی تھی
جب فہمیدہ یوسف کا مسودہ پڑھا کرتی تھی۔ گھر کے پاس ہی ایک مسجد میں عشاء کی اذان
ہو رہی تھی۔ یوسف نے فہمیدہ سے مخاطب ہو کر کہا "مَیں نماز پڑھ کر آتا ہوں۔ آپ میرے
لیے ایک دستہ کاغذ منگوالیں مَیں رات کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مَیں
بی۔اے کرنے سے پہلے اس کتاب کا ایک حصّہ مکمل کرلوں گا۔

حمیرا نے پوچھا "بھائی جان ایک حصّہ کیوں پُوری کتاب کیوں نہیں؟"

"بھئی یہ کتاب ایک دیہاتی لڑکے کی سرگزشت ہے جس نے کئی کٹھن مراحل طے
کرنے کے بعد ایک ناول نگار بننا ہے، پھر یہ بعض ایسے لوگوں کی سرگزشت بھی ہوگی جو ان
کٹھن مراحل میں اُس کے ہمسفر ہوں گے۔ اس لیے لکھنے سے پہلے سرگزشت
کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ اِس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اِس میں کتنا وقت لگے گا اور اس
کے شائع ہونے تک مَیں کتنی اور کتابیں لکھ چکا ہوں گا۔"

حمیرا نے کہا۔ "بھائی جان میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا شاید نسرین سمجھتی ہو۔"

نسرین بولی "چلو گھر چلو۔ وہاں آپا جان تمھیں سمجھا دیں گی۔"

رات کھانا کھانے کے بعد یوسف اپنے کمرے میں گیا تو وہاں میز پر کاغذات اور
روشنائی کی شیشی پڑی ہوئی تھی۔ یوسف کرسی پر بیٹھ گیا تو نسرین چمڑے کا ایک چھوٹا سا
بکس اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور اُسے میز پر رکھ دیا۔ یوسف نسرین سے کچھ
پوچھنے والا تھا کہ فہمیدہ اور اس کی ماں کمرے میں آگئیں اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

صفیہ نے کہا "بیٹا بیٹھے رہو۔ امی جان یہ سُن کر بہت خوش ہوئی ہیں کہ تم کچھ لکھنے
لگے ہو۔"

"خالہ جان آپ تشریف رکھیں" یوسف نے کہا۔

صفیہ نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹا میں تمہارا وقت ضائع نہیں کرنا
چاہتی۔"

"خالہ جان میرا وقت ضائع نہیں ہوگا بلکہ لکھنے کے لیے میرا موڈ بن جائے گا۔
فہمیدہ آپ بھی بیٹھ جائیں۔"

فہمیدہ بولی "نہیں۔ مَیں صرف آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ اس بکس میں آپ
کا مسوّدہ اور ایک نیا قلم بھی ہے جو مَیں نے اس خیال سے خرید کر اِس بکس میں رکھ دیا
تھا کہ کسی دن آپ یہ مسودہ تلاش کرتے ہوئے ہمارے گھر آئیں گے اور مَیں یہ قلم آپ
کو اس درخواست کے ساتھ پیش کردوں گی کہ اسے جلدی مکمل کیجیے۔"

یوسف مسکرایا۔ "لوگ مصنفوں کو اُس وقت قلم پیش کرتے ہیں جب وہ بہت
مشہور ہوجاتے ہیں۔ اِس لیے مَیں اس قلم کو بہت بڑا انعام سمجھتا ہوں اور آپ کا
بہت شکر گزار ہوں۔ نسرین مَیں تمہارا شکر گزار بھی ہوں کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی
کتاب شائع ہونے سے پہلے ہی اِتنے بڑے قدر دان مل گئے ہیں۔"

صفیہ نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "قدر دان بھی اور دعائیں کرنے والے بھی۔ اب
تم اپنا کام کرو۔"

وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔

یوسف نے بکس کھول کر پہلے فہمیدہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خوب صورت جلد نکالی، شروع اور آخر کے چند صفحات پڑھے پھر نیا قلم نکالا اسیاہی بھری اور بسم اللہ کہہ کر لکھنے میں مصروف ہوگیا جب صبح کی اذان سنائی دی تو اُس نے قلم رکھ دیا اُٹھ کر وضو کیا اور نماز پڑھی اور میز پر بکھرے ہوئے کاغذ اکٹھے کیے بغیر سوگیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو بیگم فریدہ احمد بستر کے قریب بیٹھی ہوئی تھیں وُہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور بولا "امی جی میں لکھتے لکھتے سوگیا تھا اور شاید بہت دیر سویا رہا۔"

"بیٹا تم لکھتے لکھتے نہیں نماز پڑھ کر سوتے تھے اور میرا خیال ہے کہ ابھی تمھاری نیند پوری نہیں ہوئی اور ایک دلچسپ بات جو میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ نصیرالدین تمہارے نئے لکھے ہوئے صفحات پڑھنے کے بعد اس بکس سے تمہارے مسودے کی نقل نکال کر لے گیا تھا۔"

یوسف نے میز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن وہ کاغذ جو میں نے لکھے تھے؟"

"میرا خیال ہے وہ فہمیدہ کے پاس ہیں"

تم نے رات بھر جو کچھ لکھا تھا وہ سب سے پہلے فہمیدہ نے پڑھا تھا پھر صفیہ نے۔ پھر اُس سے نصیرالدین چھین کر لے گیا تھا اور اب میرا خیال ہے کہ ظہیر ذکیہ اور حمیرا کو پڑھ کر سنا رہا ہے۔

چند منٹ بعد یوسف ناشتہ کر رہا تھا کہ نصیرالدین مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہُوا

"بھئی یوسف! اگر تم اس بات پر خوش ہوسکتے ہو کہ میری عمر کا آدمی تمہارے قارئین کی جماعت میں شامل ہوچکا ہے اور تمہیں ہر سطر پہ داد دینا چاہتا ہے تو تم جی بھر کر خوش ہوسکتے ہو۔"

یوسف نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نمناک آنکھوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے لیے یہ بہت بڑا انعام ہے کہ آپ نے وُہ پڑھ لیا ہے۔"

"بیٹا اصل بات یہ ہے کہ مَیں نے صرف چند صفحات پڑھے ہیں اور مَیں اسے پُوری یکسوئی سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ فہمیدہ کسی معمولی بات سے متاثر نہیں ہُوا کرتی لیکن تمہارا اندازِ تحریر مجھے بالکل انوکھا معلوم ہوتا ہے۔"

یوسف نے کہا "نسرین، ذرا اِدھر آنا مَیں پھر ایک بار تمہارا شکریہ ادا کردوں۔"

"کس بات پر؟ بھائی جان"۔ اس نے بھاگتے ہوئے قریب آکر کہا۔

"وُہ بات یہ ہے کہ تمہاری وجہ سے مَیں بہت شفقت اور پیار کرنے والوں سے متعارف ہوا ہوں۔"

نصیرالدین کچھ دیر غور سے یوسف کی طرف دیکھتا رہا، پھر اس نے کہا "بیٹا، کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تم چند دن اور یہاں رُک جاؤ اور کچھ اور لکھ لو۔"

یوسف نے جواب دیا "جناب میں پھر آؤں گا اور آپ مجھ سے تنگ نہ آگئے تو بار بار آتا رہوں گا، لیکن اس وقت مجھے جانا چاہیے، مَیں گاؤں میں دو دن ٹھہر کر لاہور چلا جاؤں گا۔"

نصیرالدین نے کہا "انشاء اللہ لاہور میں بھی ملاقات ہوتی رہے گی۔ فہمیدہ کے متعلق پہلے تو یہی سوچا گیا تھا کہ وہ کالج کی تعلیم کی ابتدا لاہور سے کرے لیکن چونکہ اس کا طبعی رجحان ڈاکٹری کی بجائے ادب کی طرف ہے اِس لیے ایف اے تک یہیں پڑھے گی اور اس کے بعد لاہور چلی جائے گی، وہاں اس کا چچا اور چچی اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اگر فہمیدہ ڈاکٹر بننے کا شوق ظاہر کرتی تو ہمیں اسی سال لاہور بھیجنا پڑتا۔"

"وُہ مجھ سے بھی بہت پیار کرتے ہیں"۔ نسرین نے کہا۔

"لیکن ان کے پیار کا یہ مطلب نہیں کہ مَیں تمہیں بھی لاہور بھیج دوں گا۔"

"ابا جان، مَیں آپ کو چھوڑ کر لاہور کیسے جاسکتی ہوں اور نانی جان سے بھی مَیں دُور نہیں ہونا چاہتی۔"

نانی نے کہا "اجی میرے ساتھ مکر نہ کرو مجھے معلوم ہے جب تمہارا لاہور جانے کا وقت آئے گا تو تم نانی کو پوچھو گی بھی نہیں۔ نصیر الدین بیٹا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ فہمیدہ کے بجائے نسرین ڈاکٹر بن جائے اور تم میڈیکل کیلئے اسے میرے پاس لدھیانہ بھیج دو۔"

صفیہ نے کہا "امی جان، بیٹی کو ابھی سے پریشان نہ کریں جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔"

نسرین نے کہا "امی جان میں پریشان نہیں ہوا کرتی۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم جالندھر کی طرح لاہور میں بھی اکٹھے ہو جائیں اور نانی جان وہاں ہمیں ملنے کے لیے آیا کریں۔ نانی جان میں سچ کہتی ہوں، مجھے بڑا مزہ آتا ہے آپ کا انتظار کرنے میں۔"

اگلے دن نصیر الدین یوسف کو ریلوے اسٹیشن پر خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ گاڑی روانہ ہونے سے چند منٹ پہلے اس نے پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے کہا "یوسف رات میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی تمہارے گاؤں تک ہو آؤں لیکن پھر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جب تمہارے ابا جان لاہور آجائیں گے تو ہم پہلے وہاں آئیں گے اور اس کے بعد کسی اچھے موقع پر تمہارے گاؤں جانے کا کوئی پروگرام بنائیں گے۔ ایک بات جو میں اس وقت کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب بھی تمہیں کوئی الجھن یا پریشانی ہو تو تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ میرے گھر میں تم کبھی اجنبی نہیں سمجھے جاؤ گے۔"

یوسف نے جواب دیا "جناب میں تشکر کے الفاظ سے آپ کے خلوص کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میری زندگی کا ایک عجیب اتفاق ہے کہ آپ مجھے اس وقت ملے ہیں جب مجھے آپ کی ضرورت تھی بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئٹہ سے میرا، نسرین اور اُس کی نانی جان کے ساتھ سفر کرنا اور پھر جب امرتسر سے میرا راستہ جدا ہو رہا تھا تو اپنے مسودے کو وہاں بھول آنے میں یہی ایک راز تھا کہ کسی دن میری زندگی میں ایک

بہت بڑا خلا پیدا ہونا تھا اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے آپ سب کو نمودار ہونا تھا۔ نصیر الدین صاحب میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ قدرت کو یہ معلوم تھا کہ کسی دن اچانک میں بہت بُری طرح گھائل ہو جاؤں گا اور میرے زخم مندمل کرنے کے لیے آپ آگے بڑھیں گے۔"

نصیر الدین نے اسے گلے لگا لیا۔ گاڑی نے سیٹی بجائی اور نصیر الدین نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "بیٹا، خدا حافظ، میں ہمیشہ تمہارے لیے دعائیں کیا کروں گا اور دعا کے ساتھ ہم ایک دوسرے کے لیے اور کر بھی تو کچھ نہیں سکتے۔"

گاڑی حرکت میں آچکی تھی اور یوسف جلدی سے خدا حافظ کہہ کر گاڑی پر سوار ہو گیا۔ نصیر الدین بے حس و حرکت پلیٹ فارم پر کھڑا تھا، کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا اور جب گاڑی دور نکل گئی تو وہ آہستہ آہستہ اسٹیشن سے چل پڑا۔

باب - ۲۷

جالندھر سے واپسی پر یوسف تین دن گھر رہا اور اپنے والد سے اجازت لے کر لاہور چلا گیا۔ وہاں مکان پر نوکر موجود تھا تاہم اسے وہاں رہتے ہوئے وحشت محسوس ہوتی تھی۔ تین دن اپنے مکان میں رہنے کے بعد وہ اپنے دوست منظور احمد کو جو چار طلبا کے ساتھ کالج کے قریب ایک مکان میں رہتا تھا اپنے ساتھ لے آیا جب اُس کے والد اپنی چھٹی ختم کرنے کے بعد واپس آئے تو منظور پھر اپنے مکان میں چلا گیا تاہم اُن کے تعلقات اِتنے گہرے ہو چکے تھے کہ وُہ چھٹی کا دن عام طور پر یوسف کے گھر ساتھ گذارا کرتے تھے۔ کبھی کبھی کالج کے اور ساتھی بھی ان کے ساتھ آجایا کرتے تھے۔ یوسف کی وجہ سے منظور کو بھی کشتی رانی سے دل چسپی ہوگئی تھی اور چھٹی کے دن وُہ عام طور پر طلوع آفتاب سے پہلے کشتی رانی کے لیے دریا پر پہنچ جاتے تھے۔ کبھی کبھی دو اور لڑکے محمد حفیظ اور عبدالمجید بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ کشتی رانی کے بعد وہ یوسف کے گھر آکر ناشتہ کرتے، کچھ دیر پاس ہی ایک باغ میں جاکر مطالعہ کرنا شروع کر دیتے۔ وہاں چند لڑکے اور جمع ہو جاتے تو تحریکِ پاکستان اور جنگ کی صورتِ حال کے متعلق باتیں شروع ہو جاتیں۔ اُن کے لیے دوپہر کا کھانا یوسف کے گھر تیار ہوتا تھا اور یوسف کے والد اُس کے دوستوں کی مہمان نوازی میں ایک راحت محسوس کیا کرتے تھے۔ یوسف نے اپنے کسی ساتھی کو

یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وُہ اپنی زندگی کا ایک عظیم ترین المیہ دیکھ چکا ہے تاہم منظور کبھی کبھی اُس کے ساتھ دل کی بات کر لیا کرتا تھا۔ دوسرے لڑکوں سے وہ زیادہ جانتا تھا۔ فروری کے دنوں میں یوسف نے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی شروع کر دی لیکن ایک دن اسے غیر متوقع واقعہ پیش آیا اُس کی چچی اور چچا گاؤں سے آئے اور اگلے دن اس کی ماموں زاد بہن سعیدہ بھی بہاول پور سے وہاں پہنچ گئی۔ ان کے درمیان ایک دن کوئی کھسر پھسر ہوتی رہی اور پھر سب یوسف کے کمرے میں آگئیں۔ چچی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"دیکھو یوسف اگر تم ناراض نہ ہو تو میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ بھائی جان عام طور پر رات کے وقت اُٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہم وہ دن واپس نہیں لا سکتے جو انہوں نے آپا قدسیہ کے ساتھ گذارے تھے مجھے وُہ زمانہ ایک خواب معلوم ہوتا ہے اور صرف مَیں ہی نہیں بلکہ سارا گاؤں بھی محسوس کرتا ہے۔ گاؤں میں ہم نے یہ مسئلہ چھیڑا تھا کہ بھائی جان دوسری شادی کر لیں لیکن تمہاری وجہ سے وہ ایسی بات سُننے کے لیے تیار نہیں۔"

یوسف نے جواب دیا۔ "چچی جان آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ میں اباجی کو اس طرح مغموم دیکھنا پسند کرتا ہوں۔"

"بیٹا تم پسند نہیں کرتے لیکن تمہارے اباجی کا یہ خیال ہے کہ تمہاری دل آزاری ہو گی۔"

"آپا سعیدہ کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں۔"

"بھائی میں کچھ نہیں سمجھتی مجھے چچی کے خطوط آئے تھے اور مَیں یہ سوچ کر یہاں پہنچ گئی ہوں کہ تم مجھ سے بہتر سوچ سکو گے۔"

یوسف نے اُٹھتے ہُوئے کہا۔ "مَیں ابھی اباجی سے بات کرتا ہوں۔"

ایک منٹ بعد وُہ دوسرے کمرے میں اپنے والد سے کہہ رہا تھا۔ "اباجی! میں یہ محسوس کرتا ہوں

کہ یہ تنہائی کی زندگی آپ کے لیے بہت تکلیف دہ ہوگی۔ میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ آپ کو کسی اچھے گھرانے کی خاتون سے شادی کر لینی چاہیے لیکن مجھے یہ بات کہنے کی جرأت نہیں پڑتی تھی۔ اب آپا سعیدہ اور چچی جان کے خیالات معلوم کرنے کے بعد مجھے اس بات پر بے حد ندامت محسوس ہوئی ہے کہ میں نے ایک فرمانبردار بیٹے کا فرض ادا نہیں کیا۔"

باپ نے اُٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچ کر اپنے قریب لاتے ہوئے کہا "یہ باتیں شروع میں ہوئی تھیں تو میں نے گاؤں میں ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے سے کسی بڑے خاندان کی عورت کی ضرورت نہیں، ایک ایسی نیک طبیعت خاتون کی ضرورت ہے جو میرے بچوں کی خدمت کر سکے۔"

"ابا جی! اس بات کا فیصلہ آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے جو کوئی بھی اس گھر میں آئے گی ہم اپنی ماں سمجھ کر اس کی عزت کریں گے۔"

"بیٹا اگر تم اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس کیے بغیر یہ بات کر رہے ہو تو اپنی چچی سے پوچھ لو وہ میرے لیے کیا پسند کرتی ہے۔"

"ابا جی میں ابھی پوچھتا ہوں۔"

یوسف واپس اپنی چچی اور سعیدہ کے پاس آ بیٹھا اور اُس نے کہا "چچی جان اگر آپ مجھے اپنی پسند کی خاتون بتا دیتیں تو میں اِسی وقت ابا جان سے یہ فیصلہ کرا لیتا۔"

"بیٹا مجھ سے زیادہ یہ تمہاری بہنوں کی پسند کا مسئلہ ہے۔ زہرہ نے اُسے پسند کیا تھا تمہاری بہن بھی اُسے جانتی ہے، اُس کی تائید کرتی ہے۔"

"چچی جان، کہاں گئی تھی اُسے دیکھنے کے لیے، وہ کون ہے جسے میں نہیں جانتا اور آپ جانتی ہیں۔"

"بیٹا وہ چراغ بی بی ہے اور تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو۔"

"کیوں زہرہ یہ وہی چراغ بی بی ہے جسے ہم سب جانتے ہیں۔"

"بھائی چراغ بی بی ایک ہی تو ہے۔"

"کیوں آپا سعیدہ تم بھی اُسے پسند کر آئی ہو۔"

"دیکھو بھائی میری طرف اِس طرح نہ دیکھو مجھے یہ خط ملا تھا کہ تمہارے ابا جان اُسے قبول کرنے پر رضامند نظر آتے ہیں اور اس خط میں یہ بھی تاکید کی گئی تھی کہ میں یہاں آنے سے پہلے اُسے اچھی طرح دیکھ آؤں، مجھے معلوم نہیں کہ ایسی عورتوں کو اچھی طرح کیسے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ گاؤں سے لاہور آنے کے بعد بھی کافی عرصہ وہ تمہارے گھر آیا کرتی تھی اور انہوں نے تمہارے بہت سے کام اپنے ذمّے لے لیے تھے۔ پھر وہ یکایک یہاں سے غائب ہو گئیں۔ میں نے پتہ کیا تو یہ راز کھلا کہ وہ اپنے گاؤں اس امید سے گئیں تھیں کہ ہم وہاں پیغام لے کر جائیں گے۔ میں چراغ بی بی کی ماں کو دیکھ کر کچھ پریشان ہوئی تھی لیکن اس کے باپ کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ بہت اچھا ہے۔"

یوسف نے کہا "آپا جی! آپ کسی کو دل کا اچھا یا دل کا بُرا نہ کہا کریں۔ کیونکہ آپ کی سوچ ہمیشہ حقیقت کے اُلٹ ہوتی ہے۔ بہرحال اگر آپ سب کو چراغ بی بی پسند ہے اور ابا جان بھی اُسے ناپسند نہیں کرتے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گا، لیکن میرے امتحان کے دن قریب آ رہے ہیں اِس لیے آپ جس مقصد کے لیے آئی ہیں اُسے جلد از جلد پورا کر لیجیے۔"

دو ہفتے بعد یوسف کے دو چچا اور ان کے والد کے چچا اپنی بیگمات کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔

بیگمات گھر میں ٹھہر گئیں اور یہ لوگ عبدالکریم اور اس کی بیوی کے ساتھ امرتسر روانہ ہو گئے۔ سفر کے لیے دو کاریں عبدالکریم نے مہیا کیں اور ایک کار لے کر عبدالعزیز پہنچ گئے۔ بلقیس کا بڑی شدت سے انتظار تھا اور یوسف کی یہ خواہش تھی کہ وہ عبدالعزیز صاحب

کے ساتھ جائے لیکن عبدالعزیز نے آتے ہی کہا "بھئی یوسف بلقیس آج سفر کے موڈ میں نہیں تھی اور ان کا موڈ اس لیے بدل گیا تھا، جب میں نے یہ بتایا تھا کہ تم گھر کے انتظامات کے لیے یہیں رہو گے۔"

"چچا جان، آپ نے انہیں بتا دیا ہوتا کہ میرا گھر میں رہنا ضروری تھا اور یہ بات بھی تو کچھ عجیب تھی نا کہ میں ...."

"بیٹا مَیں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں اور شاید اسی احساس نے تمہاری چچی کو وہاں جانے سے روک دیا ہے۔ بہرحال ہمیں اللہ سے بہتری کی دُعا کرنی چاہیے۔ مَیں تمہاری اور تمہاری چچی کی نمائندگی کے لیے تمہارے والد کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

اگلے روز یوسف ظاہری مسکراہٹوں کے باوجود بے حد اداس معلوم ہوتا تھا وہ سارا دن گھر سے باہر نہ نکلا۔ شام کے وقت امرتسر جانے والی بارات واپس آگئی۔ یوسف مکان کے دروازے سے باہر ان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا۔ عبدالکریم کی بیوی دلہن کو کار سے نکال کر مکان کی طرف بڑھی۔ چراغ بی بی سمٹی سمٹائی اندر داخل ہوئی۔ یوسف نے آگے بڑھ کر اپنے والد کو سلام کیا اور انہوں نے ہاتھ ملا کر اسے گلے لگا لیا اور پھر اسے لے کر دوسرے مہمانوں کے ساتھ بیٹھک میں چلے گئے۔

صحن کے اندر خواتین چراغ بی بی کو پلنگ پر بٹھا کر سلامیاں دے رہی تھیں اور دلہن کے لباس میں وہ اس چراغ بی بی سے بہت مختلف معلوم ہو رہی تھی جسے وہ دیکھا کرتی تھیں۔ اِس ہجوم میں یوسف کے رشتہ داروں کے علاوہ امینہ بھی موجود تھی۔ چراغ بی بی کی ماں جو دو گھنٹے قبل وہاں پہنچ گئی تھی اپنی بیٹی کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

یوسف کچھ دیر اپنے رشتہ داروں اور مہمانوں سے باتیں کرنے کے بعد نمازِ عصر کے لئے مسجد میں چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو مہمانوں کے

ساتھ چائے میں شریک ہو گیا۔ چائے ختم ہوئی تو عبدالرحیم مہمانوں کے ساتھ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد یوسف کو بازو سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے اور انہوں نے پُوچھا: "بیٹا! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟"

"جی مَیں نماز کے لئے مسجد چلا گیا تھا——"

"بیٹا، تم اب تک اپنی ماں سے نہیں ملے؟"

"ابا جان، صحن عورتوں سے بھرا ہُوا ہے۔"

"تم زہرہ سے کہو اُسے اندر لے آئے۔"

یوسف نے زہرہ کو آواز دی، وہ اندر آئی تو میاں عبدالرحیم نے کہا "بیٹی عبدالکریم کی بیوی یا بیٹی کو کہو تمہاری ماں کو یہاں لے آئے۔ زہرہ واپس چلی گئی، تھوڑی دیر بعد رشیدہ اور امینہ چراغ بی بی کو بازوؤں کا سہارا دیتے اندر داخل ہوئیں، زہرہ اور اس کی چچی اس کے پیچھے تھیں۔ یوسف اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میاں عبدالرحیم نے کہا "چراغ بی بی تمہیں سب سے پہلے میرے اس بیٹے سے ملنا چاہیے تھا جس پر مَیں فخر کیا کرتا ہوں"۔ چراغ بی بی نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا سر پکڑ لیا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "جی یوسف پر سارا خاندان فخر کرتا ہے اور مَیں بھی اسے بیٹا کہتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہوں"۔

یوسف کا چہرہ حیا اور غصے سے اچانک سُرخ ہو گیا اور اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ بیٹھ جائیں"۔

جب وُہ بیٹھ گئی تو اُس کی ماں بھی اندر آگئی۔ یوسف اپنی آستین سے پیشانی پونچھتا ہُوا وہاں سے کھسکا اور صحن کے ایک کونے میں نلکے کے پانی سے اپنی پیشانی رگڑ رگڑ کر دھونے لگا اور پھر وضو کرنے کے بعد ڈیوڑھی سے سائیکل اُٹھا کر باہر نکل گیا۔

یوسف کے والد مغرب کی نماز کیلئے گھر سے نکلے تو امینہ چراغ بی بی کو ہاتھ سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "آپا چراغ بی بی، یہ تم سے کس بے وقوف نے کہا تھا کہ تمہارے لیے اُس کا ماتھا چُومنا بھی ضروری ہے، خُدا کا شکر کرو کہ اُس نے غصّہ ضبط کر لیا تھا ورنہ یوسف کا چہرہ دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہُوا تھا کہ وہ اچانک تمہارا گلا گھونٹ ڈالے گا، تم نے اُس کے ہاتھ نہیں دیکھے۔ اگر وہ اچانک تمہاری گردن پر پہنچ جاتے تو کوئی تمہاری جان نہیں بچا سکتا تھا۔ تمہیں ایڑیاں اُٹھا کر اُس کی پیشانی تک پہنچتے ہوئے شرم آنی چاہیئے تھی۔" چراغ بی بی غصّے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھ رہی تھی، اُس کی ماں نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے آواز دی بیٹی! تم کیا مشورہ کر رہی ہو" امینہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "جی، مجھے آپا جی سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" امینہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔ ماں نے بیٹی سے کہا "بیٹی، کیا بات ہے تمہارا چہرہ اترا ہُوا ہے"۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "امی، امینہ مجھ سے جلتی ہے، وُہ سب مجھ سے جلتے ہیں"۔

"کیا کہا تمہیں اس نے؟"

"امّی وہ نہیں چاہتی کہ مَیں یوسف کی ماں کہلاؤں"۔

اس کی ماں عالم بی بی نے کہا "بیٹی، مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ لوگ تمہارا سُکھ برداشت نہیں کریں گے لیکن پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"



یوسف نمازِ مغرب کے بعد اپنی ماں کی قبر پر کھڑا تھا، قبرستان کے سکوت میں بیٹھ کر پہلی بار وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنے ماضی کے متعلق کچھ سوچ رہا تھا اُسے ایسا

محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے حال اور مستقبل کے متعلق سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ اچانک اسے کِسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اس نے مُڑ کر دیکھا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا "کون ہے؟"

"جی مَیں فضل دین ہوں" آنے والے نے بہت بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ آپ کو گھر سے نکلے بہت دیر ہو گئی تھی اور وہاں سب پریشان تھے۔ امینہ کو اچانک کوئی خیال آیا اور وُہ مجھے اپنے ساتھ لے کر کار پر اس طرف نکل آئیں۔"

یوسف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "وُہ یہاں آئی ہیں؟"

"جی ہاں، وُہ باہر سڑک پر کھڑی ہیں اور وہ آپ کی ناراضگی کے ڈر سے یہاں نہیں آئیں۔ اب میں آپ کی سائیکل لے آتا ہوں اور آپ امینہ بی بی کے ساتھ جلدی گھر پہنچ جائیں۔ صاحب جی مَیں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ امینہ بی بی اتنی نرم دل بھی ہو سکتی ہیں لیکن آج معلوم کیا ہوا کہ وُہ رو رہی تھیں اور اپنے ماں باپ کے متعلق بھی یہ کہہ رہی تھیں کہ انھوں نے آپ پر ظلم کیا ہے، وہ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اس نے چراغ بی بی کی بڑی بے عزتی کی ہے۔"

یوسف نے کہا "اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"جناب یہ بات آپ اُسے سمجھا سکتے ہیں۔ کیونکہ سب سے زیادہ وُہ آپ کا کہا مانے گی"۔

فضل دین نے چند قدم دُور جا کر سائیکل پکڑ لیا اور یوسف اس کے ساتھ چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سڑک پر امینہ کو اپنی کار کے ساتھ کھڑی دیکھ رہے تھے۔"

یوسف نے آگے بڑھ کر کہا "دیکھئے آپ کو اس وقت نہیں آنا چاہیے تھا یہ اچھا کیا آپ آگے نہیں آئیں ورنہ قبرستان اور خاص کر اس موسم میں محفوظ جگہ نہیں۔ یہاں سانپ ہوتے ہیں، بہت زہریلے سانپ"

امینہ بولی، "مَیں سانپوں کے خوف سے یہاں نہیں رُکی، صرف اس بات سے ڈرتی تھی کہ کہیں آپ دیکھتے ہی مجھ پر برس نہ پڑیں۔"

"کتنی غلط فہمی ہے آپ کو میرے متعلق، آپ کو یہ کبھی خیال نہیں آیا کہ مَیں کسی کی

دل آزاری نہیں کر سکتا۔"

"جی اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں یہاں تک آنے کی جرأت بھی نہ کرتی، اب اگر آپ کو میرے ساتھ چلنے پر کوئی اعتراض نہ ہو تو جلدی کیجئے وہاں لوگ بے حد پریشان ہیں — فضل دین آپ کی سائیکل لے آئے گا۔"

یوسف کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ کار پر بیٹھ گیا۔ کافی دیر دونوں خاموش رہے، پھر امینہ نے کہا "جب میں کار اسٹارٹ کر چکی تھی تو میں نے بیگم بلقیس صاحبہ کو آتے دیکھا تھا، میں نے کار روکی تھی لیکن ان کا ڈرائیور آگے نکل گیا تھا پھر بھی میرا خیال تھا کہ بیگم بلقیس نے مجھے یقیناً دیکھ لیا ہوگا اگر وہ رک جاتیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی آپ کی تلاش میں آجاتیں۔ میں اس بات سے بہت ڈرتی تھی کہ آپ مجھے دیکھ کر خفا ہو جائیں گے۔

" آپ جن حالات میں گھر سے باہر نکلے تھے۔ میں اُن کے باعث پریشان ہو گئی تھی اور پھر آپ کی تلاش میں نکل پڑی تھی۔ مجھے خیال آیا تھا کہ شاید آپ اپنی امّی جان کی قبر پر گئے ہوں گے اور عجیب بات ہے کہ میرا خیال درست نکلا۔"

" امینہ میں اس بات پر خفا نہیں ہوں اور میں چراغ بی بی کو بھی قابلِ معافی سمجھتا ہوں۔ اگر میں تھوڑی دیر تک ٹھنڈے دل سے سوچتا تو شاید گھر والوں کو پریشانی نہ ہوتی، مجھے اب خیال آ رہا ہے کہ چراغ بی بی نے میری ماں کو جان کنی کی حالت میں بھی پیار کرتے دیکھا تھا۔ شاید اس نے پہلے بھی امی کو میرا ماتھا چومتے دیکھا ہو اور اس بات کو ایک ماں کی حیثیت سے اپنے فرائض میں شامل کر لیا ہو۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس مسئلے کو آئندہ زیرِ بحث لایا جائے۔ میں اُسے خوش رکھنے کی کوشش کروں گا یہ اور بات ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نہ ہو۔"

"یوسف صاحب"، امینہ نے کچھ سوچ کر کہا۔ "آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو صرف

دوسروں کی اچھائیوں پر نگاہ رکھتے ہیں لیکن دنیا کا ہر انسان آپ جیسا نہیں۔ چراغ بی بی کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس سے بے وقوفی ہوئی تھی لیکن آپ نے اس کی ماں کو غور سے نہیں دیکھا مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اس سے خوف کھاتی ہوں یہاں تک کہ مجھے اس کے پیار سے خوف آتا ہے۔ آپ بُرا نہ مانیں تو میں یہ کہوں گی کہ آپ کو اس سے بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

"میں اسے بھی خوش رکھنے کی کوشش کروں گا اور تمہیں ان مسائل کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ دنیا میں پہاڑ سا بوجھ اٹھانے کے لیے پہاڑ بننا پڑتا ہے میں پہاڑ تو نہیں لیکن میں چھوٹی موٹی تلخیاں بڑی ہمت کے ساتھ برداشت کروں گا۔"

"یوسف صاحب میں اس بات سے بے خبر نہیں ہوں کہ اللہ نے آپ کو کتنی ہمت اور کتنا حوصلہ دیا ہے۔ کاش میں آپ کی طرح ایک ادیب ہوتی اور آپ کے متعلق ایک کتاب لکھ سکتی۔"

یوسف نے ہنستے ہوئے کہا "ہاں باتیں عجیب آتی ہیں آپ کے ذہن میں"۔

"یوسف صاحب میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ میرے ساتھ گاڑی پر بیٹھ گئے ہیں"۔

"بھئی شکریہ مجھے ادا کرنا چاہیے کہ آپ میری تلاش میں نکل پڑی تھیں، میں اتنا ناشکر گزار تو نہیں ہو سکتا کہ آپ گاڑی لے کر سڑک پر کھڑی ہوں اور میں آپ کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیتا۔ ویسے مجھے یہ خیال آیا تھا کہ آپ کو پیچھے بٹھا کر مجھے کار خود چلانی چاہیے۔"

امینہ نے گاڑی روکتے ہوئے کہا "یوسف صاحب میں اب بھی پیچھے بیٹھنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اب تو ہم گھر پہنچنے والے ہیں اب چلو۔"

امینہ نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا، "یوسف صاحب میں دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

گاڑی گھر کے قریب پہنچی تو بلقیس گلی سے نکل رہی تھی اور اس کا ڈرائیور دروازہ کھول رہا تھا۔ امینہ نے گاڑی روکی اور یوسف جلدی سے اتر کر بلقیس کی طرف بڑھا اور اس نے پوچھا،

"چچی جان! آپ جا رہی ہیں؟"

بلقیس نے اسے امینہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا وہ چند ثانیے خاموش رہی اور پھر کہنے لگی،

"میں نے تمہارا کافی انتظار کیا ہے"۔

"چچی جان میں صبح آپ کے پاس حاضر ہونا چاہتا تھا لیکن گھر کے کاموں میں الجھا رہا اور پھر مجھے یہ بھی امید تھی کہ آپ کسی وقت یہاں آئیں گی۔"

"بیٹا! میں آئی تھی تو تم گھر میں نہیں تھے اور یہ کوئی بھی نہیں بتا سکا کہ تم کہاں گئے ہو۔ امینہ کو میں نے نوکر کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا لیکن تم اس وقت کار پر نہیں تھے۔"

"چچی جان میں سائیکل پر باہر نکلا تھا۔ یہ لوگ مل گئے تو میں نے اپنی سائیکل امینہ کے نوکر کے حوالے کر دی۔

بلقیس نے کہا" یہ بھی اچھا ہوا کہ امینہ کو تمہارے پروگرام کا علم تھا ورنہ گھر میں بہت پریشانی تھی۔ اچھا اب تم آرام کرو میں جاتی ہوں تمہارے چچا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

یوسف کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن بلقیس نے کار پر بیٹھ کر دروازہ بند کر لیا اور ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر دی۔

اگلے دن وہ صبح ہوتے ہی بلقیس کے گھر پہنچا تو میاں عبدالعزیز دفتر جا چکے تھے۔

اس نے السلام علیکم کہنے کے بعد بلقیس سے کہا" چچی جان آپ میرے لیے ایک الجھن چھوڑ آئی تھیں، میں کافی دیر سو نہ سکا۔ میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ میں کسی پروگرام کے ساتھ گھر سے نہیں نکلا تھا اور امینہ کو یہ علم نہیں تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ بہرحال وہ میری تلاش کے لیے نکلی تو میں اپنی ماں کی قبر پر کھڑا تھا۔ شاید یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آسکے کہ میں ماں کی قبر پر کیوں گیا تھا۔"

یوسف کی آواز بھرا گئی۔ بلقیس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا بیٹا! تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم اپنی ماں کی قبر پر کیوں گئے تھے۔ اگر تم میرے گھر سے ہو کر جاتے تو شاید میں بھی تمہارے ساتھ چلتی، تمہارے گھر نہ آنے کی وجہ یا امرتسر نہ جانے کی وجہ یہی تھی کہ میرے دل میں تمہاری ماں کی موت کے زخم اچانک تازہ ہو گئے تھے اور آج بھی سب کے سامنے تمہیں امینہ کے ساتھ دیکھ کر مجھے یقیناً غصہ آیا مگر اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میرے طرزِ عمل سے تمہاری دل آزاری ہوئی ہے۔ بیٹا مجھے معاف کر دو، کبھی کبھی مجھے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

یوسف نے کہا" چچی جان عام حالات میں میں شاید اس کے یا کسی اور لڑکی کے ساتھ کار پر بیٹھنا مناسب نہ سمجھتا لیکن کل میرا دماغ جواب دے چکا تھا۔"

"بیٹا بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو؟"

"نہیں چچی اب میں چلتا ہوں۔"

"اچھا تم مجھ سے وعدہ کرو جب بھی تمہیں کوئی پریشانی ہوگی تم میرے پاس آیا کرو گے۔"

"چچی جان، میں ضرور آیا کروں گا لیکن اپنی پریشانیوں میں آپ کو حصے دار نہیں بناؤں گا۔"

"ہاں بیٹا میں شاید اس قابل بھی نہیں ہوں کہ تمہاری پریشانیوں میں حصہ دار بن سکوں۔"

"چچی جان، میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ بیٹے جوان ہو جائیں تو وہ ماؤں کو اپنی پریشانیوں میں حصہ دار نہیں بنایا کرتے اور میں اس رات شاید ایک بچے سے اچانک جوان ہو گیا تھا۔ جب امی جان چلی گئی تھیں۔ چچی جان اگر کبھی مجھے بچہ بننے یا بچے کی طرح رونے کا خیال آیا تو آپ کے گھر کے علاوہ کسی اور گھر کو موزوں نہ سمجھوں گا لیکن آپ کو بھی میرے

لیے یہ دعا کرنی چاہیے کہ میں کسی کو پریشان نہ کروں۔ میں عجیب قسمت لے کر پیدا ہوا ہوں۔ جن لوگوں نے مجھ سے پیار کیا تھا وہ اچانک اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ پہلے چچا شیر علی اور میرے پردادا چل بسے۔ پھر امی جان کی باری آئی، میں آپ کے لیے دعا کیا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کی عمر بہت لمبی کرے اور جب تک میں بوڑھا نہیں ہو جاتا آپ اور چچا جان سلامت رہیں۔"

"بیٹا تمہیں پیار کرنے والے اور بھی تو بہت ہیں۔" بلقیس نے جواب دیا۔

"جی ہاں ان کے لیے دعا کیا کرتا ہوں جب کوئی میرے دل کے قریب آتا ہے تو یہ خوف طاری ہونے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے چھین نہ جائے۔"

"لیکن تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ کتنے لوگ تمہارے لیے دُعا کرتے ہیں۔"

"چچی جان اس کے لیے بھی میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ اب مجھے اجازت دیں۔"

یوسف السلام علیکم کہہ کر چلنے لگا تو بلقیس نے اسے آواز دے کر کہا "بیٹا ٹھہرو میں تمہیں ایک خوشخبری سنانا چاہتی ہوں، فہمیدہ بہت جلد یہاں آ رہی ہیں۔ انشاء اللہ وُہ چند دن یہاں گزارے گی۔ نسرین بھی اُس کے ساتھ ہو گی۔ اُن کے صحیح پروگرام کا ٹیلیفون پر گفتگو سے معلوم ہو جائے گا۔ اگر تم آج رات ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ تو ان سے گفتگو بھی کر سکو گے۔ میرا مطلب ہے اگر تمہارا وقت ضائع نہ ہو" بلقیس مسکرا رہی تھی

"چچی جان میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ لیکن آپ کو یہ خیال ہے کہ میرا وقت ضائع ہوگا۔ اب تو میری یہ حالت ہے کہ وقت میرے لیے ایک سزا بن چکا ہے۔ رات مجھے نیند نہیں آتی تھی اور آج بھی اگر میں یہ اطمینان لے کر نہ جاتا کہ آپ میری حماقت پر خفا نہیں ہیں تو مجھے نیند نہ آتی۔ چچی جان نیند کا نہ آنا ایک بہت بڑی سزا ہے۔"

بلقیس نے آگے بڑھ کر پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "بیٹا تم نے کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ غلطی میری تھی دیکھو جا کر بیٹھک میں سو جاؤ، ہم رات کو ٹیلیفون کریں گے

"نہیں چچی جان اب آپ مجھے اجازت دیں تو میں رات سے پہلے آجاؤں گا۔"



اس دن وُہ بہت خوش تھا۔ شام کے وقت منظور اس کے پاس آیا تو وہ دونوں چائے پی کر سائیکلوں پر راوی کی طرف چلے گئے۔ وہاں مغرب کی نماز کے بعد انہوں نے ایک کشتی لی اور یوسف کئی ہفتوں کے بعد دریا کے بہاؤ کے خلاف خوشی خوشی کشتی چلا رہا تھا۔

منظور نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ تم بہت بشاش نظر آ رہے ہو"۔ یوسف نے کشتی دوسرے کنارے لگاتے ہوئے کہا "دیکھو منظور اس دنیا میں زندہ رہنے کے لیے میرے جیسے آدمی کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ کسی پر یقین رکھتا ہو یا کسی کے لیے زندہ رہنا یا مرنا چاہتا ہو، کبھی کبھی یوں ہوتا ہے کہ رات کالے بادلوں کے باعث ستاروں کی ضیا پاشیوں سے محروم ہوتی ہے پھر اچانک کسی جگہ سے بادل پھٹ جاتے ہیں اور کوئی ستارہ پوری تابانیوں کے ساتھ نظر آتا ہے اور تھکے ہارے مسافروں کو اپنا راستہ اور منزل دکھائی دینے لگتی ہے۔ منظور، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے مقدر کے ستارے کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کر چکا ہوں لیکن اس کی تفصیلات کے لیے میں تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

"یوسف! میرے لیے اصل مسئلہ اس دنیا میں تمہاری خوشی ہے اور یہ میں تمہاری آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ تمہارے مقدر کا روشن ستارہ کون سا ہے۔ یوسف تمہیں معلوم ہے کہ جب سے تمہاری امی جان فوت ہوئی ہیں میں تمہارے لیے کتنی دعائیں کیا کرتا ہوں میں ہمیشہ تمہیں مسکراتا اور قہقہے لگاتا ہوا ساتھی دیکھنا چاہتا ہوں جس کے متعلق مجھے پہلی ملاقات کے ساتھ ہی یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ دنیا میں نام پیدا کرے گا اور میں اس کا دوست کہلانے پر فخر کروں گا۔ اب نماز کا وقت ہو رہا ہے

اور آج یہاں ریت پر مَیں تمہارے پیچھے نماز پڑھوں گا۔" اُنھوں نے وضو کیا اور دریا کے کنارے خشک ریت پر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز ختم کرنے کے بعد جب وہ دوبارہ کشتی پر سوار ہوئے تو یوسف کہہ رہا تھا "منظور! کبھی کبھی مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اللہ میرے حال پر بہت مہربان ہے۔ ماں کی موت کے بعد مَیں نے اپنے دل پر جو زخم محسوس کیے تھے وُہ مندمل ہو رہے ہیں اور بعض فرشتے مجھے کھینچ کر جنّت کی طرف لا رہے ہیں اور ان فرشتوں میں سے ایک تم بھی ہو، مَیں تمہاری نیک دعاؤں کے لیے شکر گزار ہوں۔ کبھی کبھی مجھے یہ تلخی محسوس ہوتی ہے کہ کوئی تاریک سایہ میرا پیچھا کر رہا ہے لیکن پھر کسی ساتھی کی آواز سُنائی دیتی ہے اور یہ تاریک سائے روپوش ہو جاتے ہیں۔ مَیں تمہارا شکر گزار ہوں منظور۔"

"بھائی شکریہ مجھے ادا کرنا چاہیے جسے تم نے یہ احساس دلایا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں مجھ جیسے عاجز کی دعائیں بھی قبول ہو سکتی ہیں۔ آج سے مَیں تمہارے تصوّر کے ستارے کے لیے بھی دعائیں کیا کروں گا اور وہ دن میرے لیے انتہائی خوشی کا دن ہوگا جس میں تمہاری زبان سے یہ سنوں گا کہ تم اپنی منزل پر پہنچ چکے ہو۔"

کشتی کنارے پر لگی یوسف نے حسبِ معمول کشتی والے کو پیسے دینے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو منظور نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "نہیں یوسف صاحب، آج سے کشتی والے کو مَیں پیسے دیا کروں گا۔"

یوسف نے کوئی مزاحمت نہ کی اور منظور نے اپنی جیب سے ایک روپیہ نکال کر کشتی والے کو دے دیا۔



رات کے وقت یوسف عبدالعزیز کے گھر پہنچا تو وہاں کھانے کی میز پر اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ بلقیس نے اُسے دیکھتے ہی کہا

"یوسف! تم ذرا دیر سے آئے ہو، ہمیں جالندھر کی ٹیلی فون کال بُک کراتے ہی مل گئی تھی۔ وہ سب بخیریت ہیں اور تمہارے چچا نے ان سے کافی دیر گفتگو کی تھی۔"

عبدالعزیز نے یوسف کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا:

"بیٹا مَیں کھانا کھاتے ہی ایک ضروری کام سے دفتر چلا جاؤں گا اور یہ ممکن ہے کہ مَیں پچھلے پہر تک واپس نہ آسکوں تو تم اطمینان سے کھانا کھاؤ اور میری بات سُنتے رہو۔ میں ایک مُدّت سے ایک اہم فریضہ پُورا کرنے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔ تمہاری چچی سے بہن قدسیہ نے آخری وقت جو باتیں کی تھیں اُن سے صرف مَیں ہی نہیں ہمارا پُورا خاندان متاثر ہے۔ اگر بلقیس نے تمہیں وُہ باتیں نہیں بتائیں تو کسی وقت ان سے پُوچھ لینا۔ جہاں تک تمہارے مستقبل کے متعلق فہمیدہ کے والدین اور دوسرے عزیزوں کا تعلق ہے۔ اُن کے لیے یہ جان لینا ہی کافی ہے کہ اللہ نے تمہیں ایک دوسرے کے لیے بنایا ہے اور بیٹی نسرین ہمیں ایک دوسرے سے قریب لانے کے باعث پُورے خاندان میں بہت معتبر بن گئی ہے۔"

یوسف مسکرایا اور پھر اچانک اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور وُہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "چچا جان! مجھے اظہارِ تشکّر کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ مَیں یہ سوچتا ہوں کہ آپ اور چچی بلقیس کے بغیر میری دُنیا کتنی ویران اور اُداس ہوتی۔"

بلقیس بولی "بیٹا! تمہیں معلوم نہیں کہ تم ہماری دُنیا میں کتنی خوشیاں لے کر آتے ہو۔"

عبدالعزیز نے کہا "دیکھو یوسف! بلقیس تمہیں دیکھ کر جس قدر خوش ہوتی ہے۔ اُسی قدر تمہیں اُن سے خوف زدہ رہنا چاہیے کیونکہ جب اُنھیں غصّہ آتا ہے تو یہ کبھی نہیں دیکھتیں کہ وُہ غریب جو اُن کے تیرونشتر کا ہدف بن چکا ہے

ان سے کتنا پیار کرتا ہے ۔"

"نہیں چچا جان"۔ یوسف مسکرایا "مجھے یقین ہے کہ چچی جان کو مجھ پر کبھی غصہ نہیں آئے گا۔"

عبدالعزیز نے گلاس اُٹھا کر پانی کے چند گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ "بیٹا میں تمہیں صرف محتاط رہنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ اگر مجھے دفتر میں زیادہ دیر ہوگئی تو ممکن ہے کہ گھر آنے کی بجائے وہیں آرام کرلوں تمہیں اُٹھنے کی ضرورت نہیں۔ خدا حافظ"!

عبدالعزیز نے غسل خانے میں جاکر ہاتھ صاف کیے اور وہیں سے باہر نکل گیا۔

یوسف نے قدرے توقف کے بعد بلقیس کی طرف دیکھا اور کہا "چچی جان! میرے لیے اسی وقت دُعا کریں"۔

وہ بولی "بیٹا! مَیں ہر وقت تمہارے لیے دُعا کیا کرتی ہوں"۔

"وُہ مجھے معلوم ہے چچی جان، لیکن آپ اِس وقت میرے لیے یہ دُعا کریں کہ مجھ سے کوئی ایسی حماقت نہ ہوجائے جس سے آپ کو غصہ آجائے"۔ "بیٹا مجھے تم پر غصہ نہیں آسکتا اور قدسیہ کے بیٹے کو یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ مجھے اُس کی حماقتوں پر بھی پیار آئے گا"۔

"چچی جان، آپ دعا ضرور کریں کیوں کہ چچا جان نے مجھے بڑی سنجیدگی سے وارننگ دی تھی"۔

"نہیں بیٹا! انہوں نے مجھے ڈرانے کی کوشش کی تھی ان کا خیال ہوگا کہ میں کسی بے خیالی میں تمہاری دِل آزاری نہ کر بیٹھوں اور تم روٹھ جاؤ۔ اِس لیے مجھے گفتگو میں بہت محتاط رہنا چاہیے"۔

یوسف مسکرایا "چچی جان، اگر یہ بات ہے تو مَیں اسی وقت ٹیسٹ دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ کے جی میں جو آئے کہتی جائیں اور میں مسکراتا رہوں گا، روٹھنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک بیٹا ماں سے اگر رُوٹھے گا تو کہاں جائے گا"۔ بلقیس نے قدرے توقف کے بعد کہا "بیٹا، تم نے مجھ سے یہ نہیں پُوچھا کہ تمہاری ماں نے جان کُنی کے وقت مجھ سے کیا باتیں کی تھیں"!

"چچی جان! مجھے پُوچھنے کی ضرورت نہ تھی مَیں یہ بات جانتا تھا اور جو باتیں مَیں نہیں سُن سکا تھا ان کے متعلق بھی میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ وہ یہی تھیں ویسے چچی جان میرے کان بہت تیز ہیں اور جن باتوں کا میری زندگی کے ساتھ اتنا گہرا تعلق تھا وہ جاننے کے لیے میری حسیات پُوری طرح بیدار تھیں۔ مَیں ساری عمر اس بات پر آپ کا شکر گزار رہوں گا کہ جب امی جان آخری سانس لے رہی تھیں تو آپ نے ان کی سب سے بڑی الجھن اور بے چینی دُور کر دی تھی"!

بلقیس آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے بولی "بیٹا، یہ کوئی احسان نہیں تھا بلکہ جو خواہش ان کے دل میں تھی وہ میرے دل میں بھی تھی۔ انشاءاللہ! آج تمہیں میری طرف سے کوئی انعام ملے گا"۔

"وُہ کیا ہوگا چچی جان"؟

"بیٹا وہ انعام یہ خوشخبری ہے کہ فہمیدہ، نسرین اور اُن کے والدین کل صبح یہاں آرہے ہیں۔ یہ بھائی جان پر منحصر ہے کہ وہ کب پہنچیں گے۔ اگر ان کا موڈ بن گیا تو انشاءاللہ نماز سے فارغ ہوتے ہی چل پڑیں گے۔ فہمیدہ نے کالج کی چند کتابیں خریدنی ہیں لیکن اہم ترین بات یہ ہے کہ سب کا اوّلین مقصد تمہیں دیکھنا ہے"۔

یوسف نے جھجکتے ہُوئے کہا "چچی جان، اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتی ہیں تو مَیں بہت خوش قسمت ہوں"!

"تم یقیناً بہت خوش قسمت ہو بیٹا! عام حالات میں شاید وہ اتنی جلدی یہاں آنے کا پروگرام نہ بناتے لیکن تمہارے چچا نے اپنے بھائی سے خلاف توقع ذرا

کھُل کر بات کی تو وُہ فوراً تیار ہوگئے اور بیٹا سنو جب میں فہمیدہ کی ماں سے تمہاری پریشانی کا ذکر کر رہی تھی تو مجھے ٹیلی فون پر فہمیدہ کی ہلکی ہلکی سسکیاں بھی سنائی دے رہی تھیں ـــ اچھا بیٹا یہ بتاؤ اس خبر سے بڑھ کر کیا انعام ہوسکتا ہے"؟ یوسف مغموم لہجے میں بولا "چچی جان جب مَیں بہت چھوٹا تھا تو امی جان مجھے کوئی خوبصورت کھلونا دیا کرتی تھیں تو ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ ہوا کرتی تھی جو مَیں آپ کے چہرے پر دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت میں اس کے سوا کچھ نہیں سوچتا کہ اپنے کمرے میں جاؤں وضو کروں اور اللہ کے حضور سربسجود ہو جاؤں"۔

بلقیس نے نوکر کو بلوا کر حکم دیا "تم یوسف صاحب کو بیڈ روم میں لے جاؤ ان کے لیے دودھ اور پانی رکھوا دو اور یہ بھی دیکھ لو کہ غسل خانہ صاف ہے کہ نہیں ایک جائے نماز بھی وہاں رکھوا دو"۔

تھوڑی دیر بعد یوسف نے بیٹھک میں جاکر نماز پڑھی دعائیں مانگیں اور کچھ دیر صحن میں ٹہلنے کے بعد بیٹھک کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ تاروں کی روشنی یکایک بڑھ گئی ہے۔ سردی کے باوجود ہوا کے جھونکے اُسے خوشگوار محسوس ہو رہے تھے۔ پھر کچھ دیر ٹہلنے کے بعد اس پر لکھنے کا موڈ طاری ہوگیا اور وہ نیچے جاکر بیٹھک میں ایک کشادہ میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے میز کا دراز کھولا تو وہ فل سکیپ کاغذ سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے چند کاغذ نکال کر میز پر رکھے اور لکھنے میں مصروف ہوگیا۔

"مہرو ماہ سلامت رہو!

یہ وہ خط ہے جو تمہیں بھیجنے کی جسارت کرنے کے بجائے کہیں چھپا کر رکھ لوں گا اور کبھی کبھی تجدید عہد کے لیے خود ہی پڑھ لیا کروں گا۔ یہ ایک مشہور شہزادی کا نام ہے۔ ابھی مَیں چھت پر کھڑا جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھ رہا تھا تو تمہیں پکارنے

کے لیے مجھے مہرو ماہ کے الفاظ پسند آگئے۔ دیکھئے مسئلہ ذاتی پسند کا ہے۔ ذوق سے اِس کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر مَیں سوچ میں پڑ جاؤں تو فہمیدہ کے علاوہ اور کوئی نام مجھے پسند نہیں آئے گا۔ مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ آئندہ جو چیز مجھے پسند آیا کرے گی وہ تمہارے نام کا حصّہ بن جایا کرے گی۔ مجھے اِس خوشی میں نیند نہیں آئے گی کہ آپ کل تشریف لا رہی ہیں۔ خدا کرے کہ ابا جی علی الصباح سفر کے موڈ میں ہوں اور آپ اچانک یہاں پہنچ جائیں جب مجھے کوئی اور کام نہیں ہوتا تو مَیں اپنی والدہ کی قبر پر جاتا ہوں اور وہاں فاتحہ خوانی کے ساتھ یہ وعدہ بھی دہرایا کرتا ہوں کہ ان کی سب سے بڑی خواہش پوری کرنا میری زندگی کا ایک مقدس فریضہ ہے۔ مَیں نسرین، تمہارے والدین اور بڑی ماں جی کی بلند ترین توقعات پوری کروں گا۔

امتحان قریب آرہا ہے مجھے پچھلی کمی پورا کرنے کے لیے سخت محنت کرنا پڑے گی لیکن سرِدست مَیں اپنا مسوّدہ مکمل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ انشاء اللہ آج یہ کام شروع کروں گا اور آپ کے یہاں آنے کی خوشی میں جو تحفہ پیش کروں گا وہ میری پہلی کتاب ہوگی پُوری کتاب نہیں ہوگی شہزادی صاحبہ! کیونکہ آخری صفحات لکھنے کے لیے مجھے وقت کا انتظار کرنا پڑے گا اور ہمیں اللہ کی بارگاہ میں بہت سی دُعائیں کرنا پڑیں گی کہ اس کی تکمیل ہماری خواہشات کے مطابق ہو۔

مَیں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بعض لوگوں کی تقدیس کے احترام میں مجھے مسوّدے میں ان کے نام تبدیل کرنے پڑیں گے اور بعض واقعات اور مقامات میں بھی کچھ ردّو بدل کرنا پڑے گا اور یہ سب اس لیے ہوگا کہ میری کتاب میں کئی ایسے کردار آئیں گے جن کی اصل شخصیتیں مَیں زمانے کی نگاہوں سے اُوجھل رکھنا چاہتا ہوں۔

فہمیدہ! اِس وقت میرے ذہن میں ہزاروں باتیں ہیں اگر لکھنا شروع کردوں تو ایک اور کتاب بن جائے گی۔ مَیں انتہائی اختصار سے کام لیتے ہوئے یہ کہنا چاہتا

ہوں کہ جب میرے گردوپیش تمام روشنیاں گل ہوگئی تھیں۔ میرے سامنے کوئی منزل اور راستہ نہ تھا تو تمہاری یاد میرا آخری سہارا بن گئی تھی۔ پھر ایک دن جب کہ میرے دل پر والدہ کے زخم بہت تازہ تھے۔ مَیں ریلوے سٹیشن پر کھڑا کانگڑہ سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا اور دُور سے گاڑی کا دھواں دکھائی دیا اور مَیں نے ایسا محسوس کیا کہ اِس دھوئیں کے بادلوں سے میری زندگی کی مسکراہٹیں نمودار ہونے والی ہیں، پھر بڑی ماں جی سے ننھی نسرین سے اور آپ کے والدین سے باتیں کرتے ہُوئے مَیں نے محسوس کیا کہ مَیں نے پُوری قوت سے زندگی کا دامن پکڑ لیا ہے اور میرے تصوّرات حقیقت بن کر میرے سامنے آگئے ہیں۔

فہمیدہ! اِس وقت شاید مَیں تمہیں یہ نہ سمجھا سکوں کہ تمہارے متعلق مَیں کیا سوچتا ہوں۔ کیونکہ جب مَیں تمہارا تصوّر کرتا ہوں تو سوچ ختم ہو جاتی ہے۔ اللہ تمہیں وُہ سب کچھ دے جو مجھ جیسا تہی دست انسان نہیں دے سکتا۔

جب تم سے آزادی کے ساتھ باتیں کرنے کا وقت آئے گا تو مَیں تمہیں یہ سمجھا سکوں گا کہ بعض لوگ اچانک زندگی کا سہارا بن کر آتے ہیں اور زندگی سے زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں۔ معاف کرنا اس وقت وہ بے شمار باتیں میری سمجھ میں نہیں آسکتیں جو ایک شہزادی کے شایانِ شان ہوں۔

یوسف''

یوسف نے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھے کر کے بستر کے ساتھ تپائی پر رکھ دیے اور پھر اطمینان سے لیٹ کر انھیں پڑھنا شروع کر دیا۔ چند منٹ بعد اس نے اچانک بستر سے اُٹھ کر بعض الفاظ میں ردّ و بدل کیا اور کچھ دیر باہر نکل کر صحن میں ٹہلتا رہا جب خنکی محسوس ہونے لگی تو وہ اندر جا کر بستر پر لیٹ گیا اور لکھے ہوئے کاغذ دوبارہ پڑھنے شروع کر دیے۔ پھر یکایک اُسے اُونگھ آگئی اور کاغذ اُس کے ہاتھ سے گر کر بکھر گئے۔

وُہ خواب کی حالت میں اپنے گاؤں کے کھیتوں میں گھوم رہا تھا۔ فہمیدہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ کانگڑہ کے ایک بلند پہاڑ پر چڑھ رہا تھا اور فہمیدہ اور نسرین اُس کے پیچھے آرہی تھیں۔ وہ پھل سے لدے ہوئے ایک انجیر کے درخت پر چڑھ رہا تھا اور نسرین جھولی تانے اپنی بہن کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ ایک آبشار کی طرف بڑھ رہا تھا اور نسرین اس کا بازو پکڑ کر چلا رہی تھی "بھائی جان آگے نہ جائیے۔ یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔" پھر اُسے کمرے میں ہلکی ہلکی آہٹ اور دبے دبے قہقہے سنائی دینے لگے کچھ دیر وہ آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ نسرین کہہ رہی تھی "آپا جی بہت دیر ہوگئی ہے مجھے تو خوف آتا ہے ایسی گہری نیند سے میرا خیال ہے کہ آپ انہیں جگا دیں"۔ فہمیدہ کی آواز سنائی دی "بے وقوف شور نہ مچاؤ ورنہ مَیں پٹائی کر دوں گی"۔

"آپا جان آپ کیا لکھ رہی ہیں"۔ "بے وقوف چپ رہو"۔

یوسف نے آنکھیں کھولیں، نسرین بولی "السلام علیکم بھائی جان! اگر مَیں اب شور مچاؤں تو آپ کی نیند تو خراب نہیں ہوگی؟"

"تمہاری آواز سے میری نیند کبھی خراب نہیں ہوتی"۔ یوسف نے جواب دیا۔

فہمیدہ جو ہاتھ میں قلم لیے میز کے سامنے بیٹھی تھی بولی "اور میری آواز سے؟"

"اگر مَیں نے سوال کا صحیح جواب دیا تو آپ ناراض ہو جائیں گی"۔

"مَیں کیوں ناراض ہونے لگی؟"

"دیکھئے شہزادی صاحبہ اگر مَیں دنیا میں نہ ہوتا تو بھی آپ کی آواز سُن کر اُٹھ بیٹھتا۔ میرا جواب غلط نہیں ہے لیکن آپ یقیناً بُرا مانیں گی"۔

فہمیدہ بولی "آپ کا جواب غلط بھی ہے اور مجھے پسند بھی نہیں آیا اور یہ خط جسے آپ نے سنبھال کر رکھنا تھا مجھے مل گیا ہے اور مَیں نے اس کا مختصر جواب بھی

لکھ دیا ہے۔"

فہمیدہ نے میز سے کاغذ اٹھا کر یوسف کو پیش کر دیا۔ اُس نے لکھا تھا۔

"یہ خط جو آپ نے سنبھال کر کہیں رکھنا تھا۔ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے۔ اگر شاعری زیادہ نہ ہوتی تو خط بُرا نہیں تھا۔ بہر حال آپ کی شکر گزار ہوں، لیکن دیکھئے مجھے یہاں رہنے دیجئے۔ سُورج اور چاند بنا کر لاکھوں اور کروڑوں میل دُور نہ بھیج دیجئے آپ کی ایک بات صحیح ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض لوگ زندگی کا سہارا بن کر آتے ہیں اور جان سے پیارے ہو جاتے ہیں لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جسے ہم دونوں اپنی زندگیوں سے عزیز سمجھتے ہیں اور وہ پاکستان ہے جس کی دلکش تصویریں مَیں آپ کی آنکھوں سے دیکھا کرتی ہوں۔ جب مَیں آپ کے سپنوں کے پاکستان کے متعلق سوچتی ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مستقبل کے اُفق پر انتہائی دل فریب رنگوں کی روشنیاں پھیل رہی ہیں لیکن کبھی کبھی مَیں اس خیال سے خوف زدہ بھی ہو جاتی ہوں کہ اگر ہم پاکستان حاصل نہ کر سکے تو کیا ہو گا؟" ________

یوسف نے اطمینان سے اُٹھ کر بیٹھتے ہُوئے جواب دیا۔ "فہمیدہ! مَیں پاکستان پر اتنا ہی یقین رکھتا ہوں جتنا مجھے آج غروب آفتاب اور طلوع آفتاب پر یقین ہے۔ ہم جس دَور میں پیدا ہوئے ہیں اس کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے لئے حصول پاکستان یا موت کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ پاکستان اس برصغیر پر آج نہیں، اِس صدی سے نہیں، بلکہ تیرہ صدیوں سے قائم ہو رہا ہے۔ کوئی قوم اپنے مستقبل کو اپنے حال اور ماضی سے جدا نہیں کر سکتی۔ کسی نے اُن قافلوں کو رُکتے نہیں دیکھا جن کے پیشرواُن کے راستوں پر اپنے خون کی روشنائی بکھیر جاتے ہیں۔ فہمیدہ! مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مستقبل کا ہر راستہ پاکستان کی طرف جاتا ہے

اور یہ ایک خواب نہیں ہے۔"

فہمیدہ بولی:

آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ جو اُمیدیں آپ نے پاکستان سے وابستہ کی ہیں وہ پُوری نہیں ہوئیں تو کیا ہو گا؟"

"دیکھئے، میرے دِل میں کبھی یہ خدشہ پیدا نہیں ہوا کہ میری امیدیں پوری نہیں ہوں گی اگر مجھے کسی غیر متوقع صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تو بھی میں سوچوں گا کہ میں کہاں تک اس کا ذمہ دار ہوں اور مَیں نے اپنی قوم کو فکر وعمل کا صحیح راستہ دکھانے میں کس حد تک اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔ فہمیدہ! جب قافلے چلتے ہیں تو ان کے راستے میں نشیب و فراز بھی آتے ہیں۔ اگر رات اندھیری ہو اور ہاتھوں میں مشعلیں نہ ہوں تو زیادہ ٹھوکریں لگتی ہیں۔ مَیں اس وقت صرف یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ آپ میں سے کسی کو مجھ سے یہ شکایت نہیں ہو گی کہ جب پاکستان کا قافلہ کسی نازک موڑ سے گزر رہا تھا تو مَیں نے پوری قوت اور ایمان داری سے اس کو آوازیں نہیں دی تھیں اور جب ہمیں تاریکیوں نے گھیر لیا تھا تو میں نے دونوں ہاتھوں سے مشعلیں بلند نہیں کی تھیں۔ اللہ نے مجھے قلم دیا ہے اور مَیں اپنے وقت سے بہت دُور آگے دیکھ سکتا ہوں مَیں پوری سنجیدگی اور دیانت سے علامہ اقبالؒ کے حسین سپنے کی تعبیریں لکھتا رہوں گا اور جب میری طاقت جواب دے جائے گی اور میرے ہاتھ سے قلم گر پڑے گا تو مجھے اس دنیا میں آخری سانس لیتے وقت بھی یہ اطمینان ہو گا کہ میں نے اپنے دل و دماغ اور جسم و روح کی تمام توانائیاں اپنے مقدس مشن کی تکمیل پر صرف کر دی ہیں۔ میرے اللہ! مَیں اس سے بہتر نہیں کر سکتا تھا۔"

فہمیدہ بڑی کوشش سے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"یوسف" اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ جب آپ پاکستان کے سپنے کی حسین تعبیریں لکھا کریں گے تو اللہ کا ہاتھ آپ کے سر پر ہوگا اور آپ کی توانائیاں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پاکستان کی منزل اچانک بہت قریب آگئی ہے۔ آپ جلدی سے تیار ہو کر آئیں میں آپ کا ناشتہ رکھواتی ہوں چچی جان کو اس قدر پریشان نہ کیا کریں۔"

فہمیدہ باہر نکل گئی اور نسرین یوسف کا ہاتھ پکڑ کر سہمی ہوئی آواز میں بولی:

"بھائی جان! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیا کریں میں بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روک رہی تھی۔"

یوسف نے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "نسرین تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ پاکستان تمہارا وطن ہوگا اور میں اِس وطن کے حصول کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دے سکوں گا۔"

"بھائی جان" نسرین نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بھائی جان آپ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے بہت کچھ مانگنا چاہیئے اور میں بہت کچھ مانگا کرتی ہوں: مجھے پاکستان کی ضرورت ہے اِس سے آپ کی ضرورت کم نہیں ہو جاتی۔ میں آپ کے بغیر پاکستان کا تصوّر نہیں کر سکتی۔ میں آپ کی شفقت سے محروم ہو کر زندہ رہنا بھی پسند نہیں کروں گی۔"

"میری ننھی شہزادی! تم پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتا ہُوا دیکھو گی اور تم اس بات پر بھی فخر کیا کرو گی کہ تمہارا بھائی اس کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ایک تھا۔"

"صرف بنیاد رکھنے والوں میں نہیں۔ بھائی جان! میں اس عمارت کی دیواریں اور چھت تعمیر کرتے ہوئے بھی آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں اس دُنیا میں وہ سب کچھ دیکھنا

چاہتی ہوں جو صرف میرا بہادر بھائی سر کر سکتا ہے بھائی جان! میں اللہ سے دعا کیا کرتی ہوں کہ جب تک ہم سب بہت بوڑھے نہیں ہو جاتے آپ زندہ رہیں آپ بہت اچھی کتابیں لکھیں — بہت سی کتابیں لکھیں اور میں اور میری طرح لاکھوں افراد انھیں بار بار پڑھا کریں۔ آیئے بھائی جان وہ سب ناشتے پر انتظار کر رہے ہیں۔"

ختم شد

”عرضِ حال“

زندگی میں میرے ساتھ دو بار ایسا ہُوا ہے کہ جب مجھ پر کسی بیماری کا حملہ ہوتا ہے تو میں کوئی بڑا کام شروع کر دیتا ہُوں ـــــ ۱۹۵۴ سے ۱۹۵۹ تک میں جوڑوں کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا ہوا تو میں نے بستر پر پڑے پڑے دو ناول ”معظم علی“ اور ”اور تلوار ٹوٹ گئی“ اِملا کروا دیے ـــــ

پھر ۱۹۸۲ سے لے کر اب ۱۹۸۹ تک ـــــ مجھے بستر پر لیٹنا پڑا ہے تو دو اور طویل کتابیں (ا) ”پردیسی درخت“ اور (ب) ”گم شدہ قافلے“ اِملا کرواتے ہُوئے مجھے بیماری سے زیادہ اس بات سے تکلیف ہوئی تھی کہ مجھے اِملا کروانے کے لیے بعض اِنتہائی ناموزوں لوگوں سے واسطہ پڑا۔

اِس عرصے میں دوسری بات یہ ہُوئی کہ میری آنکھوں کی تکلیف، جس کے متعلق گزشتہ پچیس سال سے مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میری یہ تکلیف بہت کم ہو گئی ہے، پھر ایک بار پُرانی شدّت کے ساتھ ظاہر ہُوئی اور وہ بیماری یہ تھی کہ کئی برس لیمپ کی روشنی میں کام کرنے کے باعث میں چند سال قبل گکروں کی شدید تکلیف میں مبتلا رہا ـــــ پپوٹوں کے اندر، رائی کے دانوں جتنے چھوٹے سخت قسم کے دانے پیدا ہو گئے تھے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے جب یہ تکلیف شروع ہُوئی تھی تو آنکھوں کے مشہور مُعالج سر ہنری ہالینڈ کوئٹہ میں تھے۔ لیکن اُس زمانے میں، اُن کے پاس بھی نیلا تھوتھا معمُولی مقدار میں پانی میں مِلا کر آنکھوں میں ڈالنے کے سوا کوئی اور علاج نہ تھا۔ پھر چند سال بعد ایک ایسی دوائی آ گئی جو اس تکلیف کے لیے کافی موثر تھی ـــــ

جب دوبارہ مجھے یہ تکلیف شرُوع ہُوئی تو اِتفاقاً آنکھوں کے مشہور و معروف معالج ڈاکٹر لیسین دُرّانی صاحب سے مُلاقات ہو گئی۔ اُنھوں نے کھڑے کھڑے

میری آنکھوں کو دیکھ کر کہہ دیا ـــــ ”بھئی، کل تم میرے پاس آ جاؤ، ایک آنکھ کی تکلیف تو اُسی روز ختم ہو جائے گی دوسری دو تین دِن بعد ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ چھوٹے چھوٹے دانے، جو تمھارے پپوٹوں کے اندر جم گئے ہیں، نِکال دیے جائیں گے“ ـــــ

ڈاکٹر دُرّانی صاحب اس انداز سے بات کر رہے تھے جیسے یہ کوئی مرض ہے ہی نہیں۔ میں مُحترم ڈاکٹر افضل اِعزاز صاحب کے ساتھ اُن کے پاس پہنچا۔ یہ اُن کا اپریشن کا دن نہیں تھا۔ بہرحال، انھوں نے مجھے اپنے دفتر میں ہی میز پر لِٹا کر ایک دوائی ڈالی اور چند منٹ بعد وہ چھوٹے چھوٹے دانے جن کی عُمر یقیناً میری عُمر سے نِصف ضرور ہوگی، نِکال ڈالے اور مجھے یہ محسوس تک نہ ہُوا کہ یہ کوئی اپریشن تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر افضل اعزاز صاحب مجھے کار پر گھر چھوڑ گئے۔ چند دِن بعد میرے اندر اِتنی خود اِعتمادی آ چکی تھی کہ میں ایک نوکر کو لے کر ہسپتال پہنچا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے اپریشن کا دن تھا۔ انھوں نے اطمینان سے میری دُوسری آنکھ بھی صاف کر دی۔

اس تکلیف سے تو مجھے نجات مِل گئی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اچھی طرح دیکھنے کے بعد مجھے بتایا: ”تمھاری آنکھوں میں سفید موتیا اُتر آیا ہے تاہم دو تین سال تم بڑے اطمینان سے کام کر سکو گے۔“

تین سال بعد ـــــ ”گم شدہ قافلے“ بالکل قریب الاختتام تھی کہ مجھے پھر تکلیف ہُوئی اور میں ڈاکٹر دُرّانی صاحب کے پاس پہنچا اور کہا ”ڈاکٹر صاحب، میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ کی وجہ سے میرے اندر جو خُود اِعتمادی پیدا ہُوئی تھی اس کی بدولت میں دو کِتابیں ختم کر چکا ہُوں۔“ ڈاکٹر صاحب نے میری آنکھوں کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کہا ”تمھاری آنکھوں میں جو کنکریشن بچ گئے ہیں وہ تمام صاف کر دیے جائیں گے اور میں تمھیں یہ خوشخبری بھی دے سکتا ہُوں کہ موتیا جہاں تھا، وہیں رُک گیا ہے اور تم دس بیس اور کتابیں لِکھ سکو گے۔“

”دس بیس نہیں ڈاکٹر صاحب، اب میں صرف ایک کتاب اور لِکھنا چاہتا ہوں اور وہ مجاہدینِ افغانستان کے متعلق ہوگی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کِتاب لکھنے میں میری رہی سہی توانائی ختم ہو جائے گی۔“

تاہم آج میں اتنا کہنے پر ہی اکتفا کر رہا ہوں کہ آپ کے ہاتھوں میں "پردیسی درخت" دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں اور اگر میری آنکھوں میں پھر کوئی تکلیف نہ ہو گئی تو دو ایک ماہ میں اپنی دوسری کتاب "گم شدہ قافلے" بھی آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا ——— انشاء اللہ

نسیم حجازی